بیاد مرحومین:۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شسنہاروی ﷫ بیادگار:۔ زین العابدین احمر و ادریس شسنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

SV02

— فہرست —

جلد ۵۳ شمارہ ۱

— بدل اشتراک —

- فی شمارہ .... ۵ روپے
- سالانہ .... ۵۰ روپے
- لائف ممبری .... ۱۰۰۰ روپے

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل

ریور سائیڈ روڈ، گیا

فون نمبر:۔ ۲۱۵۷۳

نوٹ

اب بھی تھوڑا وقت ہے

آج ہندوستان شدید ترین سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی بحران کا شکار ہے۔ افراتفری اور انتشار کی ایک منطق یہ بھی ہے کہ ایسے حالات میں ہماری نظریں اہم ترین اور بنیادی مسائل سے ہٹ جاتی ہیں اور غیر ضروری یا کم اہمیت کے حامل امور میں ہم اپنے آپ کو ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک طبقے نے ملک کو ایسے ہی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ دستور اور آئین کی بے حرمتی کھلے عام ہو رہی ہے۔ انتظامیہ اور عدلیہ بے بس ہے۔ سیاست ناکام ہو رہی ہے۔

یہ سب صورت حال کیوں کر پیدا ہوئی اور آئے دن اس میں اضافے کے اسباب کیا ہیں ــــ؟ ان سوالات پر اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ایک بات بڑی صاف نظر آئے گی اور وہ یہ ہے کہ آج برسر اقتدار سیاسی جماعت ذہنی انتشار اور فکری مغالطے میں مبتلا ہے۔ مرکز میں کانگریس سرکار ادھر دو دہوں سے مسلسل نظریاتی کشاکش کی شکار ہے۔ انتخاب اور دوٹوں کی سیاست نے کانگریس کے نظریات کو ختم کر کے اسے سمجھوتہ کی حکمت عملی پر مجبور کر دیا ہے لیکن ہوتا کیا ہے کہ حالات کو درست کرنے کی بجائے اگر منفی رجحانات سے ایک بار مفاہمت کر لی جائے تو پھر ہمیشہ کے لئے توازن بگڑ جاتا ہے اور ووٹوں کی خاطر غلط اور مہلک عناصر سے سمجھوتہ سیاسی جماعت کو ہر منزل پر اپنے نظریات کھو دینے اور ملک کو غلط راستے پر لے جانے کے لئے مجبور کرتا جاتا ہے۔ کانگریس اسی دلدل میں پھنستی جاتی ہے۔ چنانچہ اب حال یہ ہے کہ کانگریس کا تشخص مسخ ہو چکا ہے۔ اس کی سابقہ پالیسی بھی ختم ہو چکی ہے۔ نظریاتی طور پر یہ کھوکھلی ہو گئی ہے ــ اور اپنی کمزور

ہوگئی ہے کہ ہوا کے معمولی تھپیڑے پر یہ اسی رخ کو اپنانے پر مجبور ہے جس رخ پر ہوا اسے لے جائے ۔

ملک میں تخریب کاری کا جو سلسلہ چل رہا ہے۔ وہ نہ صرف یہاں کی تمام اقلیتوں کے لیے خلفشار کا باعث ہے بلکہ خود ملک کی سالمیت اور تحفظ کے ان دیکھے خطرات ہمارے دروازوں کو کھٹکھٹانے والے ہیں۔ کانگریس کی مفاہمت پرستی، ترقی پسند، روشن خیال اور مثبت تعمیری ذہنوں کو متحد ہونے میں بھی مانع بن رہی ہے۔ اگر اب بھی Polari-sation کے اس فطری تقاضے کی تکمیل نہ کی گئی اور کانگریس نے اپنے سابقہ نظریات کو اپنے عمل میں نہ اُتارا تو بلاشبہ یہ سیاسی جماعت اپنے ساتھ ساتھ پورے ملک کو ڈبو دے گی، اب بھی تھوڑا وقت ہے، اقتدار کی بھوک اور بھیڑ چال سے ہٹ کر سیکولرزم سوشلزم اور جمہوریت کی سچی تعبیرات ہی ہمارا مداوا کر سکتی ہے۔

مسعود منظر

اصغر علی انجینئر

پریم چند۔ حیات اور فن

قسط ۱۱

پریم چند اور مہاجنی تہذیب

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد اپنی زندگی کے آخری دور میں پریم چند کو آدرش واد کھوکھلا نظر آنے لگا۔ وہ ساری زندگی غریبوں، محنت کشوں اور اچھوتوں کے لئے لڑتے آئے تھے لیکن ان کی یہ لڑائی انسان دوستی اور آدرش واد کی بنیادوں پر تھی۔ طبقاتی بنیادوں پر نہیں۔ لیکن اب انہیں احساس ہونے لگا کہ انسان دوستی اور آدرشوں کی اپیل طاقتور مفاد پرستوں کے دلوں کو چھو بھی لے تو انہیں اپنے مفادات سے دستبردار ہونے پر مجبور نہیں کر پاتی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، پریم چند نے اپنے شاہکار ناول "گئودان" میں رائے صاحب کا کردار پیش کر کے اس بات کو اچھی طرح جتاتے ہیں۔ اب وہ سماجی نظام کے طبقاتی کردار کو اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں اور سماج میں جاری طبقاتی لوٹ کھسوٹ کے میکانزم کو سائنٹیفک بنیادوں پر اپنی تخلیقات میں پیش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ گئودان میں کھنّا کے کردار کے ذریعہ پریم چند نے سرمایہ دارانہ نظام کے طبقاتی کردار اور اس کی لوٹ کھسوٹ کی میکانزم کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔

کھنّا رائے صاحب کو ان کی کمپنیوں میں حصے خریدنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"روپئے جتنے چاہیں مجھ سے لیں۔ بیشک آپ کا ہے۔ ہاں ابھی آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ نہ کرایا ہوگا۔ میری کمپنی کی ایک بڑھیا پالیسی لے لیجئے سو دو سو ماہوار بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں۔ اور بعد کو یکجائی رقم مل جائے گی۔ چار پانچ ہزار لڑکوں کے لئے اس میں بہتر بندوبست آپ نہیں کر سکتے۔ ہمارے قواعد دیکھئے۔ ہم باہمی امداد کے اصولوں پر پورا عمل کرتے ہیں۔ دفتر اور عملے کے خرچ کے سوا نفع کی ایک پائی بھی کسی کی جیب میں نہیں جاتی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اس طریقہ پر کمپنی کیسے چل رہی ہے اور میری صلاح سے تھوڑا سا سٹّے کا کام شروع کر دیجئے یہ جو آج صدہا کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں سب اسی کی بدولت بنے ہوئے ہیں۔ روئی، شکر، گیہوں، ربر کسی چیز کا سٹّہ

کیجئے، منٹوں میں لاکھوں کا نپٹارا ہوتا ہے۔ کام ذرا بے تکا ہے۔ بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مگر وہی جو اناڑی ہیں۔ آپ جیسے تجربہ کار تعلیم یافتہ اور دوراندیش لوگوں کے لئے تو اس سے بہتر نفع کا کام ہی نہیں ہے۔ بازار کا چڑھاؤ اتار کوئی ناگہانی واقعہ نہیں۔ یہ بھی ایک سائنس ہے ایک بار اسے غور سے دیکھ لیجئے تو کیا مجال کہ دھوکا ہو جائے؟

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند سرمایہ دارانہ نظام اور اس میں دولت مند بننے کے ہتھکنڈوں پر پوری نظر رکھتے تھے۔ اس نظام میں دوسروں کو اکسپلائٹ کر کے دولت مند بننا ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے — انسانیت، عزت نفس، دوستی اور مروت کے لئے اس نظام میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ کھنا رائے صاحب کے بہترین دوستوں میں تھے مگر جب وہ ایک بڑے سنکٹ میں پھنس کر مسٹر کھنا کی بینک سے قرض لینے کے لئے بڑی امیدیں لے کر جاتے ہیں تو کھنا انکا صاف جواب دے دیتے ہیں۔ لیکن رائے صاحب جب بہت ہی منت سماجت کرتے ہیں تو کھنا صاحب دوستی، مروت سارے جذبات کو ٹھکرا کر ایک ہوشیار بزنس مین کی طرح رائے صاحب سے کہتے ہیں۔ "بینک کی جو حالت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ بینک نے ایک طرح سے لین دین کا کام بند کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جائے۔ مگر کاروبار تو کاروبار ہی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے۔ میرا کمیشن کیا رہے گا؟ مجھے آپ کے لئے خاص طور پر سفارش کرنی پڑیگی ..."

"رائے صاحب کا چہرہ اتر گیا۔ کھنا ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے بیٹھنے والے اور وہ ان سے کمیشن کی امید رکھتے ہیں۔ اتنی بے مروتی! آخر وہ جو اتنے دنوں سے کھنا کی خوشامد کرتے آئے ہیں تو کس دن کے لئے۔ باغ میں پھل ہوں، ترکاریاں ہوں، سب سے پہلے کھنا کے یہاں بھیجتے ہیں۔ کوئی جشن ہو، کوئی جلسہ ہو، سب سے پہلے کھنا کو مدعو کرتے ہیں۔ اس کا یہ جواب ہے!

دراصل حقیقت یہ ہے کہ نہ رائے صاحب کی دوستی کھنا صاحب سے نہ کھنا صاحب کی دوستی رائے صاحب سے خلوص اور بے غرضی پر مبنی ہے۔ دونوں کے اپنے مفادات ہیں ایک کے سرمایہ دارانہ اور دوسرے کے جاگیردارانہ۔ ان کے آپسی رشتے میں خلوص، شرافت، مروت کو کیسے دخل ہو سکتا ہے۔ ان کی تو سنکٹ میں پڑ کر محض دہائی دی جاتی ہے۔ پریم چند نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا اور اپنے اس دور کی تخلیقات اور تحریروں میں وہ اس حقیقت کو پوری ایمانداری سے بے نقاب بھی کرتے ہیں ادبی تخلیقات میں پوری فنکارانہ حسن کاری سے اور مضامین میں سائنٹیفک معروضیت اور دلائل کے ساتھ۔ اپنے آخری دور میں انھوں نے "مہاجنی سبھیتا" (مہاجنی تہذیب) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون نظریاتی اعتبار سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہم یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

"مگر اس مہاجنی تہذیب میں سارے کاموں کی غرض محض پیسہ ہوتی ہے۔ کسی دیش پر راج کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ مہاجنوں، سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھو تو آج دنیا میں سرمایہ داروں کی حکومت ہے۔ انسانی معاشرہ دو طبقوں میں

بٹ گیا ہے۔ بڑا حصہ مرنے اور کھپنے والوں کا ہے، اور چھوٹا حصہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اپنی طاقت اور اثر سے بڑے طبقے کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ انہیں اس بڑے طبقے سے کسی طرح کی ہمدردی نہیں، ذرا بھی رورعایت نہیں۔ بڑے طبقے کی ہستی صرف اس لئے ہے کہ اپنے آقاؤں کے لئے پسینہ بہائے۔ خون گرائے اور ایک دن چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔

پریم چند کو اس بات پر بڑا افسوس ہے کہ حکمراں طبقوں کے یہ خیالات محکوم طبقوں پر بھی اثر کر گئے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر فرد اپنے آپ کو سماج سے علیحدہ تصور کرتا ہے اور وہ شکاری جانور بن کر سماج کو اپنا شکار سمجھتا ہے۔ اس کا سماج سے ایک ہی رشتہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کس طرح کوئی ایسی ترکیب اسے سجھائی دے تاکہ وہ اسے بے وقوف بنا کر جتنا ممکن ہو سکے پیسہ بٹور لے۔ اس مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ پیسوں کی لالچ نے تمام انسانی احساسات کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ پیسہ اور صرف پیسہ ہی ہمارا سماجی مرتبہ، ہماری بھلائی اور ہماری قابلیت طے کرتا ہے۔ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو آپ دیوتا بن سکتے چاہے آپ کا دل کتنا ہی کالا کیوں نہ ہو۔ ادب، موسیقی، فن، سبھی کو دھن کے دیوتا کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ دولت نے ہماری فضا کو آلودہ کر دیا ہے کہ اس میں سانس لینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس مہاجنی تہذیب میں، پریم چند لکھتے ہیں۔ پیسوں نے انسان کے دل و دماغ پر ایسا غلبہ حاصل کر لیا ہے کہ اس کی حکمرانی پر کسی زاویئے سے حملہ کرنا خطرناک نظر آتا ہے۔ انسان جو ایک زمانے تک محبت، رحم، سچائی اور شرافت کا زندہ مجسمہ سمجھا جاتا تھا اب بے جان میکانزم بن کر رہ گیا ہے جیسے رحم اور شفقت سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ اس مہاجنی تہذیب نے نئے قوانین اور نئے مفروضے بنائے ہیں جس کے مطابق آج سماج کا کاروبار چلایا جا رہا ہے۔ ایسا ایک مفروضہ ہے۔ وقت پیسہ ہے، ایک وقت ایسا تھا کہ وقت زندگی تھا اور اس کا بہترین استعمال علم و تہذیب کے حصول اور غریبوں اور امداد کے مستحق لوگوں کی خدمت میں صرف کرنا تھا۔ آج کل اس کا بہترین استعمال اسے پیسہ کمانے پر خرچ کرنا سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی انگلیاں مریض کی نبض پر ہوتی ہیں مگر اس کی آنکھیں گھڑی پر جمی رہتی ہیں۔ ہر منٹ اس کے لئے اتنا پیسہ ہے۔ اگر مریض نے اسے ایک روپیہ ادا کیا ہے تو اسے ایک منٹ سے زیادہ وقت نہیں دیا جا سکتا۔ وہ جیسے تیسے نسخہ لکھ کر دوسرے مریض کو دیکھنے کے لئے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ پیسے کے اس مذہب نے دوستی اور انسانیت کو بے معنی بنا دیا ہے۔ شوہر کے پاس اپنے بیوی بچوں کے لئے ہی وقت نہیں ہے، دوستوں اور عزیزوں کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ جتنا وقت وہ ان کے ساتھ بات کرنے میں گذارے گا وہ اسے پیسہ کمانے پر خرچ کر سکتا ہے۔ زندگی کے اسی صورت میں کچھ معنی ہیں جب وہ اسے کچھ کمانے پر خرچ کرے ورنہ سب تضیع اوقات ہے......

اس تہذیب کا دوسرا مفروضہ ہے۔ بزنس بزنس ہے، اس میں انسانی احساسات اور جذبات کا کیا دخل۔ زندگی کے پرانے اصول ایسی بے رحمانہ بے باکی۔ جسے بے شرمی بھی کہنا چاہئے۔ اور جو اس نئے اصول کی زندگی اور روح ہے، کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جب ہم پیسوں کی نقد رولیوں کی بات کر رہے ہیں تو ہم دوستی اور انسانیت کا کوئی لحاظ نہیں کر سکتے۔ بزنس میں دوستی کو کیا دخل....

اس مہاجنی تہذیب کے ان تمام نئے اصولوں میں بزنس بزنس ہے، والا اصول سب سے زیادہ مہلک اور عفون کا پھیلا سا اصول ہے۔ شوہر اور زن کے درمیان بزنس، باپ اور بیٹے کے درمیان بزنس، علم اور متعلم کے درمیان بزنس، انسانوں کے درمیان تمام روحانی رشتے نابود ہوتے ہیں۔ اگر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی رشتہ رہ گیا ہے تو وہ اس بزنس کا رشتہ ہے۔ جہنم میں جائے یہ بزنس

اس مہاجنی تہذیب سے پریم چند کو جتنی نفرت ہے وہ اس مضمون سے ظاہر ہے۔ لیکن انسانیت کے مستقبل سے وہ بالکل مایوس نہیں ہیں۔ اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"ایک نئی تہذیب کا سورج دور مغرب سے طلوع ہو رہا ہے، جس نے اس سرمایہ داری کی جڑ کھود کر پھینک دی ہے۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے جسم و دماغ سے محنت کر کے کچھ پیدا کر سکتا ہے حکومت اور سماج کا قابل احترام رکن ہو سکتا ہے اور جو صرف دوسروں کی محنت یا باپ دادا کے جوڑے ہوئے دھن پر رئیس بنا پھرتا ہے۔ وہ قابل نفرت انسان ہے۔ اسے نہ معاملات حکومت میں رائے دینے کا کوئی حق ہے، نہ شہریت کے حقوق لینے کا سرمایہ دار۔ اس نئی لہر سے بوکھلایا ہوا پھر رہا ہے۔ اور ساری دنیا کے سرمایہ داروں کو مشترکہ آواز اس نئی تہذیب کو کوس رہی ہے:

پریم چند اس نئی تہذیب کے خلاف سرمایہ دارانہ سازشوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ یہ انفرادی آزادی کی دشمن ہے، یہ انسان سے مذہب اور ضمیر کی آزادی کا حق [illegible] ہے۔ روزانہ نئے نئے الزام تراشے جاتے ہیں۔ نئے نئے توہم لگائے جاتے ہیں اور اسے کالے رنگ سے پوتا

جا رہا ہے۔ لیکن پریم چند کا اٹل فیصلہ ہے کہ:-

مبارک ہے وہ تہذیب جو امیر آدمی کی حکومت کا خاتمہ کر رہی ہے اور نجی ملکیت کا جلد یا بدیر دنیا کو اسی کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ یہ کہنا کہ یہ نظام اس یا اس ملک کے سماجی اور مذہبی حالات کے راس نہیں آتا یا اس یا اس کی فضا کے مطابق نہیں ہے، بیہودہ بات ہے.... ہاں، مہاجنی نظام اور اس کے کرائے کے چاکر اس کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنے پر اپنا سارا زور صرف کریں گے۔ عوام کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہو جائے فتح تو سچائی کی ہی ہوگی:

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ پریم چند سوشلسٹ نظام کو انسانیت کے لئے بہترین نظام تسلیم کر چکے تھے اور یہ کسی اصولی طور پر نہیں ملک پر غور و فکر کے بعد صدف اور خاص کے ساتھ۔ اور دن بدن اس نئے نظام پر ان کا ایمان مضبوط ہوتا گیا اور تادم آخر اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے آخری ناول "منگل سوتر" میں جسے وہ مکمل نہ کر سکے، انہوں نے خیالات پر زور دیا ہے وہ اس ناول کے صرف چند ابواب ہی لکھ سکے۔ ان ابواب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گئو دان کے آگے کی چیز تھا اور اس ناول میں وہ انسانی معاشرے کے بنیادی مسائل کو بالکل نئے زاویے سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ "شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دیو کمار جیسے معمر ادیب اور مفکر کو ناول کا ہیرو بنایا ہے، وہ ایک دانشور ادیب ہے۔ متعدد کتابوں کا مصنف ہے اور ساری زندگی ادب کی خدمت کرتا رہا ہے...... وہ صرف گھریلو مسائل پر غور و خوض کرتا

بلکہ کل ہی نوع انسان کے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنا چاہتا ہے وہ سب کو ایک سطح پر خوش حال اور آسودہ دیکھنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ پریم چند پر سوشلسٹ تہذیب اور اس نئے نظام کا ہی نتیجہ ہے۔

دیوکمار کو ہر طرف بے انصافی، بے ایمانی اور لوٹ کا بازار گرم نظر آتا ہے تو اس کا دردمند دل پکار اٹھتا ہے۔

"کہاں ہے نیائے؟ کہاں ہے؟ ایک غریب آدمی کس کیفیت سے بالیں توڑ کر کھا لیتا ہے۔ قانون اسے سزا دیتا ہے۔ دوسرا امیر آدمی دن دہاڑے دوسروں کو لوٹتا ہے اور اسے پدوی ملتی ہے۔ سمّان ملتا ہے۔۔۔ یہاں دیوتا ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہے ہیں۔ انہیں اب بھی سنسار، دھرم اور نیتی پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن انہیں دیوتا کیوں کہو کاپُرش (بزدل) کہو، سوارتھی۔ آتم سیوی (خود غرض اور مطلبی) کہو۔۔۔۔ یہاں دیوتا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔ دیوتاؤں ہی کی بدولت ہمیں سنسار میں منش (انسان میں انسان) جیسا پڑے گا۔ درودوں (غریبوں) کو بیچ میں ان سے لڑنے کے لئے ہتھیار باندھنا پڑے گا۔ ان کے پنجوں کا شکار رہنا دیوتا پن نہیں گراوٹ ہے۔"

اس ناول کے ان چار ابواب سے اب یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ پریم چند عدم تشدد کے قائل نہیں رہے تھے اور تشدد کے مقابلے پر وہ تشدد کا استعمال بھی ضروری سمجھنے لگے تھے۔ منگل سوتر کا ہیرو دیوکمار اور اصل ایک طرح سے پریم چند کی اپنی آتم کتھا ہے) ظلم اور بے انصافی سے سمجھوتا کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے۔ روحانیت پر سے بھی ان کا اعتقاد متزلزل ہو چکا ہے عقل اور استدلال ہی کو حکمراں وہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔ دیوکمار کا کردار یوں بیان کرتے ہیں۔ (اور گویا اپنے دل ہی کی بات کہتے ہیں)

"پنڈت دیوکمار کو دھمکیوں سے جھکانا تو ناممکن تھا مگر عقلی دلائل کے سامنے ان کی گردن آپ ہی آپ جھک جاتی تھی۔ ان دنوں وہ یہی پہیلی سوچتے رہتے تھے کہ دنیا میں یہ بدحالی کیوں ہے۔۔۔۔ روحانیت سے ان کی گتھی نہ سلجھتی تھی۔ اگر ساری کائنات ایک آتم (خودی یا روح) کی مظہر ہے تو پھر یہ تفریق کیوں ہے۔۔۔۔ کیوں ایک آدمی سخت سے سخت محنت کر کے بھی بھوکوں مرتا ہے۔ اور دوسرا آدمی ہاتھ پاؤں نہ ہلا کر بھی پھولوں کی سیج پر سوتا ہے۔۔۔۔ عقل کہتی ہے یہاں سب ہی آزاد ہیں سب کو اپنی صلاحیت اور امکانات کے لحاظ سے ترقی کرنے کا حق ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ سب کو برابر کا موقع کہاں نصیب ہے۔ بازار لگا ہوا ہے جو چاہے وہاں سے اپنی خواہش کے مطابق چیز خرید سکتا ہے۔ مگر خریدے گا تو وہی جس کے پاس پیسے ہیں اور جب سب کے پاس پیسے نہیں ہیں تو سب کا برابر حق کیسے مانا جائے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بار بار پریم چند کو ان کے آخری دور میں یہی سوال ستاتا رہا ہے کہ نابرابری، ظلم اور جبر اور لوٹ اور کھسوٹ کو کیسے ختم کیا جائے۔ وہ اپنے قاری کو اس کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور ان بے انصافیوں سے نپٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ادیب اور قلم کار کے لئے سماج وادی اہمیت جتانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

دہلی

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط نمبر ۱۰

(ح) بسمل سنسہاروی مرحوم

گیا کے شاعروں کا جب تذکرہ کر رہا تھا اس وقت یاد آیا کہ بسمل صاحب مرحوم کا ذکر بھی کرتا چلوں مگر جس طرح شمس صاحب سرپرست اور مقصود عالم صاحب مرحومین کا ذکر کیا۔ اصولی طور پر بسمل صاحب کا تذکرہ بھی علیحدہ سے کرنے کو دل چاہا۔ ان تین حضرات کی طرح بسمل صاحب مرحوم کو سننے کا موقع نہ ملا۔ مگر ان کی اہمیت تاریخ نکالنے میں کسی سے کم نہیں بلکہ چند ہی شاعر ایسے ہوں گے جو نہایت بے تکلفی سے اتنی سلیس اور فصیح عبارت میں تاریخ پیدائش، شادی یا تاریخ وفات نکال سکتے ہوں۔ شمس صاحب مرحوم ان کے بے حد مداح تھے۔ بسمل صاحب مرحوم گو عمر میں ان سے بڑے تھے مگر رشتہ میں فوقیت رہے صاحب کو تھی۔ مرحوم کا ایک شعری مجموعہ بھی چھپ چکا ہے شاعری کے علاوہ آپ کی دین آج بھی جاری و ساری ہے یعنی "سہیل"۔ انجم مانپوری مرحوم ندیم نکالتے تھے۔ پھر مولانا ریاست علی ندوی مرحوم اور بڑے بھائی جان مرحوم (سید حسن امام صاحب) ندیم کی اشاعت میں خلوص سے لگے رہے مگر ندیم جاری نہ رہ سکا۔ لیکن بسمل صاحب کے بعد ان کے دو پسران زین العابدین صاحب مرحوم (پسر اول) اور ادریس صاحب مرحوم نے اس چراغ کو روشن رکھا۔ اور اب عزیزم مسعود منظر سلمہٗ اس چراغ کو روشن رکھے رہے ہیں۔ آج جب کہ اردو میں جریدہ نکالنا کچھ آسان کام نہیں ہے پھر بھی اہل ذوق اور ادب کے دلدادہ حضرات کے تعاون سے یہ شمع روشن ہے۔

بسمل صاحب مرحوم کی ایک اور خوبی کا ذکر نہ کرنا بددیانتی تصور کروں گا۔ وہ یہ کہ اکثر و بیشتر شاعروں کا دوسرا پیشہ نہیں ہوتا۔ مشہور مصرع ہے۔ "دو روٹیاں کھولیے میں مرثیہ خواں ہوں"۔ مگر مرحوم نے گیا کو ایک اور تحفہ دیا یعنی "شمسی پریس" جو آج بھی قائم ہے۔ کتنے ہی پریس قائم ہوئے مگر اب ان کا شمار تذکروں میں مل سکتا ہے۔ مگر شمسی پریس آج بھی گیا میں ہے اور

اب بیشک کتابت کا وہ معیار نہیں رہا پھر بھی خراب
کتابت کا سہرا اس کے سر نہیں ہے۔ سہیل کا ایک اور
کارنامہ رہا ہے کہ گیا میں نوجوان لکھنے والوں کو لکھنے
کی تحریک ملی اور کافی اہل قلم سہیل ہی سے ادب کی دنیا
میں روشناس ہوئے۔ قیصر عثمانی صاحب کلکتہ اور
بمبئی جانے سے پہلے سہیل سے وابستہ رہے۔

گیا کا مشاعرہ

سنہ ۱۹۲۴ء میں گیا میں جناب نیاز احمد صاحب
ڈسٹرکٹ اور سشن جج تھے۔ مرحوم شبلی نعمانی مرحوم کے
عزیز تھے۔ آپ آئی سی ایس (ی ا) تھے مگر کلکٹر ہونا
پسند نہ کیا اور جوڈیشیل Judicial سروس Service
کو پسند کیا۔ نہایت خلیق، باغ و بہار اور منکسر مزاج تھے
آپ نے یہاں اہل ذوق حضرات کو امادہ کیا کہ مشاعرہ
منعقد ہو۔ اور آپ کی ہی وجہ سے حضرت جگر مراد آبادی،
جناب روشن صدیقی، جناب شفیق جونپوری اور جناب
قدر لکھنوی گیا تشریف لائے اور مشاعرہ ریلوے سینما
ہال کے مغربی حصہ میں بعد نماز مغرب شروع ہوا۔ مقصود
عالم مرحوم کو شروع میں پڑھوا دیا گیا جس سے ان کی
طبیعت بشاش ہو گئی کہ مشاعرہ انہوں نے اسٹارٹ
START کر دیا (یہ اسٹارٹ ان کی تیزی طبع کی داد خواہ
تھی) اور وہ فوراً مشاعرہ سے رخصت ہو گئے۔ دیگر شعرائے
گیا نے بعد میں اشعار سے لوگوں کو خوش یا ناخوش کیا
سریر صاحب مرحوم شاید پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ
بہت بھدی آواز میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے تھے۔
حسرت موہانی اس معاملے میں سریر صاحب سے سبقت
لے جانے والے واحد شاعر تھے۔ خیر اب باہر سے آنے والے
شعراء نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں۔ قدیر لکھنوی،
شفیق جونپوری، روشن صدیقی اور جگر مراد آبادی کو
خوب خوب داد ملی۔ سریر صاحب مرحوم نے دوسرے
روز ایک ہجو لکھی۔ اشعار یاد نہیں "بھی تھے" ردیف
اور حال، قال، چال، تال قوافی۔ "عجب شعر بہاری پڑھتا
تھا..... (تو اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ مصرع یاد نہیں)
اور یوپی والوں (اشعار یہ حال بھی تھے اور تال بھی تھے)
قدیر لکھنوی (غالباً سبھی مرحوم ہو چکے ہیں یہاں یک کر
نیاز صاحب اور ان کی اہلیہ بھی کہنے جو غزل سنائی اس
کے شاید دو چار اشعار یاد ہیں وہ لکھ رہا ہوں۔

نشیمن کی جانب ہے رخ ہر کلی کا
کوئی گل کھلانے کو جی چاہتا ہے
محبت کا مفہوم وہ پوچھتے ہیں
کلیجہ دکھانے کو جی چاہتا ہے
خدارا ذرا اپنا مسکن بتا دے
ترے پاس آنے کو جی چاہتا ہے

خوب خوب داد ملی۔ شفیق جونپوری جو حسرت موہانی کے
شاگرد تھے ان کے ایک دو شعر سن لیجئے۔

نہ چھیڑ اے دوست اب مجھ کو اسی مشکل میں رہنے دے
نگاہ و دل کا افسانہ نگاہ و دل میں رہنے دے
اٹھا ساقی مئے و مینا اٹھا مطرب رباب اپنا
نہیں ہیں وہ تو بے رونق محفل میں رہنے دے

غرض انہیں بھی لوگوں نے پسند کیا۔ پھر روشن صدیقی نے
اپنے کلام سے سامعین کو لطف اندوز ہونے کا موقع
دیا۔ کلام کی پختگی نے دیگر شعرا سے بھی داد و تحسین
وصول کی۔ مطلع یاد نہیں۔ دو اشعار سن لیں۔

حرم نادیدہ بت خانہ گریزاں برہمن رہبر
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے

تغافل کی حدوں سے بڑھ گیا ہے کوئی دیوانہ
اب ان کے التفات ناگہاں کی آزمائش ہے

ہمارے قارئین خود صاحب ذوق ہیں ظاہر ہے ان اشعار کی داد دیئے بغیر نہیں رہیں گے۔ پھر آخر میں جگر صاحب نے اپنی غزل سنائی۔ غزل تو کلام کے مجموعے میں چھپی ہے مگر مجھے دو تین اشعار جو اس وقت یاد آرہے ہیں (۴۲) کی بات ہے۔ اڑتالیس برس ہوگئے۔ اگر غلطی ہو تو معاف کریں گے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر کیا چیز ہے جو انعام نہیں

اک شاہد معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر بھی فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں

اور اشعار یاد نہیں۔ مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ دوسرے دن شام کو میں نے ظفر منزل میں سبھوں کو چائے پر مدعو کیا۔ جگر صاحب کے علاوہ جناب روشن صدیقی جناب شفیق جونپوری اور قدیر لکھنوی تشریف لائے۔ نیاز احمد صاحب بھی تھے۔ در اصل اس کی تحریک بھی آپ ہی کی تھی۔ شمس صاحب تو ظفر منزل میں رہتے ہی تھے۔ مقصود مرحوم کو تکلیف اس لئے نہ دی کہ وہ شریک ہوتے مگر واقعی ان کو تکلیف ہو جاتی۔ سرور صاحب تو خفا تھے اس لئے نہ آئے۔ جگر صاحب نے وہ غزل سنائی جس کا مشہور شعر

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
[illegible]

یہ تو میری سمجھ میں بہت بعد میں آیا۔ مگر شمس صاحب نے بے حد داد دی۔ مکرر پڑھوایا۔ اس کا مطلع جو مجھے یاد آرہا ہے۔ پیش کر رہا ہوں۔

زندگی ہے مگر پرائی ہے
رگِ غیرت تری دہائی ہے

یہ غزل تو سارے قاری پڑھ چکے ہوں گے۔ مطبوعہ غزل ہے جگر صاحب کا کیا کہنا اور پھر جگر صاحب کا ترنم۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان سے اچھا ترنم تو کسی شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ ان کے بعد مجھے مجروح سلطان پوری کا ترنم بے حد پسند ہے۔ شکیل بدایونی بھی خوش لحن تھے۔ خیر اب دوسرے شاعر جن کے کلام سے میں متاثر ہوا وہ جناب روشن صدیقی تھے۔ ان کا مطلع یاد ہے۔

نگہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہ یار سلامت ہزار میخانے

پتہ نہیں روشن صدیقی کے متعلق میرا خیال ہے کہ ناقدین نے شاید ان کے کلام کی طرف کم توجہ کی۔ بہت ہی اچھے غزل گو شاعر تھے۔ بمبئی میں یہ شعر جب جناب مجروح کو سنایا تو انہوں نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ مجروح کا جب ذکر کروں گا تو وہ اشعار بھی لکھوں گا۔

جواب کے لئے
ڈاک ٹکٹ
ضرور
ارسال کریں

۶ر دسمبر

قیصر عثمانی

قاتل بھی وہی منصف بھی وہی پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا
انصاف کے منہ پر کالک ہوگی جس کو چھپائے غازہ ہوگا
آسیب جنوں نے عقل و خرد پر ایسا گہرا وار کیا
تاریخ کے ہر ہر صفحے پر اب کارسیہ کا دھبہ ہوگا
رام رحیم کے ماننے والو اتنا بھی معلوم نہیں
دل ہی میں کہیں کاشی ہوگا دل ہی میں کہیں کعبہ ہوگا
صدیوں کے مقدس شہر میں کل وحشت کا جو ننگا ناچ ہوا
تہذیب و تمدن کی دنیا میں اس سے برا اب کیا ہوگا

جنون تخریب کاری

شفیع اللہ خاں راز اناوی

اندھا سورج
سلگ رہا ہے ــــ
سرخ فضائیں
دھواں دھواں ہیں ۔
بغض کے شعلے ،
بھڑک اٹھے ہیں
گونگا موسم
دہک رہا ہے ــــ
بہرے رشتے
شرر فشاں ہیں
مندر
مسجد
گرودوارے ہیں
خون کی ہولی کھیلنے والے ،
پاگل پن میں
نکل پڑے ہیں
انسانوں کے خون کے پیاسے
ہتھیاروں کو پوجنے والے
ملک کے دشمن
ظلم کے حامی
کنکر
پتھر
پھوڑنے والے
تمیشوں سے ،
دل جوڑنے والے
اندھے دیوپہ
بھینٹ چڑھانے
معصوموں کو ،
ہانک رہے ہیں
دیش کی دولت
جلا رہے ہیں ــــ
نادانوں کو کون بتائے
اپنا ہی
گھر
پھونک رہے ہیں

کلیم حیدر شرر

پوسٹ مارٹم

(والدہ محترمہ کی اچانک وفات پر ایک تاثر)

میں اپنی ماں کو مٹی کے حوالے کر کے جب پلٹا
تو اپنے چاہنے والوں کی مجھ کو صف نظر آئی!
خدا رکھے میرے احباب کو جو خوب کام آئے
ضروری ہو چکا ہے پوسٹ مارٹم، جو حاضر تھے سبھی یہ کہہ رہے تھے!
وہ ساعت ذہن کے پردے پہ یوں محفوظ و روشن ہے،
کہ وہ ماں — زندگی بھر جس نے پردے کی حفاظت کی،
اسی ماں نے — ضروری ہو گیا جب اسپتال آنا،
تو برقع پھینک کر کیوں صرف ایک چادر کی خواہش کی،
وہ اک چادر جس میں اس کے روزے تھے، نمازیں تھیں
وہ چادر جس میں اس کی مامتا کی آنکھ کے آنسو امانت تھے!
بہت اندر بہت چہرے نظر آنے لگے مجھ کو،
میں اپنی ماں کے بے پردہ شہادت پر ہوں شرمندہ،
خدا معلوم ان کے قاتلوں کی صف سے باہر ہوں،
کہ ان کی صف میں شامل ہوں،
کہ میری ماں نے میرے چاہنے والوں کے چہروں سے،
نقابیں نوچ لی ہیں،
ردائے شفقتِ مادر سے میں محروم ہوں لیکن،
کوئی چارہ نہیں ہے — ضروری ہو چکا ہے پوسٹ مارٹم

محمد عبدالقادر ادیب

سالِ نو

سالِ نو، اے سالِ نو! تو ہے سراپا آرزو
گنگناتے جھومتا ہے دے کے تو اپنا لہو
ناز فرما کیوں نہ ہو، تو ہے جمالوں کا جمال
ظلمت وحشت میں ہے تو، صاحب فضل و کمال
ہائے پچھلے سال نے، روتے ہوئے اتنا کہا
خوش رہو اے سالِ نو، حکم سفر ہم کو ملا
جشنِ نو نے، سالِ نو کے دل کو گلشن کر دیا
مسکراتی شام نے، ہر گھر کو روشن کر دیا
سالِ نو کی ہر ادا میں، زندگی کا نور ہے
بر بساطِ رنج و الم کے شور و شر سے دور ہے
نور سے پر نور ہے زندہ دلوں کی کائنات
مدتوں تک یاد آئے گی تری رنگین رات
زمزموں سے جھومتی ہے عشق عشرت کی فضا
سالِ نو کی رات بھی ہے حسن فطرت کی عطا
وقت کی رفتار میں تیری حرارت سے ہے رواں
دم سے تیرے، آرزو بھی ہوتی ہے ہر دم جواں
تو ہے نقشِ ماہ تاباں یا مجسم عبادلی
دِل نوازی سے تیری سب کو ملی ہے زندگی
سالِ نو پیغام دیتا ہے جہاں کو اے ادیب!
پیار جس کے دل میں ہے، وہ ہے جہاں میں خوش نصیب

قاسم ظفر خاں

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری

سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو آگے بڑھایا ان میں پیرزادہ احمد شاہ احمد ندیم قاسمی کا نام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی فکری اور فنی لحاظ سے متنوع شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی اہمیت نہ صرف افسانہ نگاری میں مسلم ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر بھی ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی انہوں نے نام کمایا ہے۔ اور وہ ایک بہترین مدیر بھی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء سے لکھنے پڑھنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اب تک جاری ہے۔

اردو میں مختصر افسانہ، ناول کی طرح، مغرب سے آیا اور اتنی تیزی سے پروان چڑھا کر دیکھتے ہی دیکھتے نثر کی تقریباً ساری تخلیقی اصناف پر حاوی ہوگیا۔ آج اس کی روایت اتنی روشن جاندار اور مستحکم نظر آتی ہے کہ اس روایت پر صدیوں پرانی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر سو سال سے بھی کم ہے افسانے کے اس تیزی سے مقبول ہونے اور آگے بڑھنے کے متعدد اسباب ہیں۔ اردو میں مغربی انداز کا افسانہ تو نہ تھا، لیکن داستان، کہانی اور حکایت کے روپ میں اس کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔ اس روایت میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مغرب کے آئے ہوئے مختصر افسانہ میں کسی نہ کسی رنگ میں دخیل تھی۔ پروفیسر وقار عظیم کا تو یہاں تک خیال ہے کہ فسانۂ آزاد اور باغ و بہار کے بعض اجزا کو الگ کر کے دیکھا جائے تو ان کے اندر بعض جگہ مختصر افسانہ چھپا ہوا نظر آئے گا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ مختصر افسانہ مغرب سے ضرور آیا، لیکن پنپنے، بڑھنے اور بار آور ہونے کے لئے ہمارے یہاں زمین پہلے سے ہموار تھی۔

اردو میں مختصر افسانے کے بانی سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ اور اردو کا پہلا افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ" ہے۔

افسانہ معارف علیگڑھ بابت اکتوبر ۱۹۰۳ء میں
وجود ہے۔ اس اعتبار سے آج (۱۹۹۳ء) اردو
افسانے کی عمر ترانوے سال بنتی ہے۔ اردو افسانہ
اپنی ترانوے سالہ سفر میں موضوع اور تکنیک کے
اعتبار سے جس قسم کے تجربات و رجحانات سے دوچار
ہوا وہ یہ کہ اردو افسانے سیاسی، غلامی، معاشرتی
جبر، معاشی پسماندگی اور ذہنی و جذباتی زلزلوں
سے معمور دنیا میں آنکھ کھولی۔ یوں اپنے آغاز میں ہی یہ
اپنے لب و لہجے طرز احساس اور تدبیر کاری کے اعتبار
سے دو منطقوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک منطقہ رومان
کا تھا۔ یہاں خواب و خیال اپنی رنگینیاں بکھیرتے
اور شیرینیاں بانٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں فرد
اپنی ذہنی و جذباتی آزادی اور فطری مسرت کی
حفاظت کے لئے کوشاں دکھائی دیتا ہے جو حقیقی
دنیا پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ اس دائرے میں ماورائیت
جنسی و نفسیاتی شعور کی لپک اور انفرادیت کا زمزمہ
گونجتا دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ دوسرے منطقے میں
بے بسی اور مجبوری، کسمساہٹ اور تلملاہٹ کو پروان
چڑھا رہی تھی۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ہی
سیاسی اور سماجی منظر کا عکس ہے۔ اضطراب اور
ہلچل اور انحراف ان دونوں منطقوں میں باطنی وحدت
پیدا کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ موجودہ دور میں نسلی نفرت
نسلی غربت، اور طبقاتی اتار چڑھاؤ زور پکڑ رہا ہے
جس نے آج کے افسانہ نگاروں کو ضرور چکا چوندھ
میں ڈال رکھا ہے۔ ایسی ہی کچھ کشمکش، احمد ندیم
قاسمی کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۳۶ء سے افسانہ لکھنے
کا جو سلسلہ جاری رکھا ہے وہ اب بھی جاری ہے۔
یہ بڑا طویل عرصہ گذر گیا ہے ۵۷-۵۶ سالوں سے
ان کا قلم اسی آب و تاب سے افسانے اور شعر تخلیق
کر رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ہمیں
جنگ کی ہولناکی، نیم پاگل پن، ملک کا بٹوارہ، سماجی
بھید بھاؤ، نفسیاتی کشمکش، غریبی، مفلسی، بے روز
گاری، بھوک مری اور محبت بھری داستان سنائی دیتا
ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے "فساد" پر اچھے افسانے لکھے
ہیں یہی نہیں بلکہ اردو بعض دوسرے فنکاروں نے بھی
اس موضوع پر کئی اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً بیدی
کا لاجونتی، احمد عباس کا "سردار جی" اور پریم ناتھ درد
کا "آخر کیوں" ـــــ اور ملک تقسیم سے متعلق فسادات
پر احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "میں انسان ہوں" "نیا فرہاد"
"پرمیشر سنگھ" "کپاس کا پھول" وغیرہ یہ افسانے تکنیک
کے اعتبار سے گھٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "کپاس کا پھول"
کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں فساد سے مرے ہوئے لوگوں
کو دکھایا گیا ہے۔

" زور سے ایک دھماکہ ہوا اور مائی تاجو دیوار
سے ہٹ آئی تھی پھر دیوار کی طرف بڑھی ـــ
ایکدم چودھری فتح دین کے دروازے کو کسی
نے کوٹ ڈالا پھر کواڑ دھڑام سے گرے۔ اکٹھی
بہت سی گولیاں چلیں اور اکٹھی بہت سی چیخیں
بلند ہوئیں۔ مائی نے ان میں سے راحتاں کی
چیخ کو صاف پہچان لیا ـــ راحتاں بیٹی،
وہ چلائی، لاٹھی ٹیکتی ہوئی بڑھی اور اپنے
دروازے کی کنڈی کھول کر باہر گلی میں آ گئی ـــ

گلی میں شہاب دین، نور اللہ، محمد بشیر، حمید
خاں اور جانے کس کس کی لاشیں پڑی تھیں۔
چودھری فتح دین کے گرے ہوئے دروازے کے
پاس مولوی عبدالمجید مردہ پڑے تھے۔ ان کا
آدھا چہرہ اڑ گیا تھا۔ ماں نے مولوی صاحب
کو ان کی نورانی داڑھی سے پہچانا۔"

(افسانہ کپاس کا پھول، احمد ندیم قاسمی)

"پرمیشر سنگھ" کا یہ اقتباس دیکھئے۔

" ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان
نکال لی تھی بولا ذرا ٹھہر پرمیشرے کرپان اپنا
دھرم پورا کرے پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

(افسانہ پرمیشر سنگھ۔ احمد ندیم قاسمی)

احمد ندیم قاسمی نے فساد کے بعد نیم پاگل انسانوں کی نفسیات
کی عکاسی بھی کی ہے۔ ہندو پاک کے بٹوارے کی ہولناکیوں
نے اپنی باہیں بہت دور تک پھیلائی ہیں۔ کتنوں کو جان
سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کتنوں کو پاگل ہونا پڑا اور کتنے نیم
پاگل پن کی حالت میں گلی کوچے کا چکر لگاتے پھرے۔ اس
موضوع پر ندیم کا افسانہ "علیبہ" کا بوڑھا کسان "بابا نور"
ہے۔ منٹو کا "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، خواجہ احمد عباس کا
"ٹڈی" وغیرہ اہم ہیں۔ "بابا نور" کے اس اقتباس سے
صاف ظاہر ہو جائے گا کہ نیم پاگل پن کیا بلا ہے۔ کہانی
نرم و لطیف، دھیمی دھیمی فضا میں آگے بڑھتی ہے۔ بابا نور
کسی کسان کی بیٹی کی پیش کی ہوئی لسی پیتا۔ کسی کو
دعائیں دیتا، اور کسی کی خیریت پوچھتا ڈاکخانے پہنچ
جاتا ہے۔ اور ڈاک منشی سے اپنی ڈاک کے بارے میں
پوچھ کر خاموشی سے لوٹ جاتا ہے۔ دیکھئے بابا نور پر
کیا گزرتی ہے۔

" پھر منشی بولا: آج دس سال سے بابا نور اسی
طرح آرہا ہے۔ یہی سوال پوچھتا ہے اور یہی
سوال لے کر چلا جاتا ہے۔ بے چارے کو یہ یاد ہی
نہیں رہا کہ سرکار کی وہ چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے
پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ اس
کا بیٹا برما میں بم کے گرنے کا شکار ہو گیا۔ جب سے
پاگل سا ہو گیا ہے۔ پر خدا کی قسم ہے دوستو اگر آج
کے بعد وہ پھر بھی سیدھا میرے پاس یہی پوچھنے آیا تو مجھے
پاگل کر جائے گا۔

(افسانہ بابا نور، از احمد ندیم قاسمی)

احمد ندیم قاسمی ڈاکخانے تک پہنچتے پہنچتے بابا نور کو قاری
کے دل سے اتنا قریب اتنا مانوس کر دیتے ہیں کہ بابا نور
کا المیہ اپنا یا اپنے کسی عزیز کا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ
فنی چابکدستی کا کرشمہ ہی تو ہے۔

بقول وقار عظیم "پریم چند نے دیہات کے افسانے
لکھے اور دیہاتیوں کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ یہ
ایک بڑی خدمت تھی۔ لیکن دوسری طرف احمد ندیم قاسمی
نے بھی پنجاب کے دیہاتوں اور یہاں کے دیہاتوں کو ایک
ابدی زندگی دی ہے۔"

احمد ندیم قاسمی ان معدودے چند ادیبوں میں
سے ہیں جو خود دیہاتی ہیں جن کی حساس افتاد طبع نے
انہیں اپنے گرد و پیش کے حالات کا غائر مطالعہ
کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اور جو اب بھی اپنی زندگی کا بیشتر
حصہ ان کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ بسر کرتے ہیں
جنہیں عام طور پر اس برصغیر میں ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا
ہے۔ دیباچہ طلوع و غروب میں وہ رقمطراز ہیں۔

" میں نے دیہاتی موضوع پر صرف اس لئے قلم اٹھایا

تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے
والا مجھے کوئی نظر نہ آیا . . اس سرزمین میں ایک ایسی
جماعت بھی آباد ہے جو باسی روٹی اور پیاز سے پیٹ
بھر کر بھی طاقتور رہ سکتی ہے. لیکن جیسے شرافت
اور عصمت کی حفاظت کے لئے اپنا سر کٹا دینے میں
کوئی باک نہیں ہوتا.

(طلوع و غروب)

احمد ندیم قاسمی نے گاؤں میں رہنے بسنے والے
لوگوں اور وہاں ہونے والے کاموں کو اپنے افسانے
کا اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے. افسانوی مجموعہ
"گرداب" کا ایک افسانہ "غریب کا تحفہ" ہے جس میں
اپلے (گوبر) تھوپنے والی دوشیزہ کی کہانی کی عکاسی کی
گئی ہے. ایک منظر دیکھئے.

"تم کس کی بیٹی ہو؟ اس نے پھٹی ہوئی چادر
سینے پر پھیلا کر کہا.
میں پردیسی ہوں جی میرے ماں باپ مر گئے ہیں"
بولی. اپلے جی. انہیں بیچ کر پیٹ بھرتی ہوں"

ایک اقتباس اور دیکھئے. اس افسانے میں ایک دوشیزہ
کی کہانی پیش کی گئی ہے جو ہر وقت کام کرنے میں مشغول
رہتی ہے.

"اس بیچاری کو گھر جا کر بہت سے کام کرنے میں
پہلے تو گھاس کا گٹھا زمیندار کی حویلی تک پہنچایا
جائے گا جہاں زمیندار کے ڈھور ڈنگر منہ اٹھائے اس کے
منتظر ہوں گے" اور باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں
پکا کر اور چھاچھ کا ایک پیالہ بھر کر بوڑھی ماں کے آگے
رکھ دے گی. چھاچھ کے برتن پر موٹی رکھ کر اور اپنی
پھٹی چادر سے ڈھانپ کر باہر کھیتوں میں اپنے باپ کے
پاس چل دے گی. خالی برتن اٹھا کر واپس گھر آئے گی. مل
کی مٹھی چاپی کے بعد وہ درانتی اور رسی اٹھا کر پھر جنگل کا راستہ
لے گی. بہت دیر تک تنکا تنکا گھاس کاٹتی پھرے گی"

(افسانہ مسوادلیس)

احمد قاسمی نے دیہاتی موضوع پر ہی نہیں بلکہ
شہری موضوعات پر بھی اچھے افسانے لکھے ہیں. دیباچہ
گرداب میں وہ رقمطراز ہیں

"کہاں کے مسائل الگ تھے، ماحول الگ تھا، لوگوں
کی ذہنیں الگ تھیں. یہاں پتلونوں کی جمی ہوئی لکیروں
اور بالوں کی متناسب لہروں کے تذکرے تھے. تصنع تھا.
تکلف تھا، ریاکاری تھی اور ان کے ساتھ ساتھ علم و فن
کے چرچے تھے. یہاں نت نئے سازشوں کے راز فاش ہو رہے
تھے، مصفا چہروں کے پیچھے سماج کا پلپلا تعفن پھیلا رہا
تھا. اور لباس حریر کے نیچے زخمی روحیں بلک رہی تھیں"

"کپاس کا پھول" کا افسانہ "کیا لگے" شہری تعفن
کا جاگتا نمونہ ہے. ایک طالب علم جو ایم اے پاس ہے
وہ اس خوشی میں ایک پارٹی کا اہتمام کرتا ہے جس میں عارف
اس کی بہن صفیہ اور اس کے والدین شریک ہوتے ہیں. یہی
نہیں بلکہ وہاں آرکسٹرا پارٹی ہو رہی تھی. جس میں عارف
اور اس کی بہن اپنا پروگرام پیش کر رہے تھے. ایک منظر
آپ بھی دیکھیں.

"عارف کی اماں! اری او عارف کی اماں! سنتی ہو
یہ تمہارے سامنے تمہارا عارف ناچ رہا ہے. یہ وہ ہے جو
"تعریف اس خدا کی" گاتا تھا. تو بے نمازی بھی تو نہ تھا جب
ہو کر نماز پڑھنے لگتے تھے.... عارف کی اماں! سنتی ہو! یہ
تمہارے سامنے تمہاری بیٹی ناچ رہی ہے. یہ وہ ہے جسے دوسری
کلاس میں دس صورتیں ازبر تھیں. یاد ہے جب یہ قرآن کو

کی لونڈیا الغوزالتوں ہو کر اور ماتھے تک ڈوپٹہ کھینچ کر۔
کم سے کم دوپٹہ تو اس کے کندھوں پر ضرور ہونا چاہیے تھا۔
دوپٹے تو اس کے پاس بہت ہیں:

(افسانہ پاگل)

میں نے اوپر ندیم کے افسانے کا جو جائزہ لیا وہ بہر
طور فساد، نیم پاگل پن، دیہاتی موضوعات اور شہری موضوعات
ہیں۔ یہ سب تو خاموش افسانے کہے جا سکتے ہیں مگر ندیم
نے طنز و مزاح کا افسانہ بھی لکھا ہے۔ جو ایک افسانوی
مجموعہ "کیسر کیاری" میں شامل ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ
ہو۔

"مسکرانے کی اس دنیا میں سب سے پہلے کون
مسکرایا۔ کون مسکرایا۔ وہی۔ سفید رنگ اور
سرخ ناکوں والے یورپینوں، سانولے چہرے والے
سست قدموں والے ہندوستانیوں، گھنگھر والے
بالوں، اونچے اونچے بھرے بھرے ہونٹوں والے حبشیوں
اور خشخاش بھر کی آنکھوں اور ننھے ننھے بالوں
والے چینیوں، جاپانیوں سب کے جد امجد بابا
آدم علیہ السلام"

یہ سارے افسانے ندیم کی فنی چابکدستی اور سماجی
شعور کی علامت ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد
ندیم قاسمی نے معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور
متحرک مناظر کو اچھی طرح گرفت میں لیا ہے

کبھی یہ زلفوں کے ناگ کالے، کبھی نگاہوں کی بجلیاں ہیں
مرے تصور کے زاویئے ہی مری جوانی کے امتحاں ہیں
حقوقِ انساں، رسوخِ انساں کے حیث ہاتھوں میں کھیلتے ہیں
یہاں زمانے کے زمزمے ہیں، جو چپ رہیں گے وہ بے زباں ہیں
سجا شبستانِ نازاں کا کھلے مرے ذہن کے دریچے
اگر یہ تنہائیاں ہیں میری، تو ان کی تنہائیاں کہاں ہیں
کہاں وہ وحشت خرامِ لیلیٰ، کہاں جنوں کی یہ احتیاطیں
وہی تذبذب کے مرحلے ہیں نہ بے یقیں ہیں نہ بے گماں ہیں
یہ کارگاہِ حیات راہی بساطِ بے کیف بن گئی ہے
یہاں نہ قدروں کی روشنی ہے، یہاں نہ قدروں کی پاسباں ہیں

رام پرکاش راہی

غزلیں

تازیانہ بن کے جب قدموں کے سر ہو جائے گا
پھر وہ آغازِ سفر، ختمِ سفر ہو جائے گا
کشتیاں ڈوبیں تو موجوں پر وہی کنبہ ملا
ڈوبنے والوں کا اب پانی ہی گھر ہو جائے گا
اس کی یہ سب سے بڑی دانشوری کہلائے گی
آب و دانہ کے لئے جو بے ہنر ہو جائے گا
روز و شب کا سلسلہ اک ناامیدی سے نہ باندھ
یہ بسر ہونے کی شے ہے، یہ بسر ہو جائے گا
شل ہوئے ہیں ہاتھ تو غیروں کا تکیہ بھی بہت
اور کیا اپنی دعاؤں کا اثر ہو جائے گا
دیکھ راہی مرحلوں کی خوش ادائی پر نہ جا
یہ سفر، ورنہ، سفر اندر سفر ہو جائے گا

دب

غزلیں

نشتر اکبرآبادی

آندھیوں کے سامنے شمعیں جلا کر دیکھنا
اور حفاظت کے لئے پھولوں کا لشکر دیکھنا
کب تلک لپٹا ہوا خوابوں کا بستر دیکھنا
کب تلک اپنے ہی گھر میں خود کو بے گھر دیکھنا
لوگ کس کے حق میں اچھی رائے رکھتے ہیں یہاں؟
تم مری غزلوں کو تنہائی میں پڑھ کر دیکھنا
آدمی کے ظرف کی کتنی بڑی توہین ہے
ساحلوں کے تٹ سے طوفانوں کا منظر دیکھنا
میں کہاں۔ غالب کہاں۔ موتی کہاں سیپی کہاں
خواہشوں کی ضد کہ قطرہ میں سمندر دیکھنا

اختر شاہجہانپوری

جو ذہن و دل کے زہریلے بہت ہیں
وہی باتوں کے بھی میٹھے بہت ہیں
چلو اہلِ جنوں کے ساتھ ہو لیں
یہاں اہلِ خرد سستے بہت ہیں
مری بے چہرگی پر ہنسنے والو
تمہارے آئینے دھندلے بہت ہیں
کوئی یادوں کے ہی کنکر اچھالو
تواَج دل میں سناٹے بہت ہیں
تری بالا قدری بدنام ہوگی
یہاں کے بام و در نیچے بہت ہیں
شجر بے سایا سورج ہے برہنہ
مگر ہم عزم کے پکے بہت ہیں
کرو اب فتح کا اعلان اختر
سروں سے سرخرو نیزے بہت ہیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

ستمگر شہر کو مقتل بنا کر ۔۔ مگن ہیں بیکسوں کا خوں بہا کر
اڑانوں پر نظر رکھے ہوئے ہے ۔۔ وہ شاخوں سے پرندوں کو اڑا کر
درندے چال چلنا چاہتے ہیں ۔۔ بساطِ دہر پر مہرے سجا کر
ہمارے دم سے رونق ہے چمن میں ۔۔ بہت پچھتاؤ گے ہم کو مٹا کر
یہ رسمِ دوستی اچھی نہیں ہے ۔۔ اگر ملنا ہے تو دل سے ملا کر
وہی ہم کو مٹانے پر تلے ہیں ۔۔ جنھیں پالا تھا خونِ دل پلا کر
اندھیرے میں زمانہ کھو نہ جائے ۔۔ چراغِ عالمِ امکاں بجھا کر
فلک سے سنگ برسانے چلے ہو ۔۔ زمیں پر آئینہ خانے سجا کر
نگر میں راز ہنگامہ بپا ہے ۔۔ نکل آئے ہیں ہم دامن بچا کر

غزلیں

سُہیل اختر

دوست ناحق ہے سرشار اپنا
بیٹھ جائے گا خود غبار اپنا

اب تو ذہنِ رسا بھی قائل ہے
خوب مضبوط ہے حصار اپنا

مجھ سے ہمدردیاں تو رکھ، لیکن
خود اٹھانے دے مجھ کو بار اپنا

مجھ سے الہام ہو گیا سرزد
شاعروں میں ہوا شمار اپنا

یوں حوالوں سے بات کرتا ہوں
کھو دیا جیسے اعتبار اپنا

بک گئی گاؤں کی حویلی بھی
صرف باقی ہے اب وقار اپنا

شبیر احمد قرار

امکان کیسے کیسے کھنگالے ہے زندگی
اندھے کنویں میں ڈول بھی ڈالے ہے زندگی

دلدل دلدل سے بھی تو چاند نکالے ہے زندگی
رخ اپنا اس طرح بھی اجالے ہے زندگی

خوش فہمیوں سے ہاتھ ملانے کا شوق ہے
سانپوں کو آستین میں پالے ہے زندگی

ایسا نہیں کہ شہر سے ہٹتی نہ ہو نظر
جنگل کو بھی عذاب میں ڈالے ہے زندگی

اُمید کے شجر سے لپٹنا تو موت ہے
جینے کی پھر بھی راہ نکالے ہے زندگی

نشّے بغیر سانس بھی لیتی نہیں کبھی!
مذہب کو بھی شراب میں ڈھالے ہے زندگی

سچائی ہوں بہت ہی پرانی کتاب ہوں
تازہ اشاعتوں کو اچھالے ہے زندگی

کچے دھاگوں پہ رقص کھانا ہے
کب ہوا میں قدم جمانا ہے

اب وہ سب کچھ کہاں تلاش کریں
گھر بھی آنگن بھی کارخانا ہے

ہو چکی قربتوں کی پیمائش
اب کیسے فاصلہ بڑھانا ہے

خوف، دہشت، عذاب ہر لمحہ!
فضلِ رب دیکھنا دکھانا ہے

اپنی پہچان کیوں گنوائیں ہم
دھوپ کو چھاؤں میں کب آنا ہے

میر و غالب خدا رسول نہیں
اپنا رستہ الگ بنانا ہے

عبدالسلام کوثر

نظر ملتے ہی وہ شرما کے جب بھی سر جھکاتی ہے
مجھے اس وقت نازک لاجونتی یاد آتی ہے
تمہارے باغ میں جو ہی ہمیشہ مسکراتی ہے
مگر میرے یہاں کھلنے سے پہلے سوکھ جاتی ہے
کسی کا گھر مہکتا ہے چنبیلی سے گلابوں سے
مرے آنگن میں نرگس رات بھر آنسو بہاتی ہے
بنفشہ، فالسہ، شہلا، اگر محلوں کی زینت ہیں
غریبوں کے یہاں بھی رات رانی مسکراتی ہے
مہک اٹھتا ہے جب گلشن محبت کی بہاروں سے
تو ہر بلبل کو گل ہر گل کو بلبل راس آتی ہے
میں جب بھی دیکھتا ہوں گلمہر کے سرخ پھولوں کو
مجھے بیساختہ اس وقت تیری یاد آتی ہے
سینگے، تتلیاں، بھنورے یہ سب کس دھن میں ہیں
یہ کس کی یاد میں کوئل برہ کے گیت گاتی ہے
ادھر محلوں میں سناٹا ادھر رونق مزاروں میں
شہنشاہوں کی حالت پر فقیری مسکراتی ہے
ادھر اظہار الفت پر ندامت ہے مجھے کوثر
ادھر اُن شوخ نظروں میں شرارت مسکراتی ہے

اطہر ھلسوئی

غزل

وہ [illegible] ہو شکر جس میں کہ تسکین قلب ہی نہ ہوئی
مری نظر میں ریا ہے وہ بندگی نہ ہوئی
وہ رات رات نہیں جس میں تیرگی نہ ہوئی
وہ صبح صبح نہیں جس میں روشنی نہ ہوئی
نگاہ عشق میں کچھ کام کا نہیں ہوتا
وہ حسن جس میں کہ شوخی و دلبری نہ ہوئی
بہ رنگ شعلہ وہ سینے میں جلتی رہتی ہے
لگائی آگ جو تم نے وہ سرد ہی نہ ہوئی
کچھ اس طرح سے اٹھائی ہے لاش قاتل نے
کہ دیکھ کر مرے دشمن کو بے رخی نہ ہوئی
نہیں ہیں شان کریمی کی مستحق آنکھیں
وہ جن میں اشک ندامت کی کچھ کمی نہ ہوئی
بہار آئی ہے گلشن میں یہ بجا ارشاد
ہنوز چہروں پہ کلیوں کے تازگی نہ ہوئی
کوئی تو ماہ جبیں ہے ہماری محفل میں
یہ کس نے کہہ دیا محفل میں چاندنی نہ ہوئی
جگاؤ شعر کے جادو کبھی بزم میں اطہر
کہ لوگ کہتے ہیں محفل میں ساحری نہ ہوئی

عبدالشکور شکور

جینا مشکل ہے اب آدمی کے لئے
ہے خطر ہی خطر زندگی کے لئے

ہے خوشی عارضی پل میں ڈھل جائیگی
مضطرب ہوتے ہو کیوں خوشی کے لئے

آسرا مصلحت کا لئے، ہاتھ وہ
ہے بڑھانے لگا دوستی کے لئے

ہر طرف ہے اندھیروں کی اب سلطنت
ہم کہاں جائیں گے روشنی کے لئے

اس کے الفاظ ہر دل کو چھو جاتے ہیں
یار مشہور ہے سادگی کے لئے

رہزنی میں رہا مبتلا جو سدا
اب وہ آیا میری رہبری کے لئے

جانبِ میکدہ باپ جانے لگا
بچہ روتا رہا نان ہی کے لئے

خونِ دل صرف ہم نے کیا ہے شکورؔ
گلشنِ زیست کی دلکشی کے لئے

غزل

یہ معجزہ نہیں تو کرامت ہے دوستو
سر پر مرا پاگلوں میں سلامت ہے دوستو

شکوہ نہ کوئی اس سے شکایت ہے دوستو
جس آدمی سے مجھ کو محبت ہے دوستو

اب تو کوئی خلوص سے کرتا نہیں ہے بات
پنہاں ہر آدمی میں سیاست ہے دوستو

لپٹا ہوا ہوں قرض کی چادر میں آج تک
یہ میرے بزرگوں کی عنایت ہے دوستو

ملتی ہے میری نسل نوابوں کی نسل سے
خستہ سہی مرا یہ عمارت ہے دوستو

لفظیں مرے کلام میں معنی مری کنیز
یہ شاعری تو میری وراثت ہے دوستو

ڈرتا ہے کون کس سے زمانے میں اے شمیم
خوفِ خدا تو ایک کہاوت ہے دوستو

شمیم انجم وارثی

اظہر نیّر

میرے اس کے درمیاں اب کیا رہا کچھ بھی نہیں
دوستی، اخلاص، الفت اور وفا کچھ بھی نہیں

اب نہ وہ محفل رہی ان کی نہ وہ باتیں رہیں
لالہ و گل رنگ و بو پر پوچھو کچھ بھی نہیں

پوری بستی آگ کے شعلوں میں جل کر رہ گئی
مندر و مسجد، کلیسا کیا بچا کچھ بھی نہیں

ایک مدت سے پڑا ہوں راہ میں ٹوٹا ہوا
وہ گزرتا ہے مگر وہ دیکھتا کچھ بھی نہیں

اہلِ دانش کہہ رہے تھے کل وطن کیا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیا نیّر ہوا کچھ بھی نہیں

غزل

علیم صبا نویدی

تیسرا آدمی

فاصلوں کا بُعد کئی صدیوں بعد طے ہوا۔ وہ صدیاں جن کے درمیان میں اور وہ کئی کٹھن مرحلے طے کرتے ہوئے اس منزل تک پہنچے تھے۔ وہ مجھ سے الگ کوئی دوسری مخلوق نہیں تھی۔ اس کے لطیف ہونٹوں کے کناروں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ اس کی مسکراہٹ کا زاویہ بھی عام مسکراہٹوں سے الگ نہیں ہے۔ مجھے جب پہلی مرتبہ اس کے متعلق ایک ماورائی وجود کا احساس ہوا تو میں نے اس کے حسین ہونٹوں پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کر دی تھی تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ اس کی وجودی حیثیت عام انسانوں سے جدا نہیں ہے جب مجھے اچھی طرح اطمینان ہو گیا اس کے پیٹ کے نیچے دہکتی ہوئی بھٹی کی آنچ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سے پینگیں بڑھائیں۔ اسے حاصل کرنے کے لئے واقعی مجھے کئی صدیوں کو پیچھے چھوڑنا پڑا۔ جب وہ مجھ سے ملی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "ہماری ملاقات گو ابھی ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ اس سے قلیل مدت میں نجانے کتنی صدیوں کا سفر دونوں کو طے کرنا پڑا ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ شام کے وقت وہ میرے پاس آئی۔ موسم بڑا اچھا تھا، سہانا، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ سامنے کے پیڑ کے پتوں کا رنگ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ جھکی جھکی ڈالیوں سے چھنتی ہوئی ایک انجانی گرد میری ذہنی سطح میں کثافت کی ایک تہہ جما رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ موسلا دھار بارش کے باوجود نہ جھکی جھکی ڈالیوں سے چھنتی ہوئی گرد دھلتی ہے اور نہ میری ذہنی سطح صاف۔ وہ اسی موسم میں آئی تھی۔ اس نے اپنے حسن کی آرائش کے سلسلے میں کسی خاص توجہ سے کام نہیں لیا تھا البتہ آج اس کے سینے کے دائیں حصہ پر جو سیاہ خال پہلے سے موجود تھا وہ ذرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ چونکہ میں تنہا تھا اگر یہ کہوں تو مناسب ہوگا کہ میں نے نہیں بلکہ میری خاموش تنہائی نے اپنے مضبوط

ہاتھ بڑھاکر اسے بڑے چاؤ سے ایک تپائی پر بٹھا دیا اور وہ تپائی پر اس طرح بیٹھی جیسے کسی گہوارے کے آغوش میں لاشعوری طور پر سمٹ گئی ہے۔ مجھے اس کا یہ انداز ذرا برا معلوم ہوا۔ برا اس لئے کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری تنہائی اسی کی طرح سمٹ کر اس کے وجود کے کئی حصے میں گم صُم بیٹھ گئی ہے۔

اس کے آنے کے بعد میرے دل میں جو پہلی خواہش پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ میری تنہائی کی باہوں سے اس طرح چمٹ جائے کہ میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاؤں کہ یہ وسیع و بسیط کائنات سمٹ سمٹا کر میری تنہائی کے قریب سانس لے رہی ہے۔

یہ بھی درست تھا کہ اسے میرے کمرے میں آنے کے بعد فوراً پھیل جانا نہیں چاہئے تھا ورنہ اس کے انداز دل ستانی پر ضرور حرف آتا۔ تقریباً پندرہ منٹ وہ تپائی پر بیٹھی میری تنہائی سے سرگوشی کرتی رہی۔ میں چپ تھا گویا میری تنہائی کچھ واضح، کچھ صاف انداز میں اسے کوئی بات سمجھا رہی تھی اور اس اعتماد کے ساتھ شاید وہ بات مان جائے میں خواہ مخواہ تنہائی اور اس کے درمیان مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تپائی سے آہستہ اٹھی جیسے اس نے میری تنہائی کی بات مان لی ہو۔

اب میں نے دیکھا کہ سامنے کے پیڑ کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اور جھکی جھکی ڈالیوں سے کوئی سیال روشنی آہستہ آہستہ زمین کی نشیب کی طرف چھن رہی ہے۔ کسی تمہید کے بغیر میں نے افسانہ شروع کر دیا اور شوخ تنہائی کے لطیف ہونٹوں پر بڑی عجیب معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ افسانہ CLIMAX کے قریب

قلم لکھتے لکھتے ٹھہر سا گیا اور میں خاموش اسے تکتا رہا۔ میری تنہائی جو اس کی بجائے اب تپائی پر بیٹھی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانس لے رہی تھی۔ وہ اٹھی اور دبے پاؤں دروازے کی طرف گئی۔ اس نے پہلے دروازے کے روزن سے جھانک کر دیکھا پھر کواڑ کھولے بغیر تپائی کے قریب آ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کون ؟ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خاموش !!

مگر میری کھوج کی حس خاموش نہ رہ سکی پھر میں نے پوچھا۔ کون ؟

اس نے پھر اسی طرح ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لئے کہا۔ وہ ہم دونوں کی طرف ٹکٹکی باندھے حیرت و استعجاب کے عالم میں خاموش دیکھتی رہی۔ میری تنہائی نے اسے بتایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دستک دینے والا اپنا ہی آدمی ہے۔ میں نے اسے روزن سے دیکھ لیا ہے۔

تنہائی کے ان تسلی بخش کلمات کے باوجود میں نے تنہائی سے جھنجھلا کر پوچھا کون ؟

اس نے میرے کان کے قریب آ کر آہستہ سے کہا ــــ "تیسرا آدمی" ــــ

ختم

پرنٹر پبلشر این منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا

ویریندر پٹواری

شاید!

دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا سے کیا ہو گیا ۔۔۔!
کبھی آس پاس ڈراؤنی خاموشی چھا جاتی ہے اور کبھی چونکا دینے والا شور برپا ہو جاتا ہے۔

اس شور و غل میں اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل ہیں۔

آخر وہ کرے بھی تو کیا کرے۔ اپنے لب سی لینا چاہتی ہے تو آنکھیں ٹوٹے باندھ کی طرح بہتی رہتی ہیں ۔۔۔ آنسوؤں روک لینا چاہتی ہے تو تھرتھراتے ہونٹ یوں نظر آتے ہیں جیسے گرج کے بعد ایک دوسرے سے ٹکرائے ہوئے بادلوں کے مضطرب ٹکڑے ۔۔۔ شاید اسی لئے وہ اپنے آپ سے گھبرا کر مر جانا چاہتی ہے۔

مگر حالات نہ اس کو مرنے دیں رہے ہیں اور نہ جینے دے رہے ہیں۔

چند روز پہلے پدما بھوشن کو شہر والے تو کیا، اڑوس پڑوس والے بھی نہیں جانتے تھے ۔۔۔ جانتے بھی کیسے؟ کسی کے ساتھ میل جول، دعا سلام، آنا جانا ہوتا تب نا۔ پڑوسیوں کے لئے وہ پچھلے پندرہ سال سے ایک پہیلی بنی ہوئی ہے۔ شاید اسی لئے اب کوئی اس کو جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ ہاں کبھی کبھار جب وہ اپنے رئیس بوڑھے شوہر برج بھوشن کے ساتھ باغ میں ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی تو جھانکنے والوں کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا۔ ہائے یہ میاں بیوی ہیں یا باپ بیٹی ۔۔۔ اس پر یہ طرہ کہ بیوی حسین اور جوان جبکہ مرد بدصورت اور ڈھیلا ڈھالا۔ پھر بھی جب بھی کبھی وہ اِدھر اُدھر نظر آتی تب وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی قدم سے قدم ملا کر چلتی پھرتی نظر آتی۔ ورنہ یہ پری چہرہ عورت اپنے محل نما مکان کے اندر ہی رہتی تھی۔ پھر اگر کوئی مہمان، کاریگر، مزدور، دودھ والا، گیس والا گھر میں آتا جاتا بھی تھا تو مالکن کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پاتا تھا۔ مگر آج پنجرے میں رہنے والی اور عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے والی اس عورت کو سارا شہر اخباروں میں چھپی سرخیوں کے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ آج یہ عورت پولس کے لاک اَپ میں یوں نظر آ رہی ہے جیسے چڑیا گھر میں نمائش کے لئے رکھا ہوا ایک خونخوار درندہ اس کا قربت میں رہنے والی اس کی پسندیدہ

نوکرانی رادھا نے شاید خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ بھی اس کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جائے گی۔ شاید وہ درزی جس کے ہاتھ پدما کے سنگ مرمر جیسے بدن کا ماپ لیتے ہوئے کانپ جاتے تھے، یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج اسی بدن پر زخم ہوں گے اور وہ خود ہی اپنے ناخنوں سے اپنے شاداب سینے کو کھرچ کھرچ کر لہو لہان کرتی رہے گی۔

شاید پدما کچھ اور کر بھی نہیں سکتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر ہی تو پولس والے اس کے چیخنے چلانے کو سائرن اشارہ سمجھ کر کسی کو بھی اس کے قریب نہیں جانے دیتے۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ دورے کی شدت زیادہ ہے وہ [illegible] کو بھی دور دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ پدما کچھ کر بیٹھی تو۔ یہ دیکھ کر پدما کی حالت ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسے بجلی کڑکتے ہی گھوڑی خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اپنے بال نوچتی رہتی ہے۔ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان ہو جاتی ہے پھر غش کھا کر یوں خاموش ہو جاتی ہے گویا آتش فشاں پہاڑ پھٹ کر شانت ہو چکا ہو۔

ہوش آتا ہے تب وہ گھنٹوں چھت کو گھور گھور کر دیکھتی رہتی ہے سسکتی رہتی ہے۔ نہ کوئی سوال کرتی ہے اور نہ کسی سوال کا جواب دیتی ہے۔ اس کی یہ قابل ترس حالت دیکھ کر چند سپاہیوں اور تماشائیوں کا دل بھر جاتا ہے مگر بیشتر لوگ، بلکہ تحقیق کرنے والے پولس افسر بھی پدما کی خاموشی کو معنی خیز بتا کر یہی سوچ رہے ہیں کہ یہ سب بناوٹ ہے اور ایک انوکھی داستان پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔

ظاہر ہے لوگ نت نئی باتیں سنا کر داستان کو اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ کیوں نا کریں۔ آخر پدما گھر گھر بحث کا موضوع بن چکی ہے۔ کچھ لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس قیامت خیز خوبصورت عورت پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ کوئی سمجھ رہا ہے کہ وہ پاگل ہو چکی ہے کوئی کہتا پھرتا ہے کبھی پاگل کتے نے کاٹ کھایا ہوگا کبھی۔ یعنی (Hydrophonia) ہائیڈرو فوبیا ہو گیا ہے۔ مگر اخبار والے پاگل پن یا دیوانگی کو سنگین جرم کے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اپنے کالموں میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاید کروڑپتی کی بیوی کسی اچھے وکیل کے مشورے پر سزا سے بچنے کی خاطر پاگل پن کا ڈھونگ کر رہی ہے۔ مگر صداقت یہ ہے کہ واردات کے تیسرے دن بھی نہ تو پدما کی ضمانت منظور ہوئی ہے اور نہ اس کو پاگل خانے بھیجا گیا ہے۔

بات عورت کی ہو تو لوگ اور بھی جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ کچھ اخلاق سے گری ہوئی باتیں جس کوشش کر نفرت اور غصے کے جذبات دہکتے انگارے بن کر پدما کو راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس شیطانی عورت کے خلاف تھانے کے باہر مظاہرے بھی کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی مانگ کرتے ہیں کہ عورت کے نام پر کلنک لگانے والی اس عورت کو سرے عام پھانسی دی جائے۔ پولس مظاہرے کرنے والے لوگوں اور پدما کے درمیان نہ آئیں تو وہ پدما کے اخبار میں چھپے فوٹوگراف کو پاؤں سے مسلنے کی بجائے پدما کو ہی سنگسار کر دیں۔

پولس بھی آخر کیا کرے۔ آخر ایک ماں جس نے نہایت بے رحمی سے اپنے ۱۸ سالہ اکلوتے بیٹے کو قتل کر دیا ہو اس کے بارے میں رائے عامہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ جبکہ ماں کو پولس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے اس لئے شک کی گنجائش نہیں۔ ہاں کچھ لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ماں شاید کسی تانترک کے وش میں آکر بیٹے کو قتل کر دیا ہے

مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قتل سے پہلے یا قتل کے بعد کبھی
کوئی تانترک یا اس قسم کا کوئی شک آور شخص مکان میں
داخل ہوا ہو۔

پھر ماں کیسے ڈائن بن کر بیٹے کو کھا گئی۔ وہ اکلوتا
بیٹا جو پورے ایک سال بعد چھٹیاں کاٹنے آیا تھا۔؟

پدما گھوش جنگلات کے ٹھیکیدار برج گھوش
کی چوتھی بیوی ہے۔ بے چارے ٹھیکیدار کی قسمت ہی
ایسی ہے۔ پہلی تین بیویاں شادی کے ایک دو سال کے
اندر ہی فوت ہو گئیں تھیں اور چوتھی نے اس کو جیتے جی
مار دیا۔ برج گھوش نے جب پدما سے تقریباً ۱۵ سال
پہلے شادی کی تھی تب وہ خود ۴۰ سال کا تھا جبکہ پدما
مشکل سے ۱۷ سال کی تھی۔

گاؤں سے جب وہ شہر آیا تو کسی نے یہ جاننے
کی کوشش نہیں کی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑپتی کیسے
بن گیا۔ مگر اب اخبار والے میاں بیوی کے ماضی کے
بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کر رہے
ہیں۔ اور اپنے زیادہ سے زیادہ کالم بھر رہے ہیں۔ آخر
وہ بھی کیوں نہ لکھیں اس انوکھے قتل کے بارے میں
جانکاری حاصل کرنے والے اخبار مہنگے داموں پر بھی
خرید رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارا شہر یہ جان چکا
ہے کہ برج گھوش کا گھر کسی مہاراجے کے قلعے سے
کم نہیں ہے۔ بڑی ڈیوڑھی تب کھلتی ہے جب برج
گھوش کی کار احاطے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور
چھوٹی ڈیوڑھی تب کھلتی ہے جب ان کا خاص نوکر سوہو
ایک سیکورٹی گارڈ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا
ہے۔ اس کی حرکتوں پر نظر رکھتا ہے۔ کام ہوا تو ڈیوڑھی
بند۔

تقریباً ۲۵ کمروں والے ایک عالیشان مکان میں
برج گھوش، پدما، سوہو اور ایک نوکرانی کے علاوہ مقتول
اجے گھوش رہتا تھا۔ ایک سال پہلے اجے جنوبی ہند کے
کسی دور دراز کالج میں ڈاکٹری پڑھنے گیا تھا۔ اور ۱۰۱ ویں
روز گھر آیا تھا جب اس کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔

چونکہ یہ سب محلے والوں سے کٹے ہوئے تھے اس
لئے ان کو واردات کے بارے میں علم بھی نہ ہوتا اگر اچانک
پولیس کی جیپیں اور ایمبولنس کی گاڑی احاطے کے اندر داخل
نہ ہو پاتیں۔ ورنہ اس گھر میں داخل ہونے والا جب
دروازے پر دستک دیتا تھا تب یوں لگتا تھا جیسے کوئی
فریادی شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہو

اس گھر میں یہ سخت پابندیاں کس نے عاید کیں
تھیں۔ شوہر نے یا بیوی نے یہ وہ بھی نہیں جانتے جن کی
دیواریں ان کی دیواروں سے جڑی ہوئی ہیں۔ پھر یہ کوئی
کیسے جان سکتا تھا کہ پدما دن بھر مکان کے اندر بیٹھی کیا
کر رہی ہے۔ فلموں سے متاثر چند دل پھینک نوجوان
یہاں تک سوچتے رہے کہ کہیں اندر باہر جانے کا کوئی
چور دروازہ تو نہیں ہے۔ یا کوئی زمین دوز سرنگ وغیرہ۔
لیکن پدما کی خاص نوکرانی گیتا یہ بتا چکی تھی کہ پدما دن کا
زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔ کبھی
چھت کو گھورتی تھی اور کبھی بالکونی میں بیٹھ کر نیلے
آکاش اور دور کھڑے برفیلے پہاڑوں کو دیکھا کرتی تھی۔
مگر جب بادل گرجتے تھے تب اس پر ایک عجیب کیفیت
طاری ہو جاتی تھی اور کہیں چھپ جانے کی کوشش کرتی
تھی۔ لگتا تھا کوئی اس کے قریب آ رہا ہو اور وہ اس
کو بار بار دھکا دے کر اپنے سے دور رکھنے کی کوشش
کر رہی ہے۔ پھر وہ پردے کو سینے سے لگا کر چیخ پڑتی تھی

پھر یوں اچھل اچھل کر چل پڑتی تھی گویا نوکیلے کانٹوں پر چل رہی ہو۔ پھر لگتا تھا جیسے اس نے کسی کو دبوچ کر اس کا گلا دبا دیا ہو۔ مگر پھر جب وہ گر جاتی تھی تو لگتا تھا جیسے بیڈ روم نہیں بلکہ کوئی اور چیخ رہا ہو۔ چلا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھی۔

گیتا یہ بتا چکی تھی کہ ایسا ہی پچھلے پندرہ سال سے ہوتا رہا ہے۔ مگر اس بارے میں برج بھوشن اور سومو کی خاموشی یا بوکھلاہٹ ان دونوں کو مشکوک کردار بنا رہے تھے۔ جب سومو پر دباؤ پڑ گیا تو اس نے بتا دیا کہ پدما کی ایسی ہی حالت تھی جب وہ ناری نکیتن میں رہتی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ پدما کا ماضی داغدار ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کو چال چلن میں سدھار کے لئے پولس نے ناری نکیتن کے سپرد کیا تھا اور یہ کہ برج بھوشن صرف خوبصورتی سے متاثر ہو کر پدما کو بیاہ کر لایا تھا۔

سومو یہ سب اس لئے جانتا تھا کیونکہ وہ برج بھوشن کے ساتھ پچھلے ۲۰ سال سے کام کرتا آیا ہے اور وہ اپنے مالک کے اشارے پر مر مٹنے والا سورما ہے۔ اخباروں میں جب سے یہ کہانی آ گئی ہے گلی گلی کوچے کوچے میں، چائے کی دکانوں، نائی کی دکانوں، سبزی منڈیوں، دفتروں اور بسوں میں صرف پدما بھوشن کے چرچے ہو رہے ہیں۔ قیاس آرائیاں جہاں دلچسپی کا مواد پیدا کرتی رہیں وہاں اس انوکھے قتل کے معمے کو حل کرنے کے لئے پیچیدگیاں بھی پیدا کرتی رہیں۔

حالات اور بیانات بھی برج بھوشن کو مجرم ثابت کرنے [illegible] سوموکو اور پدما کے

ساتھ جوڑ کر کہانیاں بناتے رہے۔ عام لوگ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آخر برج بھوشن نے اپنی جوان بیوی کو سونے کے پنجرے میں کیوں قید کر دیا ہے کیا اس لئے کہ وہ اس سے اندر ہی اندر دھندہ کرواتا تھا یا ایک غیرت مند شوہر کی طرح اس پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ کیا دونوں میں اختلاف تھا یا کوئی اور بات جس کی وجہ سے بیٹا شکار ہو چکا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ ماں بیٹے کو پل بھر کے لئے بھی اپنے سے دور نہیں رکھنا چاہتی تھی ——

ایک بیٹا ہی تو تھا جس کے ساتھ پدما ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔ اکثر اس کو اپنے کمرے میں بٹھا کر کھلایا پلایا کرتی تھی بلکہ وہ اکثر اس کو اپنے کمرے میں ہی سویا کرتا تھا۔

مقتول ایک اچھا شرمیلا لڑکا تھا یہ سبھی کہہ چکے تھے۔ مگر گیتا کی رائے اچھی بھی تھی اور بری بھی۔ حالانکہ وہ کچھ کہنے سے جھجھک رہی تھی مگر دباؤ میں آ کر یہ بتا چکی تھی کہ مقتول ٹریننگ پر جانے سے پہلے اکثر چوری چھپے اس کو گھورتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی صرف اس لئے کچن میں آجایا کرتا تھا تاکہ میرے بدن کے کسی حصے کو کسی نہ کسی بہانے سے چھو سکے۔ مگر وہ داڑھی مونچھ کے بغیر ۱۷ سال کے لڑکے سے خوفزدہ ہونے کی بجائے پریشان ہوا کرتی تھی کہ یہ لڑکا گھر سے باہر رہ کر کسی چکر میں نہ پڑ جائے۔ مگر گیتا یہ بھی بتا چکی تھی کہ مقتول اپنی ماں سے بہت ڈرتا تھا۔ جبکہ ماں بیٹے کو ہر وقت سینے سے لگانے کے لئے بے چین رہتی تھی۔

اور جب گیتا نے اس بات کا انکشاف کیا کہ مقتول اجے بھوشن پدما کا اپنا بیٹا نہیں بلکہ کرائے

اناتھ آشرم سے گود لیا بچہ ہے تو سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ کیا کچھ ہو سکتا ہے لوگ بہت کچھ سمجھ کر بھی اپنی زبان پر کچھ نہ لا سکے۔ مگر اخباروں نے مجبوراً وہ بات لکھ دی جس کو زبان پر لانے سے پہلے ہر شخص اپنے منہ میں خاک ڈال دینے کی بات کرتا رہا۔ ماں بیٹے کے رشتے کو رسوا کیا گیا تو عام لوگوں کے چہروں پر چھائی لالی یہ مانگ کر رہی تھی کہ ایسی ڈائن کو زندہ جلا ڈالو۔

شاید بیٹے ہی کے اندر شیطان چھپا بیٹھا تھا۔ باہر آیا تو ماں نے کچل ڈالا۔ کچھ لوگ یہ بھی سوچتے رہے مگر پولس صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اگر پدما اور سومو کے ناجائز تعلقات تھے تب ہو سکتا ہے کہ بیٹے نے درمیان میں کھڑے ہو کر جان گنوا دی۔ لیکن اگر مقتول اور قاتل کے درمیان کچھ سلسلہ تھا تب ہو سکتا ہے برج بھوشن نے قتل کیا ہو یا سومو سے کروایا ہو۔ مگر پدما اپنا اقبال جرم کر چکی تھی۔ اور وہ یہ بڑبڑاتی ہے یا چیخ کر کہتی ہے۔ ہاں — ہاں — میں نے اجے کو مار ڈالا — میں نے اجے کو مار ڈالا — کیوں مار ڈالا — اس کا جواب دینے کے بجائے پدما بوکھلا جاتی ہے یا پھر وہی چیخنا چلانا۔ اپنے ناخنوں سے جسم کو کھرچنا — بال نوچنا اور پھر دھڑام سے یوں گر جانا گویا مر گئی ہو —

شاید اسی لئے پولس تذبذب میں ہے کہ کیا کیا جائے۔ کیونکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مصلحتاً کسی کا جرم اپنے سر لے رہی ہو — مگر کون ہے وہ ؟

قتل کے چوتھے دن تمام اخبارات کے سنڈے شماروں میں جب کیس کی پوری تفصیل آ گئی تو برج بھوشن پر بجلیاں گر گئیں۔ وہ بہت وکیلوں سے مایوس لوٹ کر جب پدما سے ملنے تھانے پہ آیا تو آس پاس کے لوگوں کے تاثرات پڑھ کر وہ ٹوٹ گیا۔ اور ایک کاٹھ کے ٹکڑے کی طرح فرش پر گر گیا۔ شاید اس لئے کہ اخبار میں یہ لکھا تھا قتل اس نے کیا ہے۔ کیونکہ اسے مقتول کو زنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ دور سلاخوں کے پیچھے جھانکتی ہوئی پدما نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ اتنی زور سے چیخ پڑی کہ آس پاس کھڑے لوگ چونکنے کے ساتھ ڈر بھی گئے۔

جب تحقیق کرنے والا پولس انسپکٹر پدما کے قریب گیا تو پہلی بار اسے اس کو نہ روتے دیکھا۔ نہ چیختے چلاتے دیکھا اور نہ یہ بتاتے کہ میں نے اجے کو مار ڈالا — اچانک وہ ایک نارمل عورت نظر آئی۔ مگر تھکی تھکی سی۔ بجھی بجھی سی۔ انسپکٹر مسکراتا رہا کیونکہ اس کو شروع سے ہی یہ شک تھا کہ پدما پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ قتل کے دن نہ تو بادل گرجے تھے نہ بجلیاں چمکی تھیں اور نہ تیز بارش ہوئی تھی۔

پدما رنج اور غم میں ڈوبی ہے مگر اس کی سنجیدگی اور باوقار طرز بیان کو دیکھ کر انسپکٹر کو یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ ایک قاتل سے بات کر رہا ہے۔

پدما کا بیان قلمبند کرنے کے بعد جب پدما نے اپنے شوہر کو ہسپتال میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تب انسپکٹر خود ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہوا۔

برج بھوشن کو نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر پدما بہت روئی اور برج بھوشن کے پاؤں اپنی چھاتی سے رکھ کر تب تک سسکتی رہی جب تک ڈاکٹر نے کمرے سے جانے کے لئے کہا — برج بھوشن کو جب بھی ہوش آجاتا وہ پدما کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر آہیں بھر لیتا اور پھر بے ہوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتا۔ شاید اس لئے کہ وہ پدما کی تڑپ محسوس کر سکتا تھا مگر

میں : دوران نہ پدما کچھ بول سکی اور نہ برج بھوشن۔

انسپکٹر یہ منظر دیکھ کر پدما کے بارے میں سوچتا رہا ــــ اور گئی رات تک پدما کے بارے میں ہی سوچتا رہا بار بار اس کے بیان کو پڑھتا رہا اور ہر بار دل میں ایک کسک سی محسوس کرتا رہا۔

آج پھر پدما کو دیکھنے والے لوگ آئے ہیں۔ اور وہ پھر چیخ رہی ہے۔ چلا رہی ہے ــــ روتے روتے اپنے بدن کو ناخنوں سے کھرچ رہی ہے۔ مگر انسپکٹر پدما کی بڑی بڑی خوبصورت مگر مرجھائی ہوئی آنکھوں میں اس کی زندگی کی کہانی ایک بار پھر جاننا چاہتا ہے ــــ حالانکہ بیان میں پدما سب کچھ بتا چکی ہے۔

دور بہت دور پہاڑیوں کے گود میں پدما کا گاؤں ــــ گاؤں میں ندی کنارے ایک سرکاری افسر کا پکا کوارٹر ــــ اور ساتھ ہی ایک چوکیدار کا چھوٹا سا گھر۔ بوڑھا باپ سرکاری افسر کا کھانا بنایا کرتا تھا اور ۱۵ سال کی بیٹی اس کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ افسر بہت مہربان تھا اور پدما کو بیٹی کی طرح پیار کرتا تھا۔ پھر افسر کے گھر والے چھٹیاں گزارنے آئے۔ سال میں ایک ۱۸ سال کا بیٹا اور دو چھوٹی بیٹیاں ــــ بیٹا کسی کالج میں پڑھتا تھا اور پدما کو بات بات پر ہنسایا کرتا تھا۔ اپنی بہنوں کیطرح اس کے ساتھ بھی کبھی تاش کی کوئی گیم سکھاتا اور کبھی جنگل میں لے کر خوب سیر کرواتا تھا۔ مگر جس روز وہ واپس لوٹ کے جا رہے تھے اس سے ایک دن پہلے بادل گرجتے رہے۔ بجلیاں چمکتی رہیں۔ اور اس وقت زبردست بارش ہوتی رہی جب منہ بولے بھائی نے پدما کو دبوچ کر کچل ڈالا۔ وہ چیختی رہی، چلاتی رہی مگر اس کی آواز کو بادلوں کی گرج . . . . . . نے بیٹی کا صدمہ ٹرھ لیا اور دم توڑ

دیا مگر باپ جیسے افسر یہ سمجھتا رہا کہ بیٹی باپ کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کی کوشش نہیں کر رہی ہے۔

پھر جب احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے تب وہ دریا میں کود پڑی۔ مگر اپنے باپ کی گود میں پہنچنے کی بجائے وہ پولیس تھانے میں پہنچ گئی۔ اور پھر ناری نکیتن۔ چال چلن میں سدھار کی خاطر۔

انسپکٹر پدما کو دیکھتا رہا۔ اور اپنے ساتھی سے باتیں کرتا رہا۔

دراصل کہانی کا یہ حصہ اخبار میں آ چکا تھا۔ مگر انسپکٹر اپنے ساتھی کو کہانی کا دوسرا حصہ سنا رہا ہے۔ جبکہ پدما معمول کے مطابق چیخنے چلانے کے بعد دھڑام سے فرش پر گر گئی ہے۔ شاید بے ہوش ہو چکی ہے۔ اسی لئے سپاہی پانی پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

پدما کو آج عدالت میں جانا ہوگا۔ اور آج اس کا چالان پیش ہوگا۔

انسپکٹر ابھی تیاری مکمل کر چکا ہے۔ اور اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

واردات کے دن پدما بہت خوش تھی۔ وہ اپنے بیٹے کا سواگت کرنا چاہتی تھی اور وہ بھی چار سو بکھری ہوئی خوشبو سے۔ سنوں پھول آ چکے تھے اور اس نے سوموار گیتا کو اور پھول لانے کے لئے بھیجا تھا۔

برج بھوشن بیٹے کو لینے ریلوے اسٹیشن پر گیا تھا مگر اجے بھوشن سیدھے اپنے گھر آ کر ماں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اور وہ چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر ماں کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ ماں باتھ روم میں تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سمجھی اس کی نوکرانی گیتا ہوگی۔ مگر وہاں کوئی اور تھا۔ پدما چیخ

The Constitution of India
Preamble
"WE THE PEOPLE OF INDIA, having solemnly resolved to constitute India into a SOVEREIGN SOCIALIST SECULAR DEMOCRATIC REPUBLIC and to secure to all its citizens ..."
सर्व धर्म समभाव
سرو دھرم سمبھاؤ
Yajurveda
(Hadith)
سب ہی مذاہب کا یکساں احترام
بھارت کی تہذیب میں رچا بسا ہے
اور یہ ہمارے روحانی خیالات کی بنیاد ہے
سیکولر نظریہ ہماری اصل طاقت ہے
اور یہی جذبہ ہمارے آئین میں نمایاں ہے
آئیے ہم سب اس اصول کو بنائے رکھنے
کا پھر سے عہد کریں۔
Treat others exactly as you would like to have them treat you.
(Luke 6,31)
Guru Gobind Singh
سیکولرازم ہماری جمہوریت کا استحکام ہے
davp 92/569

پڑی۔ ایک جانا پہچانا چہرہ جس کو یاد کرتے کرتے وہ اکثر اندر ہی اندر ابل پڑتی تھی سامنے تھا۔ وہی بھورے بھورے لمبے بال۔ چہرے پر بھوری داڑھی اور آنکھوں پر ایک عینک۔ پدما دیکھتے ہی ایک زخمی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور اس کی گرفت تب ڈھیلی پڑ گئی جب شکار کا سانس رک چکا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے پدما کو احساس ہوا کہ مردہ انسان وہ نہیں ہے جس نے ۱۹ سال پہلے اس کی عزت لوٹ لی تھی بلکہ اس کا بیٹا اجے بھوشن ہے جو داڑھی مونچھے اور عینکیں پہن کر بالکل باپ جیسا لگ رہا تھا۔ دراصل جس لڑکے کو پدما اناتھ آشرم سے لے آئی تھی وہ اس کا اپنا بیٹا تھا۔ یہ برج بھوشن بھی جانتا تھا اور سوموبھی ——

انسپکٹر مایوس ہے۔ اور پدما کو دیکھ کر کہہ رہا ہے۔

کون سوچ سکتا تھا کہ اس بدنصیب عورت کی اتنی دردناک کہانی ہوگی۔ پھر بھی قتل قتل ہے۔ جرم کی سزا تو ہوگی۔

پھانسی یا عمر قید۔

یہ سن کر پدما آخری بار چیخ پڑی اور پھر جھولی پھیلا کر کہنے لگی۔ مجھے موت چاہئے —— زندگی نہیں۔

اور تھانے کے باہر کھڑے لوگ چپ چاپ پدما کے چہرے کو دیکھتے رہے۔

ختم

براہ کرم نگارشات خوشخط لکھیں

مدیر سہیل کے نام

ایک خط

(بسلسلہ سید علی مظفر)

قیوم خضر

۱۶ جنوری ۱۹۹۴ء کو سہیل (شمارہ ۱۱) ملا۔
کھولا، اور سب سے پہلے سید علی مظفر صاحب کا مضمون (پراگندہ طبع لوگ) پڑھ ڈالا۔ انہوں نے جب سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے، میں اسے پابندی کے ساتھ نہ صرف پڑھا کرتا ہوں بلکہ اس کے تراشے بھی محفوظ کر لیا کرتا ہوں۔ حفاظت کا اہتمام خاص اس خیال سے کیا گیا کہ آنے والے زمانے میں ان کی حیثیت ریکارڈ کی ہو جائے گی۔ لیکن قسط ۸ اور ۹ پڑھ کر میرے خیال کو بڑا ہی دھکا لگا۔ یہ دونوں قسطیں بے حد سرسری اور سطحی طور پر لکھی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحب مضمون اکتا گئے ہیں، لکھنے سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ اور محض تمہارے تقاضوں سے چھٹکارا پانے کی غرض سے، بس یونہی کچھ لکھ دیتے ہیں۔ ان کی اکتاہٹ اور پیچھا چھڑانے والی کیفیت مندرجہ بالا دونوں قسطوں سے واضح ہے۔ قسط ۸ میں جب انہوں نے گیا کے شعراء کا ذکر چھیڑا تو میری یادوں کی سطح پر بھی نجانے کتنے شعراء کی تصویریں، اور نہ جانے کتنی علمی و ادبی جلسوں اور مشاعروں کے نقشے ابھرنے لگے۔ مجھے یاد آتے ہیں گیا کے جناب مقصود گیاوی کی، جو نہ صرف شاعر بلکہ عجیب دلفریب شخصیت کے حامل تھے۔ قدیم وضع قطع کا انگرکھا، اور کبھی خالتا تو کبھی چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ سر پر چوگوشیا غالب نما ٹوپی اور پھٹے پاؤں میں سلیم شاہی جوتا ہوا کرتا تھا۔ گہرے گندمی رنگ کے آدمی تھے، چہرے پر مٹھی بھر داڑھی بھی تھی۔ مالی اعتبار سے، وہ تھے تو بالکل "پھٹے حال"، گیا کے خوشحال گھرانوں سے ان کی کفالت ہوا کرتی تھی، مگر جب گھر سے باہر نکلتے تو عجیب شان ہوتی۔ ایک ہاتھ میں خوبصورت منقش چھڑی اور دوسرے میں پان کا بڑا سا ڈبہ اور بٹوا ہوتا۔ سڑک پر چلتے تو معلوم ہوتا کہ "چغتائی آرٹ" کی کوئی زندہ تصویر محو رفتار ہے! قدیم وضع قطع نے ان کی شخصیت کو اور بھی جاذب نظر بنا رکھا تھا۔ مشاعرے میں ایک خاص ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ وہ سراپا شاعر ہونے کے علاوہ، شہر کے بوڑھے، جوان، اور بچوں کے لئے "کھلونا" بھی تھے، ہر شخص ان کو چھیڑتا اور وہ اس شخص کو اپنی مخصوص ایجاد کردہ گالیوں سے نوازتے — ان کی گالیوں کا کوئی برا نہیں مانتا۔ بلکہ لطف اٹھاتا تھا — اس

موقع پر مجھے "بڑے باغ، محلہ موریا گھاٹ" گیا کے ایک مشاعرے کی یاد آگئی، اس مشاعرے میں قریب قریب تمام مقامی شعراء شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے میں جب مقصود گیاوی کے پڑھنے کی باری آئی تو انہوں نے جیب ٹٹولا، لیکن غزل غائب تھی۔ عین اسی وقت صفِ سامعین سے ایک صاحب[1] نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا، اور مقصود صاحب کو مخاطب کرتے کہا کہ "چچا! آپ نے جو غزل بلبل بہار حضرت سریر کابری کو اصلاح کے لئے دی تھی، انہوں نے مجھے آپ تک پہنچانے کو کہا تھا مگر میں بھول گیا، لیجئے یہ حاضر ہے"۔ بلبل بہار کے ساتھ سریر صاحب کا نام سُن کر مقصود صاحب آگ بگولہ ہوگئے۔ اور سریر صاحب کی موجودگی میں سر مشاعرہ انہوں نے باآواز بلند کہا کہ "حاضرین! ایک راز کی بات سن لیجئے کہ بلبل کی دُم کے نیچے لالی ہوتی ہے، اور سریر کو خونی بواسیر ہے، اسی رعایت سے یہ اپنے آپ کو "بلبل" کہتے ہیں — گالی دینے کے سلسلے میں اس ندرتِ بیان کو دیکھئے اور لطف اٹھائیے۔ اب جبکہ سریر صاحب کا تذکرہ آ ہی گیا تو ان کے بارے میں کچھ اور بھی سُن لیجئے۔ وہ شاعر تو بلا شبہ کہنہ مشق اور بلند درجے کے تھے ہی، لیکن شاعر سے زیادہ فن عروض کے استاد تھے، اور لکھنوی انداز کی روائتی غزل خوب کہتے تھے، لیکن کریہہ الصوت ہونے کے سبب مشاعرے میں جب بھی پڑھتے تو بڑی ہوٹنگ ہوا کرتی تھی۔ خراب پڑھنے کے علاوہ مشاعرے میں عجیب عجیب حرکتیں بھی کرتے۔ مثلاً جب کوئی داد دیتا تو ٹخنے کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے۔ پڑھتے وقت زور زور سے زانو پر ہاتھ پٹکتے، اگر وہ اپنے ہی زانو پر ہاتھ پٹکتے تو کوئی بات نہ تھی، لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی کے زانو پر ہاتھ پٹکتے جس سے وہ بے چارا تلملا جاتا۔ اسی طرح ایک نجی مشاعرہ میں بغل میں بیٹھے ہوئے شخص کے زانو پر انہوں نے جیسے ہی ہاتھ پٹکنا چاہا، تو اس نے اپنا زانو پھرتی کے ساتھ کھینچ لیا۔ اور ان کا ہاتھ رکھے ہوئے اگالدان پر پڑ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اگالدان اچھلنے کی وجہ سے سارا فرش تو خراب ہو ہی گیا، اس کے علاوہ وہ ہوٹنگ بھی کہ نشست ہی برخاست کر دینی پڑی اگالدان پر ہاتھ پڑ جانے کے سبب انکی "تاڑ تھپی" میں ایسی چوٹ آئی کہ ہفتوں کے بعد سوجن کم ہوئی۔ سریر صاحب کی ایک خصلت یہ بھی تھی کہ وہ گیا شہر کے اکثر معاصر شعراء کو اپنا شاگرد کہتے تھے، جس کی وجہ سے خواہ مخواہ وہ دشمنی مول لیتے۔ اور جہاں تک مقصود گیاوی کا معاملہ ہے تو سریر صاحب اور مقصود صاحب کے درمیان ہرگز ہرگز استاد شاگرد کا تعلق نہ تھا بلکہ دونوں میں سالا بہنوئی کا رشتہ تھا — یہ تو ناصر میاں کی ستم ظریفی تھی کہ انہوں نے کسی صورت سے مقصود صاحب کے جیب سے ان کی غزل اچک لی تھی، اور محض تنگ کرنے کی غرض سے یہ تماشے کئے تھے، جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، مقصود صاحب فطری شاعر تھے،

---

[1] ناصر میاں جو سید علی مظفر نواب صاحب کے ملازم تھے، اور آخری عمر میں رئیس شہر احمد سعید قادری مرحوم کے یہاں بھی ملازمت کرتے تھے، یہ مقصود صاحب کو "چچا" کہتے اور جہاں موقع ملتا چھیڑ کر ان سے پر لطف گالیاں سنا کرتے۔ افسوس کے ناصر میاں

شاعرانہ صلاحیت اکتسابی نہیں بلکہ وہبی تھی، وہ نہ کسی
استاد تھے اور نہ کسی کے شاگرد! اسی لئے غزلوں کے
بعض اشعار میں فنی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن شاعرانہ
فتاد اور تخلیقی قوت بے پناہ تھی۔ مذکورہ مشاعرہ
یں میں جو غزل پڑھی تو دھوم مچ گئی۔ مجھے صرف ایک
طلع یاد رہ گیا ہے۔

اتنی جو ہے مہک مہک گلشن لالہ زار میں
تم نے جو مسکرا دیا جان آگئی بہار میں!

اگر ان کے کلام کا ایک معیاری انتخاب شائع ہو جاتا تو
اچھی شاعری کے کچھ نمونے دیکھنے کو ملتے۔ ان کے مندرجہ ذیل
دو اشعار تو ایسے ہیں کہ رہتی دنیا تک یاد کئے جائیں گے۔

ایک دن وہ تھا کہ گلشن میں بسر ہوتی تھی
آج دو پھول کو محتاج ہے تربت میری

سبزہ اگر نہ گور غریباں کی لے خبر
حسرت زدوں کی قبر پہ چادر چڑھائے کون؟

آخری عمر میں مقصود گیاوی کا قیام محمود وکیل مرحوم (کرانی
قنعات، ندی کنارے) کے مکان پر تھا اور وہیں انتقال بھی
ہوا۔ سنا ہے کہ ان کا مکمل دیوان کلام حیدری صاحب کے
پاس موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب! بہرحال مقصود
صاحب کا تذکرہ تو ضمنی طور پر آگیا۔ ان کے بارے میں میری
واقفیت بھی محدود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مظفر نواب صاحب
اپنی وسیع معلومات کی بنا پر آئندہ کسی شمارے میں مقصود
مرحوم کا بھی تذکرہ کریں۔

- قسط ۵ کو مضمون نگار نے سید ظفیر الدین شمس
گیاوی (سمندلو بہادر) کے تذکرہ سے شروع کیا ہے، لیکن
اس قدر سرسری اور بھاگم بھاگ انداز میں کیا ہے کہ طبیعت
جھلا گئی۔ جھلاہٹ کا سبب یہ ہے کہ شمس صاحب مرحوم
کے بارے میں تفصیل سے اگر مظفر نواب صاحب نہیں لکھیں
گے، تو اور کون لکھے گا؟ تفصیل سے مراد یہ نہیں کہ وہ شمس
صاحب کی پوری سوانح عمری یا ان کی ہجو اور سنجیدہ شاعری
کا بھرپور جائزہ لیتے، کیونکہ تفصیلات اور جزئیات
نگاری کا یہاں پر کوئی موضوع و محل بھی نہیں، پھر بھی وہ اتنا
تو لکھتے جس سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی اور ان
کی شاعرانہ حیثیت اجاگر ہو جاتی ہے ـــــ گیا شہر کے
ادبی و صحافتی اسٹیج پر شمس صاحب کی حیثیت ایک اہم
کردار کی تھی۔ انہوں نے گیا شہر کی قریب قریب تمام قابل
ذکر شخصیتوں پر پھبتی کسی، اور سبھوں سے متعلق ایسی ایسی
ہجو لکھا کہ اگر کوئی حوصلہ مند، باشعور اہل قلم "ہمزاد"
کی فائیلوں سے ان تمام ہجو کو ایڈیٹ کر کے شائع
کر دے تو اردو کی ہجویہ شاعری میں اضافے کی حیثیت
ہوگی۔ اس کے علاوہ ان کی مجلسی گفتگو اور لطیفہ گوئی
کا تذکرہ بھی مزہ لے لے کر، کرنے کی ضرورت ہے، خاص طور
پر لطیفہ گوئی کے سلسلے میں جب مانی صاحب مرحوم بھی کسی
نشست میں ساتھ ہوتے تو دونوں کے درمیان جو پر
لطف باتیں ہوتیں اور "پالکنے" میں جو ایک دوسرے
پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے، اس کے تذکرے
سے مصاحبانہ اور مجلسی گفتگو کی یاد تازہ ہو جاتی ـــ
شمس صاحب کی مخصوص رنگین مزاجی کا اثر ان کے رہنے
سہنے، لکھنے پڑھنے، بولنے چالنے اور زندگی گزارنے کے

۱؎ "حبیب" کو اکثر لوگ تانیث لکھتے [illegible] بولتے ہیں حالانکہ متفقہ طور پر یہ لفظ تذکیر ہے

مختلف پہلوؤں کے علاوہ ان کے لباس اور وضع قطع وغیرہ سے جو ظاہر تھا، اس کا تذکرہ تو بطور علامت شمس صاحب کا ہوتا، مگر اس سے ان کے عہد کی جھلک اور بالخصوص گیا کے کچھ مخصوص کریکٹر نیز پراگندہ طبع لوگ وغیرہ کی جھلکیاں مل جاتیں ۔ اور بہت ساری ایسی باتوں کی واقفیت ہو جاتی جن سے موجودہ نسل بالکل ناواقف ہے ۔ میں نے "سہیل" (شمارہ ۹ جلد ۱۵) میں "جا علی حسن" کے عنوان سے مگھی الفاظ پر مشتمل انشائیہ لکھ کر، پچاس برس پہلے کے گیا شہر کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔

"پراگندہ طبع لوگ" کی قسط ۹ تو اور بھی سرسری طور پر لکھی گئی ہے، حالانکہ جن حضرات گرامی کا ذکر انہوں نے چھیڑا ہے، وہ سبھی علم و فن کے ستون تھے، اور مضمون نگار کی توجہ خاص کے مستحق بھی! لیکن ان سبھوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے، جیسے کوئی شخص بھاگتے ہوئے، ہانپتے کانپتے، جلدی جلدی میں کوئی بات کہہ دے ۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ نواب امداد امام اثر مرحوم کو انہوں نے بچپن میں سرسری اور مختصر طور پر دیکھا تھا، جتنا بھر دیکھا یا ذاتی طور پر جتنا بھر جانتے تھے لکھ دیا، سنی سنائی اور کتابوں باتوں کا تذکرہ انہوں نے ضروری نہیں سمجھا، لیکن جناب شفق عماد پوری کو تو انہوں نے قریب سے دیکھا بھی تھا اور شمس صاحب کی وساطت سے ان کے بارے میں سنا بھی، اس کے باوجود یہ کیسے لکھ دیا کہ ان کا کلام دستیاب نہیں اور دیوان ضائع ہو گیا، حالانکہ کلام ان کے زمانے کے اکثر رسائل و جرائد میں موجود ہونے کے علاوہ دیوان بھی محفوظ ہے ۔ چنانچہ محلہ کریم گنج، گیا میں مقیم جلال الدین اکبر (ریٹائرڈ سب رجسٹرار) کے سالے عزیزی سلمان سلمہ نے شفق صاحب سے متعلق تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے ۔ بہر حال، مضمون نگار موصوف کو اگر شفق مرحوم کے ایک ہی شعر کو پیش کرنا تھا تو مندرجہ ذیل شہرۂ آفاق شعر کو پیش کرنا چاہئے تھا ۔

معطر ہے اسی کوچے کی صورت اپنا صحرا بھی
کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے!

شفق مرحوم کے بعد سریر صاحب کو جاننے کے باوجود ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہیں لکھتے تو زیادہ اچھا تھا ۔ اور باتوں کے علاوہ ان کے سلسلے میں ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ گفتگو میں جب کسی شاعر کا ذکر آجاتا تو اس کا پورا نام مع تخلص لیا کرتے تھے ۔ مثلاً سید علی محمد شاد، خواجہ حیدر علی آتش وغیرہ، لیکن یہ بات لکھتے وقت وہ بھول گئے کہ اس کا راوی قیوم خضر ہے ۔ اس لئے کہ یہ بات اسی سے اور اس کی دوکان (آہن کدہ) پر ہوئی تھی ۔ اس نشست میں خواجہ عنایت اللہ مرحوم اور سید شاہ لعل قادری مرحوم بھی موجود تھے، ان لوگوں کی موجودگی میں یہ قیوم خضر تھا جس نے "کسترین" کا پورا نام پوچھ کر اس بات کو لطیفہ کی حیثیت دے دی اور اسی نے اس لطیفے کو ان گنت لوگوں سے کہا بھی لیکن اس معاملے میں مضمون نگار موصوف کا کوئی قصور نہیں بلکہ موصوف تک جس کے ذریعہ یہ بات پہنچی اسی خائن نے اسے

ا؎ راقم الحروف نے سریر صاحب سے متعلق ایک بسیط مضمون "زبان و ادب" پٹنہ (جولائی ۔ اگست ۱۹۹۱ء) میں تحریر کر کے اپنی دو ٹوک رائے کا اظہار کر دیا ہے

وی کا نام ہی حذف کر دیا ہوگا، بہرحال، اس کی نہ
ی اہمیت ہے اور نہ اس کی مجھے پرواہ! اس لئے کہ
جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جو میرے اگلے ہوئے نوالے
چباتے پھرتے ہیں، حد تو یہ ہوگئی کہ ایک دو سال
پہلے کی بات ہے کہ گورنمنٹ اردو، لائبریری۔ پٹنہ کے
منعقدہ ایک سیمینار میں ایک صاحب نے میری موجودگی
میں جو مضمون پڑھا، اس میں میرے مجموعۂ مضامین —
(تنویرات) میں شائع شدہ ایک مضمون کا پورا پیراگراف
نقل کر کے اقتباساً نہیں بلکہ میرے حوالے کے بغیر اپنی
عبارت کے طور پر پڑھ ڈالا۔ شرکا میں جو لوگ واقف
تھے وہ مسکرا رہے تھے، لیکن لوگوں کی طنز آمیز مسکراہٹ
کا بھی کوئی اثر ان صاحب پر نہیں ہوا۔ خیر، چھوڑو ان
باتوں کو، میں نے تو ضمنی طور پر ان باتوں کا تذکرہ محض
اس لئے کر دیا کہ لوگوں کو علمی و ادبی خیانتوں کا اندازہ
ہو جائے۔

میں مضمون نگار موصوف سے دست بستہ
عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بھی جو بھی لکھیں دھیان سے ٹھیک
ٹھیک لکھیں، اور اس طرح لکھیں جس طرح لکھنے کا حق ہے۔
اس لئے کہ وہ لکھ سکتے ہیں، ان کے پاس علم بھی ہے، فنی
ورزش بھی ہے، مشاہدہ و مطالعہ کے علاوہ تجربہ بھی ہے
اور ساتھ ساتھ فرصت بھی ہے، اور وہ سب کچھ ہے
جو دوسروں کے پاس نہیں — انہوں نے شروع میں جو چند
قسطیں لکھی تھیں، وہ بہت خوب تھیں، اور امید
بندھی تھی کہ سید علی مظفر صاحب، اردو ادب کے
ذخائر میں اضافہ فرمائیں گے۔ ابتدا کی قسطوں میں انہوں
نے "غزل" سے متعلق نہایت ہی گمبھیر اور فکر انگیز اشارات
کئے تھے۔ انہوں نے مختلف شعرا کی غزلیں پیش کر کے اپنے
معیار ذوق کے مطابق "اصلی غزل" کے اشعار کی نشاندہی
بھی کر دی تھی۔ ان کی نشاندہی نے "تغزل" کو سمجھنے میں
لوگوں کی مدد کی۔ اگر وہ اسی پیٹرن پر لکھتے رہتے تو رطب
یابس کی تمیز ہو جاتی، اور غزل گو شعرا کے غزلیہ معیار ذوق
ذوق کا بھی اندازہ ہو جاتا، نیز غزل کیا ہے، اس کا
جواب بھی مل جاتا۔

ان کی سرگذشت کی پہلی قسط ("مجھے یاد ہے سب
ذرا ذرا" مطبوعہ: زبان و ادب" پٹنہ شمارہ ۷-۸)
سے متعلق میں اپنی رائے ابھی محفوظ رکھتا ہوں، سردست
صرف اتنی گزارش ہے کہ اس کے لکھنے میں وہ ہرگز عجلت
پسندی اور سہل نگاری سے کام نہ لیں، بلکہ سوچ سمجھ کر،
ٹھہر ٹھہر کر اور کھل کر وہ تمام باتیں لکھ ڈالیں، جن سے ان
کے خاندان کے علاوہ ان کے عہد کی تمام اہم شخصیتوں نیز
اہم واقعات کی واقفیت آنے والی نسلوں کو ہو سکے۔
ان کی زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ ہوئے کہ ان کے
پاس لکھنے کو بہت ساری باتیں ہیں۔ وہ اگر لکھنا چاہیں
تو بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔

اس خط کے لکھنے کا سبب، یہ عرض کرنا ہے
کہ ان کے بارے میں جو امیج بنا ہوا ہے، اس کو مجروح
نہ کریں، اور ان سے جو توقعات وابستہ ہیں، اس سے
لوگوں کو محروم نہ کریں۔ ان کے لئے میرے دل میں بڑی قدر و
منزلت ہے۔ میری التجا ہے کہ وہ ہم جیسے کم علم والوں
کو اتنا بھر دیں کہ تہی دامنی کا شکوہ جاتا رہے۔ اور بس!

غبارِ کاروانِ رفتگاں
قیوم خضر، پٹنہ ●

نئی کتابوں کا تعارف

(ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری)

نام کتاب :۔ دیوار پر لکھی ہوئی عبارت (افسانے)
افسانہ نگار :۔ آسی رام نگری
صفحات :۔ ۲۸۰ ● قیمت :۔ ۷۵ روپے

پتہ :۔ جامعہ لمیٹڈ ، اردو بازار ۔ دہلی
(۲) سیمانت پرکاشن ، ۹۲۲ ، روہیلا اسٹریٹ ، تیراہا بہرام
دریا گنج ، نئی دہلی

آسی رام نگری صاحب ایک استادِ فن تھے ۔ اور نئے لکھنے والوں کی تحریروں پر اصلاح دیا کرتے تھے ۔ اس طرح متعدد نوجوان افسانہ نگار و شاعران کے دامنِ تربیت میں پلے ۔ آزادی سے قبل ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ کئی بار چھپا اور اب ان کے سعادت مند صاحبزادے نسیم بن آسی نے اپنے مرحوم والد محترم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے ۔

آسی صاحب پریم چند دور کے لکھنے والوں میں تھے اور ان کا ایک خاص انداز تھا ۔ جو افسانے سے زیادہ انشائیہ کے قریب تھا ۔ اس لئے کہ وہ قصے کے بجائے انشاپردازی پر زور دیتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے تصورات و خیالات کا اظہار مختلف موضوعات پر کیا کرتے تھے ۔ اسے چشمہ خیال کی تکنیک تو ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا لیکن اس میں ماجرا کی ترتیب سے ایک قسم کا بے پناہ عنصر ہے ۔ یہ ادبِ لطیف سے ملتی جلتی ایک چیز ہے جس میں احساسات کی رومانی رَو کو ایک خاص سلیقۂ تحریر سے بیان کیا جاتا ہے ۔ جدیدیت کے حلقہ بگوش آج کے بہتیرے نئے افسانہ نگار آسی کے افسانوں میں اپنا ایک پیش رو تلاش کر سکتے ہیں ۔

آسی کی کہانیوں میں انسانوں کے تعلقات و واقعات سے شاید کچھ زیادہ اہمیت مناظرِ فطرت کو دی جاتی ہے ۔ اس لئے ایک درخت کے موضوع پر نہ صرف یہ کہ ان کی متعدد کہانیاں ہیں بلکہ دوسری کہانیوں میں بھی درخت ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے ماحولیات کے شیدائی چاہیں تو اپنی سرگرمیوں کے لئے آسی کی تحریروں سے کچھ اقتباسات لے سکتے ہیں ۔ یہ تو کچھ خیالستان قسم کی چیز ہے ۔ بہرحال آسی کی تحریروں میں زبان و بیان کا ایک سلیقہ ہے جس سے نئے لکھنے والے کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔

▲ پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی

فکر و تحقیق کے تین شمارے

(۱) پہلا شمارہ (جنوری تا جون ۱۹۸۹ء)

فکر و تحقیق ترقی اردو بیورو کا سہ ماہی رسالہ ہے ادارے کے جملہ منصوبوں میں اس مجلے کی اشاعت ایک نمایاں کارگزاری ہے اس کے ذریعہ اردو زبان و ادب کے سلسلہ میں مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی گنجائش ہے اردو شاعری کی تمام اصناف پر بحث کی جاسکتی ہے اردو شاعری کے احوال و آثار معلوم کئے جاسکتے ہیں، ان کے کلام کی تنقید ممکن ہے، قدیم اثاثۂ ادب کی تعبیر نو ہوسکتی ہے۔ ہم عصر شعر و ادب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں نیز عالمی سطح پر اردو کے تخلیقی کارناموں کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ادبیات عالم سے لین دین کے روابط روا کئے جاسکتے ہیں۔ غرض اس رسالے کے ذریعہ ہماری زندگی اور توانائی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اردو قارئین کے علمی و ادبی حلقوں میں رسالہ فکر و تحقیق کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرنا چاہئے اور مجلس ادارت کے اراکین یعنی ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ابوالفیض سحر اور بلجیت سنگھ نظیر کا ممنون ہونا چاہئے۔

پیش نظر شمارہ ترقی اردو بیورو کے خواب کی خوشگوار تعبیر ہے۔ کم و بیش تین سو صفحات کا یہ شمارہ دکنی ادب کی تحقیق و تدریس کے لئے مختص ہے۔ دکنی ادب کی تفہیم و تحقیق سے متعلق اس شمارے کی نوعیت یہ ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اس موضوع پر سہ روزہ سمینار اور ورک شاپ منعقد کیا تھا، یونیورسٹیوں کے بعض اہم اساتذہ نے اس میں اپنے جو مقالات پیش کئے تھے انہیں مرتب کرکے فکر و تحقیق کا یہ خصوصی شمارہ شائع کردیا گیا ہے اس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ سمینار میں پڑھے گئے پرچوں کے علاوہ ان موضوعات سے متعلق کچھ ایسے مقالات بھی شامل کئے جاتے جو خاص طور پر رسالے کے لئے لکھوائے جاتے۔ اس طرح ان اہل علم اور اہل قلم حضرات کی خدمات بھی حاصل ہوجاتیں جو کسی وجہ سے سمینار میں مدعو نہیں کئے گئے تھے یا شریک نہیں ہوسکے تھے۔ اس طرح یہ خصوصی شمارہ ورک شاپ اور سمینار کی رپورٹ تک محدود نہیں رہتا بلکہ مسئلہ کے چند دوسرے پہلوؤں کو بھی سمیٹ پاتا۔ سمیناروں میں پڑھے جانے والے پرچے وقت کی حد بندی، مجلس کی دلچسپی اور سامع کی آسانیوں کو سامنے رکھ کر لکھے جاتے ہیں۔ ان میں خود لکھنے والا دقیق علمی مسائل کو چھوڑ کر آسانی کا راستہ اپنانا چاہتا ہے یا ادق لفظوں پہ وضاحت سے لکھنے کی بجائے محض اشارات سے کام لینے پر اکتفا کرتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ریڈیو ٹاک میں بھی ہوتا ہے۔

سمینار اور ورک شاپ کے موضوع و مقصد سے ہم آہنگی اور تطبیق پیدا کرنے کے لئے بعض مقالات کے بہت سے نقطوں میں یکسانیت ہے۔ اس REP-ETATION نے شمارے کی ضخامت میں اضافہ کردیا ہے ان سے بچنے کے لئے بعض مقالات کے اقتباسات سے کام نکالا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ "ترتیب" کے تحت مقالات کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ بھی واضح درجہ بندی ثابت نہیں کرتی۔ بالخصوص پہلے اور دوسرے حصوں میں خط تقسیم کھینچنا ممکن نہیں جو یہاں ہے وہ وہاں بھی ہے۔ بایں ہمہ مجلہ فکر و تحقیق تشنگان علم کی سیرابی کرتا ہے۔ امید ہے کہ ارباب ادارہ اس کے ہر شمارے کو علم و ادب اور زبان و ثقافت کے کسی ایک پہلو کے لئے مخصوص کرکے اس کی افادیت میں اضافہ کریں گے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اپنے اداریے میں یہ اطلاع دی ہے کہ "پہلا کل ہند سمینار بیورو نے ۱۹ اور ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو "تکنیکی اور انجینیرنگ کی تعلیم اردو کے ذریعہ" پر کیا جو بہت کامیاب رہا اور خوب پسند کیا گیا تھا" میری گذارش ہے کہ اس سمینار میں پیش کئے مقالات پر مبنی ایک خصوصی شمارہ شائع کر دیا جائے تاکہ اس مفید کار موضوع پر عالموں کے خیالات سامنے آسکیں۔

"فکر و تحقیق" کے پیش نظر ضخیم خصوصی شمارے کی قیمت صرف پندرہ روپے ہے۔ اس کے بعد بھی اردو والے اسے نہ خریدیں تو اس بدبختی کا کیا جواب ہے۔

(۲) شمارہ جنوری تا جون ۱۹۹۰ء

یہ فکر و تحقیق کا تیسرا شمارہ ہے۔ پہلے شمارے پر گفتگو ہو چکی ہے، دوسرا دیکھنے کی نوبت نہیں آئی لیکن اندازہ ہے کہ ادارے نے جن اعلیٰ مقاصد کے لئے اور جس ستھرے مذاق کے ساتھ فکر و تحقیق کا اجرا کیا ہے وہ معیار بہر حال قائم ہوگا۔ پیش نظر شمارہ بھی اس کا آئینہ ہے۔ اس شمارے کے مشمولات میں قدیم اردو نظم (ڈاکٹر فہمیدہ بیگم) اور سب رس میں نعت و منقبت (سید قدرت اللہ نقوی) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

اول الذکر میں سلطان علی عادل شاہ ثانی متخلص بہ شاہی، مرزا داؤد اورنگ آبادی اور ولی دکنی کے کلام کے انتخابات پیش کئے گئے ہیں۔ متن کی تسوید میں غایت احتیاط برتی گئی ہے۔ دکنی اردو کے مخصوص الفاظ کے معنی بھی حاشیے پر مرتسم کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان شعرا کے بارے میں ضروری اور اہم اطلاعات بھی بہم پہنچا دی گئی ہیں۔ دوسرے مقالات بھی غنیمت ہیں۔ یہ سب مل کر فکر و تحقیق کو اردو کے دوسرے رسائل سے ممتاز بناتے ہیں۔

یہ مجلہ ترقی اردو بیورو سے شائع ہو رہا ہے اس لئے توقع کی جانی چاہئے کہ ادارے کے اراکین کتابت، طباعت اور املا کی غلطیوں پر خصوصی نگرانی رکھیں گے۔ اس شمارے میں متعدد غلطیاں رہ گئیں ہیں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو کے رسالے میں یہ خامیاں رہ گئیں تو پھر لوگ انہیں سند ماننے لگیں گے۔ صفحہ ۹۷ پر تشبیہ کی جمع تشبیہات درج ہے۔ اس صفحے اور اسی سطر میں قوس قزح کی جگہ پر قوس و قزح لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۷۵ پر تسامحات رقم کیا گیا ہے "تسامح" کافی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں نبوت کا دعویدار مسیلمۂ کذاب نہیں تھا بلکہ مسیلمۂ کذاب تھا۔ (صفحہ ۶۸)۔ صفحہ ۹۵ پر جرأت انگیز غالباً حیرت انگیز کی جگہ پر لکھا گیا ہے۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی خامیاں بہت سی ہیں۔ ان کی زیادہ نشاندہی بھی اچھی بات نہیں۔ بہر حال! ادارہ کو اس کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ رسالہ تحقیق و تنقید سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ان میدانوں میں چھوٹی خامیاں بڑی گمراہیاں پیدا کر سکتی ہیں۔

(۳) شمارہ :- جولائی تا دسمبر ۱۹۹۰ء

فکر و تحقیق کے اس شمارے میں حسب معمول ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے دکنی ادب کی تفہیم و تدریس کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں عبدل اور ابن نشاطی کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ عبدل اپنی مثنوی ابراہیم نامہ کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ تاریخی، لسانی اور فنی حیثیت سے یہ مثنوی خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علمی و ادبی خدمات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ شمارہ پیش نظر میں ابراہیم نامہ کا متن بھی ہے اور حاشئے پر مشکل الفاظ اور مقامی املا کی تفہیم و توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ اسی طرح ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن کی تدریس بھی کی گئی ہے۔ فکر و تحقیق میں قدیم اردو کی تدریس کا یہ سلسلہ نہایت مفید ہے امید ہے کہ ایسے قائم رکھا جائے گا۔

دوسرے مقالات میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور ایم حبیب علوی کی تحریریں نہایت قیمتی ہیں۔ ابوفیض سحر کا مقالہ "ادب کی تخلیق اور ترسیل کا مسئلہ۔ نئے تناظر میں" کئی اہم مباحث پیدا کرتا ہے۔ ملکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے تخلیق و ترسیل کے مسائل سے زیادہ دوسرے مباحث پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک طرف اس بات کی تائید بھی کرتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے بہتر ادب کی تخلیق بھی کی ہے۔ اور دوسری طرف اس عہد کے ادب کو "بے میل اور بے جوڑ نظریات کے تحت تخلیق پایا ادب" بھی کہتے ہیں۔ شعر و ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور کے ادب کا ایک بڑا حصہ مزخرفات پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کمزور تخلیقات کی بنیاد پر ادب کے معیار کا تعین نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے فیوض کو اس عہد کی چند انتہا پسندانہ تخلیقات کی روشنی میں پرکھنا اور حکم لگانا قطعی درست نہیں۔ کیا وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تحریک کے قبل غزل کو چھوڑ کر نظم نگاری، افسانہ نگاری، ناول، ڈرامے نیز ہیئتی و فنی تجربات کے میدانوں میں ہمارے شعر و ادب میں زیادہ طاقت و توانائی، تنوع، معاشرتی شعور اور ذہنی بالیدگی کی خوبیاں موجود تھیں ہے اگر ایسا نہیں تھا اور یقیناً نہیں تھا تو ہماری ترقی پسندی کو برا بھلا کہنے کا جواز کیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار موضوع کو سمیٹ نہیں پائے ہیں اور پورا مقالہ انتشار کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ بایں ہمہ 'فکر و تحقیق' اپنے بیشتر مشملات کے ذریعہ اپنی معتبر پہچان دینے میں کامیاب ہے۔ ترقی اردو بیورو کا یہ ایک اہم ACHIEVEMENT ہے۔ اسے پابندی سے شائع ہونا چاہیے۔

▲ ڈاکٹر علیم اللہ حالی، گیا

نام کتاب :۔ **رقص زندگی**

تخلیق :۔ رؤف جاوید

نوعیت :۔ شعری مجموعہ صفحات :۔ ۱۲۰ قیمت :۔ ۲۵/

ملنے کا پتہ :۔ ۱۷ ڈی ماڈل ٹاؤن دہلی 110009

رؤف جاوید بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری ہماری روزمرہ کی زندگی کے مسائل اس کے واقعات، سانحات و حادثات اور نشیب و فراز کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز اور ان کی آپ بیتی ہے۔ جس کے در پردہ جگ بیتی نہاں ہے۔ اس طرح ہماری رقص کناں زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور ان کا انداز بیان صاف شستہ اور سیدھا سادہ ہے۔ کہیں بھی الجھاؤ یا گنجلک پن نہیں ہے، اور نہ ہی (ماسوا چند) غیر مانوس اور دبیز الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، پرکاری اور سحر انگیزی کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ جس کی وجہ کر ان کے کلام میں جادو بھر گیا ہے۔ قاری اس میں ایک عجیب سی کشش اور اپنا پن محسوس کرتا ہے۔ غزلوں میں اکتا دینے والی کیفیت نہیں

نہیں ہے۔ ان کی یہی خوبیاں انہیں ان کے فن کو کامیابی کی ضمانت اور سند عطا کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں اگر ایک طرف زندگی کا الم ہے تو دوسری طرف اس کا بدلتا ہوا رنگ و مزاج بھی انہوں نے آج کے سماج اور آج کے انسان کی بہترین تصویر کشی اپنی غزلیہ شاعری میں کی ہے۔ اس کے چہرے پہ پڑے نقاب کو پلٹ کر اس کا اصلی چہرہ سامنے لایا ہے۔ ان کے اشعار میں اگر غم جاناں اور غم دوراں ہے تو طنز کے گہرے تیر اور عشق و محبت کے راگ کے زیریں لہریں بھی ہیں۔ کہیں کہیں مذہب و تصوف کی باتیں بھی ہیں۔ ان کے متفرق اشعار میں کچھ بڑے خوبصورت اور بولتے ہوئے اشعار ہیں۔

رؤف جاوید نے کچھ "آزاد نظمیں" بھی لکھی ہیں جیسے "نثری نظموں کا عنوان دے کر" آزاد نظم " کی صنف کا مذاق اڑایا ہے۔ یہ بات مجھے بری طرح کھٹکی ہے شاید انہیں نہیں معلوم کہ اس کی اپنی صنفی اور ہیتی شکل اور منفرد مقام بھی ہے۔ اس میں ربط و تسلسل لئے تار، جھنکار وہ سب کچھ ہے جو پابند نظموں میں چاہئے۔ اسے "نثری نظم" کو ود کو رہنشی کہتے ہیں۔ جو اس کے صنفی و ہیتی پابندیوں اور قواعد کو برتنے سے معذور ہیں۔ بہرحال یہ تو میرا جملہ معترضانہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں ایک ہم آہنگی، تسلسل اور فضا بندی کی کیفیت ہے۔ یہ نظمیں موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہت خوب ہیں بالخصوص پہلی، دوسری، پانچویں، ساتویں، آٹھویں، دسویں، گیارہویں، تیرہویں اور سولہویں نظمیں۔ یہ نظمیں انسانی کرب، حالات و واقعات کی داستان مسلسل ہیں۔ ان میں عزم بیکراں اور دعوت فکر ہے۔

گرچہ رؤف جاوید نے الفاظ و محاورات و استعارات اور بعض مصرعوں پر فنی جوہریوں کی گرفت و گوشمالی کے مواقع فراہم کر دیئے ہیں مگر مجموعی طور پر "زندگی" ان کا ایک کامیاب مجموعہ کلام ہے۔ جس کی مناسب داد کے مستحق ہیں۔

طباعت، کتابت، سرورق ہر لحاظ سے یہ مجموعہ قابل تحسین ہے۔ آج کے دور کے لحاظ سے قیمت کچھ بھی نہیں ہے شعر و ادب کا ذوق لطیف رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

▲ سید ابوالفیض سید آبادی
دہلی

شہرِ خیال

آج کی ڈاک سے "سہیل" کا شمارہ نمبر ۱ ملا۔ اتنے دنوں تک غزل اور افسانہ کی رسید نہ ملنے پر میں آپ کی طرف سے تقریباً نا امید ہو چکا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید میری دونوں تخلیقات پسند نہیں آئیں۔ لیکن آج خلاف توقع رسالہ پا کر اور اس میں اپنے افسانہ "کرم جلی" کو شریک اشاعت دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ بہرحال، اس کرم فرمائی کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

افسانہ کے ساتھ بجائے احمد سعدی کے میرا نام احمد سعیدی چھپ گیا ہے حالانکہ مسودہ پر صاف اور خوشخط تحریر میں احمد سعدی ہی لکھا ہوا ہے۔ سید عبدالاحد گیاوی تو پرانے کاتب ہیں۔ ان سے تو ایسی صریح غلطی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ آئندہ شمارہ میں اس کی تصحیح شائع کر دیں۔ ممنون ہوں گا۔

دسواں شمارہ پسند آیا۔ کافی متنوع ہے۔ سبھی مضامین "پریم چند۔ حیات اور فن" کیفی اعظمی کے آوارہ سجدے کی تخلیقی تشکیل اور پراگندہ طبع لوگ" دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔ خاص طور پر "پریم چند۔ حیات اور فن" سے پریم چند کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ غزلیں بھی زندگی کی حرارتوں سے پر ہیں۔

اس بار تو ہندوستان ایک بہت بڑے بحران سے دوچار ہو گیا ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت کی فضا بھی شدید تر ہو گئی ہے۔ خدا آپ سبھوں کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

نیا سال مبارک ہو!

● احمد سعدی، بنگلہ دیش

نیا سال مبارک ہو

خدا کرے نیا سال ہمارے لئے امن آشتی کا پیغام بن کر آئے۔ ہم ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنا۔ محبت سے رہنا سیکھ جائیں۔ فرقہ پرست اور امن دشمن طاقتوں کو ان کی گھنگی کا احساس دلا سکیں اور موقع پرست، مفاد پرست سیاسی گٹھ بندیوں کو ختم کر سکیں۔ آمین

● شرون کمار ورما، امرتسر

گزشتہ دنوں جو عظیم سانحہ گزرا اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ فسطائیت اور مذہبی جنون نے معصوم جانیں لیں۔ وحشت اور درندگی اپنی انتہا کو پہنچی، سب کچھ

اس منظم طریقے سے ہوا کہ نیند حرام ہو گئی۔ ایسے کڑے وقت میں بے یار و مددگار سبھوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ جس ملک میں انسانیت، قانون اور اخلاقی قدریں ختم ہو گئی ہوں وہاں امن پسند انسان اپنے کو بیگانہ محسوس کرتا ہے اور یہ اچھی علامت نہیں۔ دیکھئے آئندہ صورت حال کیا ہوتی ہے؟ پورے ملک میں جو کچھ اور جس طرح ہوا وہ ہم سبھوں پر عیاں ہے۔ کم از کم بہار اس مرتبہ دوسرے شہروں کے بہ نسبت شانت رہا۔

اپنی خیریت اور تفصیلات جلد لکھیں۔ آپ سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔ حالات معمول پر آجائیں تو حاضر ہوں گا

● قیصر زماں، گریڈیہہ

○ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

بابری مسجد سانحے کی وجہ سے حالات ابھی تک کشیدہ ہیں۔ کب کیا ہو جائے کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تو ہر شخص خوفزدہ ہے۔ لوگوں کے گھر جل رہے ہیں میرا تو دماغ جل رہا ہے۔ تاریک پسند قوتوں کے حوصلے بڑھ رہے ہیں۔ ایسے میں بس یہی جی چاہتا ہے کہ ایسی جگہ چلے جائیں جہاں کوئی نہ ہو۔ رت سی ہو گئی ہے ان انسانی درندوں سے۔ نہ عورتوں عصمت محفوظ نہ انسانی جان کا کوئی احترام۔ دونوں قے کے لوگ بہیمیت پر اتر آئے ہیں۔ آپ ہی بتائیں ہم کریں کہاں جائیں۔

●

○ ۶ر دسمبر ۹۲ — دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان سے سیکولرزم کا جنازہ اٹھ گیا۔

۶ر دسمبر ۹۲ — بابری مسجد کے ساتھ ہندوستانی

○ مسلمانوں اور دوسری تمام اقلیتیں شہید کر دی گئیں ۶ر دسمبر ۹۲ء — دستورِ ہند، عدالت عالیہ، پالیمنٹ، قومی یکجہتی کونسل، صدرِ ہند اور وزیر اعظم شری نرسمہا راؤ کے منہ پر کار سیوکوں نے تھوک دیا۔

اب ہندوستانی مسلمان اور دوسری تمام اقلیتیں کس کا دامن تھامے اور کس کے منہ پر تھوکے۔؟؟

وزیر اعظم نے فرقہ پرست ووٹوں کے خوف سے ملک کو داؤں پر لگا دیا۔ اب دیش کے برے دن آگئے ہیں۔

سیاسی پارٹیاں ووٹوں کی راج نیتی اور دلی کی گدی پر نظریں جمائے ہوئے ہیں وہ دن دور نہیں جب ایک دلی کی دس دس دلیاں ہو جائیں گی۔

منصف ہی مجرموں کا طرفدار ہے تو پھر
انصاف کیا جئے گا عدالت کے باوجود

● مقصود

○ پہلے دلوں ہی ہماری مشترکہ تہذیب اور سیکولر اقدار کو جس طرح ایک حد تک مسمار کیا گیا اور بعد ازاں ہزاروں بے گناہ لوگ جس طرح مذہب کے نام پر مارے گئے یہ سارا ہولناک منظر چپ چاپ دیکھنے والے گنہگاروں میں ایک میں بھی ہوں کہ معمولی فرد ہوں اور منظم غنڈہ گردی کے ہاتھوں کسی دن قتل ہو جانا ہم سب غیر منظم افراد (جو سیکولرزم کے روادار ہیں) کا مقدر ہے۔ یہاں کے تسکین ہے کہ سیکولر طاقتیں از سر نو ملک میں قوی ہونے لگی ہیں۔ ایسے میں ہم ادیبوں کا فرض اولین بنتا ہے کہ ادب میں جمالیاتی پہلوؤں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد سے کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے سیکولر اقدار کی غمازی پر زور دیں تاکہ قاری کا ذہن کچھ بصیرت افروز ہو — دعا گو ہوں کہ آپ اور ادارۂ سہیل

کے ارکان اور ان کے اقارب سبھی بخیر ہوں۔

● پروفیسر آر۔ پی۔ شوق، ہریانہ

○ سہیل کا شمارہ ۱۰ نظر نواز ہوا۔ نمود کے تحت "اردو یونیورسٹی کا استقبال" یقیناً تمام اردو دوست کے لئے پیغام مسرت ہے۔ لیکن اب جبکہ وراثت میں چھوڑی ہوئی عبادت گاہوں کی خیر نہیں پھر کس امید سے اعتماد پر کسی تعمیری کام کی توقع کی جائے چلئے ایک خواب اور سہی۔

"پریم چند۔ حیات اور فن" کا یہ قسط بڑی جامعیت اور جاذبیت کا مظہر ہے۔ بے شک پریم چند کی شخصیت اور ان کا فن ہندوستان کی ادبی، تہذیبی، اور ثقافتی تاریخ میں نہ صرف قابل مستحسن ہے بلکہ موجودہ صورت حال کے لئے مشعل راہ اور مقام عبرت بھی ہے۔

ڈاکٹر سید حامد حسن کا مضمون متعلقہ مجموعے کی فنی عظمت کی نشاندہی تو کراتا ہے لیکن تخلیقی تشکیل کے عنوان کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر پاتا۔ البتہ مضمون نگار اگر مجموعہ "آخری شب" اور "آوارہ سجدے" پر تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے تو کچھ نئی بات ضرور فراہم ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ایک ایسے شاعر پر مضمون نگار نے قلم اٹھایا ہے جس کے رگ رگ میں عالم انسانیت کا درد انگڑائی لے رہا ہے۔

سیدھے سادے پلاٹ پر مبنی افسانہ "کرم جلی" پسند آیا۔ غزلوں میں فضا ابن فیضی اور کرشن پرویز کی پہلی، تیسری اور آخری غزل بہت اچھی لگی۔ واقعی کرشن پرویز کی غزلوں میں آہنگ اور تقاضا آج کا ہے لیکن تہ تہ ۔ اور تو لمحوں ماضی کا ہے۔

تمام قارئین کو نئے سال کی مبارکباد پیش خدمت ہے۔

● مسحور قیصر، مونگیر

○ سہیل کا مطالعہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔ گیا کی سرزمین پر ایک مستند ادبی رسالہ کی متوازن آبیاری بلاشک آپ جیسے کرم فرماؤں کی ذات بابرکات سے ہی متوقع ہے۔ سہیل کی دن دونی رات چوگنی ترقی کا خواہاں ہوں۔ ماہنامہ سہیل کی مقبولیت اردو ادب کے لئے خوش آئند علامت ہے۔

خدائے دوجہاں آپ کو اپنی محافظت میں رکھے۔ آمین
سال نو کی مبارکباد قبول فرمائیں۔

نسیم عزیزی، ہوڑہ

○ واپسی ڈاک سے اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں۔ یہاں کرفیو اب بھی جاری ہے۔ تادم تحریر ہم لوگ زندہ ہیں۔ ذہنی بگاڑ اور سیاسی اچھالیں شباب پر ہیں۔ دعا کیجئے موسم بدل جائے۔ اس گلابی موسم میں نفرت کی بدبوئیں سونگھنے کو مل رہی ہیں۔ ہمارے یہاں لوگوں کا پیٹ بھرا ہے اس لئے انہیں روٹی کے بجائے مندر اور مسجد کی فکر ہے۔ دل ٹوٹنے کوئی بات نہیں۔

● گوہر شیخپوروی، بنارس

○ تازہ شمارہ دستیاب ہوا
آپ کی ادارتی تحریر "اردو یونیورسٹی کا استقبال" سے اتفاق کرتے ہوئے دل سے اس کی تائید و حمایت کرتا ہوں۔

● خالد عبادی، دربھنگہ

سہیل کے ایک اہم شمارے کا

اعلان

ماہنامہ سہیل "فن اور فنکار" کے نام سے ایک عام شمارہ کچھ خصوصیت کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ تمام ادبی حلقے اس بات کے معترف ہیں کہ سہیل نے اب تک متعدد فن کاروں کو متعارف کیا ہے ــ ایسے تخلیق کاروں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے جنہوں نے اہمیت اور بڑائی کا تمغہ حاصل کر لیا ہے ــ اور ایسے افراد کو بھی آگے بڑھایا ہے جن کی تخلیقی جودت تابناک مستقبل کی پہچان دیتی رہی ہے۔

ادھر کچھ عرصے میں متعدد فن کاروں کی کاوشوں پر شخصی، تاثراتی اور تجزیاتی مقالات کی ایک ضخیم فائل دفتر میں تیار ہو گئی ہے۔ چونکہ عملاً تمام شخصی مقالات کی اشاعت ممکن نہیں اور پھر یہ کہ حصول شہرت کی دوڑ میں اس امر کا بھی گمان ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں اپنے محدود تجرباتی لمحوں میں بھی زیادہ سے زیادہ نام کمانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے ایسے بہت سے شخصی مقالات روک رکھے ہیں۔ تاہم ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں جنہیں حقیقتاً شائع ہونا چاہئے۔

ہم ایسے ہی مقالات سے انتخاب کر کے "فن اور فنکار" کی ایک خصوصی اشاعت کا نظم کیا ہے۔ ان مقالات سے جہاں تخلیق کاروں کے فکر و نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور ادب و شعر کی سمت و رفتار متعین ہوتی ہے وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان فن کاروں پر قلم اٹھانے والے لوگوں میں ان کے مطالعے اور تاثر کے

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمن بسمل شنہاروی (مرحوم) بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس شنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

شمارہ ۲ جلد ۵۳

بدل اشتراک
• فی شمارہ ...... ۵ر روپے
• سالانہ ...... ۵۰ر روپے
• لائف ممبری ...... ۱۰۰۰ر روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا
فون نمبر :- ۲۱۵۷۳

انکم ٹیکس سے بچنے کے آسان طریقے

نیشنل سیونگ سرٹیفیکٹ/آٹھویں نگم

مولئے ورگ :- سبھی ڈاک گھروں میں 500/1000/ اور 10000/ روپے کی دستیابی
سود دَر :- بارہ فی صد سالانہ در سے چکرورد ھی سود پر چھ ماہی کے حساب سے پری پکوتا پر دیتا ہے
ٹیکس راحت :- ان کی لگائی گئی رقم پر انکم ٹیکس قانون کے دفعہ 88 کے تحت چھوٹ۔ سالانہ راجیت سود جو کہ پوری نیوشٹ سمجھا جاتا ہے بھی انکم ٹیکس قانون کی دفعہ 88 میں چھوٹ کے قابل ہے

نیشنل سیونگ اسکیم - 1987

نیولیش :- سبھی اہم اور چنے ڈاک گھروں میں کم از کم 100/ روپے سے کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔
ایک مالی سال میں زیادہ سے زیادہ 40,000 روپے نیولیش کر سکتے ہیں۔
سود :- گیارہ فی صد پر سال دستیاب ہے

پندرہ سال بھوشیہ نیدھی کھاتہ

نیولیش :- کم از کم 100/ روپے سے کھاتا کھولا جا سکتا ہے۔ ایک مالی سال میں زیادہ سے زیادہ 60,000 ہزار روپے نیولیش کر سکتے ہیں۔
سود :- بارہ فی صد پر سال کمپاؤنڈ
ٹیکس راحت :- انکم ٹیکس قانون کے دفعہ 88 کے تحت چھوٹ دستیاب ہے۔ کورٹ انچمنٹ سے بری
نکاسی :- چھ سالوں کے بعد نکاسی کر سکتے ہیں۔ تین سال کے بعد قرض لینے کی سہولت

دستخط :- ارون جھا، ڈائریکٹر
نیشنل سیونگ، فینانس ڈیپارٹمنٹ، بہار، پٹنہ

P.R. 215 21(24-122) 92-93

غود

نازک مرحلہ

کلوچیوسکی (KLYUCHEVSKY) نے روس کی زارشاہی حکومت کا نقشہ یوں کھینچا تھا کہ "حکومت پھول رہی تھی اور عوام پچک رہے تھے" آج ہندوستان کی صورت حال یہ ہے کہ عوام تو پچک رہے ہیں مگر خود حکومت کے پھولنے کے آثار بھی نہیں ہیں۔ اِدھر ہمارے ملک کے عوام پے در پے جن مسائل اور مصائب سے دوچار ہیں ان سے برسر اقتدار جماعت بھی اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتی۔ اب عالم یہ ہے کہ اقتدار کی ساری مشنری پر حکومت کی گرفت ڈھیلی ہوتی جاتی ہے۔ ہر چیز قابو سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ، آئین و دستور —— ہر جزو میں کمزوری کے آثار ہویدا ہیں اور اگر جلد ہی مضبوط ارادوں کے ساتھ ان کی شیرازہ بندی نہ کی گئی تو پھر ہمارا حال کیا ہوگا یہ کہنا مشکل ہے۔

اتنی بات تو طے ہے کہ ہندوستان کا تحفظ اور اس کی سالمیت سیکولرزم کے اصول میں مضمر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مختلف نظریاتی اور مسلکی طبقوں کی بقا کا نظم کیا گیا ہے۔ یہ ملک متعدد اقلیتوں کے خوش گوار رابطے کی ضمانت دیتا ہے اس لئے کہ اقلیتوں کی مجموعی تعداد اکثریت سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ اقلیتیں زبان، مذہب، کلچر، اقتصادی درجوں اور ذات پات کے عوامل سے متشکل ہوتی گئیں۔ یہ اس قدر متفرق متعدد ہیں کہ یہاں کسی ایک طبقہ کو اکثریت کے دعویٰ کا موقع نہیں ہے۔

ہمارے آئین میں [illegible] ایسی لچک رکھی گئی ہے جہاں کسی ایک طبقہ کی شدت اور اجارہ داری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ماضی قریب میں کانگریس نے

اپنی اصولوں پر عمل کر متوازن حکومت کی بنیاد ڈالی تھی ۔ لیکن جیسے جیسے کانگریس کے صاحبان اقتدار اور پارٹی کے نظریہ ساز حضرات ان اصولوں کو ترک کرتے جاتے ہیں ملک عوام اور خود کانگریس کے لئے مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

حالیہ واقعات کانگریس کے لئے تنبیہ کا کام کر رہے ہیں۔ اصولوں سے منحرف ہوتی ہوئی کانگریس پارٹی نے اگر پھر جلد ہی مراجعت نہ کی اور ہندوستان جیسے کثیر آبادی والے ملک میں عوام کے بنیادی مسائل سے دلچسپی کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس نے اگر لوگوں کی وقتی اور مختصر سیاست سے اپنے آپ کو الگ نہ کیا اور فسطائی، جمہوریت دشمن اور ملک کے لئے تخریبی کام کرنے والے نظریات اور جماعتوں سے تمام تر اصولی اعتماد کے ساتھ مقابلہ نہ کیا تو پھر اس جماعت کے نیست و نابود ہونے اور ملک کو پائمال ہونے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

برسراقتدار کانگریس جماعت کی نظر شاید ان سازشوں تک بھی نہیں پہنچ پا رہی ہے جو بیرون ملک چل رہی ہیں۔ اور جن کے ایجنٹ اس ملک میں اودھم مچانے کے در پے ہیں۔

اس نازک مرحلے میں عالمی طاقتوں میں سے دوست نما دشمنوں سے بھی ہمیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

(مسعود منظر)

اصغر علی انجینئر

پریم چند ــ حیات اور فن

قسط ۱۲

انجمن ترقی پسند مصنفین میں پریم چند کا خطبۂ صدارت

۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد کی اور پریم چند سے اس کی صدارت کی درخواست کی۔ پریم چند نے بخوشی صدارت قبول کی اور اپنا تاریخی صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس کے چند مہینوں کے بعد ہی پریم چند کا انتقال ہو گیا اس لئے یہ خطبہ ان کے آخری دنوں کی یاد ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ آنے والی نسل کے کئی ادیبوں کے لئے یہ مشعل راہ بنا اور اس لئے بھی کہ اس میں ادب اور ادیب کے متعلق پریم چند کے پختہ خیالات کا اظہار ہے، وہ خیالات جن پر عمر کے اس آخری دور میں ان کو پورا یقین تھا۔ ادب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

" ادب کی بہت سے تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہئے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانۂ عجائب کی داستان تھی۔ کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلا کا تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی

دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا۔ اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انہیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش یا نئی تشبیہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔

اس دور کے ادب برائے ادب کی اس طرح تنقید کرنے کے بعد پریم چند ادب اور زندگی کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانے میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوہ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی۔ اور اس نے درجات عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

ادب کے فنکشن پر روشنی ڈالتے ہوئے پریم چند اپنے اس خطبے میں بڑی اہم بات کہتے ہیں۔

"اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمے لی ہے اور اس کا آلہ کار ذوق حسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوق حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ کون ادیب نہیں جس میں یہ احساس نہیں کر۔ ادیب میں جتنا یہ احساس جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے ذریعے اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے انسانیت سے خالی ہے وہ اس کے لئے ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ بزرہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے یوں کہئے وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علم بردار ہے، جو پامال ہیں مظلوم ہیں محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور عدالت اس کے احساس حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کر کے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے مگر عام وکیل کی طرح وہ اپنے موکل کی جانب سے جا و بے جا دعوے پیش نہیں کرتا مبالغے سے کام نہیں لیتا۔ اختراع نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔"

ادیب کو اس کے فرائض منصبی یاد دلا کر پریم چند حسن اور اس کے بدلتے ہوئے معیار سے بحث کرتے ہیں۔ کیونکہ حسن کاری ہر ادیب کا بنیادی عمل ہے۔ حسن کاری اور جذبات کی تہذیب یہ اس کے بنیادی فرائض میں شامل ہے لیکن حسن کا معیار بھی طبقاتی عصبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے حسن کے تصور سے بحث کرنا ایک ترقی پسند ادیب کے لئے بے حد ضروری ہے۔ پریم چند اس سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے۔ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے کیوں کہ حسن کے متعلق ہم کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع اور غروب

دیکھا ہے۔ شفق کی سرخی دیکھی ہے۔ خوشنما اور خوشبودار
پھول دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں ہماری روح کیوں کھل
اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے۔
سنگیت دل کشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر
کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ انہی کیفیات
اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی
توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق
کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی
اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو نما کرتی ہے۔
جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے۔ زندگی ہے جہاں
ان کا فقدان ہے، وہیں افتراق، خود پروری ہے اور نفرت
اور دشمنی ہے اور موت ہے یہ افتراق غیر فطری زندگی
کی عکاسی ہیں۔"

وہ آرٹ کی افادیت کا کھلم کھلا اعلان کرتے
ہیں اور اس میں پریم چند کو قطعاً کوئی تامل نہیں۔

"مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں
کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں۔
بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے
اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی
ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو افادی پہلو نہ
رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شئے ہے اور ایک ہی
چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار مسرت بھی ہے اور غم
بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوشنما
نظارہ ہے۔ لیکن اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا
جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیوں
کہ وہ اکال کا [illegible]۔ اس وقت تو ہم آسمان پر
کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں
کو دیکھ کر ہم اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید
ہوتی ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اس لئے ہماری مسرت کا باعث
ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے۔"

لیکن پریم چند حسن کے معیار کو اضافی قرار دیتے ہوئے
اسے بدلنے پر زور دیتے ہیں۔

"ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا
معیار امیرانہ اور عیش پروانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن
سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انھیں کی قدردانی پر اس کی ہستی
قائم تھی۔ اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں
چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس
کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے
اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت
کے دامن سے خارج سمجھتا تھا اگر وہ کبھی ان کا ذکر بھی کرتا
تھا تو مضحکہ اڑانے کے لئے۔ اس کی دیہقانی وضع اور معاشرت
پر ہنسنے کے لئے۔۔۔ اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی
کہ وہ کشمکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فاقہ اور
عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے۔ اسے وہ شاید تسلیم
نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن حسین عورت میں ہے، غریب
بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی منڈیر پر سلائے
پسینہ بہا رہی ہے۔۔۔۔ لیکن یہ اس کی تنگ نظری کا قصور
ہے۔ اگر اس کی نگاہ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے
گا کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں ایثار، اور عقیدت
اور مشکل پسندی ہے۔"

پریم چند اپنے خطبے میں ادب کے ایک اور اہم پہلو
کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ادب طبقاتی ترقی پسند ہوتا
ہے۔ اور سماج میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے

"ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں

ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو وہ شاید ادیب نہ ہوتا۔ وہ آئیڈیلیسٹ ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔ وہ اپنی تخئیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کے جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اسے نظر نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ اور ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا جینے اور مرنے کے لئے بہتر جگہ ہو جائے یہی درد اور یہی جذبہ اس کے دل و دماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے۔ اس کا احساس دل یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک جماعت کیوں معاشرت و رسوم کی قیود میں پڑ کر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیا کئے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند ادب میں کمٹ منٹ کے قائل تھے اور وہ ادب کو ایک بہتر اور مبنی بر انصاف معاشرہ وجود میں لانے کا احساس دلانے کے لئے استعمال کرنا نہ صرف جائز تصور کرتے ہیں بلکہ ایسا کرنا نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنے خطبے کے آخری پیراگراف میں صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیتے ہیں

"بہرحال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اس وقت تک ادیب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے۔ مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا۔ جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ پیدا کرے، سلائے نہیں، کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

ان کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پریم چند ادب میں محض رومانویت کے قائل نہ تھے۔ نہ ہی وہ ادب کو سستی تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ادب وہی زندہ ادب کہلائے گا جو ہمارے اندر عمل کی روح پھونکے۔ آزادی کا جذبہ بیدار کرے۔ لیکن پریم چند کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ محض نعرے بازی سے ادب میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ حسن کاری ادب کا اتنا ہی بنیادی فریضہ ہے۔ جتنا کہ عمل کی تحریک دینا۔ صحیح ذوق حسن کے بغیر یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اس خطبۂ صدارت میں پریم چند نے ترقی پسند ادب کا ایک واضح تصور دیا ہے۔ ایک ایسا تصور جو آج بھی بے انصافیوں، مظالموں اور استحصال کے خلاف جدوجہد میں مصروف ادیبوں کے لئے لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ ایسا تصور جو ہمیں ادب کو محض تفریح یا سماج سے کٹے ہوئے فرد کی داخلی فریاد بنانے سے بچاتا ہے۔

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط ۱۲

(ی) انجم مانپوری۔

انجم صاحب مرحوم عالم دین بھی تھے۔ ادیب اور شاعر بھی۔ طنزیات مانپوری نے اس کو شہرت دوام بخشی۔ اور کوئی انشائیہ کسی کو یاد نہ ہو مگر "میر کلو کی گواہی" کو یاد نہ رکھنے والا اپنے کم علمی کا خود معلق ہوگا۔ لطیف ظرافت صرف لکھنے کی ہی حد تک محدود نہ تھی۔ بلکہ روزمرہ گفتگو میں بھی ظرافت کا دامن مرحوم نے کبھی نہ چھوڑا۔ ایک بار گفتگو میں کولرا (COLERA) اور پلیگ (PLAGUE) کی بات چل نکلی تو فرمایا کہ دونوں میں بڑا فرق ہے کولرا میں تو مریض مر جاتا ہے مگر پلیگ میں تو بچتا ہی نہیں۔ ایک مرتبہ تو حاضرین نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔ مگر ایک لمحہ بعد جب احساس ہوا تو اپنی بیوقوفی پر سب ہنس پڑے۔ مگر مرحوم ویسے ہی سنجیدہ رہے۔ آواز بھی اللہ کے فضل سے ایسی تھی کہ اب تک ویسا لب ولہجہ سننے میں نہیں آیا۔ آپ اگر ملنے گئے اور وہ کمرے میں کسی سے مشغول گفتگو ہیں تو آپ یہ سمجھے کہ شاید مانپوری صاحب کسی پر سخت ناراض ہیں اور اسے ڈانٹ رہے ہیں۔ حالانکہ گفتگو کا انداز ہی ویسا تھا۔ آپ نے وہ نظم بھی پڑھی ہوگی جو "ٹم ٹم" پر لکھی گئی اور اکبر الہ آبادی نے پالکی پر جو لمبی نظم لکھی اس طرز پر لکھی گئی نظم بھی خوب تھی: "وہ ٹم ٹم کو جھکولے جھلاتا ہچکولے اچھالتا وہ ڈم ڈم سیر کرتا ہوا۔

اس کے علاوہ بھی تضمین اس حسن سے کرتے تھے کہ آپ ششدر رہ جائیں۔ ایک مصرعہ طرح پر گرہ یوں لگائی "آنکھوں میں یوں بھرو کہ مژہ کو خبر نہ ہو" فرماتے ہیں۔

ہے آبدست کے لئے حاضر یہ چشم تر
آنکھوں میں یوں بھرو کہ مژہ کو خبر نہ ہو

آپ خود اندازہ کرلیں کہ مرحوم میں کتنی ذہانت تھی۔ کسی لفظ سے دوسرا معنی بھی نکل سکتا ہے۔ یہ کوئی شخص غور وفکر کرکے جہاں پہونچے وہ فوراً وہاں پہنچ جاتے۔ ایک شعر اور سنئے۔

عیاش رئیسوں سے نہیں ملنے کا کچھ بھی
اب ان کے منی بیگ میں رکھا ہوا کیا ہے

شریح کی ضرورت نہیں آپ اس شعر کو پڑھئے اور لطف اٹھایئے۔ "ندیم" کے سرورق پر آپ کا قطعہ خوب تھا۔

عشرت کدہ نہ قصر معلٰی بنائیے
اک کنج عافیت لب دریا بنائیے
گھبرا اے دل تو مونس تنہائی ہو ندیم
چھوٹی سی اک سکون کی دنیا بنائیے

کیسے کیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں پھر راہی ملک عدم ہو جاتے ہیں۔ ایک جاتا ہے دوسرا آ کے دنیا آباد کرتا ہے پھر وہ بھی چلا جاتا ہے۔ اس مضمون پر دو اشعار یاد آ گئے ایک تو آپ کو بھی ضرور یاد ہوگا دوسرا شاید نہ ہو۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز کس کی ہے
ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

دوسرا شعر بھی دیکھئے شاید پسند آئے۔

کیا خبر کس کے لئے ہے یہ طلسم رنگ و بو
باغ میں کھلنا بھی ہے کلیوں کو مرجھانا بھی ہے

(ک ے)

گیا سے نومبر ۱۹۴۷ء میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ کچھ بہاری کچھ غیر بہاریوں سے تعارف ہوا۔ ان میں کوآت (سہسرام) کے حسین الدین احمد خاں۔ آپ ٹیکسٹائل کمشنر کے دفتر میں انسپکٹر تھے۔ ایک مزل خورشید جو کلکتہ میں فضلی صاحب کی فلم کے ہیرو رہ چکے تھے۔ ایک زین شمسی صاحب (دراصل شمسوں سے ملانے والے موخر الذکر تھے) یہ کاکو کے فخر الدین شمسی صاحب رئیس کے صاحبزادے تھے۔ پتہ نہیں عمر کی وجہ سے اگر کچھ غلطی ہو گئی ہو تو قارئین معاف کریں گے اور جو تھے فقیر حبیب تنویر تھے۔ جو اپٹا (IPTA) سے منسلک تھے۔ شاعر کوئی نہیں۔ پھر جدن بائی مرحومہ کے گھر آنا جانا تو تھا ہی اکثر ان کے دفتر (فلمیں بنانے کے سلسلے میں ضروری جزو) جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ چونکہ عنقریب فلمی کیڑہ مجھے اپنی خوراک بنانے والا تھا۔ وہاں ایک شاعر سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کی شہرت اور آپ کی آواز اور لحن کا چرچہ علیگڈھ میں پڑھنے والوں سے بالعموم اور اپنے بھانجوں سے بالخصوص سنتا چلا آیا تھا۔ اور غالباً ۴۶ - ۴۷ء میں ایک مخمس بھی پڑھی تھی۔ یہ دہلی کے ماہنامہ (غالباً "ایشیا") میں چھپی تھی شاید ایڈیٹر جوش ملیح آبادی تھے۔ اس کا ایک مصرعہ یاد ہے کہ "نظر اٹھا کہ خود اپنا جواب ہیں آنکھیں" قوافی کچھ "حساب میں آنکھیں۔ شراب میں آنکھیں" یا پہیلیوں کی طلسمی کتاب ہیں آنکھیں" ایک نظم کی تعریف شُنی تھی: "او پانی کے باسی۔ قارئین سمجھ گئے ہوں گے یہ تمہید تھی جناب محمد یار خان ساغر مرحوم کی۔ نہایت جاذب نظر شخصیت کے مالک۔ ظاہر ہے کہ نوجوانی میں جب ترنم سے اپنی نظمیں یا غزلیں پڑھتے ہوں گے تو صنف نازک میں مقبولیت میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ یوسف زئی آفغان تھے اور اس پر ناز بھی تھا۔ واقعی پٹھان تھے۔ ایک بار نرگس آرٹ کنسرن (NARGIS ART CONCERN) کے دفتر میں (یہ بھی فینیس مہالکشمی کی وسیع عمارت میں تھا) اختر صاحب مجروح سلطانپوری۔ شوکت ہاشمی (یہ نرگس آرٹ کے لئے ایک سہ ماہی پرچہ نکالتے تھے۔ اور پبلسٹی کا کام بھی دیکھتے تھے) وغیرہ بیٹھے تھے کہ ساغر صاحب تشریف لائے۔ مجروح صاحب سے طالب ہوئے کہ جب وہ دفتر میں داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کیوں نہ کیا۔ مجروح نے

کہا کہ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ داخل ہونے والا حاضرین
جلسہ کو سلام علیک کہے۔ یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔
جب زچ ہوگئے تو بولے کہ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں بغرض
قائل نہ ہوئے۔ استادی اور شاگردی کے قائل نہ تھے۔
مگر اعتراف کرتے تھے کہ شروع میں سیماب اکبرآبادی
سے اصلاح لیتے رہے تھے ایک شعر جناب کا کافی مشہور
ہوا تھا۔

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

مجھے ان کے کلام میں کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں دکھائی
دیتی ہے۔ کثیر تعداد ایسے غزل گویوں کی ہے جو زیادہ وقت
مشق فن میں گزار دیتے ہیں۔ مگر ڈھنگ کا ایک شعر بھی دیوان
میں نہیں ملتا۔ اور غزل بدنام ہوتی ہے۔ نمونہ کے لئے کچھ
اشعار دو غزلوں سے پیش کر رہا ہوں۔

ہجوم خیالات ہے اور کیا ہے
وہی بار آفات ہے اور کیا ہے
وہی ہم ہیں اور آرزوئے تلاطم
وہی شور جذبات ہے اور کیا ہے
فغاں شب۔ نغمۂ صبح گاہی
فریب مناجات ہے اور کیا ہے
جنون محبت جنون محبت
جنون روایات ہے اور کیا ہے
مرے من کی دنیا مرے تن کی دنیا
جہان طلسمات ہے اور کیا ہے
ہے ساغر کو لٹنے خواہش ابھی تک
بہ سحر خرابات ہے اور کیا ہے

تغزل کو چھوڑیئے ایک شعر بھی ڈھنگ کا نہیں۔ قافیہ پیمائی
وہ بھی ایسی نہیں کہ قاری پھڑک جائے۔ حالانکہ یہ لکھنؤ
اسکول کے شاعر نہ تھے۔ مگر جوش ملیح آبادی کی طرح
لفظوں سے کھیلنا جانتے تھے۔ جوش کا کلام پڑھنے
سے یہ معلوم ہوتا ہے الفاظ دست وبستہ حاضر خدمت
رہتے ہیں کہ کچھ پر توجہ ہو جائے۔ غزل ہما کو کوششوں
میں اگر تغزل کا نہ سہی مگر شعر ایسا ہو کہ یاد رہے۔
بہ قول حسرت موہانی

شعر دراصل وہی ہیں حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

اس غزل کا مطالعہ کیجئے۔ صرف قافیہ پیمائی ہے۔ دوسرے
شعر میں لفظ تلاطم ہے اس کی کیا رعایت رکھی۔ کچھ
بھی نہیں۔ مشہور ہے کہ آتش مصحفی کے پاس گئے۔
اور بولے استاد ایک شعر ایسا کہا ہے کہ آپ بھی لاکھ
کوشش کرنے پر اس کو بہتر طریقہ سے نہیں کہہ سکتے۔
مصحفی نے کہا سناؤ بھی۔ اچھا شعر ہوگا تو بے ضرورت
کیوں مشورہ دوں گا۔ آتش نے یہ شعر پڑھا۔

فصل گل میں مجھے کہتا ہے گلستاں سے نکل
ایسی بے پر کی اڑاتا نہ تھا صیاد کبھی

مصحفی بولے کہ "بے پر کی" محاورہ ہے مگر ثابت کرو
یوں کہو۔

پر کتر کر مجھے کہتا ہے گلستاں سے نکل
ایسی بے پر کی اڑاتا نہ تھا صیاد کبھی

اب بات محاورہ کے استعمال کی نکل آئی ہے تو ایک اور
دلچسپ شعر سنئے۔ غالب کا ایک مشہور اور
اچھا شعر ہے"

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

غالب نے "بے خبر گرم" استعمال کیا یہ محاورہ ہے۔ مگر
اس کو ثابت نہ کر سکے۔
لگے ہاتھوں میر تقی میر کا شعر ملاحظہ ہو

تیز یوں ہی نہ تھی کچھ آتش شوق
تھی خبر گرم ان کے آنے کی

یہاں محاورہ کو کیسی جلادی ہے قاری خود محسوس کریں
گے۔ ایک دوسری غزل دیکھئے۔

تو نہیں بہار کا راز داں تجھے کب وقوف بہار ہے
جسے تجھ رہا ہے شمیم تو وہ چمن کا گرد و غبار ہے
یہ خرام ان کا چمن چمن یہ شمیم ان کا سمن سمن
یہ سکوت ان کا روش روش کہ بہار محو بہار ہے
وہ ملاحتیں وہ صباحتیں وہ لطافتیں وہ نزاکتیں
وہ نظر میں جب سے سمائے ہیں مجھے آنکھ اٹھانا بھی بار ہے
تو ہے جانِ گل، تو میانِ گل، تو مکینِ گل، تو مکانِ گل
ترے دم قدم سے ہے گلستاں ترے دم قدم سے بہار ہے

جوش کی تقلید کی ناکام (بھونڈی) کوشش ظاہر ہے۔ ایک
شعر یاد آگیا۔ غزل کا شعر نہ سہی مگر شاعر کی قدرت فکر
عیاں ہے۔ سننے کے بعد قاری شاعر کی صلاحیت کا
معترف ضرور ہوگا۔ وہ شعر سنئے:۔

گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ ابھرے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

خوب ہے پر یہ شعر اچھا خاصا ہے۔ بند پانی میں بہہ جانا ناممکن
بات ہے مگر واقعات کی روشنی میں صحیح ہے۔ اور پھر پہلے
مصرعہ میں گلاسوں میں جو ڈوبے۔ شعر کی تزئین میں اضافہ
ہے۔ اس پر ریاض خیرآبادی کے دو شعر سُن لیجئے۔ آپ
سے یہ اشعار خود داد حاصل کریں گے۔ عطر است کہ خود
ببوید۔ نہ کہ عطار گوید۔ تو شعر سُنئے

اک ہمیں ہیں کہ بہک جاتے ہیں توبہ کی طرف
ورنہ رندوں میں برا چال چلن کس کا ہے

دُشنام مئے فروش کہاں اور ہم کہاں
سُن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا

دل، بہزاد لکھنوی

بہزاد لکھنوی سے کبھی ملاقات ممبئی میں ہوئی مگر ان
کا ذکر اکثر علیگڈھ کے عزیزاں سے سُنا تھا۔ ان کی ایک
نظم نوجوان دل و دماغ پر چھا گئی تھی اس کے اشعار تو
یاد نہیں۔ چاندنی رات اور معشوق کا ذکر۔ نوجوانوں کے
لئے کافی دلبستگی کے سامان تھے۔ لیجئے دو اشعار یاد آگئے

خدا شاہد ہے جس دن چودھویں کی رات ہوتی تھی
ہماری زندگانی میں نئی اک بات ہوتی تھی
کہ وہ مستِ شباب آتا تھا بکھرائے نقاب اپنی
زمانے بھر پہ پھیلاتا تھا تنویر شباب اپنی
میں اس کو دیکھ کر سارا زمانہ بھول جاتا تھا
زمانہ کیسا خود اپنا فسانہ بھول جاتا تھا

وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ پھر آل انڈیا ریڈیو پر اکثر نعتیں پڑھتے
تھے۔ ترنم بے حد دلکش تھا ایک غزل اور مشہور تھی جو
اکثر لوگوں سے سُن رکھی تھی

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے
اے دل کی لگی چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے

آواز اچھی اور پھر ترنم سے یہ غزل نوجوانی کے خون کو گرم کر دینے میں کافی مددگار ہوگی۔

بہزاد صاحب مجھ سے ملنے شاطو ونڈسر (CHAT-EAO WINDSOR) یعنی میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ فرمائش یہ تھی کہ اپنی پہلی فلم کھیل کے لئے ان سے گانے لکھواؤں۔ شاعر جیسے بھی ہوں مجھے دلکش اللسان معلوم ہوئے معصوم طبع۔ دیکھنے میں جگر صاحب سے مشابہت۔ ویسی ہی کشمیری (یا جناح) کیپ۔ مگر گلے میں کفنی۔ جس کے بغیر ان کی شخصیت ادھوری تھی۔ نہایت خلیق منکسر المزاج۔ لفٹ سے خائف۔ ایک سو بیس سیڑھیاں چڑھ کر آتے۔ ظاہر ہے کہ بغیر رکے ہوئے ایک ہی مرتبہ یہ مہم سر کرنے میں سانس برقرار نہ رہتا۔ جیسے ہی وہ نشست کے کمرے میں داخل ہوتے میں ہاتھ سے اشارہ کر دیتا کہ سونے کے کمرے میں چلے جائیں وہاں پندرہ بیس منٹ مسہری پر آرام کرتے پھر آکر بیٹھتے۔ کہتے نواب میاں میں کیا بتاؤں اس پنجرے (لفٹ) میں داخل ہونے کے خیال سے دل لرز جاتا ہے۔ گانا وغیرہ خیر لکھنا ایک تجارتی معاملہ تھا۔ ویسے ساغر صاحب بھی دو گانے کھیل کے لئے لکھے۔ بہزاد صاحب تعلقات کی بنا پر مُصر ہو سکتے تھے کہ سارے گانے ان سے لکھوا جائیں مگر کبھی ایسی بات نہ کی۔ خود دار اور غیور شخص تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ اکثر و بیشتر آجاتے یہ ان کی محبت تھی۔

منصور اعجاز

— ایوت محل —

(۱) جس بستی میں رہتا ہوں
اس بستی کے سارے لوگ
اندھے بہرے ہیں
گونگے ہیں سب —
رفتہ رفتہ میں نے اپنی
گویائی بھی کھو دی ہے

صورتیں سب کی، ایک جیسی ہیں
لذت و ذائقے بھی ایک سے ہیں
جینے مرنے کے سلسلے بھی وہی
درد و غم، بھوک پیاس اک جیسی
فرد سے فرد پھر جدا کیسے ؟
تیرے ہمراہ میں نہیں تو پھر . . .
کس لئے غمزدہ ہے ؟
کیوں افسوس ؟؟
زندگی پھر بھی تیز گام تو ہے !

(۲) زمانے بھر کے درد و غم سے مجھ کو
پیار ہے لیکن —
مجھے نفرت ہے ان سے
جو،
ہر اک ظالم کو حاکم
ظلم کو قسمت سمجھ کر
صبر کو تقدیر کہہ کر
باحوصلہ اقوام کی
تذلیل کرتے ہیں

روح کا زندان

دھیرے دھیرے
اک اک کر کے
سب گرہیں کھل جائیں گی
رہ جائے گا دانا پانی
پھر سے چڑیا اڑ جائے گی

قطعات

اس حقیقت کا یقیں دل کو دلائیں کیوں کر
اپنی تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم
طاقِ نسیاں پہ رکھی ایک کتابِ زریں
وقت کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار ہیں ہم

٭

رونقِ بزمِ جہاں ہم بھی کبھی تھے لیکن
آج سرگرداں ہیں، رسوا ہیں، بہت خوار ہیں ہم
خوابِ غفلت میں پڑے سوتے ہیں دن رات مگر
پھر بھی ہوتا ہے گماں ان کو کہ بیدار ہیں ہم

٭

ظلمتِ شب کے لئے مطلعِ انوارِ سحر
قصرِ باطل پہ جو چمکی تھی وہ تلوار ہیں ہم
جانچ لو، تول لو ماضی کی ترازو میں ہمیں
وارثِ شیرِ خدا، جعفرِ طیارؓ ہیں ہم

غزل

جب سے کیا ہے تجھ کو جدا اپنے آپ سے
لگتا ہے جیسے میں ہوں خفا اپنے آپ سے
یوں مدتوں ہی دور رہا اپنے آپ سے
تجھ سے ملا تو گویا ملا اپنے آپ سے
اے دوست انقلابِ زمانہ تو دیکھئے
ملتا ہوں اجنبی سا سدا اپنے آپ سے
اس نے ضمیر کی کبھی باتیں سنی نہیں
کس درجہ تھا وہ خوفزدہ اپنے آپ سے
اوروں سے کوئی شکوہ نہ دنیا سے کوئی بیر
کچھ ہے اگر تو مجھ کو گلہ اپنے آپ سے
وہ مجھ میں تھا میں ڈھونڈ رہا تھا اسے کہاں
صد حیف! کیوں میں دور رہا اپنے آپ سے
کیا جانے کب ہو کون خطا کیسی بھول ہو
ڈرتا ہوں میں تو ضیا اپنے آپ سے

ڈاکٹر سیّد مُظفر عالم ضیا عظیم آبادی

غزلیں

شرون کمار ورما

ہر شے پہ ہر ایک شخص کو بیمار دیکھنا
اک دن تو لے مرے گا یہ آزار دیکھنا

وہ وار بھی کریں گے تو چھپ کے پیٹھ پر
ہے دوستوں کے ہاتھ میں تلوار دیکھنا

خوش فہمیوں سے دل کو سنبھالو گے کب تلک
اک روز گر پڑے گی یہ دیوار دیکھنا

یہ روشنی سی کیا ہے اندھیروں کے آس پاس
یہ کون آگیا ہے سرِ دار دیکھنا

اپنی تو دوستو یہی عادت خراب ہے
نفرت میں پیار، بغض میں ایثار دیکھنا

تہذیب نو کا یہ بھی تقاضا ہے آج کل
ہر صبح ساتھ چائے کے اخبار دیکھنا

پیار کی راہوں میں آخر امتحاں تو آئے گا
جسم کا پتھر ہمارے درمیاں تو آئے گا

آگ پھیلی گی تو کچھ کڑواہٹیں دے جائے گی
گھر کو شعلوں سے بچا لوگے، دھواں تو آئے گا

موسم گل کی عجب یہ شرط ہے، رنگِ چمن
جب اڑا لے جائے گی بادِ خزاں، تو آئے گا

زندگی کے راستوں پر دھوپ کی یلغار ہے
ہم نے سوچا تھا کہیں اک سائباں تو آئے گا

توڑنا دشوار ہوگا رشتۂ قلب و نظر
تم کہیں بھی جاؤ یہ کوہِ گراں تو آئے گا

شاخ بالا پر بسیرا کرنے والے سوچ لے
آندھیوں کی زد میں تیرا آشیاں تو آئے گا

وارداتِ دل حقیقت ہی سہی ورما مگر
آئے جب کہنے یہ رنگِ داستاں تو آئے گا

نذیر فتح پوری

زندگی کے نام پر صدمے اٹھاؤں گا بہت
دیکھ لینا ایک دن میں مسکراؤں گا بہت

ہجر کا ہر زخم خود سہہ لوں گا ہنس ہنس کر مگر
اشک بن کر تیری آنکھیں ڈبڈباؤں گا بہت

روشنی کی داستاں لکھوں گا اپنے خون سے
رات کی دہلیز پر سورج اگاؤں گا بہت

بس اسی خواہش نے ابتک زندہ رکھا ہے مجھے
تیری سونی مانگ میں تارے سجاؤں گا بہت

تجھ کو جو جتنا بھلائے گا زمانے میں نذیر
ہر قدم پر اس کو اتنا یاد آؤں گا بہت

غزل

فنکار اگر ہے تو جدا سب سے سخن بول
تیشے کو قلم، کوہ کو قرطاس کا من بول

راتوں کو جنہوں نے رلایا اسے شبنم کا بدل کہہ
تنہائی نے جو زخم دیئے ان کو چمن بول

خوابوں کے جزیرے تو ابھی دور بہت ہیں
بیدار ہوئی کس لئے پیروں کی تھکن بول

اس دور میں جینے کے یہی ڈھنگ ہیں شاید
کہہ بوند کو برسات تو ذرے کو گگن بول

یادوں کی منڈیروں پہ چہکتا رہا ماضی
کیا کیا نہ کئے ہم نے بھلانے کے جتن بول

امید کے چہرے پہ ابھی نور بہت ہے
آزردہ ہوا کس لئے اے باورے من بول

ڈاکٹر مجید آذر

غزلیں

رات جو میری اشکبار گئی
وہ مری زندگی سنوار گئی

خوشی آنے کی، غم نہ آنے کا
نبض ہاتھوں کی بار بار گئی

رات آئی تھی بن کے دوشیزہ
صبح دم ہو کے تار تار گئی

مہکی مہکی شمیم یادوں کی
دے کے رنگینیٔ بہار گئی

جسم کے در پہ وقت کی دستک
زندگی کا نشہ اتار گئی

ہے خزاؤں کی دھوپ میں آذر
روٹھ کر جب سے وہ بہار گئی

اپنے کردار کی گواہی دے
آ! مرے عشق کو تباہی دے

سارا عالم تجھے مبارک ہو
ہم کو بس دل کی بادشاہی دے

سر ہتھیلی پہ لے کے پھرتے ہوں
قوم کو ایسے کچھ سپاہی دے

ڈھال لے خود کو ایسے سانچے میں
جو زمانے کی سربراہی دے

دے سکندر کو سلطنت یا رب
مجھ قلندر کو خانقاہی دے

لوٹ لے دو جہان آذر کے
حسن کو اور بے پناہی دے

کیف بلگرامی

بارشوں میں اور کیا موجِ بلا لے جائے گی
طائرِ دل سے بھیگتا پنچھی اڑا لے جائے گی

چاند کو چھونے کی خواہش دیکھ کر دل میں جواں
اک پری جانے کہاں مجھ کو بلا لے جائے گی

جو لپٹ جائے گی آنچل سے ترے بے اختیار
وہ ہوائے تیز رو شرم و حیا لے جائے گی

صبح کی پہلی کرن چومے گی اس کی زلف کو
جو عروسِ شب فقیروں کی دعا لے جائے گی

یاد تیری نیند سے بیدار کر دے گی مگر
خواب کتنے میری آنکھوں سے چرا لے جائے گی

ان کے قدموں کی کہاں پھر کیف ہوں گی آہٹیں
خشک پتوں کو اڑا کر جب ہوا لے جائے گی

آج تک اس نے یقیناً یہی سوچا ہوگا
رات ڈھل جائے گی خوش رنگ اجالا ہوگا

دشتِ ظلمت میں عجب نور سا چمکا ہوگا
جب دعا لے کے ادھر سے کوئی گذرا ہوگا

نیند اس دور میں لوگوں کو کہاں آئے گی
جاگتی آنکھوں پہ جب خوف کا پہرا ہوگا

جس کے ماں باپ ہوئے اب کے حوادث کا شکار
لوریاں دے کے اسے کون سلاتا ہوگا

مت کرو عزمِ سفر رات کے سناٹے میں
آج تو اپنے ہی گھر میں وہ اکیلا ہوگا

اس کی تصویر بنائے گا مصور اے کیف
خواب میں دیکھا جو اک چاند سا چہرہ ہوگا

غزلیں

ڈاکٹر حسین الحق، گیا

واحسرتا!

(۷؍ دسمبر ۱۹۹۲ء کا ایک تاثر)

یہ، اسی گونگے کی کہانی ہے جو بول نہیں سکتا ہے مگر سن سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔

آج کل یہ گونگا سزائے قید بھگت رہا ہے،
کمبخت نے حرکت ہی ایسی کی تھی تو سزا نہ ملتی؟ بھلا بتایئے، وہ رات، قیامت کی رات جب گھر گھر ماتم ہو رہا تھا اور گھر گھر جشن تو ایسے میں اس کو اپنی اوقات سمجھنی چاہیئے تھی۔ مگر بے اوقاتا، اوقات کی الف سے واقف نہیں اور چاہتا ہے کہ ہر پھٹے میں ٹانگ اڑا دے، ظاہر ہے نتیجہ تو وہی نکلنا تھا، جو نکلا، اور ٹھیک ہی ہے، آخر لوگ کیا کرتے، مانا کے شہر میں کرفیو نہیں لگا تھا مگر شہر پر جس آسیب کا سایہ تھا، اس نے تو سارے شہر کا جسم میں ماچس دکھانے کا پورا انتظام کر رکھا تھا... ایک تو دسمبر کی سرد رات... اچھا یہ بھی عجیب ہے، دکھ ... حفاظت کا معاملہ ہے وہ دسمبر ہی سے ناطہ جوڑ بیٹھا ہے۔ اعراق سے ہندوستان تک، امریکیوں سے آر ایس ایس والوں تک، سب نے جیسے تاک رکھا ہے کہ جاڑا شروع ہو اور یہ متحرک ہوں...... سچ پوچھئے تو مجھے تو اس کا سرا بھی اجتماعی روایات اور ناسٹلجیا وغیرہ سے بندھا دکھائی دیتا ہے، اب آخر پرانے زمانے میں بھی تو چوری ڈاکے کا ڈر جاڑے کی ٹھٹھرتی اور کنکناتی راتوں ہی میں زیادہ رہتا تھا... تو ایسی ہی ایک بھیانک رات تھی.... دسمبر کی سرد رات.... تاریخ کچھ بھی طے کر لیجئے، چھ دسمبر یا اور آگے چھلانگ لگا کے چھ جنوری.... کوئی فرق نہیں پڑتا.... نہ تو سرد رات ٹلتی ہے نہ سرد رات کا بھیانک پن کم ہوتا ہے۔

اب وہ کہنے لگا — کیا نام ہے اس کا؟ ہاں وہ راحت علی کہ "بھیا! دن بھر کے تھکے اپنا اپنا گھونڈرا گدڑی لپیٹے، اسی کے اندر گڑمڑائے ہم لوگ سو رہے تھے۔

سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک آگ لگ گئی اور ہم لوگ بتلا بتلا کے باہر نکلے تو سامنے کھڑا مجمع تڑ تڑ گولی چلانے لگا۔ بس سمجھا ہم کیسے بھاگے ہیں' ہم کو تو خود یاد نہیں۔" راحت علی رو رو کے اپنی بپتا بیان کر رہا تھا اور مجھے ہنسی آ رہی تھی کہ تیری ماں تجھے روئے آخر علی کے ساتھ راحت کا کیا جوڑ ؟

معاف کیجئے محابات تو دراصل گونگے کی تھی مگر وہ کہانی تو ابھی گویا میں نے شروع بھی نہیں کیا پایا ہوں۔ اصل میں ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔۔۔ اب وہ۔۔۔۔۔ حلولہ نانی۔۔۔۔ میرے گھر کی ایک پرانی ضعیف بوا۔۔۔۔ ہم سب بچپن میں ان سے کہانیاں سنتے تھے۔ سو ایک رات ایسا ہوا کہ ہم سب اس کے پاس سمٹ آئے اور ضد کرنے لگے۔۔" نانی وہ کہانی سنائیے شہزادہ گلفام والی۔" پہلے تو نانی نانی رہیں مگر جب ہم لوگوں کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً انہوں نے کہانی شروع کی۔۔۔۔" سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار۔ آنکھوں دیکھی گھوشتی ہوں اور کانوں سنی کہتی ہوں کہ سات سمندر پار ایک ملک تھا اس ملک کا ایک بادشاہ عالی جاہ تھا اور اللہ نے اسے ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب گل صفت شہزادہ گلفام سے نوازا تھا۔ شہزادہ گلفام بڑا ہو کر بہت ہی کڑیل جوان نکلا، بالکل ویسے ہی جیسے میرا رحیمو تھا۔" اتنا کہہ کر وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔ اسی وقت اماں ادھر سے گزریں اور یہ منظر دیکھ کر ہم لوگوں کو ڈانٹنے لگیں۔ " چلو ہٹو تم لوگ نانی کو آرام کرنے دو" اور پھر کنارے لے جا کر سمجھایا۔" ابھی پرسوں ان کا جوان بیٹا مرا ہے۔ اور آج تم لوگ ان کو کہانی کے لئے پریشان کر رہے ہو؟"

تو اب ایسا ہے کہ میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ "تیرا کون مرا؟" تو اندر سے جیسے ایک بہت ذلیل اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ "نہیں میرا تو کوئی نہیں مرا۔" مگر تب ایسے میں ایک بڑا کریہہ اور دردناک منظر فلیش بیک میں جھانکنے لگتا ہے: پہلے اس کے گرد ایسی تنہائی نہیں تھی، بڑا تام جھام، شور و شغب، جشن، منتیں اور عقیدتیں اس کی جھولی میں بھری رہتی تھیں، ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق، سو رونق بھی تھی، پھر آہستہ آہستہ سمٹنے کا کال چکر چلتا رہا، چلتا رہا۔ آخری اطلاع یہ ہے کہ گزشتہ ۴۴ برسوں سے اس کو قید کر دیا گیا تھا اور اسے دیکھ کر زندہ رہنے والوں سے لذت دید چھین کی گئی۔ مگر وہ جو کہاوت ہے، پرانے چاول کی، تو اس کی رگوں میں بھی سارا خون انہیں دنوں کا تھا جب چیزوں میں ملاوٹ نہیں ہوا کرتی تھی، مرا ہاتھی پھر بھی سوا لاکھ، دیکھنے والوں کی نظروں میں کھٹکتی رہی اور جن کی آنکھوں کا نور تھی وہ دیکھنے کو ترس گئے۔ پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ دنیا بدل گئی، موسم بدل گیا، آسمان آگ برسانے لگا، پانی دھواں دینے لگا اور زمین بنجر ہو گئی۔۔۔۔ بانجھ عورت اور بنجر زمین اندر سے بھی سخت ہو جاتی ہے۔ بے رس!

جن نامردوں نے اسے گھیر رکھا تھا وہ اس سے جلتے تھے یا اس کی قوت تخلیق سے، یہ ایک الگ بحث ہے مگر اتنا طے ہے کہ نامرد تخلیق اور خالق دونوں سے جلتا ہے، سب نامرد تھے اس سے جلتے تھے اور ان کے اندر کی آگ اتنا پھیلی، اتنا پھیلی کہ ان کا سراپا چیر کر باہر آ گئی،

ماہنامہ سہیل گیا

کیا کیا الزام اس پر نہ لگا، کالا دھبہ، جھگڑے کا گھر، دشمن کی چھیتی۔ بھگوڑوں کی پناہ گاہ ..... اور وہ غریب، چپ سادھے سب سنتی رہتی ... کبھی کبھی جب بہت جی بھر آتا، اداس ہوتی تو بس چاروں سمتوں میں دیکھتی ... کوئی چاپ، کوئی آہٹ، آنے کا کوئی امکان ؟

اسے لگتا اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے ؟ کتنوں کو اس نے پناہ دی، عزت دی، نام دیا، کام دیا، کوئی تو آئے گا ... کوئی تو آکر ظالموں سے کہے گا .... لاکھوں میں اک بے کس و دلگیر ہائے ہائے ..... مگر اے دنیائے دنی تجھ پر ہزار بار لعنت! دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا، پھر بھی اس نیک بخت کی چاہت کا غلغلہ کرنے والوں کا کچھ نہیں بگڑا۔ کیسے کیسے سیاہ اور بھدّے قسم کے پتھر کے ٹکڑے اس کے نور سے منور ہوئے اور یوں ہوئے کہ ان کی سیاہی شہابی بنی، خدا نے ظفریاب کیا، اختر تاباں بنے، بندوں میں بھی اسم تغیر تھے بلند ہوئے تو اعظم کی نسبت مل گئی اور افضل ہوئے۔ مگر وقت نے بتایا کہ ان کی ہر ادا طوائف کی مسکراہٹ تھی۔

دکھ ہوتا ہے، آنسو نکل آتے ہیں اس کے بارے میں سوچ کر ... لکھا ہے یوں بھال کا سعت ناوک ستم / منھ کھل گیا الٹ گئی گردن رکا جو دم / کھینچی سری گلے کی طرف سے بہ چشم نم / بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم / اُبلا جو خوں نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا / چلو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا / سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں / ماری جگر پہ ابن انس نے سنان کین / بھالا گڑا کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں / گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی / تھرّا گئی ضریح رسالت پناہ کی / پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب / نکلی رکاب پائے مطہر سے، ہے غضب / حشق میں جھکی، عمامہ گرا سر سے، ہے غضب / نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار / بھیّا گلے پہ چل گئی میرے چھری کی دھار / صدقے گئی، لٹا گئی گھر وعدہ گاہ میں / جنبش لبوں کو ہے ابھی ذکر اللہ میں / ..... مگر لبوں کی جنبش سے کیا ہوتا ہے؟ لب تو گونگے کے بھی مسلسل جنبش میں رہتے ہیں۔ پھر بھی گونگا بول نہیں پاتا۔

آج کل گونگا سزائے قید بھگت رہا ہے، کمبخت نے حرکت ہی ایسی کی تھی ..... ایسی بھیانک رات میں، جب اس کے محلے کا ہر فرد سہما ہوا اور غصے میں اپنے دانت کاٹتا ہوا اپنے اپنے گھروں میں چکرایا پھر رہا تھا، ویسے میں گونگے نے ..... جی ہاں گونگے نے ... ہاں بھئی۔ گونگے نے ویسے بھیانک حالات میں ایسی حرکت کی تو اسے سزا نہ ملتی ؟

ارے بھائی ! اب حرکت کیا بتاؤں ؟ لوگوں نے بتایا کہ گونگے نے بہت ہی مشتعل کر دینے والے حرکت کی، اب ویسے میں حلولہ نانی کا بیٹا احمد آباد میں رہے یا راحت علی بمبئی میں۔ کیا فرق پڑتا ہے ؟ لاکھوں میں اک بے کس و دلگیر ہائے ہائے، صدقے گئی لٹا گئی گھر وعدہ گاہ میں !

بہرحال! یہ ایسے گونگے کی کہانی ہے جو آج کل سزائے قید بھگت رہا ہے۔

وجہ کا علم مجھے نہیں ہے، بس لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے انتہائی اشتعال انگیز حرکت کی تھی۔

ایک آخری اطلاع یہ ہے کہ نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار .... زینب نکل! حسین تڑپتا ہے خاک پر۔ اور آج کل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے

یہی پکار چاروں طرف گونج رہی ہے .... زینب نکل.....''
معاف کیجئے گا، بات تو دراصل گونگے کی تھی مگر وہ کہانی تو ابھی گویا میں شروع بھی نہیں کر پایا ہوں۔
ویسے یہ بھی تو ہے کہ موت کے فوراً بعد رویا جاتا ہے کہ مرنے والے کی داستان حیات بیان کی جاتی ہے؟
یہ ماتم کی گھڑی ہے۔

ہے ہے پسر صاحب معراج حسینا
پردیس میں بیووں کا لٹا راج حسینا
گویا کہ علی قتل ہوئے آج حسینا
ہے ہے کہ کفن و گور کے محتاج حسینا
پرسا بھی ترا دینے کو آتا نہیں کوئی
لاشہ بھی زمیں پر سے اٹھاتا نہیں کوئی

ماتم حسین ... حسین حسین .... حسین حسین ـــــ!!

ختم

بقیہ :۔ درد کا سفر

سہارا اس کا آدمی ہوتا ہے محبت کے سامنے دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔''
مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی عورت راہ راست پر آگئی۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ میں نے ولسن کے سامنے کبھی بھی سیلی کی حقیقت بیان نہیں کی ورنہ اس کے دل میں سیلی کے لئے محبت کا نرم گوشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔

ختم

بقیہ :۔ مسلمان

''کون سی نئی بات ہے۔ ابا تو ہمیشہ اللہ جانتے ہیں۔ گھر کے مسئلے پر ان سے بات کرنا بھی ایک آفت ہے۔'' قریشہ غصے سے بولی۔
الوز آہستہ سے بولا ـــ'' فرار کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ قریشہ کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ وہ زمانہ نہیں رہا جب خالی ہاتھ بھی لڑکیاں ڈولی پر چڑھا کرتی تھیں۔ ابا تو جیسے لین دین جانتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس دوسری کوئی جاگیر نہیں ہے۔ لے دے کر بس یہی حویلی ہے۔ میرا کیا ہے۔ کل کو انجینیر بن جاؤں گا لیکن ابھی وقت ہے۔ آپ لوگ ہیں۔ گھرانے کی عزت ہے، اور اس عزت کو بچانے کے لئے صرف یہی گھر ہے۔ ابا سے بات تو کرنی ہی ہوگی۔
وہ بڑوں جیسی باتیں کر رہا تھا
افروز کو اچھا لگا۔
لیکن قریشہ بگڑ گئی۔
یہ تیری بات ہے بھیا۔ تم نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ مجھے بکاؤ لوگوں سے سخت نفرت ہے۔''
امی اچانک چپ ہو گئیں۔
قریشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
پھر الوز .... پھر امی جان .... سب بوجھل بوجھل قدموں سے ہاتھ دھونے کے لئے آگے بڑھ گئے۔

ختم

کیا کیا الزام اس پر نہ لگا، کالا دھبہ، جھگڑے کا گھر، دشمن کی چھیتی۔ بھگوڑوں کی پناہ گاہ..... اور وہ غریب، چپ سادھے سب سنتی رہتی... کبھی کبھی جب بہت جی بھر آتا، اداسی ہوتی تو بس چاروں سمتوں میں دیکھتی...
کوئی چاپ، کوئی آہٹ، آنے کا کوئی امکان ؟
اسے لگتا اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے؟ کتنوں کو اس نے پناہ دی، عزت دی، نام دیا، کام دیا، کوئی تو آئے گا..... کوئی تو آکر ظالموں سے کہے گا.... لاکھوں میں اک بے کس و دلگیر ہائے ہائے..... مگر اے دنیائے دنی تجھ پر ہزار بار لعنت! دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا، پھر بھی اس نیک بخت کی چاہت کا غلغلہ کرنے والوں کا کچھ نہیں بگڑا۔ کیسے کیسے سیاہ اور بھدے سقم بھرے پتھر کے ٹکڑے اس کے نور سے منور ہوئے اور یوں ہوئے کہ ان کی سیاہی شہابی بنی، خدا نے ظفریاب کیا، اختر تاباں بنے، بندوں میں بھی اسم تغیر تھے بلند ہوئے تو اعظم کی نسبت مل گئی اور افضل ہوئے۔ مگر وقت نے بتایا کہ ان کی ہر ادا طوائف کی مسکراہٹ تھی۔
دکھ ہوتا ہے، آنسو نکل آتے ہیں اس کے بارے میں سوچ کر... لکھا ہے تین بھال کا تھا ناوک ستم / منھ کھل گیا الٹ گئی گردن رکا جو دم / کھینچی سری گلے کی طرف سے بہ چشم نم / بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم / ابلا جو خوں نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا / چلو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا / سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں / ماری جگر پہ ابن انس نے سنان کیں / بھالا گڑا کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں / گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی / تھرا گئی ضریح رسالت پناہ کی / پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب / نکلی رکاب پائے مطہر سے، ہے غضب / عش میں جھکی، عمامہ گرا سر سے، ہے غضب / نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار / بہے بہے گلے پہ چل گئی میرے چھری کی دھار / صدقے گئی، لٹا گئی گھر وعدہ گاہ میں / جنبش لبوں کو ہے ابھی ذکر اللہ میں /..... مگر لبوں کی جنبش سے کیا ہوتا ہے؟ لب تو گونگے کے بھی مسلسل جنبش میں رہتے ہیں۔ پھر بھی گونگا بول نہیں پاتا۔
آج کل گونگا سزائے قید بھگت رہا ہے، کمبخت نے حرکت ہی ایسی کی تھی..... ایسی بھیانک رات میں، جب اس کے محلے کا ہر فرد سہما ہوا اور غصے میں اپنے دانت کاٹتا ہوا اپنے اپنے گھروں میں چکرایا پھر رہا تھا، ویسے میں گونگے نے.....؟ جی ہاں گونگے نے...؟
ہاں بھئی۔ گونگے نے ویسے بھیانک حالات میں ایسی حرکت کی تو اسے سزا نہ ملتی ؟
ارے بھائی! اب حرکت کیا بتاؤں؟ لوگوں نے بتایا کہ گونگے نے بہت ہی مشتعل کر دینے والی حرکت کی، اب ویسے میں حلولہ نانی کا بیٹا احمد آباد میں رہے یا راحت علی بمبئی میں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ لاکھوں میں اک بے کس و دلگیر ہائے ہائے، صدقے گئی لٹا گئی گھر وعدہ گاہ میں!
بہرحال! یہ ایسی گونگے کی کہانی ہے جو آج کل سزائے قید بھگت رہا ہے۔
وجہ کا علم مجھے نہیں ہے، بس لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے انتہائی اشتعال انگیز حرکت کی تھی۔
ایک آخری اطلاع یہ ہے کہ نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار.... زینب نکل! حسین تڑپتا ہے خاک پر۔ اور آج کل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے

یہی پکار چاروں طرف گونج رہی ہے .... زینب نکل .....

معاف کیجئے گا، بات تو دراصل گونگے کی تھی مگر وہ کہانی تو ابھی گویا میں شروع بھی نہیں کر پایا ہوں۔

ویسے یہ بھی تو ہے کہ موت کے فوراً بعد رو دیا جاتا ہے کہ مرنے والے کی داستان حیات بیان کی جاتی ہے؟

یہ ماتم کی گھڑی ہے۔

ہے ہے پسر صاحب معراج حسینا
پردیس میں بیووں کا لٹا راج حسینا
گویا کہ علی قتل ہوئے آج حسینا
ہے ہے کفن و گور کے محتاج حسینا
پرسا بھی ترا دینے کو آتا نہیں کوئی
لاشہ بھی زمیں پر سے اٹھاتا نہیں کوئی

ماتم حسین ... حسین حسین .... حسین حسین ...!!

ختم

بقیہ :۔ دردکا سفر

ہمارا اس کا آدمی ہوتا ہے محبت کے سامنے دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔"

مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی عورت راہ راست پر آگئی۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ میں نے ولسن کے سامنے کبھی بھی سیلی کی حقیقت بیان نہیں کی ورنہ اس کے دل میں سیلی کے لئے محبت کا نرم گوشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔

ختم

بقیہ :۔ مسلمان

"کون سی نئی بات ہے۔ ابا تو ہمیشہ اٹھ جاتے ہیں۔ گھر کے مسئلے پر ان سے بات کرنا بھی ایک آفت ہے۔" قریشہ غصے سے بولی۔

انور آہستہ سے بولا ـــ" فرار کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ قریشہ کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ وہ زمانہ نہیں رہا جب خالی ہاتھ بھی لڑکیاں ڈولی پر چڑھا کرتی تھیں۔ ابا تو جیسے لین دین جانتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس دوسری کوئی جاگیر نہیں ہے۔ لے دے کر بس یہی حویلی ہے۔ میرا کیا ہے۔ کل کو انجینیر بن جاؤں گا لیکن ابھی وقت ہے۔ آپ لوگ ہیں۔ گھرانے کی عزت ہے۔ اور اس عزت کو بچانے کے لئے صرف یہی گھر ہے۔ ابا سے بات تو کرنی ہی ہوگی

وہ بڑوں جیسی باتیں کر رہا تھا

افروز کو اچھا لگا۔

لیکن قریشہ بگڑ گئی۔

یہ تیری بات ہے بھیا۔ تم نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ مجھے بکاؤں لوگوں سے سخت نفرت ہے۔"

امی اچانک چپ ہو گئیں۔

قریشہ اٹھ کھڑی ہوئی

پھر انور .... پھر امی جان .... سب بوجھل بوجھل قدموں سے ہاتھ دھونے کے لئے آگے بڑھ گئے۔

ختم

مشرف عالم ذوقی
ترجمہ: تبسم فاطمہ

مسلمان

(غلامی کے آخری دنوں سے ۱۹۸۶ء تک)

آج حویلی میں افروز کی آمد کا تیسرا دن تھا۔
نواب صاحب گھر والوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب ضرور ہوئے کہ یہ ان کے دوست مرحوم و مغفور شوکت حسین کی بیٹی ہے۔ جن کا پورا گھر دنگے میں شہید ہو گیا۔ سب کو ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ سب سے واقف ہو گئی۔

امی جان ـــ جو نواب صاحب کی بیوی تھیں۔ کم بولتی تھیں لیکن محبت سے بات کرتیں تو لگتا جیسے منھ سے پھول جھڑ رہا ہو۔

وہ لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا، وہ قریشہ تھی۔ نواب صاحب کی لڑکی۔

اور وہ لڑکا انور حسین تھا۔ نواب صاحب کا لڑکا۔ جو انجینیئرنگ کر رہا تھا۔

نواب صاحب نے گھر میں سب کو اس بات کے لئے منع کر رکھا تھا کہ افروز کے زخم کو نہ کریدا جائے۔ کوشش کی جائے کہ اس کے زخم بھر جائیں۔

قریشہ اور انور تو اتنے پیارے لگے کہ افروز کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے کبھی نہ جائے۔ آخر یہ اس کا بھی گھر ہے۔ اس گھر پر اس کا بھی حق ہے۔

مگر کیسا حق ..... ؟

ناجائز گوشت کے لوتھڑے جیسا ـــ

افروز نے دیکھا اور محسوس کیا کہ حویلی کھنڈر میں بدل رہی ہے۔ لیکن مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے صوفے، قالین، جھاڑ فانوس، پرانی نوابیت کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ رئیسی چھن گئی۔ جاگیریں ختم ہو گئیں۔ لیکن یہ مرے ہوئے ہاتھی اپنی

نوابی شان کا بھرم قائم رکھنا چاہتے تھے۔ افروز کو یہ سُن کر اچھا لگا کہ قریشہ اور انور کو خود کا نواب کہلانا پسند نہیں تھا۔ انور نئے مزاج کا شہر کی پیداوار تھا۔ وہ سلجھی ہوئی باتیں کرتا تھا۔ گھر میں نوکر چاکر نہیں تھے افروز کو لگا۔ نواب صاحب کے ہاتھ میں تنگ رہتے ہوں گے۔ تبھی تو بائی اماں کے کافی اصرار کے باوجود نواب صاحب ان کے یہاں پکا سنڈاس نہیں بنوا پائے تھے۔ نواب صاحب کو اب بھی افروز سے خطرہ تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے معاملہ ٹلے شہر کی فضا ٹھیک ہو جائے تاکہ وہ اسے چلتا کر دیں۔

وہ اسی دن افروز کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔

اپنے کمرے میں افروز کو لانے تک نواب صاحب خود کو سنبھال چکے تھے۔

"تم.... یہاں .... ؟"

روتے ہوئے افروز نے کم سے کم لفظوں میں بڑی ماما کے کود جانے اور جاگیرا کے آگ لگانے کی ساری داستان نواب صاحب کو سنا دی۔

ایک لمحے کو نواب صاحب کا جسم، جیسے لفظوں کی تیز آندھی سے لڑکھڑا گیا۔

وہ کمرے میں ٹہلنے لگے

افروز روئی جا رہی تھی۔

اب ......

بے چینی کی حالت میں ٹہلتے ہوئے نواب صاحب اس کے آگے رُکے .....

اب .... اب کیا سوچا ہے....

مجھے کچھ دن یہاں رکنے کی اجازت دیجئے نواب صاحب، پھر یہاں سے چلی جاؤں گی۔

"کہاں .... ؟"

سوچا ہے راجدھانی چلی جاؤں گی۔ وہاں کچھ نہ کوئی کام تو..... میں اس شہر سے یہاں کی یادوں سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں نواب صاحب ....

"ٹھیک ہے ..... وہاں میرے ایک دوست ہیں خط دیدوں گا۔

نواب صاحب کی بے چینی دور نہیں ہوئی تھی اور وہ رکے پھر ترچھی نظر کرکے بولے۔

"اور سنو... تم مجھے نواب صاحب کے بدلے انکل کہا کرو۔ یہاں انکل کہنے کا رواج ہے۔

پھر وہ تیزی سے اندر چلے گئے۔

افروز پھر سے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ اسی وقت چونکی جب وہ دو نرم شفقت بھرے ہاتھوں کی زد میں تھی۔ یہ امی جان تھیں جو کہہ رہی تھیں۔

"تم فکر نہ کرو بیٹی... نواب صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ گھر لٹانے کا غم مت کرو، صبر سے کام لو.....

پھر دھیرے سے انور آگے بڑھا۔

پھر قریشہ آگے آئی۔

اور اسے لگا۔ یہ نئی دنیا ہے .... یہ محبت کی نئی نئی وادی ہے، جسے نواب صاحب اس سے اب تک چھپائے ہوئے تھے۔

"آؤ بیٹی — منہ ہاتھ دھو لو...." امی جان دنیا کی تمام محبت ہونٹوں پر سجا کر بولیں۔ اور نڈھال سی افروز اجنبی بھائی بہنوں کے ساتھ چل پڑی۔

قریشہ کو تو ہر وقت شرارتیں سوجھتی تھیں۔ اس کی

رگ رگ میں شرارتیں بھری تھیں۔ الور بیرلیس تھا۔ دونوں کے کتنے ہی بار باتوں باتوں میں اس کے گھر کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن ہر بار امی جان بات ٹال جاتیں۔ وہ دونوں بھی ذہین تھے۔ افروز کا دل نہ دکھے اس لئے فوراً ہی بات بدل دیتے تھے۔

وقت کے ساتھ انسان کی ضرورتیں بھی بدلی تھیں۔ ضرورتوں نے پیر پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ افروز نے محسوس کیا نواب صاحب زیادہ تر چپ ہی رہتے ہیں۔ یا پھر اپنے کمرے میں۔ مسہری پر تکئے سے ٹیک لگائے سوچ میں ہوتے۔ بچوں سے بھی کم ہی باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ تر بس ہوں.... ہاں..... یا ضرورت ہوتی تو دو چار لفظ بول دیا۔

ضرورتوں کے پھیلتے ہوئے پیر کو بھی افروز نے اس دن کھانے کی میز پر ہی دیکھا تھا۔ دسترخوان پر کھانے چن دیئے گئے۔ لوگ بیٹھ گئے۔ الور نے دسترخوان پر پسری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"ابا۔ حویلی کی اتنی ساری زمین بے مصرف پڑی ہیں۔ آخر ان کا کیا کام"

نواب صاحب نے نظر اونچی کی غور سے الور کی جانب دیکھا۔ ایک لمبی ہوں کی اور روٹی کا نوالہ توڑنے لگے۔

"میرا خیال ہے بینک سے قرض لے کر ایک مارکیٹ کمپلکس بنا جائے تو..... اور اوپر ہماری رہائش ہو جائے....."

نواب صاحب نے اس بار ہوں نہیں کی اچانک کھانے سے ہاتھ روک دیا۔ امی جان گھبرا گئیں۔ قریشہ نے نفرت بھری آنکھوں سے نواب صاحب کو دیکھا جو کھانے سے اچانک اٹھ گئے تھے۔

نواب صاحب غصے میں چلے گئے۔
امی جان نے کھانا روک دیا۔
"یہ کیا بات ہوئی الور؟"
"بھیا نے غلط کیا کہا ہے امی؟"
قریشہ کی آنکھوں میں اب بھی نفرت تھی۔
"لیکن کھانے کے وقت، ذرا خیال تو کیا ہوتا؟"
"خیال کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے امی جان۔ ... نواب صاحب نے کب آپ کا خیال کیا، خیال کیا تو اس ٹکے کی طوا......!"
"قریشہ....."

امی کا سارا بدن کانپ گیا... افروز بھی جیسے اندر سے زرد پتے کی طرح لرز اٹھی..... تو کیا گھر میں سب کو معلوم ہے کہ نواب صاحب اس ٹکے کی..... بائی اماں کے پاس جاتے تھے.....!

"پیاری امی جان.....!"
قریشہ نے گڑگڑا کر معافی مانگی....." الور نے قریشہ کی حمایت میں کہا۔

"ابا کو خیال تو آنا چاہئے امی جان، کہ لے دے کر ایک "گولا" رہ گیا ہے جہاں سے پیسہ آتا ہے۔ اسی پیسے پر سارا گھر چلتا ہے، پھر اتنی بڑی بڑی دیواریں، محرابیں، اتنے سارے کمرے..... اور رہنے والے صرف دو تین۔ فائدہ ہی کیا ہے۔ مسلمان نے تجارت کا ہنر تو سیکھا ہی نہیں صرف ماضی کی کہانیوں پہ خوش ہوئے جا رہے ہیں۔"

امی جان نے دبی زبان میں کہا۔
"ابا نے آج بھی کھانا چھوڑ دیا۔"

(۲۵ پر)

ڈاکٹر اودے سرن ارمان بلاروی

"درد کا سفر"

ایک کہاوت ہے کہ عشق انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ لیکن اس روز مجھے یہ سچ معلوم ہوئی جب میں ٹرین سے لندن جا رہا تھا اور ویمبلے اسٹیشن پر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ دیئے سوار ہوئے۔ لڑکی کو میں پہچان گیا وہ سیلی تھی میرے ساتھ تھیٹر کے لئے کپڑے تیار کرنے والی کمپنی میں کام کرنے والی لڑکی۔ میں اس کے شوہر کو بھی پہچانتا تھا یہ وہ نہیں تھا بلکہ اس کا میل فرینڈ معلوم ہوتا تھا۔ اس لڑکے نے دروازہ پر ہی کھڑے کھڑے سیلی سے لپٹ جھپٹ کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ ویسے تو پچھمی تہذیب میں ایسی حرکتیں عام ہیں: اتوار کے دن ہر پارک میں ایسے نظارے دیکھنے کو مل جاتے ہیں لیکن ہماری ہی طرح بہت سے عمر رسیدہ انگریز ابھی ان باتوں سے نفرت کرتے ہیں۔

وہ نوجوان کبھی تو سیلی کے ہونٹ چوستا کبھی رخسار ان کے اس ڈھنگ سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پورے ڈبے میں اپنے علاوہ کسی اور کو موجود ہی نہیں سمجھ رہے تھے۔ میں ایک انگریز کی آڑ میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس بیچ سیلی نے مجھے ایک بار بھی نہیں دیکھا میں۔ اس خوف سے خود کو چھپانے میں کوشاں تھا کہ کہیں یہ مجھے دیکھ کر جھینپ نہ جائے۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں طوائفوں کو سب سے گری ہوئی عورت سمجھا جاتا ہے لیکن شرم و لحاظ ان میں بھی ہوتی ہے۔ وہ پیشہ ور ضرور ہوتی ہیں مگر جو کچھ کرتی ہیں وہ پردہ کی آڑ میں۔ کیا مجال جو کوئی انہیں ہاٹ بازار میں چھیڑ دے یہی عورت کا حسن ذاتی ہے۔ میری منزل آگئی تھی اور میں ٹرین سے

اتر کر چلا گیا گھر پہنچا سارے کام کاج کئے لیکن یہ منظر نظر کے سامنے سے نہیں ہٹ سکا۔ میں برابر یہی سوچتا رہا کہ شادی شدہ ہو کر یہ ایسا کیوں کر رہی ہے اگر اتفاق سے اس ڈبے میں اس کا شوہر ہوتا اور یہ تماشا دیکھ لیتا تو کیا ہوتا۔ ممکن ہے وہ اپنے شوہر کی خامی جسمانی کمزوری کی وجہ سے بہک گئی ہو۔ مگر مشرقی عورت کسی بھی حال میں دوسروں پر نظر نہیں اٹھاتی۔

دن نکلے وہ بھی کارخانے میں پہنچی اور میں بھی۔ فرصت کے وقت میں نے اس سے سوال کیا "شیلی اگر کوئی شادی شدہ عورت پارک یا پب میں کسی غیر شخص سے پیار کرے تو تم اس کو کیسا سمجھوگی۔

یہ سن کر اس نے میری طرف اس طرح حقارت سے دیکھا جیسے کہ میں سو سوا سو سال پرانا بچھڑا ہوا آدمی ہوں پھر وہ مسکرائی جیسے ۱۸۵۷ء میں مرا ہوا سوال کلبلایا ہو دونوں ٹانگیں سکوڑ کر بیٹھتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے کہا۔ موڈرن لوگ تو اس بات کو برا نہیں مانتے۔ اولڈ مائنڈیڈ ضرور گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں"

" اس معاملے میں آپ کی رائے کیا ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے اس کا دل کریدا۔ وہ فوراً بولی — جس طرح انگلینڈ میں آدمی کے فی میل فرینڈ ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی میل فرینڈ ہوتے ہیں اور فرینڈ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ہنسی مذاق، تفریح کرنا بری بات نہیں ہوتی ہے۔ شادی کوئی زنجیر تو ہوتی نہیں ہے جو عورت کو غلامی میں جکڑ لے۔ نہ عورت کوئی گائے بکری ہوتی ہے مرنکی ہا ہبا ہاں ملانے ہی سے عورت کو بیری تھوڑے ہی سمجھا جاتا ہے۔ شاید آپ کے یہاں یہ باتیں پسند نہیں کی جاتیں ہیں؟ اس نے مجھ سے سوال کیا، میں بولا "ہماری تہذیب میں ایسی باتیں اچھی نہیں سمجھی جاتی ہیں اور نا ہی اس طرح کی زندگی جینے کی اجازت ہے" یہ سن کر وہ بولی "آپ کی تہذیب عورت کی ناک میں نکیل ڈالتی ہے مرد کے ہرجائی پن پر کوئی روک نہیں لگاتی ایک آدمی انیک بیویاں رکھ سکتا ہے من پسند جگہ گھوم پھر سکتا ہے۔ مگر عورت کسی مرد سے بات کرتی ہوئی پکڑی گئی تو اس کو بدچلن کہہ کر طلاق دیدیا جاتا ہے۔ اس کی مجبوری پر کسی کی نظر نہیں جاتی آپ کی تہذیب میں میڈ ھے ہر جگہ مرد ہی کا بول بالا ہے وہ عورت کے دل و دماغ اور جسم پر اپنی ہی غلامی میں بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو عورت کے مزاج کا کوئی دھیان نہیں ہے نہ ہی وہ عورت کی آزادی کو منظور کرتا ہے۔ جنت میں بھی آدمی نے اپنے لئے حوروں کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔ مگر عورتوں کے لئے وہاں بھی کسی آدمی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا ذکر نہیں ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی آزادی سے نہیں رہ سکتی یہاں کا آدمی اپنی بیوی کو بیوی سمجھتا ہے غلام نہیں۔ یہاں بیوی نہیں ہسبنڈ بھی گھر کا مالک ہوتا ہے"

میں نے اس کی ہر بات بغور سنی مگر نقطہ چینی نہیں کی کیونکہ مجھے امید تھی کہ وہ اپنے خلاف بولنے پر بگڑ جاتی۔ انگریز عورتوں میں احساس کمتری نہیں ہوتا ہے وہ دقیانوسی خیال اور پرانے پن کو قطعی پسند نہیں کرتی ہیں آج مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ ایک من چلی اور آزاد طبیعت اور آزاد خیال حسینہ تھی میں اس کے شوہر کے بارے میں کچھ اور معلوم کرنا چاہتا تھا اس کی نیچر کیسی ہے وہ اس سے خوش ہے کہ ناخوش لیکن میں نے یہ سوال اگلی ملاقات تک کے لئے ملتوی کر دیا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے نازک مزاج پر بوجھ بنوں
میرا خیال یہی تھا کہ عورت ایسی حرکتیں اپنے شوہر سے
غیر مطمئن ہونے پر ہی کر سکتی ہے آج میں نے اگلے اتوار
کو پھر ہائڈ پارک میں ملنے کی گزارش کی تو وہ فوراً مان
گئی اور وعدہ کر دیا۔

میں اتوار آنے پر اس کو لے کر ہائڈ پارک پہنچا۔
خوب تفریح کی پھل کھائے جوس پیا پھر ایک پیڑ کے
نیچے گھاس پر میٹ بچھا کر ستانے لگے۔ گپ شپ ہوتی
رہی پھر میں نے اس کا موڈ فریش دیکھ کر پوچھا ۔"سیلی
تمہارے شوہر کس نیچر کے ہیں؟" یہ سن کر اسے جھٹکا سا
لگا اس نے میرے چہرے پر نظر گھمائی اور کچھ سوچ کر بولی
"بہت اچھی نیچر کے ہیں۔ [illegible]
ہیں صبح کو جاتے ہیں اور شام کو گھر آتے ہیں۔ اپنے کام سے
کام رکھتے ہیں مگر کنجوس یا کفایت شعار"

میں نے کہا۔ کنجوس یا کفایت شعار؟ یہ سن کر
اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے میرے چہرے پر نظر گھمائی اور
کچھ سوچ کر بولی: "جو کچھ ٹفن میں رکھ دیتی ہوں اس کے
علاوہ دن بھر کچھ نہیں کھاتے دو سوٹ ہیں۔ انہیں
میں پورا سال گزار دیتے ہیں۔ مگر میرے لئے ایسا نہیں
کرتے کنجوسی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں مجھ سے محبت بہت
کرتے ہیں۔ لٹو ہیں مجھ پر۔ میرے بغیر گھڑی بھر رہ نہیں سکتے
کسی پارٹی میں جانا ہو تو مجھے پہلے ساتھ لیتے ہیں ہم دونوں
کی کمائی سے گھر تو چل رہا ہے مگر موڈرن لائف جینے میں
پریشانی ہے۔"

"موڈرن لائف سے کیا مطلب؟" میں نے اس کا
منشا سمجھتے ہوئے بھی سوال کیا تو وہ سنبھل کر بولی "گھر
میں تمام موڈرن آرام دہ چیزیں بھی تو ہونا ضروری ہوتی
ہے۔ لیکن وہ سب کچھ دولت سے ممکن ہے۔ نری
محبت سے نہیں۔" مجھے اس کا دو ٹوک جواب بہت کھلا
جی میں آیا کہ اس سے کہوں سیلی دولت محبت کا درجہ
نہیں لے سکتی۔ جس کو زندگی میں کسی کا پیار مل گیا
اس کو کسی سکھ کی کمی نہیں رہتی ہے۔ مگر میں اپدیشک
بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں کچھ کہتا بھی تو وہ میرے خیال
کی قدر نہیں کرتی بلکہ کھلی اڑاتی۔ میرا منشا دوسرا
ہی تھا۔ اس لئے میں چپ ہو گیا۔

اس کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ محبت سے
زیادہ دولت کو اہمیت دیتی ہے۔ ایسے خیال کے لوگ
کسی بھی دور میں اچھے نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد ہم
دونوں اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ میں نے راستے بھر دعا
کی کہ بھگوان ایسے پتھ بھرشٹ لوگوں کو راہ راست پر لا
محبت تو دین ایمان ہے۔ اور اسی کے سہارے انسان
انسان ہے۔

کئی ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ سیلی نے اپنے شوہر پر
زنا بالجبر کا مقدمہ ٹھوک دیا ہے۔ مجھے یہ بات بڑی اٹ
پٹی سی لگی ایک دن میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا
مجھے معلوم تھا کہ وہ اس سوال پر شرم و لحاظ سے گردن
جھکانے کے بجائے مجھ پر بگڑ سکتی ہے مگر اس نے ایسا
کچھ نہیں کیا اور سنہرے بالوں کو جھٹک کر پیچھے پھینکتے
ہوئے بولی "بیوی بننے کا یہ قطعی مطلب نہیں ہوتا کہ
ساری زندگی کو ہاں کر دی یا مرد کی ہاں میں ہاں ملا کر جینا
ہی بیوی کا دھرم ہے عورت کی مرضی اور موڈ کے بغیر
مباشرت کرنا بھی ریپ کہلاتا ہے۔ ریپ ریپ ہی
ہے چاہے وہ رشتہ ازدواج میں ہو یا باہر سماج میں
سینٹر کریمنل کورٹ لندن نے یہ پاس کر دیا ہے کہ بیوی

سے زبردستی مباشرت کرنے والا شوہر بھی زنا بالجبر کا مجرم ہوگا جس کی کہ سزا پانچ سال ہے۔ اور میں نے اس قانون کا فائدہ اٹھایا ہے۔"

"ایسا کرنے سے آپ کی بدنامی نہیں ہوگی؟"

"مطلبی اور خودغرض لوگوں کو سزا دینے سے دل کو تسلی بھی تو ملتی ہے۔" اس نے منی اسکرٹ کو نیچے جھٹکتے ہوئے تن کر کہا۔ یہ سُن کر میں سُن رہ گیا اور اپنی دیوی سروپ بیوی کی باتیں یاد آگئیں جب اس نے میری ایک نازیب حرکت کی پڑوسن سے شکایت کرنے پر اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "تم آدمی کی لغزشوں پر مت جاؤ اپنی مریاداؤں کا دھیان رکھو عورت سورگ کا اپہار ہے یہ چلن سے گر گئی تو کچھ نہیں سنبھلے گا اور آدمی چلن سے گر گیا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔

سیلی مقدمہ جیت گئی۔ اور اس کے شوہر کو پانچ سال کی سزا ہوگئی تب میرے دماغ میں ایک شک پیدا ہوا کہ اس نے یونہی نارضامندی کا سوانگ رچ کر تو مقدمہ نہ ٹھوک دیا ہو۔ اس بے چارے پر۔ اسی وقت میرے دماغ میں دوسری بات آئی، اگر یہ اس لڑکے سے شادی کر لیتی ہے جو ٹرین میں ملا تھا تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ سیلی نے اپنے شوہر سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہی یہ ڈرامہ کیا تھا۔ اب وہ اس لڑکے سے جس کا نام رچرڈ تھا خوب گل چھرّے اڑائے گی۔ میں نے اس حقیقت کی تہہ میں پہنچنے کے لئے روزمرہ اس پر نظر رکھنی شروع کر دی مہینوں گزر گئے مگر میں نے سیلی کو رچرڈ کے ساتھ کہیں کسی پارک میں پکنک مناتے یا مارکٹنگ کرتے نہیں دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب اس کی ملاقاتیں زور پکڑ جائیں گی مگر ایسا ہوا نہیں۔ تنہائی کو بہت دل آزار بتایا جاتا ہے چاہے وہ مرد کی ہو چاہے عورت کی مگر مجھے وہ خوش و خرم اور بشاش نظر آنے لگی تھی جو دوست سے ملنے کا انتظار اور اس کا ملن تنہائی محسوس ہی کہاں ہونے دیتے ہیں۔ وہ روز ڈیوٹی پر آتی تھی مگر اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کو شوہر کے جیل چلے جانے کا بالکل بھی ملال نہیں تھا۔ کئی ماہ بعد اس نے ایک غیر حاضری کی میں نے سوچا ضرور دال میں کالا ہے۔ میں نے درد پیٹ کی شکایت بتا کر نصف دن کی چھٹی لی اور اس کے گھر جا پہنچا دیکھتا کیا ہوں کہ جیسے ہی میری ٹیکسی پہنچی رچرڈ اپنی کار سے روانہ ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے کار میں لگے شیشے میں میری ٹیکسی کو سیلی کے دروازے پر رکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب میں سمجھ گیا کہ سیلی نے کیوں غیر حاضری کی تھی مگر اب رچرڈ کو بھی سیلی کے چلن پر شک ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھ کو بھی اپنی ہی طرح سمجھا تھا۔

میں نے بیل بجائی سیلی نے کواڑ کھولی میں اندر داخل ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ بٹھایا بات چیت کی حال چال پوچھے اور آنے کی وجہ پوچھی میں بولا ——" آپ کی ڈیوٹی پر نہ آنے سے مجھے فکر ہوئی کہ ہو سکتا ہے آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی ہو اب آپ اکیلی ہیں اس لئے میں نے سوچا کیوں نہ اپنے دوست کی مزاج پرسی کی جائے۔ شاید میرے لائق کوئی کام نکل آئے۔" اتنا کہہ کر میں نے کمرہ کا جائزہ لیا کہتے ہیں کمرہ کی دیواروں پر ٹنگی تصویریں اور شوکیس میں رکھی چیزوں سے مالک مکان کے ضمیر کا پتہ چلتا ہے۔ مگر یہاں یہ کہاوت غلط ثابت ہوئی۔ کمرہ میں دھارمک تصویریں ٹنگی تھیں مگر سیلی میں کوئی دھارمک لچھن نہیں تھا۔

سیاست دانوں کی طرح اس کے ظاہر و باطن میں فرق تھا۔ میں کہا ــــ سیلی کیا تم تنہائی کی زندگی سے بور نہیں ہو چکی ہو؟

یہ سُن کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا: تنہائی کی زندگی کا بھی الگ ایک لطف ہوتا ہے ؟ جی میں آیا کہ کہہ دوں جب میل فرینڈ آتے رہتے ہیں تو تنہائی کہاں رہی۔ تنہائی تو شوہر کے نصیب میں ہے مگر میں نے ضبط سے کام لیا کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں نے رچرڈ کو نہیں دیکھا ہے۔ ادھر رچرڈ نے کچھ ہی دور جاکر کار خراب ہونے کا بہانا بنا کر بونٹ کھول کر یوں ہی ٹھوک پیٹ شروع کر دی۔ اور یہ ٹوہ لینے میں لگا رہا کہ میں کتنی دیر میں گھر سے نکلتا ہوں۔

میں گھر سے نکلا سڑک پر کھڑے ہو کر ادھر اُدھر ٹیکسی تلاش کی تو رچرڈ کی کار نظر آئی تبھی اس نے کار اسٹارٹ کی اور پھر ہو گیا۔ میں اس کی اس ڈرامائی حقیقت کو سمجھ گیا تھا۔ آج سے رچرڈ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ سیلی رچرڈ کی طرح مجھ سے بھی محبت کرتی ہے۔ اور کسی روز میری وجہ سے اس کو بھی شوہر کی طرح زنا بالجبر کے کیس میں پھانس کر جیل کرا سکتی ہے۔

یہ سوچ کر اس کو سیلی کے چلن پر شک ہو گیا۔ وہ اس سے ڈرنے لگا۔ اس کی محبت زہریلی محسوس ہونے لگی اور روز مرہ کا ملن مہینوں میں بدل گیا۔ سیلی اس بھید کو سمجھ نہ سکی۔ رچرڈ نے بھی لاکھ بہانے بنائے مگر حقیقت نہیں بتائی۔ اب اس کو اندر ہی اندر سیلی سے نفرت ہو گئی رچرڈ جس دوسری لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے شادی کر لی اور ساتھ ہی یا ماں میں رہنے لگا۔

ایک دن سیلی نے مجھ سے ڈیوٹی پر دل کی بات کہی وہ بولی اس دن آپ ٹھیک کہتے تھے تنہائی کی زندگی بہت بور کرتی ہے مرد کے بغیر عورت کے تمام شوق ادھورے ہوتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے ایسا لگا کہ وہ اپنے کرے دھرے پر پچھتا رہی ہے اور شوہر کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر ایسا تھا نہیں دراصل وہ رچرڈ کے غم میں پریشان تھی اور اصل بات چھپا رہی تھی۔ آج میں نے کچھ زیادہ بات نہ کی۔

ایک دن میں نے سیلی کو ہنیڈ نٹنگ اگزیبیشن میں گھومتے دیکھا۔ سنا ہے کہ وہ ایک تصویر پر اتنی فریفتہ ہوئی کہ اس نے بنانے والے آرٹسٹ ہی سے شادی کر لی اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ رہنے لگی۔ یہ خوب امیر تھا سیلی کی من چاہی مراد پوری ہو گئی۔

اب اس نے کارخانے کی نوکری سے ہاتھ دھو لیے تھے۔ ایک دن سیلی کے شوہر ولسن کا خط میرے پاس کارخانے میں آیا بیچارے کو میرے گھر کا پتہ یاد نہیں تھا۔ اس میں ولسن نے میل کے چال چلن پوچھے تھے میں نے جواب میں لکھ دیا کہ سیلی اپنی غلطی پر پچھتا رہی ہے اور برابر تمہارے گیت گایا کرتی ہے۔ لیکن یہاں سے نوکری چھوڑ دی ہے۔ کہاں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے مجھے یہ پتہ نہیں۔ جب کچھ پتہ چلا تو بتاؤں گا۔ ولسن کے خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ سال بھر سے زیادہ ہو گیا مگر اس نے ولسن کے پاس نہ تو خط ڈالا ہے اور نہ کبھی کسی بہانے سے ملنے ہی گئی ہے۔ مجھے اس بےچارے ولسن پر بہت ترس آیا۔ اور میں بڑے دن کو اس سے جیل میں ملنے گیا ـــ کچھ پھینٹ بھی لے گیا تھا۔ وہ مجھ سے جیل میں اس طرح بغل گیر ہو کر ملا کے میرے آنسو نکل گئے۔ میں نے اس سے بہت سی

باتیں کیں اس نے تمام راز کی باتیں بتائیں مگر میں نے کسی بھی طرح سیلی کو اس کی نظر میں قصوروار ٹھہرانے کی غلطی نہیں کی۔ مجھے امید تھی کہ یہ دونوں پھر کبھی مل سکتے ہیں۔ مگر میں دل ہی دل میں اس بدچلن سیلی سے نفرت کرتا تھا اور اس سے دوبارہ ملنے کی تمنا اور اس کی بابت معلومات کرنے کی خواہش ختم ہو چکی تھی۔

ایک دن جس وقت میں ڈیوٹی پر جا رہا تھا مجھے سیلی گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ بہت دنوں بعد اسے یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے [illegible] دل سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "سیلی آج یہاں کیسے؟" — وہ اختصار سے بولی — "میں نے بہت بڑی بھول کی جو نوکری چھوڑ دی اسی سلسلے میں یہاں آئی تھی مگر قسمت کی کھوٹ دیکھو کہ ٹکا سا جواب مل گیا" اتنا کہہ کر بائی بائی کرتی ہوئی وہ تڑاخ ہو گئی۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس سے پوچھوں گا کہ تم کبھی ولسن کے پاس گئی ہو کہ نہیں۔ اب کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو۔ افسوس کہ سارے سوال دل ہی دل میں رہ گیا۔ میرے دوست نے میرے پاس آ کر پوچھا "سیلی کیا کہہ رہی تھی" میں نے اس کے جملے دہرا دیئے۔ وہ بولا۔ شوہر کی طرح نوکری جلدی چھوڑی تو جا سکتی ہے مگر کھوئے ہوئے یار کی طرح آسانی سے مل نہیں سکتی۔ میں نے کہا آپ ٹھیک کہتے ہیں اس نے ولسن جیسے بھلے آدمی کو بلیم لگایا ہے قدرت اس ظلم کی سزا تو ضرور دے گی۔

دوست نے دونوں ہاتھوں کو کولہوں پر رکھتے ہوئے کہا "آپ ولسن کی بات کر رہے ہیں اس کے بعد اس نے میل فرینڈ رچرڈ کو بھی انگوٹھا دکھا دیا۔ اور اس کے بعد جون روز آرٹسٹ کو بھی طلاق دیدی۔"

"آرٹسٹ میں کیا کمی نکلی" میں نے دوست سے پوچھا۔

"آپ کمی کی بات کر رہے ہیں وہ انگلینڈ کا ایک مشہور آرٹسٹ ہے۔ اس کی تصویریں ہاتھوں ہاتھ اونچی قیمتوں میں بک جاتی ہیں۔ اس کے پاس شاندار کوٹھی ہے کار ہے۔ صاحب زر ہے مگر اس کا زیادہ سے زیادہ وقت تصویریں بنانے میں بیت جاتا ہے اس لئے وہ روز سیلی کو گھمانے پھرانے نہیں لے جا پاتا ہے اس لئے سیلی کو سکھ تو خوب دیا مگر وہ تفریح باز شوہر ثابت نہ ہو سکا اور اسی کمی کی وجہ سے سیلی نے جون روز کو بھی چھوڑ دیا۔ کبھی اس نے عشق میں اندھی ہو کر نوکری چھوڑی تھی اب پریشان ہو کر نوکری کے لئے بھاگی پھرتی ہے" یہ باتیں سن کر میرے منہ سے نکلا۔ "وہ بڑی بدچلن عورت ہے"
اس پر دوست بولا "بدچلن نہیں، جذباتی ہے۔ جذباتی لوگ دور اندیش نہیں ہوتے وہ فیصلے جلد کرتے ہیں۔ اور پچھتاتے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں انیکوں عورتیں نظر سے گزرتی ہیں ان میں کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اپنے حسن و کشش کی چھاپ اس کے دل پر چھوڑ جاتی ہیں۔ اور مباشرت کے وقت وہ دل جلا انسان انہیں کا خیال اوڑھ کر اپنی بیوی کے جسم سے کھیلتا ہے۔ ہزاروں عورتوں میں سیلی کی طرح دو چار عورتیں بھی ایسی ہی نکل آتی ہیں۔ پسندیدہ پھولوں کی طرف کون ہاتھ نہیں بڑھاتا"

میں دوست کی بات سے اتنا متاثر ہوا کہ سرنگوں ہو گیا۔ اور یہ محسوس کرنے لگا کہ میں نے سیلی کو بدچلن کہہ کر غلطی کی اس کے بعد ہم دونوں ڈیوٹی پر چلے گئے۔

بہت دنوں بعد میں اور میرا دوست فریڈرک پب میں بیئر پی رہے تھے وہاں بہت اچھی قیمتی جاپانی کار آ کر رکی دونوں نے بغور اسے دیکھا۔ یکایک میرا دوست بولا "ارے یہ تو جون گرے ہے سیلی کار ڈرائیو کر رہی ہے۔

یہ اس کا میل فرینڈ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
اس نے جون گرے کی نوکری کر لی ہو۔"
"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سیلی کا شوہر ہو۔" میں نے
کہا۔
"کس بنا پر؟"
میں نے کہا۔ "اگر یہ نوکری ہوتی تو کار سے اترتے
وقت سامان کی کنڈیا ٹھیکیدار جون گرے کے ہاتھ میں
نہ ہو کر سیلی کے ہاتھ میں ہوتی۔" یہ سن کر دوست کچھ
گمبھیر ہو گیا اور بولا "کسی حد تک آپ کی بات صحیح ہے۔"
ٹھیکیدار سیلی کو جیپ میں بٹھا کر باہر دکان سے
کچھ لینے چلا گیا۔ میرا دوست اس کو تنہا دیکھ کر اس
کے پاس گیا اور بولا "سیلی تم کیسی ہو؟" وہ خوش
مزاجی سے بولی۔ "میں خوب ٹھیک ہوں۔ میرے ہسبینڈ ایک
بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ مکان بنا بنا کر سرکار کو دیتے ہیں۔
اور اچھے امیروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔"
دوست بولا "کیا تم نے ان کا گھر دیکھا ہے؟"
"ان کے گھر میں تو میں رہ ہی رہی ہوں۔" سیلی
نے اطمینان سے کہا۔
"ٹھیکیدار تو آئر لینڈ کے رہنے والے ہیں میرا مطلب
وہاں کے مکان سے تھا۔ شاید وہیں ان کی فیملی رہتی ہے۔"
"آپ کو صحیح معلوم نہیں ہے ان کی کوئی فیملی نہیں
ہے۔ وہ تو ان میرڈ (غیر شادی شدہ) ہیں۔" یہ کہہ کر
سیلی کچھ جھولے میں سے نکالنے لگی۔ میں نے دیکھا ٹھیکیدار
آ رہے تھے۔ میں نے سیٹی بجا کر اس کو وہاں سے چلے آنے
کا اشارہ کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور فوراً میرے پاس آ کر
بیٹھ گیا۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ دوست بولا اس
کا پتہ معلوم نہیں ہے چلو کار کا نمبر نوٹ کرتا ہوں اس
کے سہارے ملنا آسان ہو جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے جون
گرے نے بھی سیلی کو بے وقوف بنایا ہے۔ اور حقیقت کو چھپایا
ہے۔ سیلی نے اس وقت میرے دوست کی باتوں پہ
دھیان نہیں دیا۔ لیکن اس کے دل میں ایک شک ضرور
پیدا ہو گیا۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح اس راز کی تہہ تک
پہنچنے میں لگ گئی۔ وہ جون کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔
ایک دن جون گرے کی عدم موجودگی میں سیلی کو آئر لینڈ
سے اس کی بیوی کا بھیجا گیا خط مل گیا۔ اور اس طرح
شک کی جڑ پر ٹھنڈا پانی لگ گیا۔ وہ جون گرے سے
نفرت کرنے لگی۔ اس بات کو لے کر اس کا جھگڑا بھی ہو گیا۔
ہوتے ہوتے بات یہاں تک آ پہنچی کہ سیلی نے اپنی بات کی
پختگی میں اس خط کو پیش کر دیا۔ انجام کار جون گرے کو
منہ کی کھانی پڑی اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے وہ کسی بھی
طرح اپنے آپ کو سچا ثابت نہ کر سکے۔ سیلی نے ان کو بھی طلاق
دیدی۔

بڑے دن کو میں پھر ولسن سے جیل میں ملنے گیا۔ اس
روز وہ بہت خوش تھا۔ میں نے خوشی کا کارن پوچھا تو اس نے کہا۔
"آپ ٹھیک کہتے تھے کہ سیلی اپنی غلطی پر پچھتاتی ہے اسے میری
ہی طرح اب بھی مجھ سے پیار ہے۔ میں نے اس کی غلطی معاف
کر دی ہے۔ وہ جذباتی عورت ہے جذباتی لوگ دل کے برے
نہیں ہوتے ہیں۔ اس کا خط آیا ہے۔" کہتے ہوئے ولسن نے
جیب سے نکال کر خط پڑھنا شروع کیا۔ وہ لکھتی ہے۔
"مجھے امید ہے ولسن تم مجھے معاف کر دو گے۔ تم نے پانچ سال
تک جسمانی سزا بھگتی ہے تو میں نے بھی سماج میں رہ کر پانچ
سال تک ذہنی سزا بھوگی ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ جس شخص
کو سچا پیار مل جاتا ہے اسے زندگی میں سب سے زیادہ قیمتی
چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ عورت کا سب سے بڑا سکھ اور

(۲۵ پر)

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر ایک کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری)

نام کتاب:۔ ظہیر دہلوی ۔ حیات اور فن
مصنف:۔ ڈاکٹر مختار شمیم
ضخامت:۔ ۱۰۰ صفحات ۔ قیمت:۔ سو روپے
پتہ:۔ بھوپال بک ہاؤس۔ بدھواره، بھوپال

ڈاکٹر مختار شمیم کا یہ تحقیقی کارنامہ اس لحاظ سے خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے ایک اہم شاعر کو گمنامی کے غار میں ڈوبنے سے بچا لیا ہے۔ اس بات پر تو واقعی حیرت ہوتی ہے کہ راقم الدولہ ظہیر دہلوی اپنے عہد میں تو شہرت کے مالک تھے۔ مگر بڑی تیزی کے ساتھ لوگ انہیں مسلسل فراموش کرتے رہے۔ وہ کئی حیثیتوں سے بدنصیب رہے ہیں۔ ذوق کے شاگردوں میں داغ بھی تھے اور ظہیر بھی۔ داغ شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئے۔ اور خود دبستان کے سربراہ بن گئے۔ ظہیر وہیں کے وہیں رہے۔ امیر مینائی بھی ظہیر دہلوی کے معاصرین میں تھے۔ انہوں نے بھی خوب خوب شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اور تو اور امیر و داغ کے شاگردوں نے بھی جو مقبولیت حاصل کی وہ ظہیر کے شاگردوں کو نصیب نہ ہو سکی ـــــ لیکن جہاں تک اپنے عہد میں اپنے کلام سے معاصرین کو متاثر کرنے کا معاملہ ہے تو ظہیر دہلوی شاید سب سے زیادہ بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ ظہیر کی شاگردی سے ان کے استاد ذوق مطمئن تھے۔ ان کے معاصر داغ بھی اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے تھے کہ وہ ظہیر کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوں۔ اپنی غیر معمولی شاگر تخلیقی صلاحیت اور معاصرین میں امتیاز کی وجہ سے ہی ظہیر کو متعدد انعامات و اعزازات حاصل ہوئے۔ ان کی قصیدہ نگاری کی دھوم تھی۔ ظہیر کا کلام سن کر استاد ذوق کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر آگیا تھا کہ۔

دیوان ظہیر فاریابی
درکعبہ بدزد اگر بیابی

اور اسی شعر میں ترمیم کے عاشق ٹونکی (شاگرد ظہیر نے یہ کہا تھا کہ ؎

دیوان ظہیر دہلوی کا
کعبہ میں بھی پاؤ تو اڑا لو

ظہیر دہلوی کے یہاں ایسے حسین اور دل نشیں اشعار بھی ہیں۔

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

٥

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

بہت معمورہ ہستی اجڑے گھر نکلتے ہیں
جہاں کھودو وہیں بنیاد کے پتھر نکلتے ہیں

سودائے محبت میں یہ سر جائے تو اچھا
یہ بوجھ میرے سر سے اتر جائے تو اچھا

سخت جانی سے میرے قاتل نے خنجر رکھ دیا
میں نے دل رکھنے کو اس کے پاؤں پہ سر رکھ دیا

بس اک نگاہ غیر نے مجنوں سا بنا دیا
اللہ! تم کو حسن پہ کتنا غرور تھا

رنج راحت اثر نہ ہو جائے
درد کا دل میں گھر نہ ہو جائے

فسانۂ شب ہجراں میں دن تمام ہوا
ہوئی جو شام تو سر پہ ہے پھر بلائے فراق
ہے دل ویران شدہ بھی اک عجیب مہماں سرا
درد و غم، برسوں رہا اندوہ اکثر رہ گیا

ایسے شعر گو اور خوش گفتار شاعر اور استاذ کو ہم فراموش کرتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر مختار شمیم کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس دفتر پارینہ کی بازخوانی کی ہے۔ اور اس طرح انہوں نے ہماری شعری اور تہذیبی روایات کی ترتیب میں ایک گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

(علیم اللہ حالی)

کتاب:۔ خرام حرف (شعری مجموعہ)
شاعر:۔ دلکش ساگری مرحوم
مبصر:۔ یوسف جمال
قیمت:۔ اڑتالیس روپے
پتہ:۔ انتساب پبلیکیشنز، سیفی لائبریری، سرونج

دلکش ساگری مرحوم کے مجموعہ کلام "خرام حرف" کے مطالعہ کے بعد معاً ذہن میں حرمت الاکرام کا ایک شعر یاد آگیا۔

سورج سب کا، لیکن کس کا، کون اسے مہمان کرے
بہتا پانی، اڑتی خوشبو، ان کو میت بنائے کون

مانا کہ سورج کی مہمانی نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ دن بھر تو رہتا ہے لیکن رات کو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہی حال بہتے پانی کا ہے کہ اسے ایک جگہ ساکت نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی کیفیت خوشبو کی بھی ہے۔ جو قید نہیں ہو سکتی۔ لیکن دلکش ساگری کی شاعری سورج، بہتا پانی، اور اڑتی ہوئی خوشبو کی مانند نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کرد جائے۔ جہاں ان کی شاعری ستائش اور پذیرائی کی طالب ہے وہیں ان کی ادبی خدمات کا بغور جائزہ لیا جائے تو شدید طور پر یہ احساس ہوگا کہ دلکش نہ صرف اردو کے دیوانے تھے بلکہ انہوں نے شعری ادب سے وابستگی کو بھی اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ جنہوں نے آخری عمر تک اردو شعر و ادب کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ افسوس کہ ان کی حیات میں انہیں نے اپنے والد دلکش ساگری کے چیدہ چیدہ کلام کو محنت و عرق ریزی سے جمع کر کے

مجموعے کی شکل میں پیش کرکے ہمیں ان کی شعری اہلیتوں سے روشناس ہونے کا موقع فراہم کیا۔

"خرام حرف" دلکش ساگری مرحوم کا وہ مجموعہ کلام ہے جس کو جدید و قدیم دونوں اذہان کے افراد پسندیدہ نظروں سے دیکھیں گے۔ جہاں ان کی قدیم شاعری میں حسن و عشق، گل و بلبل، عارض و رخسار، صحن چمن دار و رسن، مہ لقا و نازنیں، گیسوئے یار، صنم و بت خانہ، سنگ و خشت و کف خار، شور و سلاسل زنداں، نالۂ پا بہ زنجیر، دستار سر، شیشہ و سنگ، سرخیٔ بہار، جام و سبو، ابرو، نوک سناں، وعدہ رنگیں، جوڑے میں گلاب کا پھول، نقرئی کلس، نوائے شعلہ، گیسوئے پیچ و خم، دادِ وفا اور غم دوراں و غم جاناں جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جن کے تناظر میں روایتی شاعری کا پرتو ابھرتا ہے۔ لیکن ساگری کے شاعری کا کمال کہئے کہ انہوں نے روایتی منظر نامہ میں بھی شگفتگی کے پھول کھلاتے ہیں ان لفظوں کو جس انداز سے برتا گیا ہے۔ جس سے قاری پرانے چاول میں نئے چاول کی خوشبو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی وسیع النظری کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ انہوں نے نئی شاعری سے اپنے دامن کو نہیں بچایا۔ اس لئے کہ وہ عہد شناس تھے اور "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے مصداق اس پر عمل کرتے تھے۔ دلکش ساگری ایک زمانہ ساز شاعر تھے۔ اس لئے وہ ادب کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ قدیم رنگوں کے علاوہ جدید رنگ کے اشعار بھی کہتے تھے۔ نمونتاً ان کے چند اشعار سے حظ اٹھائیں۔

مجھے تلاش ہے جس کی وہ تیری [illegible] میں ہے

یہ کوہ بن، یہ سمندر کھنگالتا کیوں ہے
اپنے لہو سے اٹھ کے نئی تصویر کھینچ لے
حد نگاہ تک کوئی منظر نہیں تو کیا

وے عزیز مری بات مانتے ہی نہیں
میں اس زمین پہ سردار بے قبیلہ ہوں

نہ یہ زمیں ہے میری نہ آسمان تو پھر
کوئی بتاؤ میں کس شاخ کا پرندہ ہوں

لوگ کرتے ہیں انتظار مرا
تیر کھینچے ہوئے کمانوں میں

محولا بالا اشعار میں نیا لب و لہجہ نیز جدیدیت کے رکھ رکھاؤ کو جس حسن و خوبی سے استعمال کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دلکش ساگری نئے اسلوب پر بھی اس قدر قادر تھے جس قدر قدیم طرز فکر میں طاق تھے۔

دلکش ساگری وہ خوش فکر اور باحوصلہ شاعر تھے جنہوں نے قلیل عمر میں ہی اردو شعر و ادب کو اتنا کچھ دے دیا کہ خواہ وہ کسی بھی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والا ہو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے امید ہے "خرام حرف" کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ کتابت و طباعت غیر معیاری ضرور ہیں لیکن شعروں کے معیار اور ان کے والہانہ پن میں شک نہیں کیا جا سکتا مجموعے کی جو قیمت رکھی گئی ہے اس لئے وہ مناسب نہیں ہے کہ یہ عام لوگوں کے دسترس سے باہر کی چیز ہوگی۔

[illegible]

شہرِ خیال

سہیل کے تازہ شمارے (۱۰/۵۲) میں اصغر علی انجینئر صاحب نے پریم چند کے متعلق بعض شر پسند ادیبوں کے اس الزام کی مدلل و برہن انداز میں تردید کردی ہے کہ وہ فرقہ پرست تھے۔ دراصل سماجی حقائق کو پیش کرنے والے حقیقت پسند فنکار کے ساتھ یہی مشکل رہتی ہے۔ ایک سچا تخلیق کار جس طرح مشاہدہ کرتا ہے بعینہ اسے اپنی تحریر میں ڈھال دیتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی سماج سے ہو۔ ویسے بھی مسلم سماج کے بارے میں جو کچھ انہوں نے لکھا غلط تو نہیں ہے۔ ایسے کردار تو ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے رہتے ہیں۔ ہاں یہ غلط ہوا کہ لکھنے والا پریم چند ہے جو کہ ہندو طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی بات کوئی مسلمان ادیب لکھتا تو کوئی بات نہ ہوتی۔ یوں بھی پریم چند فرقہ پرستی سے متہم نہیں کئے جا سکتے کہ ان کا رویہ بیشتر تنازعات میں سنجیدہ اور مثبت رہا ہے۔ انکے ہی کے ایک ہم عصر ادیب علامہ تاجور نجیب آبادی نے اپنے مقتدر مجلہ شاہکار لاہور دسمبر ۱۹۳۵ء میں پریم چند کا ایک مضمون سید حسن ریاض ایڈیٹر نوید لکھنؤ کے اردو ہندی کے متعلق ایک بحث کے تحت شائع کرتے ہوئے لکھا تھا: "منشی پریم چند ان نیک فطرت ہندوؤں میں سے ہیں جو اصل معنی میں بے تعصب اور ایک محب وطن ہندوستانی ہیں۔"

ڈاکٹر سید حامد حسین نے "آوارہ سجدے" کے حوالے سے کیفی اعظمی کے شعری کردار پر اچھی بحث کی ہے۔ کیفی صاحب کا تعلق اس طبائع اقلیت سے ہے جو بلا خوف لومۃ لائم، بے باکی کے ساتھ اپنے صحت مند نظریات کی تبلیغ کرتی رہتی ہے۔ گو کہ ان دنوں ناقص رویے اور خیالات کی تشہیر کرنے والے سماجی مجبوروں نے ہر شعبۂ زندگی پر اپنا تسلط جما رکھا ہے۔ مگر کیفی صاحب کی آواز ایسے میں بھی اپنا اثر دکھا کر ہی رہتی ہے۔

▲ حقانی القاسمی، علیگڑھ

صورت حال یہ ہے کہ وطن کا کونہ کونہ متاثر ہے۔ پتہ نہیں رہبروں نے کیا ٹھان رکھی ہے۔ ابھی ایک آگ سرد نہیں ہوئی کہ دوسری جگہ بھڑک اٹھتی ہے۔ وجہ چاہے جو بھی ہو۔ مگر سوچنے پر سب مجبور ہو جاتے ہیں۔ تشویش سب کی ہوتی ہے۔ دل و دماغ سب کے ہل جاتے ہیں۔

کچھ لیڈروں کو اپنا الو سیدھا کرنے سے مطلب ہے۔ یہ دیش کی جلتی ہوئی آگ پر اپنی روٹیاں سینک رہے ہیں اور سینکتے رہیں گے جب تک ہم (عوام) ان کی باتوں میں آکر بھڑکتے رہیں گے۔ یہ لیڈر دوسروں کے عیب تو تاکتے ہیں مگر اپنے گریباں میں جھانک کر نہیں دیکھتے

ہم نے جس شخص کو دیکھا ہے تو مضطر دیکھا
اپنے دامن میں لئے درد کا دفتر دیکھا
انگلیاں اوروں کے عیبوں پہ اٹھانے والے

جھانک کر تم نے کبھی اپنے بھی اندر دیکھا

▲ کرشن پرویز، کھرار

مجھے یقین ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔
سہیل کا تازہ شمارہ دیکھا، مضامین افسانے
غزلیں نظمیں وغیرہ معیاری ہیں اس میں کوئی شک
نہیں کہ آپ اس رسالے کو سنوارنے میں اپنا خون جگر
صرف کرتے ہوں گے۔

▲ ملک زادہ جاوید

سہیل کے شمارہ نمبر ۱ جلد ۱۲ میں "شہر خیال"
کے تحت میرے خط کے نیچے میرا نام آر۔ پی۔ شوخ
(R.P. SHOKH) کی بجائے آر۔ پی۔ شوق لکھا ہے
یعنی تخلص غلط ہے۔ از راہ کرم قائم کی غلطی کا ازالہ
کردیں ورنہ آر۔ پی۔ شوخ کو آر۔ پی۔ شوق سمجھا جانے
لگے گا جس سے مجھے دشواری پیش آسکتی ہے۔

▲ آر۔ پی۔ شوخ، ہریانہ

۶ر دسمبر اور اس کے بعد ہمارے ملک ہندوستان
میں بعض ناعاقبت اندیشوں اور خود غرضوں نے انسانیت
کو مجروح، جمہوریت اور سیکولرزم کو داغدار اور
ملک کو بے وقار بنانے کی جو کوشش کی ہے اس
نے گزشتہ دنوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں
میں درندگی کا راج قائم کر دیا تھا۔ جس نے اس
ملک کے سارے انصاف پسند محب وطن کو نہ صرف
دکھ پہنچایا بلکہ انہیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔
جیسے جیسے مجبور اور مظلوم ہندوستانیوں
کی غمناک کہانیاں اخبارات کے ذریعہ منظر عام
پر آرہی ہیں سخت سے سخت دل حضرات تلملا اٹھے
ہیں اور انسانوں کے ایک طبقہ کی درندگی اور
دوسرے طبقے کی بے بسی اور مظلومیت پر نہ صرف
وہ اپنے آپ سے شرمانے لگے ہیں بلکہ انہیں اپنے
پست قدی کا شدت کے ساتھ احساس بھی ہونے
لگا ہے۔

اس طرح بعض اچھے اور سچے صحافیوں اور
محترم ہندوستانیوں نے اس ظلم اور بربریت کے
خلاف نہ صرف حق اور انصاف کی آواز بلند
کی ہے بلکہ بے خبروں کو صحیح حالات سے باخبر
کر کے اور سوتے ہوؤں کو بیدار کر کے اس کی
درندگی کی مذمت کی ہے جس نے چشم زدن میں بہت
سے معصوم انسانوں کی جانیں لیں اور بے شمار
انسانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور طویل مدت
کے لئے ان کو مصائب کے سمندر میں بے بسی کے
ساتھ غوطے لگانے کے لئے ڈھکیل دیا ہے۔ ان
میں کتنوں کے گھر جلے، کتنوں کے روزگار ختم ہوئے،
بہت سے یتیم بنا دیئے گئے۔ کثیر تعداد خواتین بیوگی
کا شکار ہوئیں۔ ہزاروں لوگ اپنے نونہالوں کے
لئے رو رہے ہیں۔ اور نوجوانوں کا ماتم کر رہے
ہیں۔ اور لاکھوں لوگ اپنے ملک کی جمہوریت
کی رسوائی اور سیکولرزم کی شکست پر آنسو بہا
رہے ہیں۔ یہ لوگ مایوسیوں کے سمندر میں بے بسی
کے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ انہیں اپنا مستقبل
تاریک سے تاریک تر نظر آرہا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا ہے۔

جو لوگ دنیا کے اس بڑے ملک کو سیکولر دیکھنا
پسند نہیں کرتے ہیں انہوں نے تنگ دلی اور تنگ نظری
کا مظاہرہ یہاں کے عوام کے دلوں میں تعصب کا زہر
بھر کر کیا ہے۔ وہ سالہا سال سے ہندوستانی عوام
کو اپنی تنگ نظری سے تنگ نظر اور اپنی بے بصری
سے بے بصر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جس میں رفتہ رفتہ
انھیں کامیابی ہوئی ہے کہ افسوسناک بات یہ ہوئی
ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ تعصب کا زہر کانوں میں
گھولا جاتا رہا اور دلوں میں اتارا جاتا رہا، نفرت
کی دیوار کھڑی کی جاتی رہی۔ ماحول کو مسموم کیا جاتا رہا
اور ملک کے نگراں بے خبری کی نیند سوتے رہے۔ چنانچہ
اس کا نتیجہ وہی ہونا تھا جو آج ہمارے سامنے آیا ہے۔

غمناک بات یہ ہے کہ اب بھی ملک کی آبادی
کے ایک حصہ کو اس وحشیانہ اور غیر منصفانہ عمل
کا احساس نہیں ہوا ہے۔ ان کی آنکھیں انسانوں کے
لہولہان جسموں کو تڑپتے اور جھلسی ہوئی لاشوں کو
انسانی بربریت کی کہانی سناتے ہوئے دیکھ کر بھی
غمناک نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ وہ اسے اپنی فتح مندی
سمجھ رہے ہیں۔ وہ بے بس اور مجبور انسانوں
کو سفاکی کے ساتھ قتل کرنے کو اپنے روشن مستقبل
کے لئے فال نیک جان رہے ہیں۔

لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ گذشتہ وقتوں کا
یہ کھیل کبھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔ وہ جس زہر کو پھیلا
کر بے بس اور مجبور انسانوں کی عزت اور آبرو و جان و
مال سے کھیل رہے ہیں کہیں اس کی لپیٹ میں ساری
آبادی نہ آجائے۔ تعصب مذہبی بھی ہوتا ہے اور
ذات پات کا بھی ہوتا ہے طبقاتی بھی ہوتا ہے لسانی
اور صوبائی بھی ہوتا ہے اس لئے تعصب کو ہوا دے
کر خوش ہونا اچھی بات نہیں ہے۔

پینتالیس سال کی آزادی کے بعد ہونا یہ چاہئے
تھا کہ ملک سے غریبی دور ہوتی۔ نابرابری ختم ہوتی۔
خوشحالی کا دور دورہ ہوتا۔ تعلیم کی روشنی عام ہوتی
اتفاق و اتحاد کا زور ہوتا، ملک طاقتور بن کر
ابھرتا اور تعلیمی و سائنسی فتوحات کے سائے میں
آگے اور بہت آگے بڑھتا اور دنیا کے سامنے امن و
امان، سلامتی اور خوشحالی کا پیامبر بن کر ہر میدان
میں اس کے لئے روشن چراغ کا کام دیتا ـــ لیکن
وائے بدنصیبی چند سنگ دل اور تنگ دل مفاد پرستوں
نے اپنی مکروہ آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ملک کو
تباہی کے راستہ پر لگانے کی کوشش کی۔ اپنے اس
عمل کو وہ حب الوطنی بتا رہے ہیں۔ کوتاہ نظر
ممکن ہے ان کی بات مان لیں لیکن حقیقت میں
نگاہیں محسوس کر رہی ہیں کہ ان کی یہ کوشش
ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ اس آزمائش
کی گھڑی میں تمام صالح ذہن ہندوستانی تنگ
دلی اور تعصب کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔
اور ان کے ناپاک ارادوں سے ملک کو بچائیں۔

اس سلسلے میں خاص طور سے ادیبوں صحافیوں
اور دانشوروں کو آگے بڑھنا چاہئے اور اپنی صحت
مند اور فکر انگیز تحریروں سے ذہنوں میں بسائے
گئے تعصب کو صاف کرنا چاہئے تاکہ ایک متحد
اور مضبوط ہندوستان ابھر کر سامنے آئے۔

گذشتہ دنوں اس قدر خط لکھ کر رکھ دیا

تھا کہ اسے مکمل کر کے آپ کو بھیج دوں گا لیکن کسی وجہ سے اسے بھیجنے میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور تازہ "سہیل" آگیا۔ جسے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ "نمود" کے تحت آپ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بروقت موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ آپ کا قلم کافی صحت مند ہے۔ اس شمارے میں مناظر عاشق ہرگانوی کی "اجودھیا۔ چھ نظمیں" اور عبدالاحد ساز کی نظم "یہ تم نے کیا غضب کیا" شائع ہوئی ہیں اور جو ابھی ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

یہ بات صاف کہنے کی ہے کہ یہ ملک جتنا کسی اور کا ہے اتنا ہی ہمارا ہے۔ اس سے ہم بے پناہ محبت کرتے ہیں اس لئے اس کی محافظت کی ذمہ داری ہمارے سروں پر بھی ہے۔ ہم اسے کسی قیمت پر تباہی کی طرف جانے نہیں دیں گے اور ملک دشمن عناصر کو ملک میں نا اتفاقی اور نفرت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

سہیل کے ذریعہ ایسی تخلیقات کو خاص طور سے پیش کریں جن سے حب الوطنی اور انسان دوستی کے جذبات تیز ہوں۔ تاکہ ملک میں میل و محبت اور اتفاق و اتحاد کی فضا عام ہو۔

ممکن ہو تو اس موضوع سے متعلق سہیل کا کوئی خاص نمبر بھی پیش کریں۔

▲ عبدالقوی دسنوی، بھوپال

"سہیل" کے ایک اہم شمارے کا —

اعلان

ماہنامہ سہیل "فن اور فنکار" کے نام سے ایک عام شمارہ کچھ خصوصیت کے ساتھ پیش کر رہا ہے تمام ادبی حلقے اس بات کے معترف ہیں کہ سہیل نے اب تک متعدد فن کاروں کو متعارف کیا ہے۔ ایسے تخلیق کاروں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے جنہوں نے اہمیت اور بڑائی کا تمغہ حاصل کر لیا ہے اور ایسے افراد کو بھی آگے بڑھایا ہے جن کی تخلیقی جودت تابناک مستقبل کی پہچان دے رہی ہے
اشاعتی سلسلے نمبر ۳ کے ذریعہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

مسعود منظر

بانی :۔ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی ▲ بیادگار :۔ زین العابدین احمر و ادریس سنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

شمارہ ۳ جلد ۵۳

بدل اشتراک

فی شمارہ ۔۔۔۔ ۵ روپے
زر سالانہ ۔۔۔۔ ۵۰ روپے
لائف ممبری ۔۔۔۔ ۱۰۰۰ روپے

فہرست

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل
ریلوے سائڈ روڈ، گیا

فون نمبر :۔ ۲۱۵۷۳

ترقی اردو بیورو کی تازہ مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	صفحات	قیمت
(۱)	جواہر پارۂ ادراک	شنکر آچاریہ / کرشن کمار پاٹھک	90	8/=
(۲)	ہندوستان میں موزوں ٹکنالوجی کی تجویز	ایم۔ ایم ہیگی / ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	88	10/=
(۳)	درد علامت اور علاج	ابو سعدی خالد جاوید	212	17/=
(۴)	معالجات (اول)	حکیم وسیم احمد اعظمی	458	48/=
(۵)	آکیوپنکچر و ماکسی بوشن کے بنیادی اصول	ڈاکٹر ظہیر الدین	128	12/=
(۶)	مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر	حکیم الطاف احمد اعظمی	180	11/=
(۷)	ذوق و جستجو	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	400	34/=
(۸)	صحت الفاظ	سید بدر الحسن	254	18/=
(۹)	کلیات عیش	مرتبہ ڈاکٹر حبیبہ بانو	556	80/=
(۱۰)	قطب مشتری	ڈاکٹر حمیرا جلیلی	236	48/=
(۱۱)	سب رس کے حروف	آصفہ بیگم	99	11/=
(۱۲)	اقبال اور بچوں کا ادب	زیب النسا بیگم	216	17/=
(۱۳)	حکیت	رام لال نابھوی	192	18/=
(۱۴)	ریاست حیدرآباد میں جدوجہد آزادی	سید محمد جواد رضوی	258	20/=
(۱۵)	سوویت یونین کا سیاسی نظام اور حکومت	پروفیسر ظفر امام	1000	74/=
(۱۶)	شعر شور انگیز (حصہ اول، دوم و سوم)	شمس الرحمٰن فاروقی	فی جلد	64/=
(۱۷)	لسانی مطالعے	گیان چند جین	200	15/=
(۱۸)	رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	752	62/=
(۱۹)	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول تا پنجم	ڈاکٹر قادری محی الدین زور	فی جلد	23/=
(۲۰)	ہند کی مایہ ناز ہستیاں و دیگر مضامین	شیخ علی	176	31/=
(۲۱)	تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ / مترجم پروفیسر نذیر احمد	109	12/=
(۲۲)	عربی ادب کی تاریخ اول تا سوم	پروفیسر عبد الحلیم ندوی	مکمل سیٹ	51/=
(۲۳)	مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	404	28/=
(۲۴)	اردو کے ابتدائی ادبی معرکے	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	254	22/=
(۲۵)	فکر و تحقیق جلد دوم و سوم، چہارم	ایڈیٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	فی جلد	15/=
۲۶	اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	240	30/=

ملنے کے پتے۔ ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸ آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ساؤتھ ریجن برانچ، گرین ہاؤس، نام پلی، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد

DAVP-511(87)92

نمود

کانگریس کی حکمت عملی

کانگریس اصولی اور نظریاتی طور پر سیکولرزم کی طرف دار ہے۔ مگر آج کے کانگریس اقتدار میں جو عملی پالیسی برتی جا رہی ہے وہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ ملک میں سرگرم رجعت پرست، فسطائی اور احیا پسند طاقتوں سے مقابلہ کر رہی ہے۔ اور مذہب کے نام پر عوام کو گمراہ کرنے والی سیاسی جماعتوں اور غیر سیاسی تنظیموں کا قلع قمع کرنا چاہتی ہے ـــــ مگر یہ بات چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہے کہ نتائج اس کے برعکس ثابت ہو رہے ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اور ملک گیر سطح پر اقلیتی فرقوں کے ساتھ جو منظم تخریبی سازش ہو رہی ہے اس کی پشت پناہی کہیں نہ کہیں سے کانگریس کے اعلیٰ ترین افراد کر رہے ہیں۔ وہ سب کچھ جو ہندو فسطائی تنظیمیں کرنا چاہتی ہیں اور علی الاعلان جلسوں اور شاہراہوں میں اقلیتی فرقوں کی دل آزاری اور تخریب کاری کے منصوبوں کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ سارا کام کانگریسی اقتدار اپنے ذمہ کر لیتی ہے۔ اور ان کو عملاً برت کر یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم فسطائی طاقتوں کو ملک سے دور کر دیں گے ـــ اس حکمت عملی سے فسطائی طاقتوں اور تنظیموں کا خاتمہ تو ضرور ہو سکتا ہے مگر ان کے سارے منصوبے پورے ہوتے رہیں گے۔

ملک کے طول و عرض میں اقلیتی فرقے موجودہ صورت حال سے زبردست طور پر نالاں ہیں اور موجودہ مرکزی اقتدار کی اقلیت کشی پالیسی سے اس طرح بیزار ہیں کہ پتہ نہیں پورے ملک میں کب کہاں کون سی آگ بھڑک اٹھے ـــ اور ظاہر ہے کہ ان سارے امور کی سب سے بڑی ذمہ داری کانگریس کی حکمت عملی ہے۔ کچھ لوگ اسے کانگریس کی دوعملی پالیسی کہتے ہیں ـــ مگر میں کہتا ہوں کہ پالیسی تو اقلیت کشی ہے۔ اور صرف اقلیت کشی ـــ وہ تو ہمیں اور دنیا کو بے وقوف بنانے کی احمقانہ صورت اختیار کرنے کے لئے یہ اعلانات ہوتے ہیں کہ کانگریس سیکولرزم کی طرف دار ہے۔ اس فریب کو وہ بھی سمجھتے ہیں اور ہم بھی۔

مسعود منظر

بابری مسجد

جگن ناتھ آزاد

[۶؍ دسمبر کو میں جموں سے دہلی روانہ ہوا۔ دوسرے دن ۷؍ دسمبر کو اردو یونیورسٹی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے۔ شام کا سفر تھا۔ طیارے میں ایک ہم سفر نے بتایا کہ بابری مسجد کے ایک گنبد کو گرا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آج دوپہر تک یعنی روانگی کے وقت تک تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس نے کہا بی بی سی نے اطلاع دی ہے۔ میں درد و غم کے طوفان میں ڈوب گیا اور اسی وقت اس نظم کی ابتدا ہوئی۔ صرف ابتدا کے تین بند ہوئے تھے کہ طیارہ دہلی پہنچ گیا۔ جب میں اپنی قیام گاہ یعنی بیٹے کے گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ساری مسجد منہدم کی جا چکی ہے۔ نظم کا باقی حصہ اس اطلاع کے بعد مکمل ہوا اس لئے یہ نظم الگ الگ حصوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ (آزاد)]

(۱)

یہ تو نے ہند کی حرمت کے آئینے کو توڑا ہے
خبر بھی ہے تجھے، مسجد کا گنبد توڑنے والے؟
ہمارے دل کو توڑا ہے، عمارت کو نہیں توڑا
خباثت کی بھی حد ہوتی ہے اے حد توڑنے والے!

○

ترے اس فعل سے اسلام کا تو کچھ نہیں بگڑا
مگر گھونپا ہے خنجر تو نے ہندو دھرم کے دل میں
ادھر ہندوستاں کا تو نے چہرہ مسخ کر ڈالا
ادھر بوئے ہیں کانٹے تو نے اس کی راہ منزل میں

○

تجھے کچھ بھی خبر اس کی نہیں اے بد نصیب انساں
کہ ہندو دھرم کیا ہے اور اسکی آتما کیا ہے
نہیں۔ یہ دھرم وہ ہرگز، جسے تو دھرم کہتا ہے
تجھے کیا علم کیا ہے آتما، پرماتما کیا ہے

○

(۲)

خبر کل تک بس اتنی تھی کہ گنبد ایک ٹوٹا ہے
کھلی اب بات مسجد کا نہیں چھوڑا نشاں باقی
وہ تہذیبی تسلسل جو تھا جاری چار صدیوں سے
تو سمجھا ہے نہ رہ پائے گی اسکی داستاں باقی؟

○

میں اک گنبد کو روتا تھا مگر اب یہ کھلا مجھ پر
گرا ڈالا ہے اس ساری عبادت گاہ کو تو نے!
دیا تھا اک دل آگاہ تجھ کو دینے والے نے
یہ کس رستے پہ ڈالا ہے دلِ آگاہ کو تو نے!

○

خدا کا گھر ہے مندر بھی خدا کا گھر ہے مسجد بھی
مجھے تو میرے ہندو دھرم نے بس یہ سکھایا ہے
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز، فقط اندھی سیاست ہے
تجھے تیرا یہ درس شیطنت جس نے پڑھایا ہے

○

مروت جس کو کہتے ہیں، مودت جس کو کہتے ہیں
یہ مسجد اس مروت اس مودت کی علامت تھی
اسی کے ساتھ تو اک اپنا مندر بھی بنا لیتا
وہی تیرا بڑپن تھا وہی تیری کرامت تھی

○

خدا کے گھر کو جب تو منہدم کرنے کو نکلا تھا
خدا جانے ترے دل میں خیال خام کیا ہوگا
مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس کو اک حقیقت ہے
شقی القلب کیا کہیے ترا انجام کیا ہوگا

○

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہلِ دل کے سینے میں
خبر بھی ہے تجھے، مسجد کا پیکر توڑنے والے
ابھی یہ سرزمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

○

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

دہلی کے چار شعراء بہ نظر انتقاد

معیاری یعنی اچھی اور بڑی شاعری کا اپنا
مخصوص کشفیہ و رمزیہ ہوتا ہے۔ اس کے مزید براں اپنے
ہی گوشہ و آہنگ زملحوظ رہے، گوشہ و آہنگ موسیقی کی
اصطلاحیں ہیں) ہوتے ہیں۔ ایک جانب وہ روایت کی
پاسدار بھی ہوتی ہے تو دوسری جانب وہ روایت میں
نئی بصیرتوں اور توانائیوں کے لئے جگہ دیتی ہے۔ اسی لئے
ویدک نیز سنسکرت شعریات میں شاعری کو سام وید
(SAM . VEDA) کہا گیا ہے اور سناتن (SAN-
ATAN) یعنی ازلیہ بھی کہا گیا ہے۔ انگریزی ادبیات
میں شاعری کو QUINTESSENCE OF LI-
TERATURE یعنی ادبیات کا عطر بتایا گیا ہے۔
حیوان سینک یعنی ترنم و آہنگ زندگی پر ابھرنے والے
نغمات میں ہمارے تصورات، محرکات، صوتی صوری تیز
سماعی محاکات و مکاشفات کے تجلی زار وغیرہ سموئے
ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر غزل میں یوں تو متعدد موضوعات
پہ کہے گئے اشعار ہوتے ہیں۔ متعدد موضوعات شاعر
کی (بڑے شاعر کی) فکر و نظر کو مجروح نہیں کرتی۔ ردیف و
قوافی کے آہنگ میں جذباتی و فکریاتی ارتعاشات بھی
شامل رہتے ہیں۔ مزید براں نفسیاتی و وجدانی منسلکات
بھی سنگت کرتے ہیں۔ منسلکات ذہنی و قلبی بھرپور
حرکت و رد حرکت (QUANTAM MOTION-
& ANTI - MOTION) سے گزرتا ہوا تصور
جذباتی منتہیٰ سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اگر شعر
پہلے حرف سے لے کر آخر تک اس منتہیٰ کو تکلم (ART-
ICULATION) بخشتا ہے تو از دل خیزد بر دل
ریزد خصوصیات سے حامل ہو کر محسوسات و محرکات،
تصورات نیز منسلکات تصورات کو نور طور معنویات
سے آشنا کرتا ہے۔۔۔۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے
دوران کسی یونانی فلسفی نے کہا تھا کہ ہمارے تجربات
کی جبلّگی سے دل و دماغ میں ابھرنے والے انکشافات،
متعدد ہیجانات سے گزرتے ہوئے توازنات میں ظہور
پذیر ہوتے ہیں۔ ان ہی کو الہام و وجدان سمجھنا چاہئے۔

(طلوع افکار کراچی، اکتوبر ۹۱ء میں مشمولہ مضمون بہ قلم رستوگی)

حاصل کلام بڑی شاعری میں مرتفع خیالات و تصورات جو دل و دماغ میں جدلیاتی سلسلوں سے گزرتے ہوئے جذبات و ہیجانات میں کشید ہو کر فنون لطیفہ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بڑی شاعری کے ملتزمات میں تعقل پذیری، جذباتی توانائی، اخلاقی یعنی طور و طریق زندگانی کے اظہار میں خلوص و بے باکی نیز پیشکش میں ناگزیریت (ING- VITABILITY) - و بے ساختگی وغیرہ ہی شمول ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی شاعر کے کلام میں بڑی شاعری اور معمولی شاعری دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے لئے اقبال کے درج ذیل دو قطعے، ملحوظ رہے اقبال رباعی کی مخصوص اوزانی جکڑ بندیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قطعہ کو بھی رباعی لکھتے تھے، جو یقیناً ژرف بینی و ندرت فکر و خیال سے بھرپور صحیح عمل ہے، پیش کئے جاتے ہیں

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی
گیا دور حدیث لن ترانی
خودی جس کی ہوئی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

سحر در رفتہ باز آید نہ آید
نسیم از حجاز آید نہ آید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نہ آید

پہلا قطعہ بلاشبہ بڑی شاعری کا نمونہ ہے اور دوسرا بدقسمتی سے لن ترانی کے تحت ہی جگہ کا مستحق ہے۔ کیونکہ شاعر خودستائی پر اتر آیا

دوسرا قطعہ یا رباعی صرف مضمرات ذہنی ہی کی آئینہ دار ہے اور اسی وجہ سے ملوثات ذہنی قلبی والے لوگ دوسرے قطعہ پر زور دیتے ہیں۔ پہلے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اقبال کا ذکر آگیا۔ تو بر سبیل تذکرہ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اقبال نے حسرت موہانی کی ساختہ اصطلاح "شکست نارو" کو بھی پیش پا افتادہ سمجھا ہوگا ورنہ یہ غزل جس کا پہلا مصرع -

<u>کبھی اے</u> حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
شامل بانگ درانہ ہوتی

اقبال نے ایک اور جکڑ بندی کو بالائے طاق رکھ دیا اور وہ ہے کہ فارسی و عربی تراکیب ہی میں استعمال کرنا۔ دیکھئے ایک مثال سے

یہ دستور زباں بندی ہے کیا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

فارسی میں "زبان بندی" جادو کے اثر سے خاموش کر دینا ہو جانا اور عدالت کے روبرو گواہ کے بیان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں "زباں بندی" بولنے، آزادی سلب کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ محولہ فوق شعر میں "زباں بندی" اردو معنی میں نظم کیا گیا ہے لہذا "دستور زباں بندی" غلط ترکیب قرار پاتی ہے۔ یاس و یگانہ کی رائے سے راقم الحروف اتفاق کرتا ہے کہ ایسی فارسی و عربی الفاظ پر مشتمل ترکیب کو صحیح سمجھنا چاہئے بلکہ ایسے الفاظ کو فارسی و عربی نما ہی ہوں اضافت کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً غالب کے یہاں "غلط ہائے مضامین" آیا ہے جبکہ فارسی میں "غلطی" کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے لکھا گیا ہے کیونکہ ردو شد

ادب میں ہنوز ایسے سرپھرے موجود ہیں جو عروض کو جامد و ساکت سمجھتے ہیں۔ جو ترنم و موسیقی کی نفسیات سے نابلد ہیں اور جو شعریات اردو کے افق درافق درخشانیوں اور تابانیوں سے ناآشنا ہیں۔ اس مضمون میں دہلی کے تین معروف و مشہور شاعروں مخمور سعیدی، راج نرائن راز اور پروفیسر عنوان چشتی اور سروش کے کلام کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

جناب مخمور سعیدی سابق ریاست ٹونک جواب راجستھان کا ایک ضلع ہے کے ساکن ہیں۔ مگر چونکہ صحافت پیشہ ہیں لہٰذا دہلی میں اقامت پذیر ہیں۔ تحریک، کہکشاں، بیسویں صدی دہلی، ہماری زبان دہلی، نخلستان وغیرہ سے وابستہ رہے اور آج کل، ایوان اردو، اور امنگ میں ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شاعر بمبئی شمارہ ۸/۶۲ کو دیئے ایک مراسلے میں منجملہ دیگر امور میں نے لکھا تھا کہ.... مخمور سعیدی انسان شناس، دوست نواز، عالمانہ جستجو میں مصروف شخصیت کا نام ہے مگر میرے خیال میں جو غلط بھی ہو سکتا ہے، بہ حیثیت شاعر مخمور صاحب کو مشاہیر میں شامل ہونے کے لئے جدوجہد کرنا پڑے گی۔ صفحہ ۱۰ پر تین غزلیں شامل ہیں۔ ایک غزل بھی اچھی نہیں ہے اور یہ مطلع ہے

کچھ اتنے پاس سے ہو کر گزر گیا ایک شخص
کہ مجھ سے جیسے مجھے دور کر گیا ایک شخص

مطلع میں دو عیوب ہیں۔ پہلا دوسرے مصرع کا "ایک شخص" پہلے مصرع کا "ایک شخص" ردیف، بیکار محض ہو جاتا ہے؟

مخمور سعیدی صاحب کے پانچ مجموعہ ہائے کلام اشاعت پذیر ہو چکے ہیں مگر بنظر تنقید اچھی شاعری کے نمونے پیش کرتے ہوئے نہیں دکھائی دیتے۔ جس غزل کے مطلع کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے اشعار بھی طلوع، افکار و جذبات سے عاری ہیں۔ ایک اور مثال

خیال و خواب میں اب بھی بسا ہوا ہے مگر
نگاہ ڈھونڈ رہی ہے کدھر گیا اک شخص

اب اگر موصوف سے دریافت کیا جائے کہ کیا لفظ "ایک" کے معنوں میں "وہ" بھی شامل ہے تو نہ جانے کیا جواب دیں گے۔ اگر "اک" جگہ "وہ" بھی بنا دیا جائے تو شعر سے لفظی عیب دور ہو جانے پر بھی معنوی اعتبار سے اس شعر کو کبھی در خور اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ یہی کیا پوری غزل ہی بغایت پوچ ہے۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو، وہ غزل جو بہ خط شاعر شائع ہوئی ہے۔ مطلع ہے

سن لی صدائے کوہ ندا اور چل پڑے
ہم سے کسی نے کچھ نہ کہا اور چل پڑے

ندا کے معنی بھی صدا ہیں۔ غالباً شاعر کا اشارہ کسی پہاڑ کی جانب ہے جس کا نام "کوہ ندا" ہے۔ بہرا لعبدہ مطلع ہے۔ معنوی سطح پر بالکل ہیچ و پوچ اور دو لخت بھی ہے۔ "کوہ ندا" نے کہا ہے تو شاعر کا یہ کہنا "کچھ نہ کہا" اس پوری غزل میں ایک بھی شعر ایسا نہیں ہے جسے اچھا کہا جا سکے۔ یہ مطلع ہے

اس کے ملنے کا احتمال سا کچھ
ہجر میں عالم وصال سا کچھ

بھی طلوع معنوی کا حامل نہیں ہے۔ پوری غزل میں مبتذل اشعار ہیں۔ اس غزل میں ایک شعر ہے ؎

حاصل عشق کیا کہیں کیا ہے
ہاتھ آیا ہے بے مثال سا کچھ

وہ بے مثال سا کچھ کیا ہو سکتا ہے فی البطن شاعر ہو کر

رہ گیا ہے ۔

ہم گزرگاہِ وقت تھے مخمور
ہم پہ گزرا ہے ماہ و سال سا کچھ

کیا "گذرگاہ" کو "گزرگاہ" اور "گذرا" کو "گزرا" لکھنا صحیح ہے ؟ املا بھی غلط ۔

جناب کرشن موہن جو فی الواقع اچھے شاعروں اور اردو شعری ادب میں خاصا کچھ اضافہ کر رہے ہیں نے اپنے مضمون "فکر و احساس کا عکس" (شاعر بمبئی شمارہ ۶/۶۲) میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو خیر اپنی جگہ غیر معیاری ہے ہی اس میں مجبور صاحب کے کلام سے بطور مثال کچھ اشعار بھی نذر کئے ہیں ۔ جو درج ذیل ہیں ۔

اک تیرہ باطن ان بستیوں کا سردار ہوگا
پہچان یہ ہے اس کا لبادہ زرد ہوگا

اجلے خوش پوشاک بدن اس بستی کے
میلی روحیں اپنے اندر رکھتے ہیں

دماغ و دل میں یہ سانپوں کی سرسراہٹ سی
ہوا چلی تو کھنڈر جاگ اٹھے خیالوں کے

اور ملاحظہ فرمائیں ـــ

رشتوں کی اک بھیڑ ہے میرے ساتھ مگر تنہا ہوں میں
کہہ نہ سکا جو درد کسی سے آج وہ تجھ سے کہہ دوں میں

وہ اور اس کا ایک ربط رائگاں میں کون ہوں
دو پرانے دوستوں کے درمیاں میں کون ہوں

نمودِ سوزِ جاں منظر بہ منظر
یہی شعلہ جواں منظر بہ منظر

کیا ان تینوں میں کوئی مطلع کسی سطح پر معیاری کہا جا سکتا ہے ۔

غرض کہ مخمور صاحب کو سربرآوردہ شعراء کی فہرست میں شامل سمجھنا دشوار ہے ۔ اور موصوف ہیں کہ وہ اسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہیں کہ وہ بڑے شاعر ہیں ۔ صحافت ، چونکہ یہاں موضوع سخن نہیں ہے میں بھی بزعم خود جو سمجھتے ہیں ۔ میں نہیں ۔ بہرکیف ، اب راج نرائن رآز جو مرکزی سرکار کے محکمہ اطلاعات نشریات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آج کل اردو (ماہنامہ بھارت سرکار نئی دہلی) کے مدیر اعلیٰ ہوگئے ۔ اور موصوف کے دور ادارت نے "آج کل" کو کیسی باغ و بہار سے آشنا کیا ۔ ایسا موضوع ہے جس پر لکھنا تو ضیع اوقات ہی کے مترادف ہوگا ـــ بہ حیثیت شاعر بھی وہ ادبیاتی خدوخال کے حامل نہیں دکھائی دیتے ۔ شروعات ، مطلع کہنے سے کی جائے ۔ پانچ غزلوں کے مطلع مثال کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ۔

اپنے کشکول میں سورج ہے کہ خالی ٹھہرے
دیکھ اے تیرہ شبی ہم ترے والی ٹھہرے

خاموشی موج موج ، سمندر صدا کا ہوں
اظہار آپ سوچئے کس کی ادا کا ہوں

موج انفاس کو روانی دے
رات کوئی تو داستانی دے

باہم سلوکِ خامی کا اک سلسلہ تو ہے
وہ کون ساتھ ساتھ ہے لیکن جدا بھی ہے

سوچئے، گرمئ گفتار کہاں سے آئی
لب بہ لب خواہش اظہار کہاں سے آئی

پہلے مطلع میں لفظ کشکول ہے جس کے معنوں میں کاسۂ گدائی، گداگر، کشتی نما صراحی، بیاض وغیرہ مشمول ہوتے ہیں۔ شاعر نے کس معنی میں لیا ہے پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے مصرعے میں تیرہ شبی کا والی یعنی مالک ہونے کا بے تکا دعویٰ کیا ہے لہٰذا خیال یہی گذرتا ہے کہ شاعر نے کشکول کو فقیر کا پیالہ ہی سمجھا ہے۔ "سورج" سے مراد اگر آفتاب ہی ہے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ شاعر کے تصرف میں سورج کیسے آگیا۔ لغویات سے بھرپور مطلع ہے۔

دوسرا مطلع صاف ہے مگر مبتدیانہ نوعیت ہی کا ہے۔ پیش پا افتادہ تصور ہے۔ تیسرا مطلع بھی گومگو ہے۔ پتہ نہیں کس سے خطاب ہے؟ چوتھا مطلع صاف شہادت دے رہا ہے کہ شاعر "سلوک" کے معنوں سے واقف نہیں ہے۔ سلوک خاص کیا ہے۔ مزید براں "ساتھ" اور "ساتھ ساتھ" کے مابین لطیف فرق ہے۔ غالباً یوں کہنا بہتر ہوتا

وہ کون ہے جو ساتھ بھی لیکن جدا بھی ہے

ان ہی غزلوں سے لئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں
ان مثالوں سے بھی شعری بے مائیگی ابھرتی ہے ۔

برگ خزاں کی زرد سی تحریر ہے مگر
دشت شفق میں پھول سنہرا کھلا بھی ہے

برگ خزاں سے مطلب؟ اور دشت شفق چہ معنی دارد؟

آؤ بنائیں کشتیاں کاغذ کی جل کے راز
پروا چلی ہے جھوم کے بادل اٹھا بھی ہے

مقطع ہے "جل کے" برائے بیت کہا گیا ہے۔ اس کی جگہ "آؤ" کی تکرار فصاحت پیدا کر سکتی تھی مگر راز اس راز کو نہیں سمجھتے۔ اور، جھوم کے گھٹا اٹھتی ہے۔ بادل کے ساتھ روزمرہ کے خلاف ہے۔ مقطع ہے ۔

سوچتا ہوں کہ خوش انداز دلوں میں اے راز
شورش خوئے دل آزار کہاں سے آئی

شاعر فارسی سے ناواقف محض ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے ورنہ دل کو خوش انداز نظم کرنے کی بجائے خوش اندیشہ استعمال کرتا۔ دوسرے مصرع میں "شورش" بھی ٹاٹ میں زربفت کا پیوند لگاتا لفظ نظم کیا گیا ہے۔

راز کس شے کی مہک چار طرف پھیل گئی
ہاں مہک شاخ ہنر کی ہے مثالی ٹھہرے

واقعی تک بندی میں راز مثالی ہیں۔ مہک پھول سے منسوب کرنا افصح ہوتا ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ "ہاں" برائے بیت ہے۔ اگر اس کو یوں کر لیا جائے

راز جس شے کی مہک چاروں طرف پھیل گئی
اپنے گل ہائے ہنر کی ہے، مثالی ٹھہرے

ٹھیک تو ہو گیا مگر معنوی اعتبار سے کوئی سطح حاصل نہیں کر سکا۔

عنوان چشتی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو میں پروفیسر ہیں اور اردو شاعری میں نام نہاد دبستان ابر گنوری سے وابستہ ہیں۔ ابر گنوری جب رام پور سے ماہنامہ احسن نکالنا شروع کیا تو موصوف کبھی کبھی چندوسی بھی آیا کرتے تھے اور میرے دوست حکیم صدیق احمد نامی (مرحوم) سمبھولی کے مطب میں مجھے ابر صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ بہ حیثیت شاعر تو کوئی مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

مگر شاگردوں کی ایک فوج ضرور تیار کر گئے۔ ان کی
عمر بھر کی شاعری میں ایک بھی معیاری شعر تلاش بسیار
پر بھی نہیں ملتا۔ عروض دانی کا زعم تو بہت تھا مگر
چونکہ وہ علم کو جامد و ساکت سمجھتے تھے نیز عالمی
عروضیات سے ناآشنائے محض تھے۔ انتقال سے
۵۰ سال پیشتر بہائی مذہب سے مشرف ہو گئے تھے۔
ابر کے دو تین شاگردوں ہی کو اچھے شاعروں کی فہرست
میں جگہ مل سکتی ہے۔ چونکہ ابر کا عروضیاتی کا خبط
مراق کے آسیب نے عنوان چشتی کو پوری طرح
اپنے قابو سانہ گرفت میں لے لیا ہے لہٰذا بحیثیت
شاعر موصوف کوئی پیش رفت نہیں کر سکے ہیں۔
شروعات چھ غزلوں کے مطلعوں سے کی جاتی ہے۔

وہ سوچتا ہے کہ سارا جہاں سالم ہے
کہ جس کے سر پہ اسی سائباں سالم ہے

کسی سے قرب ہے مجھ کو نہ کوئی دوری ہے
یہ بات سچ ہے مگر کتنی لاشعوری ہے

ہوائیں تیز بہت ہیں چراغ جاں کے لئے
کہاں سے لاؤں لہو شعلہ فغاں کے لئے

خراب حال کو ماحول کی دہائی نہ دے
برا سہی وہ مگر اسے برائی نہ دے

ابھی سے صلح کا پیغام درمیاں میں ہے
مرے حریف مرا تیر ابھی کماں میں ہے

نظر خیرہ ہے اس کی زندگی دیکھی نہیں جاتی
اندھیروں کا پلا ہے روشنی دیکھی نہیں جاتی

ان میں سے ایک بھی مطلع ایسا نہیں ہے جس کو
آشفتگیٔ جذبہ میں کشیدگی ہوئی خرد آگہی سے بھر
پور کہا جا سکے۔ ہر مطلع بحوالہ مطلع نثریت آلودہ ہے۔
تصور دبیش کش میں کوئی کشش نہیں ہے۔ پہلا
مطلع میں لفظ "جہاں" بہ اعلان نون نظم ہوا ہے جب
کہ روزمرہ میں نون غنہ سے بولا جاتا ہے۔ غلط نہیں
ہے مگر اچھا بھی نہیں۔ دوسرا مصرع ترمیم کرنے پر کچھ
درست کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہہ کر

کسی سے قرب ہے مجھ کو نہ کوئی دوری ہے
اگر یہ سچ ہے تو یہ کیسی لاشعوری ہے

استعجاب و استفہام کے معنویت پیدا کر دی، خود
احتسابی کا پہلو بھی ابھرا۔ تیسرے مطلع میں "ہوائیں"
کیوں کہا گیا، ہوا کیوں نہیں؟ اگر برائے بیت ہوا
ہے تو بھی خامی در آئی۔ ایک بھی مطلع، ایک بھی
شعر ایسا نہیں ہے جس کو معیاری کہا جا سکے۔ یہ شعر
دیکھیے ؎

کبھی تو سچ کی بلندی سے بولئے صاحب
ہر ایک بات میں کیا مصلحت ضروری ہے

"سچ کی بلندی"۔ یہ شعر کہنے کی پستی ظاہر ہو رہی
ہے۔ اگر یوں کر لیا جائے تو کیا برا ہے

کبھی کبھی ہی سہی سچ بھی بولئے صاحب
ہر ایک بات میں کیا مصلحت ضروری ہے

مشتے نمونہ از خروارے، ہی سے ثابت ہو جاتا ہے
کہ عنوان صاحب شاعری میں مقام و مرتبہ حاصل
کرنے میں قاصر رہے ہیں۔ بہ حیثیت ناقد بھی موصوف

کوئی سیر حاصل کام میری نظر سے نہیں گزرا۔ پروفیسر
عنوان چشتی بڑے شریف النفس شخص ہیں اور
حفظ مراتب کی پاسداری کرتے ہیں۔
جناب رفعت سروش جو آکاش وانی،
شعبۂ اردو میں پروگرام ترتیب دینے سے وابستہ
تھے بارسوخ حیثیت کے حامل ہوگئے۔ بہ حیثیت
شاعر موصوف اچھے شاعر ہیں نہ بڑے شاعر۔ بڑا
شاعر اچھا بھی ہوتا ہے مگر ہر اچھے شاعر کو بڑا شاعر
نہیں کہا جا سکتا۔ اچھے شعر میں جذبے اور پیش کش
کا حسین سنگم تو ہوتا ہے مگر اس کی کوئی فکری
سطح نہیں ہوتی، مثلاً ثاقب لکھنوی کا یہ شعر ؎

کچھ اور مانگنا مرے مذہب میں کفر ہے
لا، اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

فقط اچھا شعر ہے۔ برسبیل تذکرہ بات کے بعد سروش
صاحب کے کئی مطلع ملاحظہ فرمائیں ؎

ہر قدم گردِ حوادث میں چھپایا ہے مجھے
گردشِ وقت نے افسانہ بنایا ہے مجھے

گھر کو اب دشتِ کربلا لکھوں
آج خود اپنا مرثیہ لکھوں

ہم سفر پہ نکلے تھے لوٹ کر جو گھر آئے
جنگلوں کے سناٹے اپنے منتظر پائے

شہر شور و شر تنہا، گھر کے بام و در تنہا
تم نہیں تو لگتا ہے عام بشر تنہا

لذتِ درد کا حسرت و یاس کا
میرا دل اب جزیرہ ہے احساس کا

سبھی ندرت تصور، حسنِ پیشکش وغیرہ شعری
خصوصیات سے عاری نظر آتے ہیں۔ روایت
زدگی سے موصوف آب و رنگ شعری سے مشرف
نہیں ہو سکے مگر وہ اپنا شمار بڑے شاعروں
میں سمجھتے ہیں۔
اس مضمون میں مثالیں صرف غزلوں ہی سے
دی گئی ہیں۔ مذکورہ شعراء نے نظمیں وغیرہ بھی کہی
ہیں۔ مگر کسی صنف سخن میں ان میں سے کوئی بھی مابعد
الغات شعری کی خصوصیات تک نہیں پہنچ سکا۔
مابعد الغاتِ شعری میری وضع کردہ اصطلاح ہے
جس کے تحت وہ تمام تر خصوصیات اور طرز و ترتیب

بقیہ صفحہ ۳۰ پر دیکھیں

(بقیہ از واحد لاشے)

آنسوؤں کی شکست کا عمل اپنی تکمیل کو پہنچا تو
دروازے پر دستک ہوئی۔
دروازے پر دستک اب بھی جاری ہے.... میں
جانتا ہوں کہ باہر گدھے میرے منتظر ہیں..... بے حیا کوفیو..
...... دشمنِ شاہ دیں کوفیو.... مسخرے کوفیو....
میری راہ مسدود ہے کہ دروازے پر گدھے میری راہ کا پتھر
ہیں..... اور امام باڑے اور میرے بیچ نا قدر شناسوں
کا انبوہ حائل ہے؛
اور میرا ناقہ شکستہ کھنڈر امام باڑے کے حصار
میں اسیر اپنے سم پٹخ رہا ہے!!

قدغن ہے کہ اس گھر میں کوئی آنے نہ پائے ؎
گر بے خبر آ جائے تو جانے نہ پائے

میں اب تک موت کے بعد کے مراحل سے پوری طرح نبرد آزما
نہیں ہو سکا ہوں۔
اسی دوران ایک سوال اور اٹھ کھڑا ہوا ہے...
.... کیا واقعی سوگ کی مدت صرف چالیس دن ہی ہے؟؟

اصغر علی انجینئر

پریم چند۔ حیات اور فن قسط ۱۳

پریم چند کے فن کا اجمالی جائزہ

ہم نے پریم چند کے مذکورہ بالا خطبے
ں ان کی فنی نظریات سے ان ہی کے الفاظ میں
قفیت حاصل کی۔ اب ہم ان کی تخلیقات کو سامنے
ھ کر ان کے فن کا اجمالی جائزہ لیں گے۔ یہاں محدود
ﺍلت کے پیش نظر ان کے فن کا تفصیلی جائزہ لینا یا
ن کی تخلیقات کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے
م چند اہم تصنیفات کو سامنے رکھ کر ان کے فن پر
ﺠمالی گفتگو کرسکیں گے۔

جدید کہانی کے ارتقا میں پریم چند کا اہم حصہ
ہے اس سے شاید ہی کوئی نقاد، نکار کی جرأت کرسکے
۔ یہ حصہ کس قدر اہم ہے۔ اس بات پر البتہ اختلاف
ہوسکتا ہے۔ یقیناً پریم چند کے بعد کہانی اور ناول کے
ن نے بہت کچھ ترقی کی ہے اور فنی اور تکنیکی اعتبار
سے کئی بہتر کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس کے
باوجود پریم چند کی اہمیت جدید کہانی کی تاریخ میں اپنی
جگہ مسلم ہے۔ پریم چند نے کہانی کے فن کو محض داستان
یا افسوں طرازی کے جنگل سے نکال کر ایک نئے راستے
پر ڈال دیا اور اسے زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر
کر دیا ہے یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو
اور ہندی کہانی کو پریم چند نے جدید فکشن کی دنیا میں ایک
باعزت مقام دلایا۔ پریم چند پہلے اہم ادیب ہیں جنہوں نے اردو
فکشن کو حقیقت نگاری سے روشناس کرایا۔

اس بات کے پیش نظر کہ پریم چند نے اردو کہانی
میں حقیقت نگاری کی طرح ڈالی یہاں یہ ضروری ہوجاتا
ہے کہ ہم پہلے مختصراً حقیقت نگاری سے تھوڑی بحث
کرلیں۔ یوروپی ادب میں حقیقت نگاری کی اصطلاح یوں
تو انیسویں صدی سے استعمال ہوتی آئی ہے۔ لیکن
بیسویں صدی میں محض حقیقت نگاری ایک مجہول تصور
بن گیا اور روس میں سوشلسٹ انقلاب کے بعد اس پر

لفظ "سوشلسٹ" کا اضافہ کیا گیا اور اب اسے کینیڈ
ادب میں سماج وادی حقیقت نگاری یا سوشلسٹ
ریلزم کہا جانے لگا اور لوکاچ وغیرہ نے انیسویں صدی
کی حقیقت نگاری کو سوشلسٹ ریلزم سے ممتاز کرنے
کے لئے critical realism یعنی کہ انتقادی
حقیقت نگاری کی اصطلاح وضع کی۔ اب سوشلسٹ ریلزم
سے مراد اس ریلزم سے لی جانے لگی جس میں محنت کش
طبقے کے طبقاتی سماج میں اس نظریئے سے تصنیف کیا گیا
ہو جو پوری طرح سے سماج مادی ہو لیکن بہر حال
اس قدر طبقاتی سماج کی طرف ناقدانہ رویہ اختیار
کرتا ہو کہ وہ اس کی اہم سچائیوں کو بے نقاب کرنے میں
کامیاب ہو جانے اور انسانی شعور کو ان پابندیوں سے آزاد
کرا سکے۔ جو طبقاتی سماج نے اس پر عائد کر رکھی ہیں۔
انیسویں صدی میں انگریزی ادب میں چارلس ڈکنس انتقادی
حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔ ڈکنس کے ناول
کا پیکر ٹھوس ہوتا ہے۔ محض نظریاتی نہیں۔ اس کی
کئی جہتیں ہوتی ہیں۔ وہ ارتقا پذیر ہوتا ہے ٹھہرا ہوا نہیں
وہ تاریخی ہوتا ہے مابعد الطبعاتی نہیں اور اس
کا مواد بھی مقبول عام ہوتا ہے۔ ڈکنس خود حقیقت
نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حکمراں طبقوں پر
میرا اعتماد نہ ہونے کے برابر ہے اور محکوم طبقوں پر میرا اعتماد
لامحدود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صاف طبقاتی شعور نہ
ہوتے ہو۔ ے بھی ایک انتقادی حقیقت نگار کی ساری
ہمدردیاں محکوم طبقوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔
اگر پریم چند کی تخلیقات کو اس کسوٹی پر رکھا
جائے تو وہ ڈکنس کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ شروع سے
ہی انہیں مظلوم اور محکوم طبقوں سے ہمدردی رہی اور
اپنی کہانیوں اور ناولوں میں انہوں نے بھرپور طریقے سے
اپنی اس ہمدردی کا اظہار کیا۔ پریم چند کے یہاں طبقاتی
شعور تو ان کی عمر کے آخری دور میں پیدا ہوا جیسا کہ ہم
پہلے ہی دیکھ چکے ہیں لیکن ان کے آخری اہم اور مکمل ناول
گئو دان میں بھی طبقاتی شعور کا واضح تصور نہیں ملتا۔
حالانکہ اور ناولوں کے مقابلے میں اس ناول میں وہ طبقاتی
شعور کے قریب ضرور آجاتے ہیں۔ "منگل سوتر" اگر مکمل
ہوتا تو وہ ان کا آخری اور سب سے اہم ناول ہوتا لیکن
وہ اس ناول کے صرف چار ابواب ہی لکھ سکے۔ جیسا
کہ مہاجنی تہذیب والے مضمون سے اور ترقی پسند
مصنفین کی کانفرنس میں دیئے گئے خطبہ صدارت
سے ظاہر ہے وہ عمر کے اس مرحلے میں سوشلزم کے مکمل
حامی ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کہ اگر موت انہیں منگل سوتر
مکمل کرنے کی مہلت دیتی تو وہ سوشلسٹ ریلزم
کو استعمال کرتے۔ لیکن وہ ناول مکمل نہ ہو سکا اس
لئے یہ بات مفروضے کی حد سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ اس
لئے ہم پریم چند کو انتقادی حقیقت نگار کے زمرے میں ہی
رکھیں گے۔ اور اس معنیٰ میں وہ گورکی کے مقابلے میں چارلس
ڈکنس کے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ
چارلس ڈکنس کے ناولوں کی جو خصوصیات بتائی گئی ہیں
وہ بڑی حد تک ہمیں پریم چند کے یہاں بھی نظر آتی ہیں۔
اگر ان کی دور اول کی کہانیوں اور ناولوں کو چھوڑ دیا
جائے تو پریم چند کے ناول ہمیں محض نظریاتی کے مقابلے
میں ٹھوس یک طرفہ کے بجائے کئی جہتوں والا، ٹھہرے
ہوئے کے بجائے ارتقا پذیر اور مابعد الطبعیاتی کے مقابلے
میں تاریخی یعنی زمان کو حقیقی تسلیم کرنے والے نظر آئیں
گے۔

بعض لوگوں نے حقیقت نگاری کو فوٹو گرافک معروضی حقیقت کی جوں کی توں عکاسی کرنا سمجھ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مارکسی دانشوروں نے سوشلسٹ ریلزم کا اتنا محدود تصور قائم کر لیا ہے کہ اس میں اس قسم کی میکانکی عکاسی کے علاوہ کسی اور تکنک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی۔ لیکن پریم چند کے یہاں ہمیں حقیقت نگاری کا ایسا میکانکی تصور نہیں ملتا۔ حقیقت وہی نہیں ہے جیسا ہم اسے پاتے ہیں بلکہ وہ ایک بدلتا ہوا اور بدلنے والا عمل بھی ہے۔ ایک نئی ابھرتی ہوئی حقیقت بالتصور بھی ہے۔ خود پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے۔ " میں حقیقت پسند نہیں ہوں (اسی میکانکی معنی میں) کہانی میں چیز جیوں کی تیوں رکھی جائے تو سوانح عمری ہو جائے گی دستار کی طرح ادیب کا حقیقت پسند ہونا ضروری نہیں وہ ہو بھی نہیں سکتا۔ ادب کی تخلیق گروہ انسان کو آگے بڑھانے اٹھانے کے لئے ہوتی ہے۔۔ ۔۔ مثالیت ضرور ہو لیکن حقیقت پسندی اور فطری انداز کے برعکس نہ ہو اس طرح حقیقت پسند بھی مثالیت کو نہ بھولے تو بہتر ہے " اس طرح یہ بات واضح ہے کہ پریم چند حقیقت نگاروں کو فوٹو گرافی یا سوانح حیات کے معنیٰ میں تسلیم نہیں کرتے بلکہ انسان اور انسانی سماج کو اٹھانے اور آگے بڑھانے کے معنیٰ میں مانتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ حقیقت کی طرف انتقادی رویہ اختیار کرنا اور تبدیلی کے عمل پر اور دیگر نئی ابھرتی ہوئی حقیقت جو انسان کے ظاہر و باطن کو زیادہ حسین اور صحت مند بنانے کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے صحیح معنیٰ میں حقیقت نگاری کے زمرے میں شامل ہے اور یہ حقیقت نگاری زیادہ جاندار اور ماضی اور مستقبل سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہوتی ہے۔

جہاں فن کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو بڑا اہم ہے اور حقیقت نگار کی تعبیر کرتا ہے امکان اور حقیقت (POSSIBLE AND ACTUAL) میں ادیب کے لئے ہمیشہ ایک منار کی ہوتی ہے۔ ادیب امکان کا یقین اپنے آدرش کو کرتا ہے دور زندگی کی خوبصورتیوں کا تضاد نظر آتی ہے۔ جن کے امکان کا تعین وہ کر چکا ہے۔ موجودہ حقیقت (افلاس، جہالت، اونچ نیچ، لوٹ کھسوٹ، دولت کی غلط تقسیم وغیرہ وغیرہ) سماج کو بدصورت بناتی ہے اور ادیب ایک امکانی دنیا کی خوبصورتی (جہاں یہ سب کچھ نہیں ہوگا جو آج کے سماج کو بدنما بنائے ہوئے ہے) کو کچھ غلو کے ساتھ (یعنی خوبصورت کو اور خوبصورت بنا کر) پیش کرتا ہے اور اپنے قلم کے زور سے لیکھک امکان اور حقیقت کے درمیان پائے جانے والے بناؤ کو اپنے تخلیقی فن پارے کا حصہ بنا دیتا ہے۔ فن پارے میں پایا جانے والا یہ تناؤ جتنا شدید ہوگا، اس کی جمالیاتی کیفیت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ کانٹ بھی ادب سے متعلق اپنے جمالیاتی نظریئے میں اس تناؤ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ پریم چند بھی امکان اور حقیقت کے اس تناؤ کا پورا شعور رکھتے ہیں۔ اور ادب کے مقاصد متعین کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں اس کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

میرے خیال سے اور ہم سب کے خیال سے ادب کے تین مقاصد ہیں یعنی کہ جذبات کی تطہیر (Catharsis) - تفریح اور کشف۔ لیکن ایک طرح سے تفریح اور کشف، تطہیر کے عمل میں ہی شامل ہیں کیونکہ ادیب جیسی

طرز کی تفریح مہیا کرتا ہے وہ قلابازوں اور نقالوں یا
بھانڈوں کی تفریح سے مختلف ہوتی ہے۔ ادب سے حاصل
ہونے والی تفریح میں جذبات کی تطہیر کی کیفیت موجود ہوتی
ہے۔ اگر تطہیر کا مقصد سامنے رکھا جائے تو کشف کی
کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ ہم داخلی ذہنی کیفیت دکھاتے
ہیں اس لئے نہیں کہ ہمیں کوئی فلسفہ پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ
اس لئے کہ ہم خوبصورت کو اور خوبصورت اور بدصورت کو
اور بدصورت بنا سکیں۔

دراصل یہی ایک فنکار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ
بدصورت موجودہ حقیقت اور خوبصورت امکان میں شدت
سے تناؤ پیدا کرے اور اپنے قاری کی داخلی کیفیت کو بھرپور
طریقے سے متاثر کرے تاکہ اس پر ایک نئی حقیقت جو کہ امکانی
حقیقت ہے، انکشاف ہوجائے اور اس بات کو پریم
چند ادب کے مقاصد میں شامل کرتے ہیں۔

فرانس کے ایک مشہور ادیب بالزاک نے اپنے
ایک معاصر فرانسیسی ادیب کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے
ایک بڑے معرکے کی بات کہی تھی کہ اگر ایک ادیب تاریخ
کے عظیم واقعات کی خارجی چمک دمک میں الجھ جائے اور
سماجی عناصر کے ارتقاء پذیر میں پائی جانے والی داخلی
ثروت (innerrichness) تک نہ پہنچ سکے تو
وہ ادیب اپنے فن سے ہی واقف کار نہیں کہا جاسکتا
بالزاک نے یہاں جمالیات کے ایک بہت ہی اہم پہلو
کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی بھی فن پارے میں خوبصورتی
اور قوت (قاری کو متاثر کرنے کی قوت) تاریخ کے عظیم الشان
واقعات کی چمک دمک بیان کردینے سے نہیں ہوتی بلکہ اصل
قوت اور خوبصورتی کا سرچشمہ اس داخلی ثروت میں ہوتا
ہے جو سماجی عناصر کے مخصوص طور پر ہونے والے ارتقائی
عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے عام مشاہدے
کی ہے کہ اگر چھوٹا فنکار کسی عظیم تاریخی واقعے پر کہانی
یا ناول لکھتا ہے تو وہ اس کی خارجی چمک دمک میں
الجھ کر رہ جاتا ہے کیوں کہ اس کے چھوٹے ذہن کے لئے
ان واقعات کا بوجھ ہی بہت بھاری ہوتا ہے۔ اس کے
برعکس ایک بڑا فنکار اس خارجی چمک دمک میں نہیں
الجھتا بلکہ ان داخلی سرچشموں کی تلاش کرتا ہے جو اس
تاریخی واقعے کے تمام تضادات اور ان سماجی عناصر
اور عوامل کی نشاندہی کرسکے جن سے اس عظیم تاریخی واقعے
کے تانے بانے بنتے ہیں۔ وہ فرانسیسی انقلاب ہو یا
روسی انقلاب یا ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ان
پر عظیم ناول اسی صورت میں لکھا جاسکتا ہے جب یہ
شرائط پوری ہوں، جن کی طرف بالزاک اشارہ کرتا ہے۔

پریم چند نے ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جب
ہندوستان ایک زبردست بحرانی دور سے گذر رہا تھا۔
برطانوی حکومت صدیوں پرانے ہندوستانی سماج
میں نئے پیداواری رشتے اور ایک حد تک نئی پیداواری
طاقتوں کو جنم دیکر حرکت پیدا کردی تھی۔ یہ محض ماضی
کی طرح حکمرانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی، برطانوی
حکومت نے ایک نئے سماجی نظام کو بھی جنم دیا تھا۔
پریم چند نے اپنی دوربین نگاہوں سے اس فرق کو
محسوس کرلیا تھا۔ ان کی آنکھیں کبھی خارجی چمک
دمک پر مرکوز نہیں رہیں۔ ان کی تیز بیں نگاہیں اس
کے پیچھے دیہاتی ہندوستان میں پائے جانے والے تضادات
اور یہاں کے مفلس عوام کی داخلی زندگی میں خام مواد
تلاش کرتی ہیں اور وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے
ذریعہ امکانی اور کے درمیان پائے جانے والے تناؤ

کو پورے شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی
اصل طاقت کا سرچشمہ انہیں دیہات کے ان مفلس
عوام میں نظر آیا جو اپنی زندگی میں معمولی سی خوشگواری
پیدا کرنے کے لئے سخت سے سخت مشقتوں کا سامنا
کرتے رہتے ہیں اور اس معمولی سی خوشگواری کی تمنا اپنے
سینوں سے لگائے آخر موت کی آغوش میں سو جاتے
ہیں۔ گئو دان میں ہوری ایک ایسا ہی کردار ہے، ہوری
کی ایک چھوٹی سی تمنا جو روائتی معاشرے میں ہر ہندوستانی
کسان کی ہوتی ہے۔ یعنی کہ ایک گائے حاصل کرنے کی
تمنا، یہ تمنا ہوری کی زندگی کی جدوجہد کا محور ہے اور
پریم چند اس ناول میں دیہاتی زندگی کے تمام تضادات
اور تلخیوں کو بھرپور طریقے سے اس میں اجاگر کر دیتے
ہیں۔

برطانوی حکومت نے اپنے استحصالی مقاصد
کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسی تبدیلی کا عمل
ہندوستان کے روائتی معاشرے میں پیدا کر دیا
تھا جس پر ان کا بھی قابو پانا مشکل تھا۔ تبدیلی کے
اس عمل نے ہندوستانی عوام میں نہ صرف آزادی کا
جذبہ پیدا کیا بلکہ ایک نیا سماجی شعور بھی بخشا ۔۔۔
ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور ایک سے زیادہ معنی
میں بڑا ہی اہم دور تھا۔ بالزاک نے فرانس کے روائتی
معاشرے اور اس کے اشرافیہ طبقے کو ٹوٹتے بکھرتے
ہوئے دیکھا اور تاریخ کے اس عمل کو اپنی تخلیقات
کا موضوع بنایا۔ حالانکہ اس کی ہمدردیاں فرانس
کے اشرافیہ کے ساتھ تھیں لیکن ایک عظیم فنکار ہونے کی
حیثیت سے وہ اس تاریخی عمل کے داخلی سرچشموں
تک پہنچ کر اپنی تخلیقات میں ایک زبردست تاثر پیدا
کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریم چند کی ہمدردیاں
تو ہندوستان کے بدلتے ہوئے روائتی معاشرے میں
اشرافیہ کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے مظالم اور استحصال
کے شکار مفلس و نادار کسانوں کے ساتھ تھیں اس
لئے ان کی شاہکار تخلیقات جیسے کہ گئو دان اور کفن
میں بڑا زبردست تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔

جمالیات کے کئی اہم اجزا ہیں اور ایک رکی
اور بدلتے ہوئے سماج کے مختلف مسائل کو جب تخلیقی
ادب کا موضوع بنایا جاتا ہے تو یہ بات خاصی اہمیت اختیار
کر لیتی ہے کہ جمالیات کے کن عناصر پر زور دیا جائے۔ اگر
زبان پر قدرت حاصل ہو تو ایک خوبصورت فطری منظر کو
بڑی ہی خوبصورتی اور تاثر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا
ہے۔ اکثر کم صلاحیت رکھنے والے افسانہ نگار اور شاعر
بھی ایک جامد منظر کو اپنی تخلیقات میں خوبصورتی کے
ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن یہ تو جمالیات
کا ایک پہلو ہے۔ جب ایک سماج تبدیلی کے عمل سے
دوچار ہوتا ہے تو کئی انسان اس عمل سے مختلف طریقوں
سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب برطانوی حکومت
ہندوستان میں قائم ہوئی اور نئی معاشی اور سماجی قوتیں وجود
میں آئیں تو ان سے کروڑوں عوام متاثر ہوئے۔ شہروں میں
برطانوی کارخانوں کا مال برآمد ہونے لگا اور لاکھوں
چھوٹے بڑے دستکار اس سے تباہ ہو گئے۔ اپنی جڑوں
سے اکھڑ گئے۔ دیہاتوں میں برطانوی رعیت واری نظام
نے دیہات کے قدیم خود مختار کردار کو تباہ کر کے جاگیرداری
نظام کو ایک نئی شکل دی جس سے غریب کسانوں
کے استحصال میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان تبدیلیوں سے
پرانے سماجی اور انسانی رشتے بھی متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے

لاکھوں عوام کو اس عمل نے اپنی زد میں لیا اور پرانے
نظامِ حیات اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے
نے اس دور کے متاثر عوام میں کرب اور بے چینی کی کیفیت
پیدا کی۔ پریم چند کے کردار انہیں متاثرہ طبقوں سے
تعلق رکھتے ہیں اور ان کے افسانوں اور ناولوں میں تبدیلی
کے اس عمل سے پیدا ہونے والے کرب کو بڑی کامیابی
کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل جمالیات کا یہ بڑا ہی
مشکل اور پیچیدہ پہلو ہے اور اس سے وہی پوری ذمہ داری
کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کی سماجی تبدیلیوں
کی تہ در تہ پیچیدگیوں پر پوری گرفت ہو۔

پریم چند سماجی حالات اور اس میں پیدا ہونے
والے تبدیلی کے عمل پر جو گرفت رکھتے تھے وہ ان کے
ناول گئودان سے خاص طور سے ظاہر ہے۔ چوگان ہستی
اور میدانِ عمل بھی اچھے ناولوں میں شمار کئے جا سکتے
ہیں۔ لیکن ان ناولوں میں اکثر کردار پریم چند کے نظریات
کا شکار نظر آتے ہیں۔ چوگان ہستی کے سورداس اور میدانِ عمل کے
امانت دونوں کی یہی کمزوری ہے جبکہ گئودان میں ہوری ہو یا
صاحب، کھنہ ہو یا مہتا، حالات کی پیچیدگیوں اور سماجی
عمل سے ان کے کرداروں کا خمیر اٹھتا ہے۔ اور اسی
میں فنکار کی پختگی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گئودان
میں خامیاں نہیں ہیں۔ اس میں بھی کئی جھول ہیں اور میلو
ڈرامہ ہیں۔ کئی موڑ مصنوعی بھی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس
کے اہم کردار تہ در تہ پیچیدگی رکھتے ہیں اور فنکار کی
پختگی کی ہم سے داد وصول کرتے ہیں۔ دراصل اس
ناول کے تانے بانے میں وہ تمام سماجی، سیاسی اور معاشی
قوتیں گتھی ہوئی ہیں جن کے مجموعے کا نام ہندوستانی دیہات
ہے (اس میں ان کے تضادات اور ٹکراؤ سے پیدا

ہونے والے پیچیدہ مسائل کو نظر انداز کر کے بڑا ناول
نہیں لکھ سکتا۔

جمالیات کا اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ فن کار اپنے
کردار کے کرب یا مسرت کا کس طرح زیادہ سے زیادہ
پیرائے طریقے سے اظہار کرے؟ دوسرے لفظوں میں
اظہار کا مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ کیا علامتوں
سے اس کا اظہار کیا جائے یا فنطاسیہ کے ذریعے ؟
بیانیہ طریقہ اپنایا جائے یا شعور کی رو جیسی تکنک ؟
دراصل موثر اظہار کا کوئی واحد ذریعہ نہیں ہو سکتا اور
صرف زبان پر قدرت بھی اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی بعض
ماہرین جمالیات کا خیال ہے کہ فن کار کا خیال یہ ہے کہ
اظہار کے لئے اپنی زبان میں جذباتی شدت پیدا کرے
لیکن مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے
بعض مراحل اظہار کے ایسے ہوتے ہیں کہ محض جذبات
کی شدت اور اس کے لسانی اظہار سے کام نہیں چلتا۔ یہی
وجہ ہے کہ ادب میں علامیہ، استعارے، فنطائیت وغیرہ
سے بھی کام لینا پڑتا ہے کیوں کہ بعض وقت کربناکی کو عام
بول چال کی زبان کے الفاظ برداشت نہیں کر سکتے۔ یہی
وجہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں جب شدید
سماجی اور سیاسی بحران پیدا ہوا تو ادیبوں اور فنکاروں
کے سامنے اظہار کا مسئلہ پیدا ہوا کہ اس بحران سے پیدا
ہونے والے شدید انسانی کرب کو تخلیقی ادب کے
ذریعے کس طرح پیش کیا جائے۔ اسی ادبی بحران کے پیشِ
نظر دادا ازم، سرریلزم، شعور کی رو جیسی تحریکوں اور
تکنیکوں کی ابتدا ہوئی۔ ہمیں یہاں اس بات سے بحث
نہیں ہے کہ بعض ادیبوں نے زندگی اور سماج کی طرف
منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے ان تکنیکوں کو اپنا؛

بہرحال بنیادی مسئلہ اظہار کا ہی تھا۔ تکنیک بذات خود اچھی یا بُری قدروں کی نمائندہ نہیں ہوتی۔ وہ تو محض اظہار کا ذریعہ ہے۔

پریم چند کے یہاں ہمیں ان تکنیکوں کا استعمال نہیں ملتا۔ ان کے یہاں سیدھا سادہ اظہار کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے۔ پریم چند کے دور میں ہندوستان میں سیاسی اور سماجی بحران ضرور پایا جاتا تھا مگر اس کا مقابلہ یورپ میں جنگ عظیم سے ہونے والی ہلاکت خیزیوں اور اس کے سماجی بحران سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یورپ کے لئے تو وہ سرمایہ داری کے زوال اور اس کے اصلی کردار اور اس کی سفاکیوں کی بے نقابی کا دور تھا۔ امپریلیسٹ طاقتیں آپس میں لڑ رہی تھیں اور تمام انسانی قدروں کو تباہ کر رہی تھیں۔ ہندوستان اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ جاری تھی اور نئی معاشی قوتوں کے تحت اس کے معاشرے میں دھیرے دھیرے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن یورپ کی طرح ہندوستان جنگ کی تباہ کاریوں کا بلا واسطہ شکار نہیں تھا۔ اسی لئے پریم چند کے سامنے اظہار کا مسئلہ اپنی پوری سفاکی اور شدت کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ اور انہوں نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے یورپی اسالیب کے برخلاف سیدھا بیانیہ انداز اختیار کیا۔ لیکن چونکہ خارجی حالات اور سماجی تبدیلی کی پوشیدہ اور پیچیدہ طاقتوں پر ان کی گرفت تھی اس بیانیہ انداز کے باوجود انہوں نے ہمیں بعض ایسی تخلیقات دیں جن کو عالمی ادب میں مقام دیا جا سکتا ہے۔

[illegible]

EXTROVERT (خارجیت پسند) ہیں کردار کے اندر جھانک کر بہت کم دیکھتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ہمیں داخلی تصادم کی شدت بہت کم دکھائی دیتی ہے، سماجی اصلاح پر ان کی نظر جمی رہتی ہے اور سماجی برائیوں کو وہ خوب ابھارتے ہیں لیکن اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں اور روحانی اذیتوں کو وہ بہت کم ابھار پاتے ہیں۔ بیدی کے افسانے "تلادان" میں دھوبی کے لڑکے کے کردار میں جو داخلی کرب ابھر کر آتا ہے وہ ہمیں پریم چند کے نچلی ذات کے کرداروں میں بہت کم ملتا ہے۔ ان کے ہریجن کرداروں میں وہ تلخی اور اظہار کی شدت بھی نہیں پائی جاتی جو ہمیں دلت ادب میں نظر آتی ہے۔ ہریجنوں کی ذلت اور بے بسی اور سماج میں اہانت ہونے کا تلخ ترین احساس اور اس کا شدید ترین اظہار ہمیں نام دیو ڈھسال کی "گول پیٹھا" والی نظموں یا دیا پوار کی "آتم کتھا" بلوتے میں ملے گا۔ اس کا عشر عشیر بھی ہمیں پریم چند کے ہریجن کرداروں میں نہیں ملتا۔ یہ مسئلہ ان کے یہاں SUFFERING سے زیادہ سماجی اصلاح کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ حقیقت نگاری کا ایک پہلو اور بہت اہم پہلو۔ یہ بھی ہے کہ کہانی کار خارجی واقعات سے پیدا ہونے والے داخلی تصادم، نفسیاتی پیچیدگیوں، روحانی کرب وغیرہ کا بھی کامیابی سے اظہار کرے اور یہیں سے اظہار کا بھی مشکل ترین مسئلہ شروع ہوتا ہے۔

اظہار اگر بہت تلخ ہو جائے تو کلبیت (CYNICISM) کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ اور بعض اوقات حقائق کا اظہار اس تلخ نوائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

اس معنی میں پریم چند کی کہانی کفن حقیقت نگاری کا ایک بڑا کامیاب نمونہ ہے۔ افلاس کی انتہا اور اس سے پیدا ہونے والے ذہنی رویے اور روحانی کیفیت کا بڑا موثر اظہار ہے۔ جس میں مفلسوں کی دنیا کے بے رحم حقائق کو جذبۂ ترحم کے تحت نہیں بلکہ بڑے ہی بے رحمانہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور اسی بے رحمانہ اظہار نے اس افسانے کو طاقتور بنایا ہے۔ جذبہ ترحم کتنا قابل تعریف کیوں نہ ہو، اگر مصنف پر حاوی ہو جاتا تو یہ افسانے کی بڑی کمزوری ثابت ہوتا۔ یہاں پریم چند مسئلے کو سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ حقیقت کی سنگینی کو بغیر کسی رو و رعایت کے جیسی پاتے ہیں پیش کر دیتے ہیں۔ اخلاقی تصور، انسانی اقدار، کچھ بھی ان کے آڑے نہیں آتا۔ کلبیت کی انہیں حدوں کو چھو کر وہ ہندوستان کے دیہات کی حقیقت کو پا جاتے ہیں اور جسے پڑھ کر قاری میں جذبہ ترحم پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسے اس پورے سماجی ڈھانچے سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہ نفرت انقلابی سمت میں پہلا قدم ہے

ہو سکتا ہے بعض لوگ حقیقت نگاری کے اس پہلو کو محض کلبیت، یا زندگی کی طرف منفی رویہ ([illegible]) قرار دیں لیکن بات ایک خاص معنی میں ہی صحیح ہو سکتی ہیں۔ اسے موجودہ سماجی حقیقت کی کی طرف اس قسم کا رویہ قرار دیا جا سکتا ہے اس حقیقت کی طرف نہیں جس کا تصور فن کار کرتا ہے۔ ارسطو فن سے جذبات کی تطہیر (CATHARSIS) کا کام لینا چاہتا تھا اور اگر ان کا یہ مقصود قرار پائے تو حقیقت کو ایک خاص انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ جس سے قاری یا ناظر کو کردار کی صورت حال سے جذباتی طور پر ہم آہنگی محسوس ہو۔ بریخت اس کے برخلاف فن سے اجنبیت کا احساس (ALIENATION EFFECT) پیدا کرنے کا کام لینا چاہتا ہے اور میرے خیال سے حقیقت نگاری کی یہ زیادہ کامیاب تکنک ہے۔ کفن بھی CAL ELIENATIEN EFFECT نہیں - NAISIS پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نفی کی انتہا ہی اثبات کی ابتدا ہے۔ پریم چند کا افسانہ کفن بھی نفی کی انتہا کو پہنچ کر ایک نئی حقیقت کا اثبات کرتا ہے جو موجودہ حقیقت کی طرح تلخ اور ناگوار نہیں ہے۔ انتقادی رویے کی اسی انتہا کو پہنچ کر پریم چند ہمیں زندگی کا ایک نیا شعور دے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات ان کی اس سے پہلے کی تخلیقات کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ جن میں اصلاح پسندی کا جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔

دیگر

(بقیہ: مسلمان)

تھے۔ کبھی کبھی وہ بھی نہیں۔ اور یہ نواب صاحب میں نفرت کرتی ہوں۔ نفرت کرتی ہوں۔ آئی ہیٹ ....

قریشہ - انور زور سے چیخا۔

قریشہ ہٹ گئی۔ پھر وہ تیزی سے اندر بھاگ کھڑی ہوئی۔

انور نے سر جھٹکا۔ تم برا مت ماننا افروز۔ میری بہن ابا سے سخت نفرت کرتی ہے۔ ابا نے امی کو کوئی سکھ نہیں دیا۔ کتنے میں ایک کوٹھے والی تھی۔

انور اٹک گیا

افروز کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ انور سے نظریں ملانے کی اب اس میں تاب نہیں تھی۔

ختم

جوگندر پال

کتھا یاترا

میری خانہ بدوشی ساری عمر بے مقام رہی ہے۔
نہیں، کمسنی کے ایام تو ماں کی گود میں ہی بیتے، مگر اس کے بعد کبھی کہیں قیام نصیب نہ ہوا۔ ان حالات میں میں اپنا کوئی گھر — شیشے کا یا مٹی کا — کہاں کہاں اٹھائے پھرتا؟ — ہاں، جب میں زندگی کے سفر پر نکلا تھا تو دل و دماغ پر چند مقامات کے مبہم سے نقوش ضرور ابھر آئے ہوں گے ورنہ کہاں پہنچنے کے لئے نکلتا؟ انہی نقوش کی ٹوہ میں میری روانگی کے قصد کو تقویت پہنچی ہوگی۔ اور میں بڑی معصوم مسرت سے آگے ہی آگے ... گیا ہوں گا، خواب میں بھی ویسے ہی جیسے ہوش میں، بلکہ خواب میں زیادہ تیز چلتا ہوگا، اور پھر چند ہی سال میں زندگی کے گرم و سرد سے گزرنے کے بعد وہ دھندلے نقوش میرے دل و دماغ سے اڑ گئے ہوں گے۔ اور میں راستوں میں کھو کر رہ گیا ہوں گا۔

میں پوری زندگی اسی طرح کھویا کھویا چلتا رہا ہوں۔ اپنا راستہ بھول جائے تو ہر راستہ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے اور اس راستے کی ہر واردات بھی اپنی ہی۔ میری کہانی لکھنے کی خواہش میں میرا یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ میری ساری خوشیوں اور ندامتوں کا انحصار اوروں کے کئے دھرے پر ہے۔ اپنی کسی کردار کی اچھائی پر مجھے اپنا آپ ہی اچھا معلوم ہونے لگتا ہے یا میں اسی کی برائی کا اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہوتا ہوں میرے کرداروں کا دکھ سکھ ہی میرے دکھ سکھ ہوتے ہیں۔ میری اپنی کوئی زندگی نہیں۔ میں ان ہی کی زندگی کرتا ہوں۔ اپنا ناول "نادید" رقم کرتے ہوئے میں گزشتہ چند سال اپنے قلم سے ٹپک ٹپک کر ناول میں جذب ہوتا رہا اور اس سارے دوران میرے اندھے کرداروں کے مانند اندھیرا ہی میری بینائی کا وسیلہ بنا رہا۔ اور پھر ناول کے خاتمے پر جب میں اندھوں کی اس بستی سے وداع ہو کر خارج کی روشنی میں لوٹا، تو کئی ہفتے اس وقت تک مجھے اپنے ہونے کا احساس نہ ہوا جب تک

میں کسی نئی کہانی میں منتقل نہ ہوگیا۔ سالہا سال اسی نوعیت کے تجربوں کے باعث میں لاشخصی سا ہو کر رہ گیا ہوں اور جس کو واقعی مجھ سے ملنا ہو وہ میری کہانیوں میں ہی مجھ سے مل پاتا ہے میرے وجود میں مجھ سے مل کر شاید میرے دوستوں کو میری نیک نیتوں کے باوجود مایوسی ہوتی ہے اور انھیں مایوس کر کے مجھے خجالت۔ مدتوں کی ریاضت کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا ہے کہ میرے نام یا شکل سے محض ایک سماجی سہولت مہیا ہو جاتی ہے ورنہ میں کوئی اور ہوں۔ کچھ بھی، کوئی بھی۔ نہیں، جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو مجھے اپنے نام سے بڑا عشق تھا۔ اس وقت پکی سیاہی میں اپنا نام دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی اور میرا سارا تخلیقی تناؤ میری اسٹار ڈم کی خواہش سے وابستہ تھا۔ لیکن جب میری فنی شریانیں خوب کھنی ہوگئیں۔ اس دوران مجھے پتہ چلا کہ میرا نام، میری نجی شناخت کی علامتیں ڈھے رہی ہیں اور اس عمل کی بدولت میرے چہرے کا تناؤ ادھڑنے لگا ہے۔ مجھے اپنے بے نام پن کا عرفان ہوا تو سارے نام مجھے اپنے ہی محسوس ہونے لگے۔ جہاں جو کچھ جیسے بھی پیش آتا ہے وہ مجھے ہی پیش آتا ہے۔ میں صرف میں نہیں۔ میں ایک پوری کائنات ہوں۔ اور میرے نہ رہنے پر بھی اس کائنات کی آبادکاری کے اسباب ہوتے رہیں گے۔

میں بے خبر نہیں کہ فن بھی زندگی کے مانند لامحدود امکانات کا حامل ہوتا ہے اور کسی بھی فنکار کو اپنے اٹوٹ تخلیقی انہماک کے باوصف بالآخر اپنے ناکافی پن ہی کے باعث نوواردوں کی تخلیقی مہم جوئی کا باب کھولنے میں نہیں آتا۔ جستجو اور ضمیر کو اسی لئے دوام حاصل ہے کہ لکھنے والے اپنے پیش روؤں کے خوف سے جرأتوں سے تامل نہیں برتتے اور اپنے ویژن کو سہولتاً محدود نہیں کر لیتے۔ میرے

بعض نقاد میری کسی ناکامی کا ذکر کر کے کچھ اس طرح خوش ہوتے ہیں گویا میں کہیں کامیاب ہوتا تو وہ بہت مایوس ہوتے میں بھی انہیں پڑھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ کیوں کہ کامیاب ادیب یہ تو بخوبی جانتے ہیں کہ لکھے ہوئے کی زیادہ سے زیادہ اجرت کیوں کر وصول کی جاتی ہے مگر کھو پانا انھیں غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔

نقادوں کی ججمنٹ کی بے صبر خواہش کے تعلق سے مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک دفعہ میں کہیں اپنا افسانہ "باشندے" پڑھ رہا تھا اور اپنے سننے والوں سے میرا بڑا گہرا ربط پیدا ہو رہا تھا۔ کہانی کے خاتمے پر بڑی پیاری، گھمبیر خاموشی طاری ہوگئی۔ گویا سامعین اسے ابھی تک اپنے ذہنوں میں سنتے جا رہے ہوں۔ یا اپنے تلازموں کی روشنی میں اسے از سر نو دریافت کر رہے ہوں۔ کہانی میں ان کی اس قدر بھرپور شمولیت میرے لئے بڑی اطمینان بخش تھی۔ اس اثنا میں صدر کی دعوت پر ایک نقاد نے گویا سامعین کو کچا چبا جانے کے لئے اپنا منہ کھولا — "کہانی بڑی اچھی ہے مگر ——" اس کے طویں محاسبے میں ڈانٹ ڈپٹ محسوس کر کے سامعین گویا کہانی کے طلسم سے باہر آگئے۔ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے اور شرمندہ، متشکر نظروں سے دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ کتنا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہم جاہلوں کو تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ کہانی میں اتنی منہمک شرکت ججمنٹ کو زک پہنچا سکتی ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کہانی اولاً ججمنٹ کے لئے نہیں پڑھی جاتی بلکہ زندہ کہانی میں پڑھنے والا اس طرح شریک ہوتا چلا جاتا ہے گویا وہی اسے لکھ رہا ہو۔ ادب میں جس طبع زاد کام کو ہم کلاسیک سے تعبیر کرتے ہیں وہ کام بذات خود کلاسیک

نہیں ہوتا بلکہ اسے کلاسیک بنانے میں قارئین کی صدیوں
کی تخلیقی شرکتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے
پڑھنے والے بھی گویا کہانی کو از سر نو تخلیق کرتے ہیں جس سے
کہانی کے تاثر میں ان کی وارداتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں

یہ امر ہماری بدبختی کا موجب ہے کہ ہمارے
ادبی نقاد اب تک عام طور پر دو گروہوں میں بٹے رہے۔
ایک گروہ کا اصرار تھا کہ ادب سے اصلاحی نقارے کا کام لیا
جائے اور دوسرا ادب کو بے سیاق خیالی حسن کا آلۂ کار بنانے
پر مصر رہا ہے۔ مجھے ان دونوں گروہوں نے اپنی اپنی سہولت
کے مطابق رد کیا ہے یا قبولا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ یہ گروہ
اب اپنے پرکھ کے معیاروں میں خوشگوار تبدیلیاں لانے کی ضرورت
محسوس کرنے لگے ہیں۔ چیخوف نے بجا طور پر نوجوان ادبا کو
ہدایت کی ہے کہ پڑھنے والوں پر یہ مت واضح ہونے دو کہ تم
انھیں دانستہ کسی نتیجے پر کھینچ کر لئے جا رہے ہو۔ کہانی خود
رد نہ ہو اور اس میں ہر واقعہ ناگزیر نہ لگے تو اسے جمالیاتی
سطح پر قبول نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اس کے سیاق خیالی
تار و پود سے اس میں تاکید و اصرار کے عناصر نمایاں نہیں
ہو پاتے۔ فن کے جمالیاتی تقاضے خلائی سوچوں سے پورے
نہیں ہو جاتے بلکہ کسی مخصوص سیاق و سباق سے پیدہ
شدہ تناؤ ہی کسی شہ پارے میں جمالیاتی آہنگ لاتا ہے،
کہانی کار کا کمال یہ ہے کہ کہانی میں وہ اپنے آپ کو پیش
کرنے کی بجائے صرف کہانی کر سکے۔ ہمارے عراق کی
عظمت کا دارومدار بھی اسی پر ہے کہ اس کے یہاں ندیوں
میں صرف ندیاں، کھیتوں میں صرف کھیت اور پہاڑوں
میں صرف پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ خود آپ اپنی
کل کائنات سے یکسر غائب ہے۔ ہماری زندگی میں ہر صورت
حال ایک الگ نوعیت رکھتی ہے۔ اور ہماری ہر واردات

مبنی مقامی تقاضوں سے جنم لے کر پہلی اور آخری بار ناگزیر
حالات میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ میرے نزدیک کسی کہانی میں
آباد کاری کا یہی معیار اسے فنون لطیفہ کے زمرے میں لا پاتا ہے۔
مجھے اپنے افسانچے لکھنا بھی بڑا جوش آفریں معلوم
ہوتا ہے۔ مانو میرے ذہن کی شاخوں پر رنگ برنگے پرندوں
کے جھنڈ کے جھنڈ جھول رہے ہوں — ہاں مجھے معلوم
ہے کہ بعض نقادوں کو ابھی افسانچے کی صنف قبول کرنے
میں تامل ہے، مگر اس صنف کا ہر گو اختصار — مجھے یقین
ہے — دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی اپنا لوہا منوا
کر رہے گی۔ ہماری زندگی بھی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں
بٹ کر ہماری سمجھ میں زیادہ آنے لگتی ہے، اس لحاظ سے
ممکن ہے کہ کوئی بالکل مختلف اور متناسب کہانی شروع
ہونے سے شروع ہو رہی ہو اور اسے پڑھنے والا اس کے خاتمے
کے بعد بھی آپ ہی آپ اسے بڑھاتا چلا جائے۔ افسانچے
کا تناسب چست اور صحیح ہو تو قاری کو اس سے آزادانہ
ایک طویل کہانی بننے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ جس سے اس
کی تخلیقی شرکت کا ایک پورا باب کھل جاتا ہے۔ یہ بڑی
بات ہے۔

میرا جسم کھنڈر ہوتا جا رہا ہے مگر میرے ذہن میں
صداؤں کا ایک پورا نگر بسا ہوا ہے۔ میری بڑی خواہش
ہے کہ میں یہ پورے کا پورا نگر اپنے ذہن سے خارج میں آباد
کر جاؤں۔ اور مستقبل کے لوگوں کو روشنیوں کا یہ شہر بڑا مانوس
لگے۔ اور وہ یہاں بے جھجک بستے رہیں۔ اور اس کی
وسعتوں کی تدبیر کرتے رہیں۔
مجھے یقین ہے کہ میری کتھا یاترا سدا جاری رہے گی اور
نت نئی کہانیوں کی بدولت انسان کی بقا کا سامان بنا رہے
گا۔

کالاآزار پہچانیے

مرض کے آثار :- رک رک کر تیز بخار آنا، بخار کسی قسم کا ہو سکتا ہے ● کمزوری محسوس کرنا۔
● جسم میں خون کی کمی ہونا ● جسم کا وزن گھٹنا ● بھوک میں کمی ہونا ● پلہی (سپلین) اور جگر کا بڑھنا۔
● پرانے مریضوں کا ہاتھ پاؤں اور چہرے کی چمڑی کا لا پڑ جانا۔
آپ اسے پھیلنے سے روک سکتے ہیں :- بالو مکھی اس مرض کے ہونے کا سبب ہوتا ہے۔
مرطوب اور نمی والی جگہوں، گھر کی دیواروں کے پھٹے ہوئے درار یا چھیدوں، گوبر کے ڈھیر یا جمع کوڑا کرکٹ پر انڈے دیتی ہے اور اپنا خاندان بڑھاتی ہے۔
علاج :- کالاآزار ہونے کا شبہ ہو تو مریض کو نزدیک کے اسپتال یا ہیلتھ سنٹرز میں ڈاکٹروں کی صلاح کے مطابق علاج کرنا چاہئے۔ اگر جانچ کرنے پر کالاآزار نکلے تو اس کا وقت سے پورا علاج کرانا چاہئے۔ کم از کم 20 سوئی ضرور لگوائیں۔ لگاتار — سرکاری اسپتالوں اور ہیلتھ سنٹروں میں مفت علاج ہوتا ہے — ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا چھڑکاؤ — گھروں اور گئوشالوں میں ضرور کرائیں۔ سال میں دو چکر۔ فروری۔ مارچ اور مئی جون میں ڈی ڈی ٹی کا ۵ فیصد گھول چھڑکاؤ کے لئے استعمال میں لائیں۔ اس کے لئے تین پونڈ ڈی ڈی ٹی (۵۰ فیصد) پاؤڈر کے تین گیلن پانی میں گھول تیار کریں۔

روک تھام — (۱) گھر کو صاف ستھرا رکھیں
(۲) گھر میں جہاں تک ممکن ہو روشنی کا انتظام کریں
(۳) زمین پر نہ سو کر چوکی یا کھاٹ پر سوئیں
(۴) ننگے بدن نہ رہیں
(۵) رات کو مہین مچھر دانی کا استعمال کریں۔ (۶) گھر کے آس پاس پانی کا جماؤ نہیں ہونے دیں۔ (۷) سونے والے گھر سے گوہال کو دور رکھیں۔ (۸) گھر کے آس پاس گوبر کا ڈھیر جمع نہ کریں۔ (۹) سرسوں تیل سے بنائے گئے چکنے لوشن کا رات میں استعمال کرنے سے بھی اس مرض سے آپ کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

236 ڈی (ڈی۔ 132) 92-93

سید علی مظفر

مظفر شاہ جہاں پوری

میرے ہم نام۔ آپ سے ملاقات پروڈیوسر ڈائرکٹر، کہانی کار اور گانے لکھنے والے پی ال سنتوشی P L SANTOSHI کے گھر پر ہوئی۔ کم سخن۔ اپنی بات کہنے میں اپنی خود داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے اس کا لحاظ رکھنے والے شاعر۔ سنتوشی کی بڑائی تھی کہ اس بات کا اعتراف کیا کہ البتہ گانوں کے مکھڑے میرے ہوتے ہیں مگر میرے پاس اتنا کام ہے کہ میں لکھ نہیں سکتا اور مظفر صاحب ہی دراصل ان گانوں کو مکمل کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں سنتوشی نے مجھے زحمت دینا چاہا اور کہانی کے مکالمے اختر الایمان سے لکھوا لینے کی بات طے کرلی۔ زبانی نہیں بلکہ اختر صاحب کنٹریکٹ کر کے اپنی رقم سے ان کو دینے کی بات بھی تحریر میں آگئی۔ میں ممنون ہوں کہ دوسرے پروڈیوسروں کیطرح مجھے سنتوشی کے پیچھے بھاگنا نہیں پڑا۔ بات مظفر شاہ جہاں پوری کی ہو رہی تھی مگر سنتوشی کا بیچ ذکر آگیا تو میرے دل میں ان کی جو عزت تھی اس نے مجبور کر دیا کہ ان کا ذکر خیر کردوں۔ کمزوری ان کی ایک نہایت مشہور ایکٹریس تھی جو ان کے اعصاب پر سوار تھی۔ خیر عورت کا اعصاب پر سوار ہونا تو عین آدمیت ہے۔ آغا حشر کے واقعات شمس صاحب مرحوم سے سن چکا تھا کہ ایک ایکٹریس کو پوجتے تھے۔ حالانکہ وہ ایک خیالیئے (خیال کے ماہر) پر عاشق تھیں۔ ذکر منٹو کے گنجے فرشتے میں بھی ہے۔ اس سلسلے میں جوش صاحب کی رباعی بھی یاد آگئی۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا
حوا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کئے خدا نے جنت میں جتن
آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

مظفر صاحب نے دبی زبان سے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ "اگر آپ کو اختر نام پسند ہے تو آپ فرمائیں تو میں بھی تخلص اختر رکھ لوں۔ اختر حسین صاحب میرے شریک پروڈیوسر تھے۔ مزید جاں نثار اختر اور اختر الایمان شاہین پکچرس سے وابستہ تھے۔ ان کے اشعار یاد تو نہیں مگر دو شعر یاد ہیں۔ اس لئے پیش کر رہا ہوں۔

قبل آغاز ہی انجام کا ڈر ہوتا ہے
دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے
سینکڑوں سحر کی راتوں سے بھی اتنا نہ ہوا
ایک فاقہ سے بڑا جتنا اثر ہوتا ہے

(ن) آرزو لکھنوی

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

استاد فن بھی اور شاعر بھی۔ شاعر ہونا اور بات ہے اور استاد فن ہونا دوسری بات۔ بے خود دہلوی، احسن مارہروی، امیر مینائی، جلیل مانکپوری، صفی لکھنوی، جعفر علی خاں اثر، جلال لکھنوی، منشی امیر اللہ تسلیم [illegible] استادان فن، صاحب زباں قادر الکلام [illegible] قبل [illegible] تو شاہ نصیر اور ناسخ دہلوی، آرزو صاحب [illegible] کی بے حد آرزو تھی۔ ممنون ہوں قیصر عثمانی کا [illegible] دن وہ آرزو صاحب کو لے کر میری قیام گاہ [illegible] آرزو صاحب غالباً کچھ دنوں کے لئے بمبئی تشریف لائے تھے۔ آرزو صاحب کے ساتھ اسکول اور کالج کے زمانے سے عقیدت تھی۔ شاعری کی سمجھ تو خاص نہ تھی۔ مگر شمس صاحب مرحوم سے برابر غزلیں سنتے تھے۔

مزید ان کے گانے جو سہگل اور کانن دیوی نے گائے تھے بے حد پسند تھے۔ زاور سہگل کے گانے تو آج بھی سن کر جھوم جاتا ہوں۔ نئی نسل کو شاید اچنبھا لگتا ہو، فلمی گانے اپنی بندشوں اور معانی وجہ سے ظاہر ہے کہ اس وقت پسندیدگی کا باعث نہ تھے۔ مگر بعد میں جب غور کیا تو دھنیں اچھی، ادائیگی لاجواب کے علاوہ ان میں شعریت بھی تھی۔ مثلاً ایک مشہور اور مقبول گانا "پیا ملن کو جانا" پنکج ملک نے اپنی ہی دھن پر گایا بھی تھا۔ "پائل کو باندھ کے، انگھی چپ نادھ کے" دھیرے دھیرے۔ دبے دبے پاؤں کو بڑھانا ــ پیا ملن کو جانا" کیسی تصویر کشی ہے اور پھر ایسے لفظوں کا استعمال جو مروج ہیں مگر احاطۂ شعور سے ابتک باہر ہیں "چپ نادھ کے" آرزو صاحب ہی کا حصہ ہے۔ جیسے میر انیس نے "اوس" کو استعمال کیا "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" یہ صرف اہل زبان کا ہی حصہ ہے۔ "پیا ملن کو جانا" میں دو اور مصرعے دیکھئے جواب نہیں۔ جگ کی لاج، من کی موج، دونوں کو سنبھانا۔

"پیا ملن کو جانا" یہی ایک گانا نہیں۔ ایک گانا کانن نے گایا۔ "کوئی بتلائے سکھی یہ ریت موئی کیا ہے یہ پریت موئی کیا ہے" روزمرہ کو کس حسن سے باندھا سہگل نے ایک گانا گایا ہے اس کے الفاظ پر غور کیجئے۔ تپ دق کا مریض یہ گاتا ہے۔ "مجبور سہانی چنچل بالک لڑکا تھے دکھلائے۔ ہاتھ سے میٹھا گر ہے کھلونے یا لنوں سے توڑت جائے۔ وہ تو ہے اک مورکھ بالک تو تو نہیں نادان۔ آپ بنائے آپ بگاڑے یہ نہیں تیری شان" ایک غزل فلم "مکتی" میں کانن دیوی نے گائی تھی۔

"کیا اجڑا چمن خوشی کا گیا ایسا پھوٹ گیا"

پھول بھی رخصت بو بھی رخصت رنگ بھی گل کا چھوٹ گیا
نصیب پھوٹنا تو ہر کوئی لکھ سکتا ہے مگر نصیبا پھوٹ گیا
میں جو بات ہے وہ اہل فن ہی داد دے سکتے ہیں۔ ایک اور گانا یاد آگیا۔ سن لیجئے۔ فلم لگن میں سہگل نے گایا ہے۔ مکھڑا تھا: یہ کیسا انیائے داتا۔ یہ کیسا انیائے۔ کہتے ہیں۔ دکھ جھیلیں جس سکھ کے کارن

وہ سکھ بھی چھن جائے
جیسے اپنے دیئے کی جوتی دوجے کے گھر جائے
داتا یہ کیسا انیائے

"ملتی" میں چاٹے کے مزدور اور مزدورنیاں کا گانا دیکھئے

ایک شعر یاد ہے

چھپایا کئے خون اور یہ نہ پوچھا
یہ ہونٹوں پہ کاہے کی لالی جمی ہے

صرف فلمی غزلیں اور گیتیں ہی نہیں۔ سہل زبان میں ایک غزل دیکھئے۔

الگ رہے جیتے جی سدا جو وہ رو رہے تھے لپٹ لپٹ کے
گھڑا گھڑی پھرتی پتلیوں نے سماں یہ دیکھا پلٹ پلٹ کے
جو آنسو آنکھوں میں آ چکے ہیں کہاں وہ جائیں گے پلٹ کے
یہ چڑھتے پانی کے ہیں تھپیڑے پڑیں گے منہ پر الٹ الٹ کے
بھنور سے نکلی جو ناؤ بچ کر تو پار اترنے میں کھائی ٹھوکر
بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جس پر وہی کگار آگرا ہے پھٹ کر
جو مار رکھا ہے جی کو تم نے نہ آرزو اب سہنے دینا
ہوئی جو مٹھی ذرا بھی ڈھیلی یہ سانپ کاٹے گا پھر پلٹ کے

لفظ کگار کا استعمال اور سہنے دینا محاورہ آرزو صاحب کا ہی حصہ تھا۔ مقطع میں "مار" اور "سانپ" کی رعایت ان کی قادرالکلامی کا اعلان کر رہی ہے۔ کس آسانی سے استعمال کیا کہ پتہ بھی نہ چلے۔ جو غزل ابھی لکھی گئی یہ

ان کے مجموعہ کلام "سریلی بانسری" سے تھی (جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اگر غلطی ہو تو معاف کریں گے) ایک دو غزلیں اور (جو اشعار یاد ہیں لکھ رہا ہوں) جو "جہان آرزو" اور "فغان آرزو" سے ہوں گی لکھ رہا ہوں۔

معصوم نظر کا بھولا پن للچا کے لبھانا کیا جانے
دل آپ نشانہ بنتا ہے وہ تیر چلانا کیا جانے
سجدوں سے پڑا پتھر میں گڑھا لیکن نہ مٹا ماتھے کا لکھا
کرنے کو غریب نے کیا نہ کیا تقدیر بنانا کیا جانے
آنکھوں کی اندھی خود غرضی کا ہے کو سمجھنے دیگی کبھی
جو نیند اڑا دے آنکھوں کی وہ خواب میں آنا کیا جانے
چٹکی جو کلی کوئل کوکی الفت کی کہانی ختم ہوئی
کیا کس نے کہی کیا کس نے سنی یہ بات زمانہ کیا جانے
ہم آرزو آئے بیٹھے ہیں اور وہ شرمائے بیٹھے ہیں
مشتاق نظر گستاخ نہیں پردہ سرکانا کیا جانے

دل لذت غم کی نعمت پر بیجا نہیں جتنا ناز کرے
مل جائے تو اڑ جانے والے تو مجھ سے زیادہ ناز کرے
تاروں پہ فلک پھولوں پہ چمن ذروں پہ صحرا ناز کرے
کچھ اس سے الگ اے حسن عطا دل جس پہ ہمارا ناز کرے
حد سے نہ گزر سیلاب نہ بن جنگل میں نہ پھنس گرداب نہ بن
بن موج مگر ایسی جس موج پہ دریا ناز کرے
بازیچۂ الفت میں دل کی کیا الٹی سیدھی چالیں ہیں
ہو جیتنے والا شرمندہ اور ہارنے والا ناز کرے

آرزو صاحب کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر ان کے دو اشعار پیش نہ کروں۔

تارہ ٹوٹا دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹا ہے

یا دفعتہً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دیکر

یا

کس نے ٹپکا کھینچ کے ساغر موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

نام سید انور حسین ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حکیم ضامن علی جلال کے شاگرد اور جانشین۔ عربی فارسی میں اعلیٰ استعداد کے علاوہ فن عروض وقافیہ میں آپ کا فرمانا حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ چراغ ۱۹۵۱ء میں گل ہو گیا۔ میانہ قد۔ گندمی (کھلتا ہوا) رنگ۔ اخلاق اور انکساری کی تصویر مگر شوکت تھانوی کی بات بھی صحیح معلوم ہوئی جب شرف نیاز حاصل کیا۔ شوکت تھانوی نے شیش محل میں لکھا ہے کہ شاعر سے زیادہ حکیم کا اطلاق ہوتا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ہاتھ بڑھا دوں اور نبض دکھاؤں۔ ان کے شاگردوں میں کون کون رہ گئے معلوم نہیں مگر غالباً فضل احمد کریم فضلی آئی سی ایس (ر) کو آرزو صاحب کی شاگردی کا فیض پہنچا ہوگا۔ فضلی کا کلام شبہ پیدا کراتا ہے

ختم

بقیہ:- دہلی کے چار شعراء

والے منسلکات رہنمائی آتے ہیں جن پر شروعات میں روشنی ڈالی گئی ہے آجاتی ہیں۔

ملحوظ رہے، کوئی تنقید حرف آخر نہیں کہی جاسکتی۔ اگر کوئی نکتہ داں میری تردید کرتا ہے تو یا ورفر مائیں مجھے مسرت ہوتی ہے ع
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

ختم

اعلان ملکیت و دیگر تفصیلات

بابت ماہنامہ سہیل گیا

فارم نمبر ۴ قاعدہ ۸ کے تحت

مقام اشاعت:- ماہنامہ سہیل۔ ریور سائیڈ روڈ گیا
پن کوڈ ۸۲۳۰۰۱

وقفہ اشاعت:- ماہنامہ

پرنٹر و پبلشر کا نام و پتہ:- ابن منظر۔ ماہنامہ سہیل۔
ریور سائیڈ روڈ۔ گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

کیا ہندوستان کے شہری ہیں:- ہاں

ایڈیٹر کا نام و پتہ:- مسعود منظر۔ ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

کیا ہندوستان کے شہری ہیں:- جی ہاں

ان افراد کے نام و پتے جن کا رسالہ کی ملکیت میں ایک فیصدی سے زائد حصہ ہے

میں ابن منظر تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں۔

ابن منظر
دستخط پبلشر

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل، ریور سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا

نسرین حامد

جہیز

روٹی پلٹتے ہوئے
انگاروں کا انگلی چھو جانا،
اور ماں کا تڑپ جانا
مٹی کے تیل سے دور دور رکھنا،
آنچل کو، اسٹوو کے شعلوں سے دور رکھنے کے لئے ڈانٹنا
باپ کا دوڑ کر آنا
اپنے ہاتھوں سے اسٹوو جلانا
اتنی احتیاطوں کے باوجود
انہیں کیا پتہ
کہ یہ مٹی کا تیل
یہ آگ اور اسٹوو
ان کی لاڈلی کے لئے ہی تو بنا ہے

شکوہ

پہلے وقت سے شکوہ تھا
کیوں بیت جاتا ہے اتنی جلد
پتھرا جاتی ہیں آنکھیں تمہارا انتظار کرتے کرتے
اور قسمت کو ملتی ہے محرومی، بے رنگ سپنوں کی طرح
ٹھہرو!
آج تمہارا سندیسہ آیا
تو وقت پر بھی مہربان ہو گئی میں
رقص کرنے لگی ہوا کے دوش پر
اُچھلی! تم زندہ ہو.....
ہو پر کتنی دور مجھ سے
سمندر پار جتنے
یا بیچ میں حائل ہے وقت،
وقت!
کل بھی تجھ سے کوئی شکوہ نہیں تھا
اب بھی نہیں
کہ کبھی تو میرے دامن میں بھی اترے گا یہ وقت

اس محفل جہاں سے گزرنے کے بعد بھی
فنکار زندہ رہتا ہے مرنے کے بعد بھی
یہ میری سادگی ہے کہ کرتا رہا یقیں !
وعدے سے اس حسین کے مکرنے کے بعد بھی
اللہ رے حسینوں کی برہم مزاجیاں
زلفوں کے بل گئے نہ سنورنے کے بعد بھی
قسمت ہے میری ایسی ستاروں سے منسلک
روشن نہ ہو سکا جو ابھرنے کے بعد بھی
دنیا میں کون ہے ترے دیوانے کے سوا
پارہ صفت رہے جو بکھرنے کے بعد بھی
رخ سے غم جہاں کا تاثر نہ جا سکا
چہرہ ہزار بار سنورنے کے بعد بھی
شوق لوازمات میں کرتے رہے گناہ
ہر چند ہم گناہ سے ڈرنے کے بعد بھی
ہم کو مصیبتوں سے نہ عاصی ملی نجات
شکوہ کسی طرح کا نہ کرنے کے بعد بھی

صبح رنگیں میں عکس شام بھی ہے
زندگی موت کا پیام بھی ہے
عشق میں صرف میں نہیں رسوا
اب زبانوں پہ ترا نام بھی ہے
کیا ملے اس کو لطف آزادی
آدمی عادتاً غلام بھی ہے
صرف جینا تو کوئی بات نہیں
تجھ سے کچھ زندگی کو کام بھی ہے
اپنی دنیا سنوارنے والو!
کچھ خیال غم عوام بھی ہے
ناشناس مذاق اکل حلال
میرے مشرب میں کچھ حرام بھی ہے
یہ بھی سچ ہے کہ لوگ پیاسے ہیں
یہ بھی سچ ہے کہ دور جام بھی ہے
مست صبح حیات ہوش میں آ
چند ساعت کے بعد شام بھی ہے
رہ کے دنیا میں سب سے عاصی
عاقبت کا کچھ انتظام بھی ہے

مختار احمد عاصی

غزلیہ

غزل

نثار جیراج پوری

سوچ اپنی خود رہی ہے حرف بے معنی سدا
خون کو لکھتے رہے ہیں آج تک پانی سدا

اس دیئے کو کیا بجھائیں گی مچلتی آندھیاں
غیب سے ہوتی رہے جس کی نگہبانی سدا

اپنی کشتی مالکِ کل کے سہارے چھوڑ دو
یوں ہی رہتی ہے سمندر میں یہ طغیانی سدا

ان ہواؤں پہ کریں کیسے بھروسہ ماہی گیر
ساحلوں پہ جو بپا کرتی ہیں ویرانی سدا

آخری دم تک محافظ اے وطن تیرے رہے
تیری خاطر ہم نے سمجھا خون کو پانی سدا

بات کیا ہے آج کے اس دور میں آخر نثار
پھول سے چہروں پہ بھی رہتی ہے ویرانی سدا

نسیم عزیزی

اندھیرے لاکھ ہوں راہ تمنا میں، وہ چھٹ جائیں
ہماری بات گوشِ وقت تک تو آپ پہنچائیں

ہوا کی ایک ہلکی چوٹ بھی وہ سہ نہیں سکتے
مگر دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ طوفانوں سے ٹکرائیں

بچھے ہوں لاکھ کانٹے راہ میں پھر بھی سفر طے ہو
ہم اپنے عزم و ہمت کو اگر رہبر بنا پائیں

قدم کچھ سوچ کر رکھیں، گناہوں کی یہ منڈی ہے
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ساری عمر پچھتائیں

چراغوں کو بجھائے رکھتے ہیں اپنے مکانوں کے
مگر خواہش یہ ہے کہ روشنی والے بھی کہلائیں

زمینیں تنگ ہوتی جا رہی ہیں اب مکینوں پر
بسیرے ڈھونڈنے اب ہم خلاؤں کی طرف جائیں

مرے اشعار خلوت میں جو اکثر گنگناتے ہیں
نسیم ان کی نظر مجھ پر پڑے تو جھینپ سے جائیں

غزلیں

فرحت تلہوری

یہ کچھ عجیب سا منظر دکھائی دیتا ہے
فلک کا چاند بھی خنجر دکھائی دیتا ہے
یہ سارا شہر ہی کیا ہو گیا ہے دیوانہ
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے
متاعِ غم سے بھی بیگانہ کر دیا جس نے
یہ کون روح کے اندر دکھائی دیتا ہے
جو آج کل ہے مسرت سے آشنا فرحت
نصیب کا وہ سکندر دکھائی دیتا ہے

اسلم طارق

ناکامیِ الفت کا اثر دیکھ رہا ہوں
اجڑا ہوا خوابوں کا نگر دیکھ رہا ہوں
جھلسے ہوئے چہرے ہیں مسائل کی تپش سے
آنکھوں میں اٹی گردِ سفر دیکھ رہا ہوں
کیوں پیڑ محبت کے لگاتا نہیں کوئی
ہر راہ میں نفرت کے شجر دیکھ رہا ہوں
انصاف کا خورشید گھٹاؤں میں چھپا ہے
دہشت کا اندھیرا ہے جدھر دیکھ رہا ہوں
ہے تیز ہواؤں میں بھی وہ مائلِ پرواز
میں وقت کے پنچھی کا ہنر دیکھ رہا ہوں
تحریر قلم کار بھی اب بکنے لگی ہے
سکوں کی کھنک کا یہ اثر دیکھ رہا ہوں
مایوس نہیں بڑھتی ہوئی ظلمتِ شب سے
امید کی آنکھوں سے سحر دیکھ رہا ہوں
کیا ہو گیا اس پیکرِ رعنائی کو طارق
مرجھائے ہوئے اس کے ادھر دیکھ رہا ہوں

نوٹ: ادھر ہونٹ

بسمل عارفی

ہو رہا ہے اب یہ اندازہ مجھے
بھول بیٹھا ہے مرا سایا مجھے
کیا ہوا، آئے نہیں مدت ہوئی
روک کر کہنے لگا دریا مجھے
میں تمناؤں کی بستی میں رہا
خامشی کرتی رہی رسوا مجھے
دیکھتی رہ جائے گی دنیا تری
ڈھونڈ ہی لے گا مرا اپنا مجھے
میں سمجھتا تھا مری ہمراز ہے
زندگی دیتی رہی دھوکا مجھے
میں کسے آواز دوں بسمل یہاں
[illegible]

سیّدہ ثمینہ ناز

جدائی

کالے بادل چھائے ہوئے تھے
منظر پیارا پیارا تھا
کتنا حسیں تھا ساتھ تمہارا
تم جو نہیں تو سب بیکار
تم جو رہو گر ساتھ ہمارے
محفل میں چھا جائے بہار

دوہے

جنگل جنگل گھوم کے، بن بیٹھا بے باک
برہن کی اگنی لگی، تڑپ رہے دو نین
ہوں میں اس کی چال سے، چوکنا دن رات
اس بے دردی نے کبھی، دیا نہ کچھ پیغام
اک ہلکی سی وار سے، ہو جاؤں بے حال
اپنی ڈفلی خود بجا، اپنا راگ الاپ
اپنے پیروں پر یونہی، کلہاڑی نہ مار

اک چھوٹا سا مینا، کتنا ہے چالاک
اک دوجے کو دیکھنے، دونوں ہیں بے چین
رہے ادھر کی تاک میں، سدا لگائے گھات
اور ہم اس کی چاہ میں، ہو بھی گئے بدنام
مجھ جاہل سے پوچھے نہ کوئی کٹھن سوال
ناداں نہ لے بھول کے، دکھیوں کا اجیشاپ
کچھ کرنے سے قبل تو، راشد سوچ بچار

راشد انور راشد

ڈاکٹر حسین الحق
(گیا)

وامحمدا-۲

> جہاں موت ہوئی تھی وہاں سے مردہ ہٹایا جاچکا ہے
> اور چالیس دن کے سوگ کی مدت شروع ہوچکی ہے

جب خبریں آنے لگیں تو سورج اپنے زوال کی ڈھلوان پر کئی قدم آگے بڑھ چکا تھا۔

میری بیٹی اپنے کھیل میں مصروف تھی، بیوی باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ بڑا بیٹا ابھی ابھی اسکول سے آیا تھا اور اسکول میں ہونے والے کسی کرکٹ میچ کے بارے میں بھائی بہنوں کو بتا رہا تھا۔

اسی وقت میری چھوٹی بیٹی دوڑی دوڑی آئی ...

..." بابا دیکھئے.... دیکھئے نا بابا" وہ میرا دامن کھینچنے لگی۔ میں کے دیکھا... ایک گوریا آئینے پر جھپٹا مار رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں آئینے کا استعارہ ہوں یا گوریئے کا.... دھیمی رفتار میں خبر نشر ہو رہی تھی...

۔ نقصان پہنچا ہے؟

کس کو نقصان پہنچا ہے؟

سیتا ہرن ہوا تو کس کو نقصان پہنچا؟ دروپدی کو درلیودھن نے بھری سبھا میں زبردستی اپنی جانگھ پر بٹھا لیا تو کس کا نقصان ہوا؟ کس کا نقصان ہوگا؟

.... گوریا آئینے پر جھپٹا مار رہی تھی۔

میں نے بے چینی سے دوسرے اسٹیشنوں کی تلاش شروع کی.... مگر چار بجے کون سا اسٹیشن پکڑتا، خبر کا دیو آہستہ آہستہ اپنے لہولہان پنجوں کا جسم بڑھاتا جا رہا تھا... گوریا آئینے پر....." میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر آئینہ الٹ دیا، گوریا اڑ گئی، مگر میری بیٹی رونے لگی

"بلا وجہ آپ نے اسے رلا دیا؟" میری بیوی جھلا گئی

مگر یہ عجب ہوا کہ گوریا آئینے پر سے اڑی تو میرے دل میں اتر گئی۔ اور اندر اندر جھپٹا مارنے لگی۔ وہ اپنی نوک دار

چوب نخ سے بار بار میرے دل پر ٹھونگے مارتی رہی اور آکاش
وانی ایک ہی خبر بار بار دہراتا رہا۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر سرخی کھنچا گئی تھی
اور میر تیغ علی کے امام باڑے میں زنجیری ماتم شباب پر
تھا.... مگر یہ تو محرم کا مہینہ نہیں ہے... پھر یاد آیا! جب
شہادت ہو تب محرم ہے.... اور اسی پل ایک ناقہ سوار
میرے آگے سے نکلتا چلا گیا اور ساری راہیں مسدود ہو گئیں
کہ ایک پر ایک ناقہ سوار میرے دائیں بائیں آگے پیچھے سے نکلتے
چلے جا رہے تھے اور گدھا اپنی نوک دار چوب نخ سے بار بار
میرے دل پر ٹھونگے مار رہی تھی اور محلے کے لوگوں کے منھ
سے غصے میں بھرا کے، چیخیں اور گالیاں ایک ساتھ نکل رہی
تھیں۔

میں نے اپنے ناقے کو مہمیز لگانا چاہا مگر ارد گرد
نہ براء بن مالک نظر آئے نہ انجشہ......"

خبر ملی کہ ندی پار لوگوں نے سڑکوں پر تیر کمان بچھا
ڈالی ہیں اور سارا راستہ جام ہے.... جب یہاں قانون
نہیں ہے تو نہ سہی....

یاد آیا کہ انجشہ کی تلاش یوں بھی مہمل ہے کہ
کجاوے میں اب پتھر ہیں.... مگر براء بن مالک؟

"وہ بھی کیوں؟" مجھے ہوش آگیا، سب بہت تند
گدھوں پر سوار ہو رہے، تاریخ کے نشے میں دہشت...
اپنے آپ کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی.... امام باڑے
میں زنجیری ماتم شباب پر تھا...."

میں نے دیکھا۔ میں ناقے سے گدھے پر اور گدھے
سے ناقے پر لڑھک رہا تھا

میں کس پر سوار ہوں؟ ناقے پر یا گدھے پر؟
گو رہا اپنی نوک دار چوب نخ سے میرے دل پر
ٹھونگے مارتی رہی۔ مجھے لگا میرے اندر خون کی ایک بوند
زندہ دھار بہی:-

قدغن ہے کہ اس گھر میں کوئی آنے نہ پائے
گر بے خبر آجائے تو جانے نہ پائے

میں ناقے سے گدھے پر اور گدھے سے ناقے پر لڑھکتا
بھاگ رہا تھا کہ اچانک امام باڑے کی گری دیواروں کے
پیچھے بچے کھچے طاقوں پر جلتی بجھتی مدھم مدھم موم بتیوں کے
لرزتے سائے میں ایک سایہ مدھم ہوتا سر سے پیر تک
دھڑ دھڑ جلتا نظر آیا۔

میں نے لپک کر اس کے چاروں طرف لگی آگ بجھانی
چاہی تو خود میں بھی آگ کی لپٹوں میں گھر گیا۔ اب سایہ اور
وجود میں مدغم ہو جاتا۔

لیکن دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل نیا تو نہیں، یہ تو
برسہا برس سے جاری ہے۔ ایک بلائے عظیم حبشی کے سبب
کیا سیاہ سب خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے اور شہر ویران ہو
جاتا۔ پتہ نہیں وہ بلائے عظیم کوئی دیو ہے یا کوئی درندہ
خونخوار کہ کوئی اس کی کتھاہ نہیں پاتا، جب وہ آتا، کچھ لوگوں کو کھا کر چلا جاتا۔

میں پھر گدھے سے ناقے پر لڑھک گیا.... سایہ
جلتے جلتے سر سے پیر تک روشن ہو گیا، پھر اسی اس
موم بتی کے اندر سے دوسرا سایہ نکلا، پھر تیسرا، پھر چوتھا۔
.... میر تیغ علی کے امام باڑے میں تل دھرنے کی جگہ
نہیں تھی.... عزاداروں کا ہجوم.... سارے لوگ گھروں
سے نکل نکل کر محلے کے میدان میں جمع ہو چکے تھے....
بی بی سی سے خبریں نشر ہو رہی تھیں.... ایک... ماتم
کناں، پیشہ ور ماتم گسار...... یہ شام [illegible]...."
[illegible]

دور ہے فرات.... نہیں سرجو.... کیا فرق پڑتا ہے، جو شہید کے کام نہ آئی وہ فرات ہے.... چاروں طرف اک لشکر جرار، فتح کے نشے میں چور، جشن میں مصروف، ہریالی قہقہے بدمیزیاں، ور خرمستیاں.... اوران سب میں گھری ایک انہدام پذیر.... مہلوک.... خستہ و شکستہ مظلوم و بے سہارا کربلا زادی : یہ کربلا زادی کون ہے ؟

زینب ؟ یا ؟ باقی.... رہے نام اللہ کا !

عاشور کی شب تھی کہ قیامت کی گھڑی تھی.....

ایک نوحہ خواں نے پاٹ دار آواز میں شروع کیا تو بے ترتیب مجمع میں آہ و بکا اور شیون کا ایک شور سا اٹھا...."

اے خاصا خاصانِ رُسل وقت دعا ہے

امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

کہتے ہیں کہ وہ کوفی جنہوں نے حسینؑ کے ساتھ غداری کی، بعد میں، محب حسینؑ" بن گئے۔

اے خاصا خاصان رُسل !

آہ و بکا اور شیون کا وہ شور اٹھا کہ امام باڑے کی برجیاں تھرتھرانے لگیں، محرابوں میں سمٹے کبوتر بے تابی سے اڑے اور اڑتے چلے گئے، بلند بالا مضبوط فصیلوں کے در کھل گئے اور اپنے لہو میں تیرتے سیکڑوں اجسام بمبئی، احمد آباد اور سورت سے اپنے ہاتھوں میں اپنی کٹی گردنیں لئے روانہ ہوئے اور مرگ انبوہ میں شامل ہو گئے۔.... امام باڑے کے لق و دق میدان میں ایستادہ بے شمار گھنے درختوں سے ہواؤں کا وہ طوفان اٹھا کہ ساری قندیلیں گل ہو گئیں.. .... بس ایک اکیلی موم بتی لرزتی رہی.... اور میں دیکھتا رہا کہ یہ اکیلی موم بتی شکستہ کھنڈر امام باڑے میں کسی آنے والے کی راہ تک رہی ہے...."

سید کیا کہتا ہے ؟

اللہ کا بندہ کچھ بولا یا بخاری لئے بیٹھا ہے ؟

ایران اور سعودی عرب دونوں بولے ہیں۔

یہ میں کس گمان میں ؟ بیندر ہویں صدی....."

اکیلی موم بتی شکستہ کھنڈر امام باڑے میں کسی آنے والے کی راہ تک رہی تھی اور میں تعزیوں کے ساتھ بجائے جانے والے تاشوں، جھانجھ اور دھماکے کی آواز سن رہا تھا.... محرم کے سپاہی....."

محلے میں جمع فوج ایک غوغا کا سبب ہے مگر غوغا نہیں خود فوج بے سبب ہے۔

" براء..... الخشہ... جاگو بھائی..... سب شیشے ٹوٹ گئے۔

براء اور الخشہ تو نہیں جاگے مگر ایک سایہ سا ضرور لہرایا اور پس منظر میں آواز گونجی...."

" تم نمائش کے بجاری، شور و ہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات و ہیجان کی مخلوق ہو، جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی اختیار کر لیتے ہو۔ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اتنا ہی تمہارا انحراف بھی آسان ہے..... یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا نہ کہ دانہ ڈالنے کا.... اب تو سچ مچ وہ وقت آگیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرنے والے ڈرایا کرتے تھے، تم خاص وقتوں میں چیخنے چلانے لگتے ہو جس طرح اونگھتا ہوا آدمی یک بارگی چونک اٹھتا ہے..... مگر تم وقت پر سامنے آجانے والی چیزوں کے غم میں گھلے جاتے ہو؟ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے؟

پھر براء بن مالک سایہ بن کر آزاد ہو گئے یا سایہ آزاد ہو کر براء بن مالک بن گیا۔ مگر کجا وہ خالی تھا..... الخشہ ؟

میں ناقے اور گدھے کے بیچ لٹکے لٹکے اچانک
چونکا.... ہائے حسینؑ.... ہائے حسینؑ!"

"توکس زبان میں جیتا ہے بیٹے؟" ایک پراسرار
زخمی گونج امام باڑے کی دیواروں سے ٹکراتی گونجتی رہی.
...." میں جلدی سے ناقے پر سنبھل کر بیٹھ گیا" مکان
کی تباہی نے زمان کو بھی مشکوک کر دیا حضرت! میں نے
کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

"تو اپنے دل میں مکالمے مت ادا کر صاحبزادے۔
..... اپنی حد پہچان!" علم پنجہ اور ضریح جس حجرے میں
محفوظ تھی اس کی چلمنوں جھریوں، دریچوں اور شگافوں
سے ایک سرگوشی ابھری

"حد تو اضافی نسبت ہے، خود میری پہچان کیا ہے
آقا؟" میں پھر نہ پوچھ سکا مگر جواب ملا
تو اپنی پہچان خود ہے غافل!" امام باڑے کی
بیرونی دالان کی محرابوں میں بنے نقش و نگار کے درمیان
ایک تحریر کی لو جھلملائی۔

"میں کیا ہوں مولا؟" اندر ہی اندر ایک استفسار
نے سر اٹھایا
"تو ایک ذلیل کتا ہے جو نسبت کا ڈھونگ
رچاتا ہے!"

سارا امام باڑہ دھڑ دھڑ جلنے لگا اور مجھ پر
سنگ باری شروع ہو گئی، میں دھڑ دھڑ جلتے امام باڑے
اور امام باڑے کی جلی ہوئی گرتی شہتیروں کے ملبے سے
کسی طرح بچتا بچاتا نکلا.... رات ہو گئی تھی، محلّے میں
کتنی دیر ٹھہرتا؟ راتوں میں بننے والے منصوبوں
میں کیسے شامل ہو جاتا..... بھاگتا ہوا تعزیوں کے
جلوس تک پہنچا اور ایک لڑکے سے تاشہ چھین کر زور
سے بجانے لگا.... ہتھیار بٹ رہا تھا۔"
میں تاشہ بجاتا رہا — ایک ناقہ مجھے اپنے سموں
سے روندتا رہا...!

واپسی میں، میں گدھے پر سوار، میر تیغ علی کے
شکستہ امام باڑے کے پاس سے گذرا تو کھنڈر میں
اکیلی جلتی موم بتی کی مدھم لو میں ایک ناقہ غصے میں منہ سے
پھین پھینکتا اور اپنے سم اٹپکتا نظر آیا...... میں
وحشیانہ انداز میں دوڑتا امام باڑے کی سرحدوں سے باہر
نکل آیا—

My respected vice chanellor,
it is a great pleasere to welcome
you ....!

مجھے کل کے جلسے میں وی سی کا استقبال کرنا تھا....
استقبالیہ ادھورا تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا؛ گھر پہنچا تو
باہر کا کوئی اسٹیشن تفصیلی خبریں دے رہا تھا۔
"فوج کھڑی رہی اور اس کے سامنے اس
کو ہلاک کیا گیا۔ اور اس کا ایک ایک ذرہ
دریا برد کر دیا گیا —"
گویا اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔
میری بیٹی نے اپنا پنجرہ لا کر دکھایا: "دیکھئے بابا"
..... ایک خون خون گوریا اس میں قید تھی۔ میں نے آہستہ
سے پنجرہ کھولا اور اس میں قید گوریا اڑا دی.....
پھر یاد آیا ایک گوریا میرے دل میں....."
گوریا اپنی نوک دار چونچ سے میرے دل پر ٹھونگے
مارتی رہی.... خون کی ایک زندہ دھار.....اکیلی
جلتی موم بتی کے لرزتے سائے میں ایک سایہ.....میں
نے گھر میں موجود سارے آئینے جمع کئے اور انہیں چور چور کر دیا!

(نقد ۱۹۹۰ء)

مشرف عالم ذوقی

مسلمان

ترجمہ — تبسم فاطمہ

قسط ۹

(غلامی کے آخری دنوں سے ۱۹۸۶ء تک)

صبح صبح انور نے خبر سنائی —
سلمان میاں گرفتار کر لئے گئے ؟
کون سلمان میاں ؟ وہی نہ جنہوں نے مسلمانوں والے جلوس کی قیادت کی تھی ؟ قریشہ نے پوچھا۔

"ہاں وہی۔ مسلمانوں کی قیادت ؟" انور ایک طنزیہ ہنسی ہنسا۔ "ارے یہ کیا مسلمانوں کی قیادت کریں گے۔ یہ تو لڑنا جانتے ہیں۔ دنگے جانتے ہیں فساد بونتے ہیں۔ جب سے آنکھ کھولی ہے تب سے فساد ہی تو دیکھ رہا ہوں۔ بچپن میں باپو گاندھی اور وطن پرستی کی کہانیاں پڑھتا تھا۔ اب ہنسی آتی ہے۔ وہ لوگ کہاں گئے۔ ایک غلامی سے نجات دلانے کے بعد اس دوسری، ذہنی غلامی سے نجات دلانے والے رہنما کب جنم لیں گے۔"

افروز ایکدم سے چونک پڑی۔
قریشہ کے لہجے میں بھی نفرت تیر رہی تھی۔

"کبھی نہیں بھیا۔ وہ غلامی اس سے کہیں بہتر تھی۔ اس سے زیادہ ذہنی، جسمانی اور روحانی غلامی تو کبھی آئی ہی نہیں۔ ہم ایک بدترین دور میں داخل ہو چکے ہیں۔"

انور نے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھتی افروز کو دیکھا پھر روانی میں بولتا چلا گیا —

"تم اور تمہارا قصور ہی کیا تھا افروز۔ چند چونچلے بازوں نے مذہب کے نوالے اچک لئے۔ تمہارا گھر بار لوٹ لیا گیا۔ تمہیں بے سہارا کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو لو۔ تو سب سے پہلے انہیں اپنا ذہن بدلنا پڑے گا۔ اپنی سوچ میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ ذہن کو سیکولر بنا کر چلنا ہوگا۔"

لیکن یہ سب ممکن کیسے ہے ؟
بہت دیر بعد کچھ کمزور سی آواز میں افروز نے پوچھا
قریشہ نے چونک کر دیکھا۔ انور نے بھی غور سے

اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"ممکن ہے سب کچھ ممکن ہے۔ شک اور خوف کی جڑیں یوں ہی نہیں پھیلتی۔ نفرت کے بیج یوں ہی خود سے نہیں پیدا ہو جاتے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ یوں تالی بجانے کا کارنامہ تو سیاسی مہرے انجام دیتے ہیں۔ لوٹ پاٹ اور دہشت کا ماحول غنڈے اور بدمعاش پیدا کرتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں کوئی اہم بھومیکا ہماری بھی رہتی ہے افروز۔ ۔ ۔ ۔ کبھی جانے انجانے ہمارے اندر بھی مذہب کے انجکشن لگائے جاتے رہے ہیں۔" کیسے ۔۔ ؟

"میں بتاتا ہوں۔ ۔ ۔"

انور نے سانس لی پھر بولنا شروع کیا۔ میرا دوست رشید رہتا ہے، جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ اپنے ہم عمر ہندو دوستوں کے ساتھ محلے میں کھیلتا تھا تو اس کے ماں باپ خوفزدہ رہتے تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ کیوں کھیلتے ہو۔ وہ پٹ کر گھر آتا تھا تو ماں کے دو چپت لگ جاتے تھے کیوں کھیلتے ہو۔ لیکن جب وہ پیٹ کر گھر آتا اور یہ بات معلوم ہو جاتی تو بھی اس کی ماں کہتی تھی ۔ کیوں رے کمبخت، دنگا کروائے گا۔ تم ہندو ہو، تم مسلمان ہو۔ یہ بیج تو گھر والے ہی ڈالتے ہیں افروز ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سوتے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر وہ ننھا سا بیج درخت بنتا رہتا ہے۔"

آگے کی ڈور اب قریشہ کے ہاتھ میں تھی

"لیکن صرف مسلمانوں کو ہی اپنی سوچ میں تبدیلی کرنے کی نصیحت تم کیوں دے رہے ہو؟ یہ تو یکطرفہ بات ہوئی۔ یہ یکطرفہ مکالمہ بھی تو ایک طرح کا دوغلا پن ہے تم بھی تو رشید کے ماں باپ کی طرح ہی ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ جاہل تھے اور تم پڑھے لکھے ہو۔"

نہیں قریشہ ۔۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں اپنے مسلم معاشرے کے ساتھ زیادہ رہا ہوں اس لئے اس سماج کی کمیاں، خامیاں مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے میں اشارے کر سکتا ہوں۔ سیکولر کا لفظ دونوں کے لئے استعمال کیا ہے میں نے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن سوچ کی تبدیلی کی بات مسلمانوں کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بتاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ وطن کو آزادی ملی تو کہیں نہ کہیں سے یہ عدم تحفظ کا جذبہ ہی تھا کہ "میرا اپنا پاکستان" کا نعرہ بلند ہوا۔ ایسے بہت سے لوگوں نے اپنا گھربار چھوڑ کر پاکستان جانا اس لئے بھی ضروری سمجھا کہ یہاں ان کی ذات کو خطرہ لاحق تھا۔ یہاں انہیں بڑے عہدے نہیں ملنے والے تھے۔ یہاں انہیں اپنے حق سے محروم کئے جانے کا ڈر تھا۔ اس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اسی لئے وہ پاکستان چلے گئے ۔۔ پاکستان، یعنی اسلامی ملک ۔۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ پاکستان سے ایک اور ملک نکلا۔ بنگلہ دیش ۔۔ اسے بھی اسلامی ملک کہا گیا۔ یہاں بی جے پی جیسی مذہبی پارٹیاں اگر یہ محسوس کرتی ہیں کہ یہ ہندو راشٹر ہے تو مسلمانوں کو اس معاملے پر سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے۔"

یعنی ملک انہیں سونپ دینا چاہئے۔ یعنی ہندو راشٹر کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہئے؟

افروز نے بھی غور سے دیکھا ۔ ۔ ۔ "یعنی ہندو بن جانا چاہئے؟

قریشہ طنز سے مسکرائی۔ "یعنی بال ٹھاکرے جیسوں کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ جو کہتے ہیں مسلمان اس ملک کے کینسر ہیں۔ مسجد میں اذان نہیں ہونی چاہئے۔ آر ایس ایس، بجرنگ دل جیسی سنگٹھنوں کے آگے جھک جانا چاہئے۔"

"غلط — انور نے تیزی سے بات کاٹی ——
انتقامی جذبہ، نفرت کبھی اس مسئلے کا حل نہیں رہا۔ یہ
مت بھولو کہ یہاں مسلمان میجرٹی میں نہیں ہے وہ اقلیت
کہلاتے ہیں۔"

بیس بائیس کروڑ کی آبادی اقلیت نہیں کہلاتی"

یہ شہاب الدین جیسوں کی گنتیاں کہتی ہیں، میں
کسی پر مطلب پرست ہونے کا الزام نہیں لگا رہا۔ صرف
یہ کہہ رہا ہوں کہ زمانہ خراب ہے تو اسے خراب کہہ کہہ
کر خراب کیا گیا ہے۔ محبت سارے زخموں پر مرہم لگا سکتی
ہے۔ میں اپنے فرقے کے جن زیادہ تر لوگوں سے ملا ہوں،
وہ مجھے کیمونل لگتے ہیں۔ ان کی باتوں سے فرقہ پرستی کی
بو آتی ہے۔ ہمارے زیادہ تر اخبارات فرقہ پرست ہیں تو۔
میں نے پہلے بھی کہا ہے، میں اس مسلم سماج کو زیادہ قریب
سے جانتا ہوں، اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انہیں اپنی
سوچ میں فرق لانا ہوگا۔ خود کو غیر محفوظ سمجھنے کے کورے
تصور کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ہم یہاں رہتے ہیں۔ یہاں
کھاتے ہیں۔ اس لئے اپنے وطن کے لئے ایماندار
ہیں۔ ہم اپنی ایمانداری کا ڈنکا نہیں پیٹنا چاہتے
لیکن شک و شبہات کے گھیرے میں ایسی باتیں پیدا
ہوتی ہیں کہ ہم تو دوسروں کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ اس
خیال کا خاتمہ کرنا ہوگا۔"

انور سچ مچ ہانپ گیا تھا۔

قرلیشہ نے تالی بجائی۔ تقریر میں تو تم سے کوئی
جیت نہیں سکتا بھائی جان! کل کے رضاکار آندولن
اور مسلم لیگیوں کو اگر تم مل گئے ہوتے تو ہیرو بن جاتے؟

آج کون سی کمی ہے صرف نام بدلا ہے۔ جماعتیں
بدلی ہیں" انور ایک پھیکی ہنسی ہنسا ——

قرلیشہ پھر ہنسی۔ گھر کا مورچہ جیت جاؤ تو جانیں۔
مارکیٹ کمپلکس بنے گا؟" وہ انور کی نقل اتارتے
ہوئے بولی۔

انور اچانک پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔ وہ اچانک
افروز کی طرف مڑا۔

افروز؟ تم اب اس گھر کے لئے غیر نہیں رہی۔
تم جان چکی ہو کہ دور سے نظر آنے والا یہ سونا درحقیقت
سونا نہیں رہا۔ حویلی نیلام ہونے کے دن آ گئے ہیں۔ لے
دے کر پرکھوں کی یاد میں ایک گولا رہ گیا ہے۔ سبزی
منڈی — بس وہیں کا کرایہ آتا ہے۔ ابا تو کچھ کرتے
ہی نہیں۔ تم ہی بتاؤ، ایسے کیسے چلے گا۔ کچھ تو کرنا ہوگا نا۔"

"تم بات کروگے ابا سے۔ قرلیشہ طنز سے بولی۔

"ہاں! بات کروں گا"

"وہ پھر دسترخوان سے اٹھ جائیں گے۔"

"ابا ہمارے زمانے کی مجبوری تو سمجھتے ہی نہیں،
لیکن انہیں بتانا ضروری ہے۔

قرلیشہ کی آنکھوں میں پھر سے نفرت کے دیئے
جل اٹھے تھے۔

"تم تبدیلی کی بات کرتے ہو بھیا، نواب صاحب
جیسے لوگ کہاں بدلے۔ وہ آج بھی خود کو نواب سمجھتے ہیں۔
حالی موالی، نوکر چاکر، ہاتھی پہلوان نہ ہوئے تو کیا ہوا،
حویلی تو ہے۔ پرکھوں کی شان ختم ہوگئی تو کیا ہوا۔ نوابی
آن تو باقی ہے۔ یہی نوابی آن تو لے ڈوبی مسلمانوں
کو۔ اسی آن اور شان نے تو تاج و تخت چھین لئے۔ محتاج
اور ماتحت بنا دیا۔"

قرلیشہ کے لفظوں میں سانپ کی پھنکار شامل تھی
گھر کی بیویوں کو یہ نواب رات کا کھلونا سمجھتے

بقیہ۔ صد ۲۲ پر

بانی:- حافظ محمد عبدالرحمن بسمل شسنہاروی ♦ یادگار:- زین العابدین اختر و ادریس شسنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنّی
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر
- ایڈیٹر: جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر:- خورشید ہاشمی

معاونین:- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، رضوان عزیزی
- کتابت:- سید عبدالاحد گیاوی

فہرست

شمارہ ۵-۶ جلد ۵۳

سالانہ اشتراک

فی شمارہ	۵ روپے
زرِ سالانہ	۵۰ روپے
لائف ممبر	۱۰۰۰ روپے

• خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل

[illegible] روڈ، گیا

عمومی

ـــــــ یہ شمارہ ـــــــ

سُہیل کا یہ شمارہ ان معنوں میں عمومی ہے کہ اس میں کسی سالنامے یا خصوصی شماروں کی ضخامت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہ اس حیثیت سے خصوصی پیش کش ہے کہ اس میں شعرا و ادبا کی تخلیق شخصیتوں اور ان کے فکر و فن کے تجزیاتی مطالعے سے متعلق مقالات شائع کئے جا رہے ہیں۔

شعر و سخن اور علم و ادب کے کاروبار میں بہت سے لوگ لگے ہوئے ہیں ـــــ اور ادبی برادری روز بروز وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ اہل قلم ایسے ہیں جو اپنے کارناموں کی بنا پر اہم مقام و مرتبہ کے حامل ہیں، کچھ ایسے ہیں جن کی خدمات کا ہنوز صحیح اعتراف نہیں کیا جا [illegible] ہے بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے پاس اپنا دفتر عمل پیش کرنے کے لئے ابھی بہت وقت ہے

شہرت اور ناموری کا فطری جذبہ لبا اوقات ہمارے اعتدال و توازن کو بھی بگاڑ دیتا ہے ـــــ نو آموز اور لباطِ ادب کے تازہ واردان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جست لگا کر مسافت طے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ہماری فائلوں میں بہت سے ایسے مقالات جمع ہو گئے ہیں۔ جو نئے ناموں کے کارناموں

کو RELATED ANDS انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے مقالات
بھی ہیں جو ادب کے جنونین افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔
ہم نے ایسے نئے پرانے ناموں پر لکھے گئے شخصی اور تجزیاتی
مقالات کا انتخاب کیا ہے ـــــ اور اب فن اور فنکار کے نام سے سہیل کا امتیازی
اور اختصاصی شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اس شمارے کے مقالات سے کئی افراد اور کئی ادبی کارناموں کا
تعارف و تجزیہ ہی حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس سے آج کے شعر و ادب کی رفتار و
سمت کا اندازہ بھی ہو سکے گا ـــــ اور یہ بھی کہ آئندہ چند برسوں میں ادب کا
موسم کیسا رہے گا۔
ہمیں امید ہے کہ قارئین اس شمارے سے متعلق اپنی رایوں سے مطلع
کریں گے۔

ـــــــ مسعود منظر ـــــــ

(بقیہ ۔۔ سید مظفر حسین برنی ۔۔۔۔)

مذہب کو بالکل ہی تیاگ دیں۔ سیکولرزم کا اساسی نظریہ یہ ہے کہ مذہب کو حکومت کے معاملات سے کوئی بھی
سروکار نہ ہوگا۔ (محب وطن اقبال ص ۱۴۷ - ۱۵۲)

جناب برنی صاحب ایک ایسے سرگرم اسکالر ہیں۔ جو لغایات انتقادی طور و طریقہ سے ادبیات سے
مخاطب ہوتے ہیں۔ برنی صاحب نے اقبالیات میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ ان کی حالیہ پیشکش "کلیات
مکاتیب اقبال" حصہ اول ہے جس کو دلی اردو اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ جس میں علامہ کے ۴۱۹ خطوط ۲۰ فروری
۱۸۹۹ء سے لے کر ۲۸ دسمبر ۱۹۱۸ء تک مشاہیر کو لکھے۔ برنی صاحب اقبالیات کی تنظیم میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے
خطوط کو تاریخی ترتیب اور ضروری تعلیقات و حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ مقدمہ بہت عالمانہ ہے جس میں مکتوب نگاری
کی تاریخ و تناظر شامل ہیں۔ خطوط کے ساتھ تعلیقات، وضاحت کے لئے ضمیموں کی گئی ہیں۔ خطوط کے بعد بے شمار حواشی
ہیں جو اقبالیات میں رہنمائی و نگرانی کے لئے ہمیشہ ضروری تصور کئے جائیں گے۔
تنظیم اقبالیات میں برنی صاحب کا مقام و مرتبہ بلاشبہ اعلیٰ ترین ناقدین کے درمیان بھی ممتاز اہمیت
کا حامل سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

بیروباڑی، گوہاٹی ۹

سید مظفر حسین برنی اور تنظیم اقبالیات

جمیع الصفات اعلیٰ حضرت جناب سید مظفر حسین برنی (گورنر ہریانہ ریاست) نہایت ممتاز نقاد و ادیب ہیں۔ گوناگوں مصروفیات کے باوجود باوصف عمیق مطالعہ اور سنجیدہ تصنیف کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ جو فی الواقع حیرت انگیز حقیقت ہے۔ اقبالیات سے دلچسپی اور شعر و فکر کا مطالعہ دل و دماغ سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے کہ متعدد تناظیم فکر و نظر (ACADEMIC DISCIPLINS) کی جانب سنجیدہ روی لازم ہو جاتی ہے۔ شعر و فکر اقبال کا سرچشمہ مغرب بھی تھا اور مشرق بھی۔ اسلام سے بے پناہ جذباتی فکری عقیدت مندانہ محبت بھی اس کا منبع تھا۔ اور دیگر مذاہب کا احترام و مطالعہ بھی۔ ایسے عظیم شاعر کی شاعرانہ منہاج و مرتبہ سے حاصل خصوصاً کا مکشوف ہو جانا انسانیت کے لئے بالعموم اور برصغیر ہند و پاکستان کے لئے بالخصوص سیل اشک آگیں المیہ سے کسی طرح کم تلخ حقیقت نہیں ہے۔ آخر ہو گیا؟ ایسی بدبختانہ صورت حال لاحق کیوں ہوتی اور کیونکر ہوئی۔؟ اقبال اور اقبالیات پر بالآخر نزلہ کیوں گرا؟ اس نوعیت کے سوالات جن سے مخاطب ہوتا ہوں ان کا جواب مسکت دینا ضروری ہی نہیں بلکہ قومی و انسانی فریضہ ہے۔ وجوہ ذیل ہیں:

(الف) اقبال کی مسلم لیگ سیاست سے وابستگی اور اقبال کی مسلم وفود میں شمولیت

(ب) تقسیم ہندوستان اور دو آزاد ملکوں (ہندوستان اور پاکستان) کا معرض وجود میں آنا۔ نیز ان دونوں کے مابین کشیدگی تعلقات اور محاذ آرانہ سیاست کی شروعات۔

(ج) شعر و فکر پر معترضات ذہنی و قلبی کے پیش نظر تنقید۔

اگر فرقہ وارانہ خس و خاشاک سے دامن بچاتے ہوئے راہ تنقید پر تابع حقی اور جذبہ انسانیت سے بھرپور ہو کر

گامزنی کی جائے تو نہایت صالح حقائق تک رسائی کوئی دشوار کام نہیں ہے ؎

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری

اقبال کو اسلام سے بے پناہ محبت تھی۔ ساتھ ہی ثقافتی و اقتصادی استحصال اللہ کے دل و دماغ میں کرب آگیں جذباتی تموجات پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت کے پنجاب کا مسلمان استحصال کی آماج گاہ بنا ہوا تھا، لہٰذا گرد و پیش کے حالات نے نیز کچھ انگریزی قماز مسلمان زمین داروں وغیرہ کے باوجود اصرار پر اقبال مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ اقبال اچھے مقرر نہ تھے مگر ان کی شاعری کے ذلف گرہ گیر میں اسیر عوام پر ان کی شخصیت کا خاصا اثر پڑتا تھا قابل توجہ بات جو اکثر اوقات نظر انداز کر دی جاتی ہے یہ ہے کہ مسلم دفود و مسلم لیگ میں شمولیت کے باوجود ان کے حلقہ احباب میں ہندو حضرات برابر شامل رہے۔ اقبال کبھی ہندو دشمن یا وطن دشمن نہیں۔ تا دم واپسیں ان کو ہندو فلسفہ و مذہب سے رغبت رہی۔

ہمارے ملک بھارت میں تقسیم کے بعد سے اردو زبان ہی نرغے میں آگئی۔ مرور ایام کے ساتھ حالات بدلے گئے۔ اور جہاں تہاں اردو اکادمیاں اور ادارے قائم ہوتے گئے۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں ترقی پسند ادیبوں نے جشن صد سالہ کے موقع پر عالمی سمینار کا انعقاد کیا۔ جو اپنی نوعیت کا نہایت کامیاب سمینار تھا۔ اس کے انعقاد سے پیشتر اقبال پر جو کچھ لکھا گیا تھا۔ وہ باستثنائے چند نگارشات بالکل غیر معیاری ہی تھا۔ اقبال اور اسلام فلسفۂ خودی، فلسفۂ عمل، اقبال اور رومی وغیرہ موضوعات پر نہایت موعظانہ طور پر لکھا گیا تھا۔ جس میں کہیں کہیں بالخصوص یوسف علی خاں مرحوم کی تصنیف میں یہ بھی بتایا گیا کہ اسلام کو ہندو دھرم پر فوقیت حاصل ہے اور بودھ مذہب پر برتری حاصل ہے ہر چند کہ سیاق و سباق کے اعتبار سے ایسی باتوں کا جواز بھی تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال نے مغرب وغیرہ سے جو استفادہ کیا ان پر گیتا کو نشکام کرم، گائتری منتر وغیرہ سے مرتب ہوئے اثرات کا جائزہ لیا۔ سردار جعفری نے "اقبال شناسی" اور جگن ناتھ آزاد نے "اقبال اور اس کا عہد" محمد اقبال پر اردو اور انگریزی میں لکھ کر دہ موضوعات پیش کئے جو خاصے اہمیت کے حامل تھے اقبال پر بھرپور تنقیدی نظر ڈالنا اور اس کو معتقدات ذہنی سے نجات دلانا معمولی کام نہیں ہے۔

اقبال اپنے پہلے اردو مجموعۂ کلام "بانگ درا" (۱۹۲۴ء) کو اپنی نظم "نالۂ یتیم" سے بھی شروع کر سکتے تھے۔ یہ نظم ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں داد تحسین حاصل کر کے ملک بھر میں مشہور ہو چکی تھی۔ مگر اقبال نے "ہمالہ" کو پہلی نظم کے طور مجموعہ ہذا میں شمول کیا۔ اقبال اس کے ثقافتی و دینی پس منظر سے آشنا تھے ہمالہ ہندوستان کی فصیل ہے اور اساطیری بھولا شنکر ہے ؎

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

اک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

اقبال کے تصور پر ماضی ہند اتنا چھایا ہوا تھا اور انہیں اس ماضی سے اتنی وابستگی تھی کہ وہ جذباتی مراجعت کے خواہاں ہو اٹھتے تھے ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا — مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور، پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

برقی صاحب صحیح فرماتے ہیں کہ :

"اقبال نے اس ملک میں بسنے والے مختلف طبقوں اور فرقوں کے میل ملاپ اور بھائی چارہ پر زور دیا خاص طور پر اپنی نظم "ترانہ ہندی" میں انہوں نے کہا ہے کہ اگرچہ اس ملک میں مختلف فرقے بستے ہیں تاہم ان کی کثرت میں ایک رشتہ وحدت کا سبب ہے اگر ہندوستان کی تقسیم کا المیہ پیش نہ ہوتا تو ۔۔۔ یہ نظم ہمارے ملک کا قومی ترانہ بن گئی ہوتی ۔۔۔۔۔۔" (محب وطن اقبال، ص ۲۴)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

پوری نظم پرستارانہ جذبات کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم کے بارے میں یہ بات بہت کم ادیبوں کو معلوم ہوگی کہ یہ مشہور ترانہ سب سے پہلے "زمانہ" ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ ایک مصرعہ جو بعد کو بدل دیا گیا ملاحظہ ہو ؎

پنجاب کیا، دکن کیا، بنگال و بمبی کا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال نے پہلے مصرع کے بجائے "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" (یادگار جشن صد سالہ منشی دیانرائن نگم ماہنامہ زمانہ ۱۹۴۹۔۱۹۰۳ ص۔ ۲۲۴) اس سلسلے میں ایک معروضہ بہ زبانی کچھ یہ کہ ۔

"کتنے لوگ اس حقیقت سے آشنا و واقف ہیں کہ اقبال کا قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے پہلے "زمانہ" ہی میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا آنولہ کے مشہور و معروف سکینہ کالستھ شاعر تھے بریلی میں مجھے بتایا تھا کہ قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش منشی دیانرائن نگم نے اقبال، چکبست اور درگا سہائے سرور سے کی تھی بلکہ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ ان تینوں شاعروں کو منشی جی نے خطوط ان کے سامنے ہی لکھے تھے" (تارا چرن رستوگی، دیانرائن نگم ایک نصب العین، زمانہ ایک تحریک اور سنگ منزل مشمولہ جشن صد سالہ نمبر زمانہ ص ۲۵۳، ۲۵۲)

مہاتما گاندھی نے ایڈیٹر جمہور کے نام اپنے خط میں ترانۂ ہندی کی تعریف کی تھی۔ برنی صاحب نے نہایت محققانہ طور پر خط ہٰذا بطور اقتباس پیش کیا ہے۔ قومی ترانہ کی شان نزول سے متعلق ظفر ہاشمی کے مضمون علامہ اقبال کے ترانہ کے نزول (مشمولہ اوراق گم گشتہ ص ۳۱۸) سے اقتباس پیش کیا گیا ہے جس میں لالہ ہردیال کی ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن (YOUNG MENS INDIAN ASSOIATION) کا ذکر ہے۔ مزید براں یہ بتایا گیا ہے کہ افتتاحی جلسے کی صدارت نے کی اور اقبال کے بجائے "سارے جہاں سے ہندوستاں ہمارا" ترنم سے پڑھا۔ اعلیٰ حضرت سے گذارش ہے کہ وہ ہندی ترانہ کے پس منظر پر نظر ثانی فرمائیں۔ بہرکیف ہندی ترانہ حب الوطنی سے معمور و مشکور ہے۔ اعلیٰ حضرت نے درج ذیل حقائق خاصے اہم پیش کئے ہیں:

(۱) مہاتما گاندھی نے لڑکھالی میں اپنی پرارتھنا سبھا اپنی تقریر اس مصرعے پر ختم کی تھی ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

۲۔ شہید وطن شریمتی اندرا گاندھی نے ۷۶، ۱۹۷۵ء میں جب اعلیٰ حضرت برنی صاحب وزارت اطلاعات و نشریات کے سکریٹری تھے، دور درشن کی ملاقات میں اقبال کے ترانہ ہندی اپنانے کی تلقین کی تھی۔

قومی یکجہتی اور حب الوطنی میں دو مشہور نظموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو ہر اعتبار سے برحق اور خود اعتنا ہے ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا	نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا	جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

(ہندوستانی بچوں کا قومی گیت)

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے	خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ	داماں آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے	دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(نیا شوالہ)

صاحب وطن محب وطن اقبال نے فرقہ وارانہ نااتفاقی پر غم واندوہ جس نے اقبال کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ بھرپور نظر ڈالی ہے۔ جو گیارہ صفحات کو محیط ہے صورت حال سے اقبال کا دل غم واندوہ سے لبریز ہو اٹھا تھا ؎

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے	وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب	ایک ہی خرمن کے دانوں میں، جدائی ہے غضب

(صدائے درد)

اقبال نے یہی تلقین کی کہ ہم ذہنی پستی کے قعر سے نکلیں عصبیت کو سم قاتل سمجھیں اور رجائیانہ طرز حیات استوار کرنے کی کاوش کریں ؎

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے ۔۔۔ گزاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے
صفائے دل کو کیا آرائش رنگ تعلق سے ۔۔۔ کف آئینہ پر باندھی ہے او ناداں حنا تو نے

ہمیں خود شناس ہونا چاہئے اور قومی اتحاد اور باہمی محبت کی فضا پیدا کرنے کے لئے سرگرم کار رہنا چاہئے ؎

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا ۔۔۔ یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے ۔۔۔ ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں ۔۔۔ غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے ۔۔۔ کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو ۔۔۔ مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہو

اپنے قیام یورپ کے دوران قومیت کے نشے میں چور حب الوطنی کو انسانیت کش دیکھتے ہوئے اقبال قوم پرستی کے نظریہ سے بیزار ہوا تھے اور اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ یورپ سیاسی خودکشی کی طرف جا رہا ہے۔ یہی خیال W. H. AUDEN کا تھا۔ برنی صاحب نے درج ذیل اقتباس پیش کیا ہے جو ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا آئینہ دار ہے۔

IT THE NIGHT MORE OF DARK
ARE THE DOGS OF EUROPE BARK
AND THE LIVING NATIANS WAIT
EACH SEQUESTERED IN THE HATE

رات کی ہولناک تاریکی میں
سارے یورپ کے کتے بھونک رہے ہیں ۔
اور زندہ قومیں منتظر ہیں
ہر ایک اپنی نفرتوں میں پناہ گزیں

اقبال کا بیدار ذہن گزرنے والے واقعات کو دیکھ رہا تھا ؎

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں ۔۔۔ مری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

اسلامی وطنیت ۔ اس پر ایک مضمون بعنوان ، اقبال کا تصور وطنیت ، (زبان وادب جنوری مارچ ۹۴ ص ۳ ۹ از مجید بیدار) کے حوالے سے اور اگر میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دے رہا ہے ڈاکٹر خلیق انجم کے ، اقبال اور قومی یک جہتی ، پر تبصرے کے حوالے سے اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے کہ ، حب الوطنی ایک پاجی آدمی کی آخری پناہ گاہ ہے ، صحیح فقرہ یوں ہے

" POLITIS IS THE LAST RESORT OF A , COUNDRD "

یعنی سیاسیات بدمعاش شخص کی آخری کمین گاہ ہوتی ہے ، خیر اس سے موضوع زیر بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اعلیٰ حضرت نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ اسلامی وطنیت پر بات کرنے اور اس سے متعلقہ اشعار پیش کرکے ، اس اہم نکتے کو نہ جانے کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ اسلام کے عقیدہ و اعمال کا پاسداری میں اقبال کے یہاں کہیں بھی حب وطن سے بے نیازی ظاہر نہیں ہوتی (محب وطن اقبال ص ۴۱)

ہے اگر قومیت اسلام پابند مقام — ہندی بنیاد ہے اس کی نہ فارسی ہے نہ شام

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اور اقبال کے مابین جو اختلاف رائے پیدا ہوا اور جس کا جذباتی ردعمل درج ذیل اشعار میں نظم ہو گیا ہے

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ ؛ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ راست دامان است ؛ — چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ اشعار ان کے آخری مجموعہ کلام ارمغان حجاز میں شائع ہوئے ۔ (بحوالہ اقبال کا سیاسی زمانہ ، محمد احمد خاں ص ۵۹۸) تو یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے ان اشعار کو شائع کرنے کی مخالفت کی تھی ۔حقیقت یہ ہے کہ وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے ، (محب وطن اقبال ص ۴۳) اس کی تصدیق میں اقبال ہی کے ایک مضمون سے یہ اقتباس درج کرنا مناسب ہے ۔ اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے ، (اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۵۹۷) محب وطن اقبال (از سید مظفر حسین برنی ص ۴۳) برنی صاحب کی رائے سے کون اتفاق نہیں کرے گا ۔

برنی صاحب کی ندرت بینی ، توانائی ، انتقادو استدلال پر بھرپور روشنی اسی بات سے فراہم ہو جاتی ہے جو اعلیٰ حضرت نے ، جہان دوست ، کے بارے میں سپرد قلم فرمایا ہے انہیں کے الفاظ میں ، جگن ناتھ آزاد نے اپنی تصنیف IQBAL : MIND & ART جہان دوست کو شودر قرار دیا ہے ۔ میرے خیال میں علامہ اقبال نے جس طرح ، جہاں دوست ، کا ذکر کیا ہے اور اسے عارف ہندی ، اور پیر ہندی ، کہا ہے اس لحاظ سے جہان دوست دوست شودر ہی ہو سکتا ہیں ۔ شودر نہیں ہو سکتے ۔ شودر ہی سکتے ہیں ، اقبال ان کو ہرگز عارف نہ کہتے

وہ تو سرچشمہ معرفت ہیں ۔" (محب وطن اقبال ص ۹۴)

جواب مسکت ہے اور بالکل نیا ہے ۔ برنی صاحب کی یہ ادا بے قابل صد داد و تحسین ہے ۔ اس سلسلے میں ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہوں گا جب ۱۹۳۲ء میں مسلم وفد جس میں اقبال بھی شامل تھے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلینڈ گیا تھا ۔ ایک ہوٹل میں ہندوستان کے مسلم طلبا نے اقبال کو استقبالیہ دیا ۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے اپنی تخلیق " جاوید نامہ " کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ شاعر نے وشومتر کا ترجمہ تخلیق نیا میں جہاں دوست کیا ہے (ص
S.A. Vahid. Thoughts & Reflections of Iqbal (۲۲۵-۲۷

الغرض وشومتر (وشوامتر کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے جہاں دوست کے بجائے مطلب جہاں دشمن ہوجاتا ہے) اقبال کے نزدیک فرشتہ رحمت و بشارت ہے ۔

اقبال کو غداران وطن سے نفرت تھی لہٰذا میر جعفر اور میر صادق جیسے ننگ ملک و قوم لوگوں کی روحوں کو دوزخ کے نچلے طبقے اسفل السافلین میں دکھایا گیا ہے ۔

ملک دوست ٹیپو سلطان سے متعلق جاوید نامہ میں تذکرہ قابل صد لحاظ ہے اور جس کی آج بھی اہمیت وافادیت کم نہیں ہوتی ہے ۔ برنی صاحب نے ایک اور اطلاع بہم پہونچائی ہے کہ :

" یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انقلاب فرانس کا منشور ۱۵ مئی ۱۷۹۷ء کو ٹیپو سلطان شہید کے دارالحکومت سری رنگا پٹم کے پریڈ گراؤنڈ میں دریائے کاویری کے کنارے پڑھ کر سنایا گیا تھا ۔ سب نے ملک کی آزادی کے لئے جان دینے کا حلف اٹھایا تھا اور سب نے بیک آواز کہا تھا کہ ہم ملک کو آزاد کرائیں گے یا اپنی جان دیدیں گے ۔ انقلاب فرانس کا پودا تو ہندوستان کی سرزمین میں برگ و بار نہ لا سکا مگر اس کا شعار ، آزادی ، اخوت اور مساوات ہماری جنگ آزادی کی طویل راہوں میں روشنی دیتا رہا ہے ۔ اپنے فرانس کے دورے میں (جون ۱۹۸۵ء) ہمارے ہر دل عزیز نوجوان وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے اس اہم تاریخی واقعہ کو یاد دلایا " (محب وطن اقبال ص ۶۴)

اقبال کی مثنوی " پس چہ باید کرد اے اقوام شرق " (۱۹۳۶ء) میں ایک نظم اشک چند بر افتراق ہندیان ہے وہ کہتے ہیں ؎

اے ہمالہ، اے اٹک اے رود گنگ ۔۔۔ زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

یعنی اے ہندوستانیوں کب تک غلامی میں زندگی بسر کروگے اور بعد کو کہا ؎

کس نداند جلوۂ آب از سراب ۔۔۔ انقلاب، اے انقلاب اے انقلاب

مزید براں ان کے اردو شاعری کے آخری مجموعہ "ضرب کلیم" میں "نظم شعاع امید" میں وطن کی محبت کے لئے ان کا دل دھڑک رہا ہے۔" (محب وطن اقبال ص ۶۷)

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو ۔۔۔ مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن ۔۔۔ تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر ۔۔۔ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کی وطن محبت ان کے آخری مجموعہ کلام "ارمغان حجاز" سے بھی کرن کرن جھلکتی ہے ؎

شب ہندی غلاماں را سحر نیست ۔۔۔ بایں خاک آفتابے را گذر نیست
دگرگوں کشور ہندوستان است ۔۔۔ دگرگوں زمین و آسمان است
مجو از ما نماز پنجگانہ ۔۔۔ غلاماں را صف آرائی گراں است

اپنی وفات سے صرف پانچ ہفتہ پہلے مارچ ۱۹۳۸ء میں مولانا مدنی سے بحث کے دوران قومیت کے بارے میں اپنے نظریات سپرد قلم فرماتے تھے۔ جو بڑا کلیدی نکتہ پیش ہے۔

"ہزاروں لاکھوں برس سے قومیں ملکوں سے اور ملک قوموں سے وابستہ رہے ہیں۔ ہم سب ہندوستانی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کے اس حصے میں بستے ہیں جسے ہندوستان کہا جاتا ہے ...... مادر وطن کا تصور ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے دوسری لفظوں میں ہر شخص فطری طور پر اپنے مادر وطن سے محبت کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے مقدور بھر قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے۔" (محب وطن اقبال ص ۷۰)

بنہایت وضاحت و تشریح کے ساتھ برنی صاحب نے اقبال پر ہندوستانی فکر و فلسفے پر لکھا ہے اقبال کے مضامین سے اقتباسات تصدیق و توثیق کے لئے پیش ہے حوالہات پیش کئے گئے ہیں مثلاً

(۱) عبدالکریم الجیلی کا نظریہ توحید پر انگریزی مضمون میں بشمول دیگر امور یہ بھی لکھا کہ "ہم کبھی فلسفیانہ شعور میں ہندو مت کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ ظہور اسلام کے بعد عربوں ..... کو فلسفہ و علوم ..... کے لئے بہت ہی کم فرصت تھی اس لئے وہ کپل (Kapila) اور شنکر اچاریہ جیسی شخصیتیں نہ پیدا کر سکے، نہ کر سکتے تھے۔ (ص ۶۲)

(۲) عظیم ہندو مفکر کپل (Kapila) نے کائنات کے لئے تین گنوں کا نظریہ پیش کیا ہے یعنی ستوا (خیر)، تماس (ظلمت)، اور رجس (جذبہ یا احساس)، جن کی باہمی ترکیب سے فطرت وجود پذیر ہوتی ہے جب اساسی مادہ (پراکرتی Prakriti) کا توازن بگڑتا ہے۔ کثرت مظاہر کے مسئلے کے متعدد حل نکالے

جیسے ویدانتیوں نے " مایا " کی پراسرار قوت کا مفروضہ پیش کر کے حل کیا ہے اور لیبنز (Leibniz)
ایک زمانہ کے ابداسی کو اپنے " غیر شعور کی شناخت " کے نظریے سے واضح کرتا ہے ۔

برنی صاحب نے اسی سلسلے میں مایا سے متعلق اقبال کے نظریہ اور اس نظریے سے اقبال کا نمایاں اختلاف بھی دکھایا ہے ۔ بہر کیف ویدانتی اور صوفیا کہتے ہیں کہ یہ دنیا خواب نہیں ہے بلکہ خواب بیداری ہے ۔

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است ۔۔۔ کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری است

یہاں پر ایک مفروضہ ہے ۔ یہ بات غلط ہے کہ اقبال سنسکرت جانتے تھے ۔ آریائی فرقوں کے فلسفے تک اقبال کی رسائی محض میکس مولر کے تراجم و تفاسیر کی وساطت سے تھی جس کا ایک بین داخلی ثبوت (Internal Evidence) اس سے فراہم ہوتا ہے ۔ کہ اقبال نے گاتری کے ترجمے پر لکھے شذرات میں سوریہ نرائن اپنشد کا ذکر کیا ہے جو میکس مولر کی تفسیر سے لیا گیا ہو گا کیونکہ اپنشد کا نام صرف سوریہ اپنشد ہے " نرائن " کی شمولیت شرارت میکس مولر نے کی ۔ مزید یہاں مایا کا صحیح تصور یہ ہے کہ اس اصطلاح سے (Passing Reality) یعنی حقیقت گذراں مراد ہوتی ہے ۔ مایا Contingent یعنی اضافی حقیقت ہے ۔ गुण (گنا) کو سہولت کے لئے تین پہلو (Aspects) کے تحت لیا جانا چاہئے ۔ ست گن (सत्त्व गुण) ، تموگن (तमो गुण) اور رجوگن (रजो गुण) لغا ہے یہ ایک ہی حقیقت کے تین پہلو ہیں ۔ اقسام نہیں ، انہیں سے پراکرتی (प्रकृति) تکوین وجود میں آتی ہے ۔ دراصل یہ علاحدہ بحث ہے ۔ اقبال کو میکس مولر ہی کے توسط سے ہی ہندی فلسفے سے رغبت و محبت تھی ۔

بایں ہمہ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ اقبال ویدانت کے ابعاد کو نہیں سمجھ سکے جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے ۔

" ہندوستانی ویدانتی کی تعلیم یہ ہے کہ سارے دکھوں کا سبب یہ ہے کہ کائنات کے ساتھ ہمارے رویہ میں غلطی واقع ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی فطرت اصلی فکر سے عبارت ہے ارادہ و عمل سے نہیں "

(محب وطن اقبال ص ۷۹ ، بہ حوالہ ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کا ارتقا از اقبال)

یہی خیال میکس مولر کا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ویدانت فکر و ارادہ و عمل کو ایک ناقابل تقسیم وحدت کہتا ہے مزید یہاں اقبال قلب یا اس کے مصدر کو ویدانت کی اصطلاح میں علم برتر پر محمول کر گئے ۔ [illegible] (پرا ودیا) کو علم برتر نہیں بلکہ مابعد العقل کہنا چاہئے تھا ہر چند کہ یہ ترجمہ بھی پوری طرح معنویت کو نہیں سمیٹ سکتا ۔ بہر حال سوال یہ نہیں ہے کہ اقبال کیا سمجھ سکے ۔ اور کیا نہیں سمجھ سکے ۔ مطلب صاف یہ ہے کہ ہندی فلسفے سے ان کا لگاؤ گہرا تھا ۔ موت کے بارے میں اقبال کے خیالات آتما کے ہندوستانی نظریے سے ماخوذ ہیں وہ یہ عقیدہ

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی　　ہے یہ شام زندگی، صبح دوام زندگی!
(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

برنی صاحب کا مطالعہ اتھروید کے شلوک کا ترجمہ بہم پہنچاتا ہے۔

" अभय मित्राद भयम मित्राद
अभय ज्ञाताद भय परोक्षाद
अभय नक्तम भय दिवान
सर्वा आशा मम मित्र भवन्तु " (19: 5.6)

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو　　احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو
روشن مرے سینے میں محبت کا شرر ہو　　دل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو

پہلو میں مرے دل ہو مے آشام محبت
ہر شے ہو مرے واسطے پیغام محبت

(غیر مشمول، روزگار فقیر میں ہے)

غرض کہ اقبال ویدوں کے جانب بھی با احترام رجوع ہوئے۔ یہاں یہ کہتا چلوں کہ ترجمے میں لفظ " मित्र " کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ لفظ روشنی، علم عرفان، انسان دوستی جیسے مفاہیم پر محیط ہے مزید براں اس کے ساتھ ایک مخصوص سلک معنویت بھی ہے۔ جس کا ترجمہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ جملہ معترضہ میری جانب سے تھا۔ اقبال کی کاوش قابل داد ہے۔

اسی طرح اناماری سمل کی تصنیف Gabrieli Wing سے استفادہ کرتے ہوئے برنی صاحب نے اقبال پر اپنشدوں کے اثر کی نشاندہی کی ہے جو نہایت زیاف بینی سے عبارت ہے۔

بدھ مت (صحیح دراصل بودھ مت ہے مگر اردو میں بدھ ہی نظر آتا ہے) کا اثر بھی اقبال پر پڑا ہے۔ اقبال نے گوتم بدھ (یہاں بدھ صحیح ہے) کو پیغمبروں میں شمار کرتے ہوئے تمام مذاہب کی برگزیدہ شخصیتوں کی تعظیم کا ثبوت دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گوتم بدھ کی رہبانیت انسانی بنیاد پر قائم ہے۔ اس سے انسانوں کی غمخواری کا ثبوت ملتا ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال کی ملاقات وادی طواسین میں ہوتی ہے۔　(ص ۸۷، محب وطن اقبال)

"جاوید نامہ" سے گوتم بدھ سے متعلق اشعار پیش کرتے ہوئے اقبال کے جذبات و خیالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
گایتری: گایتری شلوک کو سنسکرت میں پیش کرتے ہوئے اور راقم الحروف کے مقالے IQBAL &

[illegible]

کیا گیا ہے۔

اے نورِ ازل اے رخشندہ آفتاب

آ ہم تیری عبادت کریں

آ ہم کو اپنے نور سے خرد کی روشنی عطا کر۔

اقبال کی نظم "آفتاب" گائتری منتر کی تفسیر کا بہترین منظوم ترجمہ ہے۔ غالباً میرا مضمون "گائتری منتر" جو گفتگو بمبئی کے ایک شمارے میں شامل تھا۔ اور ایک دوسرا مضمون "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" پر تجزیاتی نظر (زبان و ادب پٹنہ) برقی صاحب کو نہیں ملے مگر ایں ہمہ اعلیٰ حضرت نے سبھی نکات کا احاطہ کیا ہے۔ صرف ایک بات کی طرف توجہ منعطف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں ایک نظم بعنوان "خطاب بہ مہرِ عالم تاب" شامل ہے۔ جو کلیدی اعتبار سے "آفتاب" (گائتری) سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ بلکہ اس کو بھی گائتری کا ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔

"بھگوت گیتا کا فلسفۂ عمل: اقبال گیتا کے فلسفۂ عمل سے بہت متاثر تھے، گیتا میں آتما (خودی) کو لافانی کہا گیا ہے اور عمل کو جزا و سزا کی لاگ کے بغیر زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین بتایا ہے۔" (ص ۹۲ محبِ وطن اقبال) اقبال کے خیالات کا درج ذیل اقتباس "محبِ وطن اقبال" بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو فی الواقع جاذبِ توجہ ہیں:

"سری کرشن ..... اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایت پر تنقید کی ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ترکِ عمل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم عمل ہی کرنا چھوڑ دیں ...... دراصل ترکِ عمل کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود کو عمل کے نتائج سے بے تعلق کر لیں۔" (از پیش لفظ اسرارِ خودی)

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے　　حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر

سوداگری نہیں ہے عبادت خدا کی ہے　　اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے　　پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

الغرض مثالوں پر مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بھرتری ہری جو ساتویں صدی عیسوی کے سنسکرت کے شاعر و عارف شاعر تھے اقبال کی توجہات کا مرکز بنے رہے اقبال کا اردو ترجمہ "بالِ جبریل" بھرتری ہری کے خیالات کا ترجمان معلوم ہوتا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

व्याल बालमृ णालतन्ता रोद्ध समुज्जम्भते
भत्तु वज्रमीया शिरीष - कुसुम सन्नह्यते
माधुर्य मधुबिन्दुना रचयितक्षाराम्बुधेरीहते
नुरवा-या पथि नताम सूक्ति बलात्सुकते :
(भर्तृहरि नीति शतक श्लोक 5)

یہ شلوک جناب برنی صاحب نے THE EPIGRAMS ATTRIBUTED TO BHARAT RIHARI: ED KOSAMBIA سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ بڑا محنت و مشقت کا کام ہوتا ہے۔
اس شلوک کی بابت ایک بات عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس طرح خیام کی متعدد رباعیاں جیسے «تا بود دلم از عشق محروم نہ شد» سرمد کی رباعیوں میں بھی ملتی ہیں اسی طرح مولہ شلوک «ہت اپدیش» میں بھی ملتا ہے۔ بہرکیف اس مفروضے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اقبال نے شلوک کے کلیدی خیال کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جو قابل ستائش بھی ہے اور اس حقیقت کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اقبال کے دل میں ہندی شعر و فلسفہ کے لئے نرم گوشہ تھا۔
اقبال رامائن کو اردو شعر میں ملبوس کرنا چاہتے تھے۔ اور اس موضوع پر مہاراجہ سر کرشن پرساد کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا، اقبال نے رام چندرجی، گرو نانک، سوامی رام تیرتھ پر ہم ہنس (جو اقبال کے دوست تھے) وغیرہ پر نہایت معیاری اور شعری حسن سے جلوہ جلو نظمیں کہی ہیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی ثقافت و تہذیب کی دلدادگی نے اقبال سے ایسے اشعار بھی کہلوائے ۔؎

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے　　شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

تحریک آزادی : اپنی شاعری میں اور دوسری تحریروں میں اقبال نے ہندوستان کے برطانوی سامراج کے غلام ہونے پر مسلسل اپنے رنج و کرب کا اظہار کیا۔ ہے ان کے ابتدائی دور کی نظم «پرندے کی فریاد» بھی علامتی نظم ہے۔
ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و سکون ہے۔ مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخ عالم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں۔ اس کی عظمت و اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے۔ آئندہ نسلیں اس کی تاریخ کو پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔ (ص ۱۴۱، محب وطن اقبال)
آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو منجملہ دیگر امور پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال نے یہ بھی کہا تھا:
" ہندوستان کی سیاسی غلامی ساری ایشیا کے لئے بے پایاں مصیبت و نحوست کا سبب رہی ہے۔ اور آج بھی ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اور اسے اپنے اظہار کے اس ولولے سے

بالکل محروم کردیا ہے جس کی بدولت وہ کبھی ایک عظیم اور شاندار ثقافت کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کے لیے جس میں ہمارا مرنا جینا مقدر ہے، ہمارا کچھ فرض ہے "

اعلیٰ حضرت بالکل درست فرماتے ہیں کہ: انہوں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا جیسے سال بیلو (SAUL BELLOW) کی کہانی کا ایک کردار کہتا ہے۔

("I WAS NEVER MY OWN I WAS ONLY LOANGE TO MY SELF")

"میں کبھی اپنا نہیں تھا، میں تو خود کو مستعار دیدیا گیا تھا" (ص ۱۲۷، محب وطن اقبال)

مغرب کی غلامی پر لعنت کی شعر اقبال میں نشاندہی تو متعدد نقادوں نے کی ہے مگر برنی صاحب نے جس طرح تجزیہ کیا ہے وہ لاجواب نیت دانشوری سے عبارت ہے۔ موصوف کی رائے میں اقبال نے دو تجاویز پیش کیں۔

(۱) مغربی تعلیم، مغربی فکر، مغربی تہذیب اور روایات کی مذمت کی جائے۔

(۲) اقوام مشرق بالخصوص ہندوستان کی غلامی سے اقبال کے دل میں کرب واندوہ تھا انہیں سودیشی تحریک کی حمایت پر آمادہ کیا نیز اقوام مشرق کو بیداری و آزادی کی بشارت دی۔ جس کے لئے انہوں نے فلسفہ خودی پیش کیا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو ۔ ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار ۔ طائرک بلند بال دانہ و دام سے گذر

آدمیت زار نالید از فرنگ ۔ زندگی ہنگامہ ہر چند از فرنگ

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ۔ باز روشن می شود ایام شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید ۔ شب گذشت و آفتاب آمد پدید

دل میں انقلاب کی خواہش بیدار ہوتے ہی غلامی کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اور آفتاب آزادی ضوفشاں ہو جاتا ہے۔

فلسفۂ خودی پر اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے یہاں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے (اقبال) نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندوستان میں ہر طور پر ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے خلاف استعمال کیا ... ایک غلام قوم کے لئے خود اعتمادی، خود شناسی، اور تعمیر خودی سے زیادہ مناسب پیغام ہو بھی نہیں سکتا میں اقبال کے فلسفۂ خودی کو ایک نہایت حساس شاعر کی طرف سے اپنے ملک کی سیاسی غلامی کا ردعمل سمجھتا ہوں " ۔

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر — قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

یہ موج نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے ؟ بیداریٔ کائنات

نظریۂ آدم لو اگر غور سے دیکھا جائے تو خودی ہی کے نظریہ سے عبارت ہے ۔

آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی

برنی صاحب کے خط سے متعلقہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ۔

۵ ؍ مارچ ۱۹۸۵ء

جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے محمد علی جناح نے رحمت علی کے نظریہ پاکستان پر جو تنقید کی تھی اس تنقید کا ماخذ کیا ہے ؟ میں آپ کی توجہ فرینک موریس کی کتاب WITNESS TO AN ERA کے صفحہ ۸۰ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے ڈکاسن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے اور جو ۱۹۷۳ء میں برطانیہ میں چھپی ہے ۔ متعلقہ اقتباس مندرجہ ذیل ہے ۔

" میں جب کبھی رحمت علی کا ذکر کرتا تھا تو جناح کی بھویں تن جاتی تھیں ۔ وہ رحمت علی کے نظریہ پاکستان کو گرد ملیشن ہائٹ میر ڈکا اوس نہیں تو کم از کم والٹ ڈسنے WALT DISNEY ڈریم لینڈ DREAM LAND جنت الحمقا ضرور سمجھتے تھے ۔ میں سمجھتا ہوں ان کا یہ ناک بھوں چڑھانا ایسا تھا جیسے کسی ایسے اناڑی پر ایک ماہر کھلاڑی جھنجھلاتا ہے ۔ جو ترپ کا پتا پاس نہ ہوتے ہوئے بھی شو (SHOW) کا اعلان کر دے شاید آپ کو یہ کتاب حاصل کرنے میں دشواری محسوس ہو میں اس کے صفحات ۷۸ اور ۸۰ کے ضروری اقتباسات خط کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں "

(ص ۱۴۲ ، ۱۴۳ محب وطن اقبال)

برنی صاحب کا جواب مدلل بھی ہے اور استفادی بھی ہے ۔ جاوید اقبال صاحب بھی اسی مغالطے میں اسیر رہے کہ پاکستان کا خاکہ اقبال کے خیالات سے عبارت ہے ۔ اور اگر ان کی حیات نے وفا کی ہوتی تو وہ PAKISTAN NATIONALISM (پاکستانی قومیت) کے خاص بانیوں میں ہوتے ۔

(STRAY REFLECTIONS 1960 xxi. Ed. Jawid Iqbal)

برنی صاحب نے STRAY REFLECTIONS کا حوالہ نہیں دیا ہے ۔ مگر ان کے مکتوب کا ان میں محققانہ طور پر اس کی جانب اشارہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے ۔

برنی صاحب نے مزید شواہد بھی بہم پہنچائے ہیں جو بڑے اہم ہیں ۔

" عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے "

مہاراجہ سرکشن پرشاد، سر جگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ (والد معروف نقاش امرتا شیرگل)، مہاراجہ رنجیت
سنگھ کی پرپوتی شہزادی بمبا دلیپ سنگھ، سروجنی نائیڈو، ملک راج آنند، ڈاکٹر سوالال جو تپا کا ذکر کیا ہے۔ ان
سب کے متعلقات تحقیق و تلاش سے بیان کئے ہیں۔ ایک نام صرف نظر ہوگیا ہے یعنی سر تیج بہادر سپرو جن
کے داماد جو آئی سی ایس تھے اقبال سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ مختلف فرقوں سے نزدیکی تعلقات کی بنا پر
گایتری کا ترجمہ کرنے اور رام چندر جی پر نظم لکھنے پر چند کٹر ملا حرکت میں آگئے۔ شدھی سنگھٹن اور تبلیغ جیسی
تحریکوں سے ویسے ہی فضا خاصی مکدر ہو چکی تھی۔ نوبت این جا رسید کہ لاہور کے مولانا ابو محمد دلدار علی شاہ جو
اپنے شوق تکفیر کے لئے مشہور تھے۔ اقبال کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا۔ ملحوظ رہے کہ اقبال نے اس کا کوئی بھی
نوٹس نہیں لیا۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جید عالم دین اور دیگر علمائے اسلام ابو محمد سید دلدار علی شاہ
پر بہت لعن طعن کیا۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا — اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

اس کے بعد اقبال کے فرزند رشید جاوید اقبال کے حوالے سے اقبال کی تصنیف "زندہ رود" سے اقتباس پیش
کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت برنی صاحب فرماتے ہیں کہ "کسی قابل استناد و تاریخی مواد کے موجود نہ ہونے کے باعث
اس پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے لیکن بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اقبال اپنے کشمیری برہمن ہونے پر نازاں تھے۔
(محب وطن اقبال ص ۸ - ۱۴۷)

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند — جز برہمن پسرے محرم اسرار کجا است

نہ جانے کیوں کچھ لوگ تحقیق و تنقید کو جذباتیت سے لوث کر ڈالتے ہیں۔ اسلام نے دنیا کی تاریخ میں بہت بڑا
رول ادا کیا ہے۔ اور یہ نے اپنی انگریزی تصنیف MUSLIM WORLD : ISLAM
BREAKS FRESH - GROUND (جو پریس میں ہے) درج ذیل نتائج اخذ کئے ہیں۔

۱۔ فلاحی معاشرہ (WELFARE SOCIETY) سماجی سوسائٹی (SOCIALIST SOCIETY) کی خشت اول اسلام ہی نے فراہم کی۔

۲۔ ہندو، ہندی، ہندوستان تینوں فارسی لغات ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے شیو، وشنو، تانترک
شاکت، بدھ، جین وغیرہ فرقے تھے جن کو مجموعی نام مسلمانوں ہی نے دیا۔ ہندو کو حیثیت [illegible] (CATEGORY) کی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اب یہ ایسی اصطلاح ہے [illegible]
THE [illegible] OF HINDU FUNDAMENTALISM [illegible]

(ہندو فنڈلیشلزم کی نمائندگی) میں ڈالی ہے۔

۳۔ اسلام نے اپنے فاتحوں کو مفتوح بنا ڈالا۔ مزید برآں منگول قوم مشرف بہ اسلام ہوگئی۔

۴۔ ابن رشد، ابن سینا وغیرہ نے فلاسفہ پر تفاسیر لکھیں۔ ان کی کاوشوں نے یورپ کی ثقافتی وراثت کا تحفظ کیا۔

۵۔ خاندانی ملوکیت، آمریت وغیرہ نظام حکومت اسلام کی اسپرٹ کے منافی ہیں خلیفہ کا انتخاب اجماع پر منحصر ہوتا تھا۔

۶۔ یورپی زبانوں میں لاتعداد عربی لغات شامل ہوگئے مثلاً COTTAN, TAMARIND, ADMIRAL بالترتیب قطن، ابر البحر، تمر ہند وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

۷۔ اسلام قومیت، فرقہ واریت، ذات پات وغیرہ بالاتر تصور پیش کرتا ہے۔ برہمن، چھتری وغیرہ، طبقاتی تفرقات سے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ملحوظ رہے ویدک فلسفہ ثقافت بھی صرف انسانیت ہی سے مخاطب ہے۔ بھگوت گیتا میں بھی انسانی طبقات، وابستگی، اور انفرادی خصوصیات و عمل پر مبنی بنائی گئی۔

یہ سب کہنے کی ضرورت باوجوہ پیش آئی۔ کیونکہ اقبال کا برہمن زاد یا نژاد" دونوں متنازعہ ہیں۔ راقم الحروف اعلیٰ حضرت جیسی ذات ستودہ صفات سے استدعا کرسکتا ہے کہ وہ درج ذیل مضامین مطالعہ فرمائیں۔ اور اس کے بعد صائب رائے سے ہم سب کو نوازیں۔

(۱) اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور (ہماری زبان) از تارا چرن رستوگی۔
(۲) چہ گفتم، چہ شنیدی، چہ در گماں آید۔ " " "
(۳) کیا اقبال کشمیری پنڈت تھے " " عظیم فیروز آبادی
(۴) اقبال کے والد شیخ نتھو حصہ اول ودوم " " ڈاکٹر صابر کاشمیری
(۵) اقبال صفر، اقبال صفر کے علمبردار کے نام (سہیل بنی) تارا چرن رستوگی۔

برہمن زاد یا نژاد ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اقبال کو اپنے آبا و اجداد (ہندوؤں) کی ثقافت پر ناز تھا اور اس کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور بس۔ اس موضوع پر انتقادی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اقبال اور پاکستان بالعموم اقبال کو پاکستان کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ گہری انتقادی نظر اس دعوی کی تکذیب کرتی ہے۔ موضوع کا تقاضا ہے کہ پورے پس منظر پر نظر ڈالی جائے مگر برنی صاحب کے مکتوب بنام ڈاکٹر جاوید اقبال سے حقیقت وانکشاف ہوجاتی ہے کہ اقبال نظریہ پاکستان کے خلاف تھے۔ بات اس طرح شروع ہوئی برنی صاحب نے اپنی تصنیف "اقبال اور قومی یک جہتی" کا ایک نسخہ اقبال کے فرزند رشید جاوید اقبال صاحب کو [illegible] مکتوب گرامی [illegible] تحریر فرمایا کہ

[illegible]

نے بھی رحمت علی کے نظریہ پاکستان پر زوردار تنقید کی تھی۔ انہوں نے اسے طالب علموں کا خواب اور قطعی ناقابل عمل قرار دیا تھا۔ رحمت علی کا نظریہ پاکستان ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے مترادف تھا۔ اور مسلم صوبوں کی علیحدہ تقسیم اور انہیں ایک علیحدہ فیڈریشن میں تبدیل کرنا نہیں تھا۔ اس لئے ان کے نظریہ پاکستان کی مخالفت بہت سے مسلم رہنماؤں نے کی تھی۔ جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے لیکن آپ نے اس ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ اگر آپ مجھے اس کتاب کا حوالہ مہیا کر سکیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ (اقتباس از مکتوب ڈاکٹر جاوید اقبال لاہور ۱۹ فروری ۱۹۸۶ء ص ۱۴۰۔۱۴۱)

(محب وطن اقبال)

۱۶ مارچ ۱۹۳۳ء کو کلکتہ کے راغب احسن کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا:

"براہ کرم یہ بھی دھیان کیجئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ میری اسکیم کو نظریہ پاکستان سے (ایڈورڈ ٹامسن) مخلوط کر رہا ہے۔ میں تو انڈین فیڈریشن میں ایک مسلم صوبہ کی تشکیل کا حامی ہوں جب کہ نظریہ پاکستان میں شمال مغربی ہند کے مسلم صوبوں کی ایک جداگانہ فیڈریشن کی بات کہی گئی ہے جو انڈین فیڈریشن سے الگ اور براہ راست انگلستان سے مربوط ہوگا۔" (اقبال جہان دیگر مطبوعہ پاکستان)

ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے کہ ایک گفتگو کے دوران اقبال نے ان سے کہا تھا کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت آل انڈیا مسلم لیگ سیشن کے صدر کی حیثیت میں ہونے کی وجہ سے کی تھی۔ مگر انہیں یقین تھا کہ یہ ہندوستان کے لئے عام طور پر اور مسلمانوں کے لئے خاص طور پر نقصان دہ ہوگا۔ اپنی موت سے چند ماہ پہلے جب وہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے انہوں نے مجھے بلوایا۔ جب ان سے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اختلاف کے باوجود ہمارے بہت سے خیالات مشترک ہیں۔ مجھے یہ محسوس کر کے بہت خوشی ہوئی کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں اور میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میرے رخصت ہونے سے ذرا پہلے انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم میں اور جناح میں کیا بات مشترک ہو سکتی ہے؟ وہ ایک سیاست داں ہیں اور تم ایک محب وطن ہو۔"

(JAWAHARLAL NEHRU:, DISCOVERY OF INDIA P.354.55)

محولہ فوق شواہد بڑے ٹھوس شواہد ہیں۔ جناح کے نام لکھے گئے دو خطوط بالترتیب مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء اور ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے پیش نظر جناب پروفیسر آل احمد سرور نے یہ مطلب نکالا ہے کہ اقبال اپنی وفات سے ایک سال سے ذرا پہلے دو جداگانہ مسلم ریاستوں کی تشکیل کی حمایت کرنے لگے تھے۔ اور شاید ٹامسن کے حافظے نے اسے کچھ دھوکا دیا ہو۔ برنی صاحب نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ سرور صاحب نے جو مطلب نکالا ہے وہ اقبال کے انداز فکر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ انتہا غلط ہے۔ دراصل سرور صاحب شاعر ذہن ہیں ناقد اور محقق ہیں شاعر ہو [illegible]

ڈاکٹر ظفر حمیدی

خوشونت سنگھ سے ملاقات

آج سے تقریباً دس سال قبل ایک پوسٹ کارڈ میرے پتہ پر موصول ہوا۔ مضمون کچھ یوں تھا۔

"جناب محمدؐ فیروز صاحب! اسلام علیکم!
میں آپ کے جانے کے بعد آپ کی اہلیہ کے پاسپورٹ کی حصول کے لئے کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ کام مشکل ہے اور وقت لگے گا امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ واپسی میں مجھ سے ملاقات کرتے جائیں گے۔ باقی خیریت ہے۔
آپ کا خوشونت سنگھ"

اس خط میں لفظ "محمدؐ" پر "ؐ" لکھا ہوا پڑھ کر مجھے ایک شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ خوشونت سنگھ ایک آزاد خیال اور آزاد مشرب "سکھ" فنکار اور صحافی ہوتے ہوئے بھی حضرت محمدؐ کی شخصیت کا احترام کرتے ہوئے ان کے نام پر اسلامی روایات کی تعلیم کے مطابق "ؐ" لکھا جبکہ اکثر تعلیم یافتہ اور [illegible] ایسا نہیں کرتے

اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ جب کبھی دہلی جانے کا اتفاق ہوگا خوشونت سنگھ سے مل کر ان کے داہنے ہاتھ کا تعظیمی بوسہ لوں گا۔ ان کی عقیدت کے جواب میں۔

کچھ دنوں بعد جب فیروز صاحب اپنا خط وصول کرنے تشریف لائے تو میں نے "ؐ" کے متعلق اپنی حیرت کا ان سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اور خوشونت سنگھ ضلع سرگودھا (مغربی پنجاب) میں ایک ہی قصبہ کے رہنے والے تھے اور قریب قریب پڑوسی بھی۔ میرے قصبہ میں ایک مسلمان مجذوب ہوا کرتے تھے۔ وہ رات کے وقت خوشونت سنگھ کے دروازے ہی پر آکر سوتے تھے اور اکثر رات کا کھانا وہیں تناول کرتے تھے سائیں جی انہیں دست کا [illegible]

رہی۔ خوشونت سنگھ کی دادی ان کے جسم کی صفائی بھی کرتی تھیں۔ اور دروازہ کو خود دھوتی تھیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی دادی سے کہا۔ "سنو میں نے لاہور سے دہلی تک کی کنجی تمہارے بیٹے شوبھا سنگھ کے حوالے کر دی۔ خوش ہو جاؤ۔ وہ بڑا امیر ہو جائے گا۔" چند گھنٹے بعد مجذوب صاحب وصال فرما گئے۔ چند سال بعد جب دوسری جنگ عظیم شروع ہی ہونے والی تھی کہ شوبھا سنگھ کو لاہور سے دہلی تک کے لئے ریلوے لائن وغیرہ کی تعمیر اور مرمت کا ایک بڑا ٹھیکہ مل گیا۔ جو مستقل جاری رہا۔ انہوں نے بہت بڑی دولت حاصل کر لی۔ پہلے بھی وہ چھوٹا موٹا کام کرتے تھے اور ان کو اتنے بڑے ٹھیکہ مل جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ان کی والدہ نے ان کو مجذوب صاحب کی دعا یاد دلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خاندان مسلمانوں کا پڑوسی تو تھا ہی مگر اب ان کے مذہب کا بھی دل سے احترام کرنے لگا، مگر اپنا سکھ مذہب ترک نہیں کیا۔ وہی اثرات آج بھی خوشونت سنگھ کی شخصیت میں موجود ہیں اور وہ حضرت محمدؐ کو سب سے بڑا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ سر شوبھا سنگھ (سر کا خطاب ملا تھا) خوشونت سنگھ کے والد تھے۔

اب ذرا جناب فیروز صاحب کا (جملہ معترضہ کے طور پر) جغرافیہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ حضرت معمولی تعلیم یافتہ ہیں اور عرصہ دراز سے برمنگھم (انگلینڈ) ہی موٹر کار کے FAN BELT بنانے کے کارخانے میں کام کرتے ہیں اور برطانوی شہری بن چکے ہیں۔ دو بار حج کر چکے ہیں اور ابن بطوطہ کا مزاج رکھتے ہیں۔ ملکوں ملکوں گھوم کر بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کرتے پھرتے ہیں

میری زیر تحریر خط والی ملاقات کے چند سال قبل وہ حضرت امام ربانی کے عرس میں شرکت کے لئے سرہند شریف (مشرقی پنجاب) حاضر ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے اردو کے سابق پروفیسر مطیع الرحمٰن صاحب (وہ چنڈیہا موضع کے ساکن ہیں جو میری ننہال گڑھول شریف سے چند میل کے فاصلہ پہ ہے وہ میرے نانا حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ کے مرید سے مرید ہیں) بھی اتفاق اس سال کے عرس میں سرہند شریف میں حاضر تھے۔ فیروز صاحب سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ فیروز صاحب نے ان سے عرض کیا کہ ان کی اہلیہ علیل رہتی ہیں۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسی مسلمان خاتون سے شادی کر لیں جو بچوں اور بچیوں کو قرآن شریف اور ابتدائی دینی تعلیم دے سکیں۔ تاکہ برمنگھم میں وہ جا کر ان کے مسلمان پڑوسیوں کے بچے اور بچیوں کی مذہبی تعلیم میں حصہ لے سکیں اور ہم خرما و ہم ثواب والی بات ہو۔ مذہبی جنون کی گرفت میں آکر مطیع الرحمٰن صاحب فیروز صاحب کو ساتھ لئے ہوئے اپنے موضع چنڈیہا پہونچ گئے اور اپنے ایک رشتہ دار کسی حافظ صاحب کی ایک کم سن بیٹی سے ان کا نکاح کرا دیا۔ جو فیروز صاحب کی عمر سے تقریباً ۲۵ سال چھوٹی ہوگی — بیچارے حافظ صاحب کی کئی بیٹیاں ہیں اور وہ ولایتی یا انڈو پاکستانی بوڑھے کے تقدس اور رعب میں آکر یہ حماقت کر بیٹھے۔ اس کے بعد سال دو سال ہی فیروز صاحب آتے رہتے ہیں اور اپنی ہندوستانی بیوی کو انگلستان لے جانے کی کوشش میں بظاہر آج تک لگے ہوئے ہیں۔ وہ غریب لڑکی آج تک دو بچیوں کی ماں بن کر اپنے گاؤں میں بھلا تو خواب دیکھ [illegible]

رہا ہے اور بھی واقعات ہیں جن کا ذکر بیکار
ہے - بہرحال اس اعتقاد اور خود غرضانہ حرکت کی
بنا پر خوشونت سنگھ ٹھیک پہنچے تھے۔
میں دسمبر ۱۹۸۰ء میں اپنا میڈیکل معائنہ کرانے
کے لئے دہلی گیا۔ اس زمانے میں میرا دوسرا بیٹا ڈاکٹر محب الظفر
شیدی (M.S.) رام منوہر لوہیا اسپتال میں سرجیکل
رجسٹرار تھا۔ میں نے ایک دن اس سے کہا کہ وہ خوشونت
سنگھ سے میری ملاقات کے لئے ٹیلی فون کر کے وقت لے
(اس زمانے میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی تھے اور بے حد
مشغول۔ فیروز صاحب ان سے میرا تعارف کرا چکے تھے)
انہوں نے ایک روز تین بجے دن کا وقت دیا۔ میں اپنے
لڑکے محب کے ساتھ - Sir Sobha Singh
Road - پر SUJAN SINGH PARK میں ان کے
بنوائے ہوئے Blocks میں سے ایک Block کے
GROUND FLOOR کے ایک مکان میں داخل ہوا
سامنے ایک رائفل بردار سپاہی پہرے پر تھا۔ میں نے
اپنا نام لکھ کر ایک پرزہ اندر ارسال کیا۔ وہ فوراً باہر
تشریف لائے میرے سامنے ایک میانہ قد بوڑھا سکھ
پینٹ اور فلائنگ شرٹ پہنے ہوئے اور ایک ہلکی پگڑی
سر پر لپیٹے کھڑا تھا۔ جسم مائل بہ فربہی، داڑھی کافی حد
تک سفید اور چہرے پر متانت اور مسکراہٹ اور
بشاشت۔ نگاہیں متجسس اور ذہین۔ مجھے خوش آمدید
کہتے ہوئے وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں لے گئے۔ جب
میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سامنے کارنس پر
ایک نمایاں STICKER سٹا ہوا تھا جس پر
لکھا ہوا تھا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" عربی
خط نستعلیق میں۔ پھر مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوا تو دروازے

کے بغل میں دیوار پر ایک فریم لٹک رہا تھا جس
کے کاغذ پر مکمل سورہ فاتحہ تحریر تھا (بغیر ترجمہ کے)
جب ان کے بیٹھنے کی کرسی پر نظر پڑی تو دو فٹ اوپر
ایک پیتل کا گول پلیٹ آویزاں تھا جس پر نمایاں
خط نستعلیق میں لفظ "اللہ" کندہ تھا۔ سامنے کرسی
پر اقبال کا "بانگ درا" کھلا ہوا رکھا تھا اور ان کی
نظم "قومی ترانہ" مجھے گھور رہی تھی۔ جب وہ کرسی
پر بیٹھ گئے تو میں نے ان کا داہنا ہاتھ میں لے کر ہتھیلی
اور انگلیوں کا بوسہ لے لیا۔ اور پھر اس حرکت کی
توجیہہ بیان کی جو میں شروع ہی میں ذکر کر چکا ہوں ——
انہوں نے مسکرا کر میری اس غیر متوقع حرکت پر کسی حیرت
کا اظہار نہیں کیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے
کہا گھر کے اور افراد۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ ان کی
اہلیہ زمانہ ہوا وفات پا چکیں۔ ایک بیٹی ہے جو اپنے
شوہر کے ساتھ ہے اور صرف ایک بیٹا ہے جو صحافی
ہے اور ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اور چنڈی گڑھ
میں مقیم ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ -VOR
-VORAC نہیں ہیں تو ACIOUS EATER -
IOUS READER ضرور ہوں گے۔ جواب میں انہوں
نے کہا کہ وہ روزانہ تقریباً ایک کتاب مکمل مطالعہ
کر لیتے ہیں۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ جب سامنے رکھی
ہوئی کتاب "بانگ درا" کا میں نے ذکر کیا تو انہوں نے
کہا کہ حال ہی میں بمبئی میں کانگریس پارٹی کا صد سالہ
جشن منایا جا رہا ہے۔ رفیق ذکریا صاحب کی بیٹی نے
فرمائش کی ہے کہ وہ اس کا انگریزی میں منظوم ترجمہ
کر دیں تاکہ جلسہ میں وہ سنا سکیں۔ اس کے بعد وہ
کہنے لگے کہ اپنی کے سب سے بڑے PROPHET حضرت

محمدؐ تھے اور علامہ اقبال ان کے آخری PROPHET ہیں۔

اس زمانے میں وہ اپنے مشہور کالم MALI-GE TOWARDS ONE AND ALL (جو ہفتہ میں ایک بار HINDUSTAN TIMES میں چھپتا رہا ہے۔) میں اللہ تعالیٰ کے خلاف ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ کبھی انکار کبھی شکایت۔ کبھی مغلظات کی بوچھار (یہ وہی زمانہ تھا جب کہ کچھ ماہ قبل OPERATION BLUE STAR کے ماتحت امرتسر کے GOLDEN TEMPLE کو اندرا گاندھی کے حکم سے مسمار کیا گیا تھا۔ اور ردعمل کے طور پر خوشونت سنگھ نے اپنا پدم بھوشن کا خطاب سرکار ہند کو لوٹا دیا تھا مگر راجیہ سبھا کے ممبر بنے رہے تھے) میں نے ان سے کہا کہ آخر آپ اللہ میاں کے خلاف آج کل اپنا سارا نزلہ کیوں رجوع کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا فی الحال ان کا دماغ خدا کے وجود کا منکر بنا ہوا ہے اور اگر بالفرض اس کا وجود ہے بھی تو وہ اب Imp-otent ہو گیا ہے۔ (گویا ان کا اشارہ ظلم کے خلاف اللہ میاں کی عدم کارروائی کی جانب تھا) اب وہ اپنے کو صرف PROPHETS تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی عصبیت، فرقہ واریت، عدم مساوات، منافقت، نمائشی مذہبیت وغیرہ سے کافی بیزار لگ رہے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جب ایسا ہے تو ابھی تک آپ اپنی کرسی کی بلندی پر لٹکا ہوا لفظ "اللہ" لکھا ہوا پلیٹ اتار کر پھینک کیوں نہیں دیتے۔ وہ چپ رہے۔ میں نے کہا ڈرائنگ روم کا STICKER اور سورہ فاتحہ کا دیوار پر لٹکا ہونا یہ سب آپ کی عجیب و غریب نفسیات کا مظہر ہے۔ کیا یہ سب صرف نمائش ہے۔ اور آپ لوگوں پر جتانا چاہتے ہیں کہ آپ بہت بڑے لبرل ہیں۔ اور خصوصی طور پر اسلام مذہب کا ظاہرا احترام کرتے ہیں۔ جوش میں آ کر وہ بولے کہ وہ ذبیحہ گوشت کھاتے ہیں اور ان کا سب سے قریب ترین دوست اور ساتھی شیخ سر عبدالقادر مرحوم کا بیٹا (میں نام بھول رہا ہوں جو پاکستان میں مرکزی وزیر رہ چکے ہیں) ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اندرا گاندھی کو تو اپنی حماقت کی سزا سنجے گاندھی کے حادثہ کی شکل میں اور پھر اپنی ذات کو سکھ جوانوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر مل گئی۔ وہ خاموش رہے اور ان کی آنکھیں کچھ نم ہو گئیں۔ میں نے اپنے تین مجموعے "نوائے نیم شب" "ریزہ ریزہ" اور "موج غبار" ان کی خدمت میں پیش کئے اور عرض کیا کہ ان کا مطالعہ تو خیر آپ کریں گے ہی مگر ہو سکے تو اپنے کالم میں اللہ میاں کی طرح میری شاعری پر بھی اپنا نزلہ نازل فرمانے کی مہربانی کریں گے۔ چپ رہے اور کچھ COMMIT نہیں کیا۔ آخر میں میں نے عرض کیا کہ اگر خدانخواستہ کچھ بیماری کا چکر ہو تو میرا بیٹا یہاں لوہیا اسپتال میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ اندرا گاندھی کو گولی مارنے والے ستونت سنگھ کا آپریشن کر کے اس کے جسم سے کچھ [illegible] اور گولیاں نکالنے والے سرجنوں میں میرا بیٹا بھی تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئے۔ آخر میں وہ رخصت ہوتے ہوئے دوبارہ ملاقات کی امید ظاہر کرتے ہوئے میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ قرآن شریف کا ترجمہ ادبی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ چند سال بعد اچانک ایک دن میری نظر ان کے کالم MALICE TOWARDS ONE

صبا اکرام

عالی جی کی غزلیں اور اکتارا

جمیل الدین عالی کی شاعری، بالخصوص
ان کی غزلیں پڑھتے ہوئے دو ایک شعروں کے بعد ہی
یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ان شعروں کے پردے
سے ایک بہت ہلکی اور دھیمی سی موسیقی سنائی دے
رہی ہے۔ یوں جیسے کوئی اکتارے کے تار کو چھیڑتا،
اس کی دھن سے آواز ملاتا کہیں دور سے اپنی اور چلا
آرہا ہے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے اور ان کی غزلوں
کے سحر میں کھوتے چلے جاتے ہیں۔ موسیقی کی وہ آواز قریب
سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر یکایک بالکل
قریب آجاتی ہے اور ساتھ ہی ایک جوگی کی تصویر آنکھوں
کے سامنے آجاتی ہے۔

یہ جوگی یا سادھو سنت، فقیر کوئی اور نہیں بلکہ
شاعر کی خود اپنی ذات ہے جو اپنے ہی اکتارے
کی دھن سے آواز ملاتی، اس محبوب کی تلاش میں
سرگرداں ہے جو خود اس کے اپنے اندر موجود ہوتے
ہوئے بھی خارج کی صحرا بن کر اسے گلیوں، پگڈنڈیوں
اور شہر کی بھیڑ بھاڑ سے بھری سڑکوں پر بھٹکائے پھر رہی
ہے۔ اس تلاش کا ذکر عالی جی کے کئی شعروں میں ہوا ہے
دو شعر مثال کے طور پر پیش خدمت ہیں۔ ؎

کہیں تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا
کہ میں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آوارا

تجھے تو کیسے بتاؤں کہ خود بھی یاد نہیں
کہاں کہاں تک ترے غم نے خاک چھنوائی

کسی ذات کا سادھو سنت بن جانا اس بات کی گواہی ہے
کہ مایا موہ اور بھوگ بلاس کو ٹھکرا کر پریم تپسیا میں
وہ ذات کھو گئی ہے۔ مگر عالی جی اس تپسیا میں خود کو
گم نہیں کر دیتے۔ بلکہ پریم اگنی سے گزر کر خود کو [illegible]
کے بعد وہ واپس سنساریوں میں لوٹتے ہیں اور ان کو
پریم کا یہ سندیسہ سناتے ہیں ؎

ہے ایک نعمتِ عظمیٰ غمِ محبت بھی
مگر یہ شرط کہ انساں کو سازگار آئے

کھر کر جائیں مگر اس کو ہم بسر جانیں
جس کے دامن میں ہو خوشبوئے وفا تیرے بعد

گو کہ حالی جی کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔ مگر ان کا لہجہ کہیں بھی خطیبانہ اثر لئے ہوئے نظر نہیں آتا اور نہ ہی کہیں ہمکلامی کا وہ رویہ حاوی نظر آتا ہے جو گزشتہ دو دہائیوں کے دوران جدیدیت کی تحریک سے تعلق رکھنے والے شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے تو روایت کی پاسداری کی ہے اور محبوب سے بالواسطہ تخاطب کا انداز اپنی تقریباً تمام غزلوں میں اپنائے رکھا ہے ؎

مری پسند مرے نام پہ نہ حرف آئے
بہت حسین بہت باوفا کہوں گا تمہیں

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
امید بھی نہ رکھوں، ناامید بھی نہ رہوں

جیسا کہ غزلیں، دوہے، گیت کے دیباچے میں محمد حسن عسکری نے فرمایا ہے کہ "حالی جی کی غزلوں میں جو نفاست شگفتگی اور بانکپن ہے وہ فارسی ترکیبوں کی دین ہے مگر لہجے میں ایک خاص قسم کا جو رسیلا پن ہے وہ میرے خیال میں ہندی زبان سے ان کی واقفیت کے باعث ہے جو خود اپنے دوہوں کے راستے ان کی غزلوں میں کہیں کہیں آ گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

کچھ چھوٹے چھوٹے دکھ اپنے، کچھ اپنے عزیزوں کے
ان سے ہی جیون بنتا ہے، سو جیون بن جائے گا

روایت کی پاسداری کے باوجود حالی جی کے یہاں اس سلسلے میں کٹرپن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ جہاں تک ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکوں کے دوران رونما ہونے والی ہیئتی توڑ پھوڑ کی بات ہے تو اس سے دامن بچانے کی سعی تو ان کے یہاں پائی جاتی ہے مگر روحِ عصر سے منہ موڑنے کا رویہ ہرگز سامنے نہیں آتا۔ بلکہ انہوں نے تو جدیدیت اور ترقی پسندی کی صالح قدروں کو جگہ جگہ اپنی غزلوں کے متن میں سمویا بھی ہے بقول ؎

ہے ایک شہر میں اور مدتوں نہیں ملتا
وہ شخص جس کو رکھا ہم نے جان سے پیارا

ہزار روپ نرالے بھرے بیانوں میں
مگر رہے وہی قصے سنے سنائے ہوئے

رہا نہ دل میں غمِ تنگیِ گلستاں سے
وہ ولولے جسے کہتے ہیں طاقتِ پرواز

اس طرح کے اور بھی نہ جانے کتنے اشعار ان کے یہاں مل جائیں گے جو اس حقیقت کے غماز ہیں کہ شاعری حالی جی کے لئے صرف ذوقِ جمال کی آسودگی کا ذریعہ نہیں بلکہ شعور و احساس کی پراسرار وادی در وادی کے سفر کا وسیلہ بھی ہے۔

براہ کرم ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیں

مسعود قیصر

عصمت چغتائی۔
افسانوی فکر و فن کے آئینے میں

عصمت چغتائی جدید نثری ادب میں
ایک مقبول ترین افسانہ نگار شمار کی جاتی ہیں۔ ان
کے موضوع تخلیق نے ہمیشہ نسوانی نفسیات کے
مسائل اور جنسی تلذذات کی تکمیل کے فکر و احساس کو
اجاگر کیا ہے۔ جنسی جذبات و خواہشات گرچہ ایک
فطری تقاضۂ حیات ہے اور جس تکمیل تک ہر جاندار
کے لئے شاید اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے غذا
اور پانی وغیرہ اہم ——— خصوصاً عورت کی
جنسی خواہشات کا تقاضا ایک اہم اور پیچیدہ مسئلہ
ہے جس پر عصمت چغتائی کے فکر و احساس اور تجربہ و
مشاہدہ نے پہلی بار مختلف زاویۂ نظر سے روشنی ڈالا
اور کئی کامیاب تخلیقوں کے ذریعہ جنسی گھٹن، ناآسودہ
جذبات اور جسم کے مختلف تقاضوں سے پیدا شدہ
کیفیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ مصنفہ
کی ان کامیاب تخلیقوں کا جائزہ لیا جائے مضمون کا
تقاضا ہے کہ اس ادبی اور زمانی ماحول پر بھی ایک
مختصر نگاہ ڈال لی جائے جو ذہنی اور شعوری طور پر
خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کے ذہن و شعور پر ایک
مستحکم عکس بن کر نہ صرف ظاہر ہوا بلکہ کسی حد تک
حاوی ہو گیا اور اس کے توسط سے ادب میں نئے نئے
موضوع، عصری زندگی کے مسائل، مواد اور زندگی کے
حقائق کو پیش کرنے کا نیا حوصلہ اور نیا انداز ظہور
پایا اور یہ وسیلۂ اظہار تقریباً تمام ادیب و شاعر کے
یہاں ایک معتبر معنویت اور پرحقیقت روشنی میں اجاگر
ہوا۔

عصمت چغتائی کا تخلیقی زمانہ ہندوستان کا
وہ ادبی ماحول ہے جہاں صدیوں قدیم سماجی ناانصافی
عدم مساوات، [illegible] کا استحصال جنسی

[illegible] ذاتی مشاہدۂ حیات کی عکاس ہیں۔ اور
چغتائی خصوصی طور پر نو مسلم گھرانوں کی لڑکیوں
کے جذبات و نفسیاتی مسائل کا عکس متحرک ہے۔ اس
کی خاص وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ ایک عورت
تھیں۔ اور ایک عورت کا دوسری عورت تک پہنچنا اور
اس کے احساس و عمل سے واقف ہو جانا شاید اتنا ہی
آسان ہوتا ہے جتنا کہ ایک مرد سے دوسرے مرد کی قربت
اور خیالات کا پتہ لگانا کٹھن اور مشکل تصور کیا جاتا
ہے۔ جذبات انسانی منفرد تقاضوں کا سنگم ہوتا ہے
جہاں تلاش و جستجو کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔
اور اگر کھوجنے والا ہوشیار نہ ہو تو خود اس ہجوم میں
کھو جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ مرد کی زندگی ہمیشہ
النوع تھپیڑوں کا شکار رہتی ہے چنانچہ اس کے
جذبات اور خیالات بھی کم و بیش متغیر ہوتے رہتے ہیں
لیکن عورت کی زندگی کے چند اصولی ضابطے اور یقینی
احساسات ہوتے ہیں جو قدرت صرف عورت میں ہی
ودیعت کرتی ہے۔ اور جن کی تشکیل و تعمیر کسی نہ کسی
شکل میں سامنے آتی ہے۔ ان میں جنسی جذبات کو
سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ لمحہ خواہشات
ہے جس کی تکمیل اور عدم تکمیل تمام عمر کا فتح و شکست
ثابت ہوتا ہے۔ عصمت چغتائی کا کمال ہے کہ انہوں
نے اپنے افسانوں کو تکمیل اور عدم تکمیل کا صرف آئینہ
نہیں دکھایا بلکہ ان کے درمیانی فاصلوں سے پیدا
شدہ حالات و کیفیات کو بھی واضح کرنے کی کامیاب
کوشش کی تاکہ عورت کے جنسی جذبات کی قدر متعین
ہو اور عورت سے مرد کا رشتہ اتحاد جذباتی مفاہیم
[illegible] آشنا ہو سکے۔ ان احساسات کی تصویر کشی

مصنف نے اپنے بیشتر افسانوں میں کیا ہے۔ لیکن جس
قدر کھل کر ان کا افسانہ "لحاف" تخلیق پایا ہے اس
تک کسی اور افسانے کی رسائی نہ ہو سکی ہے۔ مگر
افسوس ہے کہ یہ وہ افسانہ ہے جس پر انہیں ستم
کے تیر و نشتر سہنے پڑے۔ لیکن اس حقیقت سے کون
انکار کر سکتا ہے کہ اس افسانے کی گہرائیت و معنویت
جس اہم تقاضۂ حیات کو ابھارتی ہے اس کا انسانی
زندگی سے کوئی لگاؤ یا تعلق نہیں . . . . کیا آج جنسی
کی بھوک مرد کو مرد سے رشتۂ جنس جوڑنے پر مجبور نہیں
کرتی ؟ کیا عورت کے خواہشات جنسی عدم تکمیل کی صورت
میں عورت سے ہی خواہش پوری کر لینے پر نہیں اکساتے
ہزاروں ایسے لوگ ہیں جن کی شہوانیت انہیں ایسی
پگڈنڈی پر سفر طے کراتی ہے۔ عصمت چغتائی کا قصور
ہے کہ وہ ایک عورت ہو کر ان تلذذات کا آئینہ پیش
کرتی ہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے عورت اور مرد کی
ان عریاں خواہشوں کا پردہ فاش کرنا ان کے
لئے معیوب سمجھا گیا ایک بات مزید کہی جا سکتی ہے کہ
"لحاف" جنسی تلذذات کے تقاضوں کو ضرور ابھارتا
ہے لیکن منٹو کے "بو" کی طرح عریاں نہیں۔
عصمت چغتائی کے افسانوں کی دنیا محدود خیالوں
کی دنیا ہے لیکن اس محدودیت ہی میں گھر، خاندان،
اور سماج کے رشتے سے جو واقفیت نظر آتی ہے وہ بڑی
معنویت کی حامل ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے ان کے افسانے
"کافر" "میرا بچہ" "خدمتگار" اور "اف یہ بچے" ایسے
افسانے ہیں جن میں عصمت چغتائی کے فکر و فن کی گہرائی
اور ان کا مشاہداتی شعور شامل نظر آتا ہے۔ ان افسانوں
میں البتہ واقعہ نگاری اور [illegible] نگاہی کی کچھ کمزوریاں

ہونے کے سبب وہ اثر پیدا نہیں ہو سکا ہے جو مصنفہ
کی کہانی "جوانی" "ننھی کی نانی" "گیندا" "باندی" اور
"چوتھی کا جوڑا" وغیرہ میں پیش نظر آتا ہے۔ مصنفہ
حقیقت پسند مقاصد اور اس کے تقاضوں سے اچھی
طرح واقف تھیں اس لئے ان افسانوں میں موضوع اور
ہیئت کے نئے تجربے پوری طرح واضح ہوئے ہیں۔ ان
افسانوں میں اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ زبان و
بیان میں جوشیلا احساس بھی کارفرما ہے اور فرائڈ کے
اصول و نظریوں کی تقلید و تائید بھی۔

عصمت چغتائی کی پہلی تخلیق جو ادبی دنیا سے
متعارف ہوئی وہ "فسادی" کے عنوان سے جانی جاتی
ہے۔ بظاہر یہ ایک علامتی افسانہ ہے اور کرداروں کے مکالموں
سے ڈرامائی انداز رکھتا ہے لیکن یہاں بھی ان کے ذہنی
ایچ کی شدت جلوہ دکھانے سے نہیں چوکتی۔ پھر بعد کے
افسانوں میں مثلاً "ساس" "پردے کے پیچھے" اور
"دوزخی" وغیرہ میں ان کا نفسیاتی اور تجزیاتی عمل
مثبت رول ادا کرتا ہے جس سے یہ احساس پیدا ہوتا
ہے کہ وہ (مصنفہ) ذہنی اور شعوری طور پر قربت جنسی لذات
کی طرف منعطف کئے ہوئے تھا۔ یہاں پر ایک سوال
ضرور پیدا ہوگا کہ ایک عورت جو بیوی بھی ہے اور کئی بچوں
کی ماں بھی پھر کس طرح اپنے خیالوں کو ہمیشہ جنسی تناظرات
میں پیش کرتی ہے۔ اس سوال کا جواب محض ان باتوں
سے تشفی نہیں دلا سکتا کہ عصمت چغتائی پر فرائڈ کا
اثر حاوی تھا یا پھر سماج اور خاندان کی بے راہ روی
سے وہ حد درجہ متاثر تھیں۔ اگر ہم ان کے افسانوں کا
[illegible] کے اصول اور مطالعے کی روشنی میں جائزہ لیں تو
[illegible]

سے اس قدر متاثر نہ تھیں جتنا کے دوسرے [illegible]
نگار ادیب متاثر نظر آتے ہیں۔ گھر کی بے راہ روی یقیناً
ان کے ذہن و شعور کے گرد ایسے ماحول کا احاطہ کرتی
ہے لیکن جب تک اپنی خواہش اور اپنا سوچ و فکر
کسی متبادل ماحول کو قبول نہیں کرتا تب تک کوئی
بھی خیال ذہن کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ وہ اصل میں
ایک ذاتی حقائق کے منظم فکر و احساس سے متاثر
تھیں جو ان کے ذہن و شعور میں سرایت کر گیا تھا۔
اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے کمالات صرف مسلم معاشرے
کی تصویر کشی نہیں کرتے۔ وہ بھی بیدی اور منٹو کی
طرح کرداروں کے انتخابات میں مصنفہ نے صرف
مسلم گھرانے کی لڑکیوں کو اپنایا ہے اور انہیں کے
کنوارے جسموں کے احساسات اور جسمانی تقاضوں
کی خواہشات کو اپنے افسانوں میں ابھارنے کی
کوشش کی ہے۔ آخر یہ انفرادی پہلو عصمت
چغتائی کے یہاں ہی کیوں نظر آتا ہے۔ اس ضمن
میں مصنفہ کا مشاہداتی فکر و احساس اور تصورات
بروئے کار آیا ہے۔ احتشام حسین نے ایک موقع
پر منٹو سے عصمت چغتائی کا موازنہ کرتے ہوئے
فرمایا ہے کہ :-

"عصمت جن معاملات کا مشاہدہ کرنے کے بعد
محض ایک خوف و تبسم کے ساتھ گزر جاتی ہیں وہاں
منٹو کی مثال اس نٹ کھٹ لڑکے سی ہے جو بازار
میں چوٹ کھول دے اور تالیاں بجا بجا کر کہے آیا
ہم نے دیکھ لیا۔" (احتشام حسین)

عصمت چغتائی کے فن سے متعلق اکثر یہ
خیالات محسوس کرتا نظر آتا ہے کہ ان کے افسانوں

میں جو پختہ کاری اور ہضم شدہ کیفیتیں پائی جاتی ہیں اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی شعوری یا لاشعوری سبب کارفرما ہے جس سے ان کا فن ایک منظم فکری اساس کا مظہر بن گیا ہے اور جہاں مسائل محصور ہو کر ایک ہی ذات کی فکر سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ یقینی جنسی تقاضا تو ایسی صورت میں ان کے خارجی احساسات اور اس سے وابستہ ان کا عملی اور مشاہداتی فکر و نظر کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا جو نہ صرف ان کی تخلیقی فکر کا آہنگ سے ہم رشتہ رہا بلکہ قصے کے موضوع اور مرکزی خیالات سے بھی ہم آہنگ رہا۔ ذاتی مسائل سے نکل کر جب کوئی ادیب یا فنکار سماجی اور معاشرتی مسائل کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کا دائرہ احساس و فکر بھی وسعت پاتا ہے اور یہی وہ توسیع ہے جس کے توسط سے خارجی اور داخلی تصورات و تجربات اپنے اپنے عمل اور مشاہدے میں فنکار کے فکری اور فنی قوتوں کو جلا بخشتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے ہمیشہ ایک محدود معاشرے کی تصویر کشی کی لیکن اس محدودیت پن کا تقاضا محض ایک معاشرے کا عکاس نہیں رہ سکا اور بلواسطہ توسیع پاتا ہوا بڑے پیمانے پر ان تمام پیچیدہ مسائل سے پیوستہ ہو گیا اور پھر دیگر صورتوں میں عورت کی ذلت اور اس کے مختلف مسائل سے بندھ گیا۔ یہ وصف ان کے خارجی احساسات اور نظریات کا ضامن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے ان کے ذاتی افکار اور تجربات کو خارجی پہلوؤں کا عکاس بتایا ہے اور ان کے فن کی گہرائی میں اسی خارجیت پسندی کو عمل و دخل بتایا ہے۔ ان کا ایک قول ملاحظہ ہو۔

* ممکن ہے ان کا سارا فن مشاہدہ ہو اور ذاتی تجربات کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ ممکن ہے افسانوں کو ان کی شخصیت اور ان کی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ بے تعلق خارجیت واقعی ایک معجزہ ہے۔"

بے شک عصمت چغتائی کی خارجیت پسندی ان کے افسانوں کی اصل جان ہے۔ اگر ان کے افسانوں میں صرف داخلیت کا ہی دخول ہوتا تو پھر افسانہ نگاری کا فنی لوازمات بھی اپنا صحیح چہرہ کھو دیتا ہے۔ افسانے میں متوسط طبقے کی تہذیبی اور گھریلو زندگی کی معنویت منعکس نہیں ہو پاتی اور اگر ایسا نہ ہو پاتا تو پھر عورت کی شخصیت کی نشو و نما نہ ہو پاتی جو عصمت چغتائی کی تحریری تخلیقی اور عملی احساس و انکار کا اصل مقصد اور تقاضا ہے۔

غرض یہ ہے کہ عصمت چغتائی کی تخلیقی کوششوں میں ان کے فعال و متحرک ذہن کے تمام تقاضوں نے حوصلہ افزائی کی اور سماج، معاشرہ، تہذیب، گھر اور خاندان کی اس ضروری اور لازمی تقاضات کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ اس کی ناآسودگی اور عدم تکمیل کے سبب پیدا ہونے والے کتنے مسائل کو بھی واضح لفظوں میں اجاگر کر دیا۔ اور یہی حقیقت نگاری کا اصل تقاضا ہے۔

ترقی پسند افسانوی ادب کا آخری ستون منہدم ہو گیا۔ بے باک حقیقت نگاری اور کڑوی سچ کو تخلیق کے قلب میں ڈھالنے والی عظیم ہستی عصمت چغتائی زندگی کے آخری سرحد کو عبور کر گئیں۔ انسانی نظریات اور احساسات نے ان کے آخری گناہ پر بہت شور مچایا اور ان کی ذات کو کبھی نہ معاف کرنے والی عالم

قیصر عثمانی

سید شاہ عبدالعزیز آزاد پیر بیگھوی

۱۸۷۳ء ——— ۱۹۳۷ء

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری عمر کے صرف چند ابتدائی سال گذرے تھے۔ میرے گھر کے باہر کے کمرے میں دیوار پر ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس کی کالی داڑھی، ترکی ٹوپی اور چوڑے چکلے جسم کی ایک دھندلی سی یاد اب تک باقی ہے۔ کبھی کبھی یہ سننے میں آیا تھا کہ میں اسی تصویر کے نیچے کھڑے ہو کر صبح و شام ایک ہی رٹ لگایا کرتا تھا "ابا پیسہ ابا پیسہ"

انہیں دنوں میرے والد ماجد حضرت سید شاہ عبدالعزیز آزاد پیر بیگھوی اپنے برادر خورد حضرت سید شاہ رحمت اللہ مرحوم کے ساتھ حج بیت اللہ کے مقدس ترین سفر پر تھے اور وہ سال تھا ۱۹۲۳ء کا جب لوگ جدہ سے مکہ معظمہ تک کا صبر آزما فاصلہ اونٹوں کے ذریعہ طے کیا کرتے تھے۔

میرا گھر شہر گیا کے مشہور محلہ کریم گنج میں واقع تھا۔ تین کٹھے کی زمین پر بنے ہوئے مکان میں ان دنوں صرف چھوٹے بڑے تین کمرے تھے۔ نیز برآمدہ اور آنگن کے علاوہ ایک چھوٹا سا کنواں بھی تھا۔ مکان کے مغرب کی جانب زمین کا ایک بہت ہی بڑا حصہ خالی پڑا تھا۔ جس میں متعدد سبزیوں کے پیڑ پودے اور رنگ برنگ پھولوں کی کیاریاں دیکھ کر طبیعت خوش ہوا کرتی تھی۔ کچھ دن بعد اسی خالی زمین کے پچھواڑے کی کچی دیوار کو توڑ کر کئی اور کمروں کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا تو کافی اونچائی سے نیچے پڑے ہوئے ریت کے ڈھیر پر میں اس طرح چھلانگ لگایا کرتا تھا جیسے خاموش فلموں کا مقبول ترین ہیرو ماسٹر وٹھل پردۂ سیمیں پر اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا تھا ـــ یہ وہی زمانہ تھا جب ذی بلکیا ذی تکھوریا، سلوچنا، زبیدہ، پیشنس کوپر، گوہر اور

زیب النساء وغیرہ کی شہرت کے ڈنکے بھی ہر طرف بج رہے
تھے۔

میرے والد صاحب ایک روشن خیال قسم کے
مذہبی آدمی تھے اور شرعی احکام کے پابند۔ عنفوان
شباب سے لے کر عمر کے آخری دور تک انہوں نے
استرے کو ہمیشہ اپنے چہرے سے دور رکھا۔ شیروانی،
عربی کٹ پاجامہ، ململ کا کرتا، ترکی ٹوپی اور ٹانڈہ کا
بنا ہوا انگوچھا ان کا مخصوص لباس تھا۔ لنگی بھی انہوں
نے کبھی سلوا کر نہیں پہنی۔

جہاں تک اسکول کا تعلق ہے، وہ نویں
درجے سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن انگریزی کی اتنی اچھی
لیاقت تھی کہ کالج کے سند یافتہ نوجوانوں کو بھی اپنی
اصلاح سے فیض یاب کیا کرتے تھے۔ اردو، فارسی،
اور انگریزی کے علاوہ عربی پر بھی کافی عبور حاصل
تھا۔ حدیث فقہ کی معلومات کچھ اتنی زیادہ تھی کہ
میں اکثر دیکھتا تھا کہ عبداللہ نام کے ایک باذوق
پڑوسی جو والد صاحب کی وساطت سے ڈسٹرکٹ بورڈ
کے چھاپہ خانے میں کمپوزیٹر کی خدمت انجام دیتے تھے۔
وقتاً فوقتاً مسئلے گھر آجاتے

غرض کہ شعر و ادب کے علاوہ والد
صاحب کو علم دین اور مسائل شرعیہ سے بھی گہرا لگاؤ
تھا۔ گھر پر ہر جمعرات کو ایک دینی مجلس کا اہتمام
بھی ہوتا تھا جس کے لئے مولانا عبدالکریم کی خدمات
جلیلہ حاصل تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ اپنے محلے کی مسجد کے
صحن میں عشاء کی نماز کے بعد والد صاحب اور مولانا
عبدالکریم آپس میں کسی مذہبی مسئلہ پر گفتگو کر رہے
تھے کہ میں نے یکایک والد صاحب سے یہ پوچھنے
کی جسارت کی کہ نماز عربی میں کیوں پڑھائی جاتی ہے؟
اردو میں کیوں نہیں؟ — اس غیر متوقع سوال پر دونوں
بزرگ چونک پڑے، مولانا عبدالکریم صاحب نے
کچھ سوچا۔ پھر بڑے اعتماد کے ساتھ بولے "بیٹے۔
بات دراصل یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ
اللہ کا کلام ہے جو عربی زبان میں ہے"۔ میں نے فوراً
جواب دیا — "تو کیا اللہ میاں کو اردو زبان بالکل
نہیں آتی؟" یہ سنتے ہی دونوں حضرات ہنس پڑے۔

والد صاحب کی مذہبیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔
لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان دنوں
جب میں کوئی فلم دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتا تھا تو وال
صاحب نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ میرے شوق
کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ خود مجھے اپنے ساتھ سنیما
لے جاتے تھے اور جب فلم دیکھ کر گھر واپس آجاتے تو
سونے سے پہلے وہ مجھ سے اس کی کہانی ایک بار ضرور
سنتے تھے۔ "الہ دین کا چراغ" اور "علی بابا چالیس
چور" کے دیکھنے کا اتفاق مجھے اسی زمانے میں ہوا تھا۔
غرض کہ انہوں نے میری فلم بینی کے شوق کو دبانے کی کبھی
کوشش نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن میں خود
فلمی صنعت کا ایک فرد بن گیا۔ ایک ایسا فرد جس نے
اس نئی دنیا سے حاصل کئے ہوئے تلخ و شیریں تجربات
کو اپنی طویل نظم "پرچھائیوں کا دیس" میں ڈھال
کر ہی دم لیا۔ مسدس کے فارم میں جب یہ طویل نظم
کتابی شکل میں منظر عام پر آئی تو اس نے مجھے توقع سے
کہیں زیادہ شہرت بھی دی اور عزت بھی — چنانچہ اگر میں
یہ کہوں کہ والد صاحب کی روشن خیالی، دور بینی اور ہمہ

افزائی ہی اس مشہور و معروف نظم کا سرچشمہ ہے تو
شاید بے جا نہ ہوگا۔

والد صاحب بڑے رعب اور دبدبے کے آدمی
تھے اور آواز میں اتنی زور دار گرج تھی کہ خدا کی پناہ۔
چنانچہ کسی محفل میں نشست و برخاست کا معاملہ ہو یا
بحث و تمحیص کا سلسلہ، لوگ اس دوران بڑی احتیاط
سے کام لیتے تھے۔ جب کسی سے کوئی معمولی سی بھی لغزش
ہو جاتی ہو والد صاحب کے غصے کا پارہ یکایک چڑھ
جاتا اور ایسا جلال رونما ہوتا کہ سامنے والا لرز کر رہ جاتا
تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے۔ گھر کی ملازمہ کو کسی بات
پر اتنی سختی سے ڈانٹا کہ اس کے ہاتھ سے پانی کا گھڑا
چھوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ معاً غصے میں والد صاحب
کی زبان پر کچھ نازیبا الفاظ آ گئے۔ لیکن بعد میں جب
اس کا احساس ہوا تو انہوں نے ملازمہ سے معافی
مانگنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کیا۔

مرحوم چائے کے بڑے رسیا تھے۔ خود بھی شوق
سے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پلا کر روحانی خوشی
محسوس کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے اگر کوئی عزیز رشتے
دار رات کے دو ڈھائی بجے بھی اسٹیشن سے سیدھا
ہمارے گھر آ جاتا تو والد صاحب مجھے جگا دیتے اور
کہتے ”سماوار لاؤ۔ چائے بنائی جائے گی“ پھر
مہمان کے ساتھ دیر تک گپ شپ بھی ہوتی اور
چائے کی چسکیاں بھی لی جاتیں۔ چائے کا ذکر آیا تو
مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے وسیع و عریض دفتر کا ماحول بھی
یاد آ گیا۔ جہاں ہر روز اسکول کے لنچ بریک میں اپنی
چھوٹی سی ہرکیولس سائیکل پر بیٹھ کر والد صاحب
کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور بلا ناغہ ڈاک بنگلہ کے
ٹوسٹ، آملیٹ، جام اور جیلی کا لطف تو اٹھاتا ہی تھا
لپچو کی اس مخصوص چائے پینے کا عادی بھی ہو گیا تھا۔
جس کے فلیور کی بات ہی کچھ اور تھی۔

والد صاحب کو سب لوگ احتراماً ”شاہ صاحب“
کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن چہرے بشرے
اور ڈیل ڈول کی وجہ سے، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو
انہیں ”گیا کے سر سید احمد خاں“ کے نام سے یاد کرتے
تھے۔ وہ اپنے علم و فضل اور وجیہہ با وقار شخصیت
کے باعث نہ صرف گیا بلکہ پورے بہار کی افضل و
اعلیٰ سوسائٹی کی برگزیدہ ہستیوں میں شمار ہوتے
تھے۔ ان کے قدر دانوں میں جلیل القدر شعراء بھی تھے
اور ادیب بھی۔ نوابین بھی تھے اور وزرائے حکومت
بھی۔ ان میں حضرت راسخ عظیم آبادی، حضرت عرش
گیاوی، نواب امداد امام اثر، حضرت ظفر نواب، سر
خواجہ محمد نور اور شری انوگرہ نارائن سنہا کے نام نامی
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ والد صاحب جہاں جاتے،
مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی
کہ مجھے خود بھی ان بزرگوں کو بذات خود دیکھنے کا فخر
حاصل تھا۔ یہاں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب میں پٹنہ کالج میں پڑھ رہا
تھا۔ میری والدہ ایک انتہائی مہلک عارضہ میں مبتلا
تھیں۔ انہیں جب گیا سے پٹنہ لایا گیا تو بیڈ کے خالی
نہ ہونے کی وجہ سے اسپتال میں داخلہ نہیں مل رہا تھا۔
یہ جان کر میں بے حد متفکر تھا کہ یکایک ایک دن
آنریبل شری انوگرہ نارائن سنہا کا خیال آ گیا جو ان
دنوں حکومت بہار کے وزیر مالیات کے علاوہ وزیر
صحت بھی تھے۔ چنانچہ وقت ضائع کئے بغیر میں اسی روز

ان کے بنگلے پر پہنچ گیا اور والد صاحب کے ریفرنس کے ساتھ اپنے نام کی چٹ دربان کے ذریعہ موصوف کے پاس بھجوائی تو انہوں نے مجھے فوراً اپنے کمرے میں بلوایا۔ سارا احوال سُنا اور ازراہ شفقت اپنا ایک خط میرے حوالے کیا جو اسپتال کے سپرانٹنڈنٹ کے نام تھا۔ پھر کیا تھا میری والدہ کو نہ صرف بیڈ مل گیا بلکہ ڈاکٹروں اور نرسوں نے اپنی اپنی خدمت گذاری میں بھی کوئی کمی نہیں کرنے دی۔

دوسرا واقعہ

میں بی۔ این کالج کے آئی۔ اے کے فائنل امتحان میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن کئی سبجیکٹ میں میرے لکچرز اتنے کم تھے کہ یونیورسٹی کے امتحان میں میرا بیٹھنا قطعاً ناممکن تھا۔ پھر بھی ہمت کر کے ایک دن ہائی کورٹ کے جج سر خواجہ محمد نور صاحب کی کوٹھی پر جا پہنچا اور اپنی چٹ ان کے پاس بھجوا دی۔ یہاں بھی میں نے دانستہ طور پر والد صاحب کے نام کا حوالہ دیا تھا چنانچہ خواجہ صاحب نے بھی اپنے دفتر میں فوراً مجھے باریاب ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔ جب میں نے موصوف سے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور یکے بعد دیگرے بی۔ این۔ کالج کے پرنسپل جناب معین الحق، پٹنہ یونیورسٹی کے رجسٹرار شری کامتا پرشاد اور وائس چانسلر شری سچدا نند سنہا سے میرے اس چھوٹے سے کام کے لئے گفتگو کر لی تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ کچھ دن بعد جب کالج کے نوٹس بورڈ پر میری نظر گئی تو کنڈون شدہ متعلقین میں میرا نام بھی موجود تھا جو میرے ساتھیوں کے لئے انتہائی حیرت کا باعث

تھا۔ غرض کہ یہاں یہ بات بلاشک و شبہ تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس زمانے کے بڑے بزرگوں میں رواداری اور محبت جو قابل قدر جذبہ پایا جاتا تھا آج کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

والد صاحب کے احباب میں ان کے ہم مذہب بھی تھے اور ہندو، سکھ اور عیسائی بھی۔ ان میں ایک تھے حضرت انجم مانپوری جو ایک بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ انجم رائس مل کے مالک بھی تھے۔ انہیں شعر و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور کسی زمانے میں شیخ عبدالقادر کے معتبر ماہنامے "مخزن" میں ان کا سنجیدہ کلام شائع ہوا کرتا تھا۔

جون ۱۹۳۱ء میں جب انجم مانپوری صاحب نے خود "ندیم" کے نام سے ایک ماہنامے کا اجراء کیا تو بہار کے ادبی حلقے میں اس کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ انہیں دنوں والد صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انجم صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے رسالہ "ندیم" سے ناتا جوڑ لیا۔ اور رکن ادارہ کی حیثیت سے اس کے ادارتی اور انتظامی امور میں دن رات بڑے خلوص کے ساتھ اپنے دوست کا ہاتھ بٹانے لگے۔ مجھے یاد ہے والد صاحب وقتاً فوقتاً دفتر "ندیم" سے نظم و نثر کے مسودات کا پلندہ اٹھا کر اپنے گھر لاتے تھے اور بڑے انہماک کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ پھر موٹے سائز کی سبز اور سرخ رنگ کی چوکور پنسلوں سے کسی تحریر پر "قابل اشاعت" لکھ دیا کرتے تھے تو کسی پر ناقابل

اشاعت۔ کئی مضامین ایسے بھی ہوتے تھے جن پر زیرِ غور لکھ دیا جاتا تھا۔ کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح بھی والد صاحب ہی کیا کرتے تھے۔

"ندیم" ہی وہ رسالہ تھا جس نے جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، عطا کاکوی اور اختر قادری وغیرہ کو شہرت سے ہم کنار کیا تھا۔ اسی ندیم میں انجم صاحب نے مانوری کے نام سے اپنی مزاحیہ نگاری کا دلچسپ سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ جب ان کا مزاحیہ شاہکار "میر کلو کی گواہی" شائع ہوا تو دنیائے ادب کے کونے کونے میں ایسی دھوم مچی کہ قارئین ہر ماہ ان کے مضمون کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ لیکن، مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ندیم کا یہ دورِ زریں ۱۹۳۷ء میں ختم ہو گیا تھا۔ حضرت انجم دمہ کے پرانے مریض تھے اور نتیجتاً اپنے رسالے کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ جب اسی سال جون کے مہینے میں ان کے دستِ راست یعنی میرے والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے تو حضرت انجم نے مجبوراً اپنا محبوب رسالہ علامہ سید ریاست علی ندوی کے سپرد کر دیا۔ ندیم ہی کے آخری زمانے میں والد صاحب چاہتے تھے کہ ان کا دیوان شائع ہو جائے۔ چنانچہ پہلے تو انہوں نے مسودہ تیار کیا پھر کتابت کے لئے رسالہ "ندیم" کے خوش نویس جناب نظام الدین رجہتی کو آمادہ بھی کر لیا لیکن خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دیوان شائع نہ ہو سکا۔ پھر بدقسمتی سے حضرت آزاد کا تقریباً سارا کلام زمانے کی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میرے چھوٹے بھائی قیوم اختر کو گیا میں پرانے کاغذات کے ساتھ اردو اور فارسی کا تھوڑا سا کلام دستیاب ہو گیا جو اب میرے پاس ہے۔

حیدرآباد (دکن) میں حضرت باقر پیر بیگھوی کے لائق فرزند حضرت عطاء الرحمٰن مستقل طور پر مقام پذیر تھے اور انجینیئر کے عہدے پر فائز تھے۔ "دیوانِ باقر" (فارسی) کی طباعت کا سہرا انہیں کے سپرد تھا۔ لیکن اس کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں حضرت آزاد نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی دیوان کے دیباچہ میں صفحہ ۱۱۱ پر مرقوم ہے۔

"۱۸۹۰ء میں شاہ آزاد نے ابتداً اردو میں غزلیں کہنی شروع کیں اور تین سال تک بہ طور خود کہتے رہے۔ ۱۸۹۳ء میں مولانا سید فصیح احمد حشر بیگھوی کی جانب رجوع کیا اور اردو غزلیں ان کی خدمت میں پیش کرنی شروع کیں۔ ۱۸۹۵ء میں گیا کے ایک مشاعرے میں شمس العلما نواب سید امداد امام المتخلص بہ اثر مرحوم و مغفور شریک ہوئے اور شاہ آزاد کی غزل سن کر بہت خوش ہوئے اور فارسی کے ساتھ ان کی فطری مناسبت کا احساس کر کے انہیں فارسی کہنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت سے شاہ آزاد نے فارسی غزل کہنی شروع کی۔ شاہ آزاد نہایت نازک خیال اور پختہ مغز شاعر ہیں۔ لیکن شاعری میں زیادہ وقت صرف نہیں کرتے۔ حضرت مولانا سید فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی مرحوم سے طریقۂ عالیہ نقشبندی سے مرید ہیں۔"

اب مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر فارسی اور اردو کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

حنائی پنجہ ات بشکست قیمت شاخِ مرجاں را

بہ یاقوت سبت نسبت کما لعل بدخشاں را
برائے کشتن عاشق نگاہ نازنیں باشد
عبث سری کنی جاناں بمن شمشیر براں را
اگر آزاد را روز جزا پرسش کنی یارب
شفیع آرد بہ درگاہ تو حضرت فضل رحمٰن را

از دہ غم ہوس روئے حسیناں نہ رود
تا بہ عمر از دل من الفت جاناں نہ رود
تا نہ بینید رخ خوب تو دم نزع مرا
جاں برود آہ ز قالب مگر آساں نہ رود
ہست آزاد گرفتار بلائے عشب ہجر
آفتے نیست کہ بر حال پریشاں نہ رود

اردو کے کلام کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے

خوگر فریاد و شیون بہ دل بیتاب ہے
اک گھڑی بھی صبر بے آہ و فغاں ہوتا نہیں

تجربہ اپنا ہے آزاد زمانے سے یہی
کوئی دنیا میں نہیں بھائی برادر اپنا

اے ستمگر بے وفا تیرا یہی انصاف ہے
بند ہو میرے لئے اور غیر پہ در باز ہو

ہوتا ہے خوف کب مجھے روز حساب کا
مداح ہوں ازل سے رسالت مآب کا

گر نہ اٹھکھیلیوں سے آپ چلے
حشر کوچے میں یہ بپا کیوں ہے

نہیں ہے یہ چمک برق تپاں کی
تجلی ہے کسی راز نہاں کی
رہی حالت یہ ضرور اس کو رلاتا ہوں میں
قصۂ درد جسے اپنا سناتا ہوں میں

تاریخوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام اشعار نوجوانی کے دور کے ہیں۔ افسوس کہ بعد کی تخلیقات میرے پاس موجود نہیں۔

حضرت آزاد کو ہجو نگاری اور تاریخ گوئی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ ملاحظہ کیجئے

چلے جب بیاہنے لڑکے کو اپنے
رئیس نیک طینت خاں بہادر
ہزاروں طشتری چاندی کی لائے
کہ بانٹی جائے شیرینی سے بھر کر
مٹھائی سینکڑوں چنگیری آئی
کہ کھائیں لوگ اس کو سیر ہو کر
ہوئی جب عقد سے فرصت مٹھائی
اٹھا کر لے گئے سب ان کے نوکر
نہ پایا ایک بھی حصہ کسی نے
ہوئے دونوں طرف کے لوگ ششدر
کسی نے یہ گڑھا دلچسپ فقرہ
یہ بجا رہے کی مٹھائی تھی مقرر
مگر اک دوسرے اس طرح بولے
نہیں بانٹی گئی لاٹھی سے ڈر کر

کوئی کہنے لگا حیرت سے یہ کیا؟
مچی تھی دھوم اس شادی کی گھر گھر
کہی آزاد نے کیا خوب تاریخ
یہ باجی تانت سمجھو دھنئے کا گھر
۱۳۱۸ فصلی

پروفیسر اختر قادری میرے ناولٹ "اور طوفان تھم گیا" کے تعارف میں ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"حضرت سید شاہ عبدالعزیز آزاد جنہیں مرزا غالب کے شاگرد رشید حضرت باقر علی باقر پیر بیگھوی سے تلمذ حاصل تھا، فارسی اور اردو کے مشاق ادیب اور شاعر گزرے ہیں۔ حضرت آزاد فارسی ادب میں نہایت بالغ استعداد رکھتے تھے اور فارسی و اردو کے دواوین پران کی نظر بہت وسیع تھی۔ بالخصوص آپ کا درجہ ایک نقاد کی حیثیت سے بہت ہی بلند تھا۔ لیکن طبعی انکسار اور بہار کے فطری ذوق گم نامی کا برا ہو کہ حضرت آزاد بیرون بہار میں صرف طبقہ خواص ہی سے روشناس ہو سکے۔

ملازمت کے سلسلے میں آپ محلہ کریم گنج گیا میں مقیم ہوئے۔ بالآخر یہیں آپ نے سکونت اختیار کرلی۔ بھائی جان کے محل اولیٰ سے قیوم اختر اور محل ثانی سے عبدالحیٔ (قیصر عثمانی)۔ یہ دو اولاد ذکور ہیں۔ عبدالحیٔ بڑے بیٹے اور بھائی جان کی آنکھوں کا تارہ ـــــ"

جیسا کہ اختر چچا نے اپنی مندرجہ بالا تحریر کے آخری چند الفاظ کے ذریعہ اشارہ کیا ہے، میں واقعی اپنے والد صاحب کا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی لاڈلا تھا۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اگر مجھے تھوڑی سی حرارت بھی ہو جاتی تو ان کا برا حال ہو جاتا تھا۔ اگر محلے میں چیچک یا کوئی اور خطرناک عارضہ پھیلنے لگتا تو وہ مجھے پہلی ٹرین سے پیر بیگھہ بھیج دیتے اور جب تک اس بیماری کا خطرہ ٹل نہیں جاتا تھا میں وہیں مدرسے میں لکھتا پڑھتا اور بستی والوں کے ساتھ کھیلتا کودتا تھا۔

یہ والد صاحب کی انتہائی محبت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے شاید ہی کبھی میری کوئی فرمائش ٹالی ہو۔ مجھے یاد ہے جب صرف دس گیارہ سال کی عمر میں، بہتوں کی مخالفت کے باوجود، مجھے ہری داس سمیتری کے درجہ ہشتم میں داخل کرادیا گیا تو میں نے والد صاحب سے کہا تھا کہ اگر میں پاس ہو گیا تو انعام میں ایک سائکل بھی لوں گا اور کلکتہ بھی دیکھوں گا۔ چنانچہ والد صاحب نے میری کامیابی کے بعد ایک ساتھ دونوں ہی فرمائشیں پوری کیں۔ سائکل بھی خرید دی گئی اور ایک دن وہ مجھے کلکتہ بھی لے گئے۔ جہاں ہم دونوں کچھ دن کولوٹولہ کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے۔

والد صاحب کی صحت ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے خود تو باہر نہیں نکلتے تھے لیکن مجھے تنہا گھومنے گھامنے کی اجازت تھی۔ آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ انہیں میرے گم ہونے یا کسی حادثے کا شکار ہونے کا خیال کیوں نہیں آتا تھا؟ بہرکیف اس چھوٹی سی عمر میں بھی بلا خوف و ہراس کلکتہ جیسے لق و دق شہر میں تنہا گھومتا پھرتا تھا۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ جب دن ڈھل گیا اور شام کے سائے

گھبرانے ہونے لگے تو میں ایک گلی سے گزر کر ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے مجھے واپسی کا راستہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ایک وکٹوریا والے نے مجھے روتے دیکھا تو اس نے پتہ پوچھ کر مجھے مسافر خانے تک پہنچا دیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ گیا آکر میں نے اپنا پہلا مضمون "کلکتہ کی سیر" لکھا تھا جو الہ آباد کے رسالہ "بچوں کی دنیا" میں متعدد تصاویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

والد صاحب کا ادھار کھاتہ ہر جگہ کھلا ہوا تھا۔ کپڑے کی دکان ہو یا اسٹیشنری مارٹ، ڈاکٹر کا شفاخانہ ہو یا بنئے کی دکان، ادھار کے بغیر کبھی کام نہیں چلتا تھا۔ حتیٰ کہ گیا، پٹنہ کے سفر کے دوران جہان آباد کے ریلوے اسٹال پر بھی اسی طرح چائے نوشی وغیرہ کا لطف اٹھایا جاتا تھا۔

کہتے ہیں خون کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس عادت کا شکار میں بھی ہو گیا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔

والد صاحب کے ایک کرم فرما تھے۔ ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر عزیز الرحمٰن جنہوں نے مجھے ازراہ کرم اپنے لوکل بورڈ کے دفتر میں ایک عارضی جگہ دے دی تھی۔ میں نے وہاں صرف ایک مہینہ کام کیا تھا اور اس مدت میں کوئی دن ایسا نہیں گذرا تھا جب کہ میں نے اسی ڈاک بنگلے میں جا کر توسٹ، آملیٹ اور جام وغیرہ کے علاوہ لیمو چائے سے اپنا مرغوب ناشتہ پورا نہ کیا ہو۔ جس سے کبھی والد صاحب کا پرانا واسطہ تھا۔ چوں کہ میں نے بھی وہاں اپنا ادھار کھاتہ کھول رکھا تھا۔ ایک ماہ بعد جب اپنی تنخواہ کے بیس روپے لے کر ڈاک بنگلے پہنچا اور خانساماں سے بل طلب کیا تو پتہ چلا کہ مہینے بھر کی واجب الادا رقم ۲۰ روپے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی تنخواہ کی پوری رقم اسی وقت ادا کر دی اور بقایہ کسی اور دن دینے کا وعدہ کر کے خالی ہاتھ گھر چلا گیا۔

عید کے دن قریب تھے۔ والد صاحب ایک دن مجھے اپنے ساتھ لے کر کپڑے کی دکان میں پہنچے جہاں پہلے تو میری پسند کے کپڑے خریدے گئے پھر قیوم کے لئے۔ جب انہوں نے کسی اور ڈیزائن کا کپڑا خریدنا چاہا تو میں نے زور دے کر کہا۔

" ابا قیوم کے لئے بھی وہی کپڑا لیجئے جو میں نے اپنی پسند سے لیا ہے" اور والد صاحب نے بڑی خوشی سے میری بات مان لی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پسند کے مطابق دو شیروانیوں کے لئے ایک ہی تھان سے الگ الگ ناپ کا کپڑا خریدا۔ ایک اپنے لئے اور دوسرا چھوٹے بھائی کے لئے۔ جن سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ والد صاحب کا یہ معمول تھا کہ ہر سال عید کے موقع پر ایک ہی کپڑے کی دو شیروانیاں لے کر اس نگری میں پہنچ جاتے تھے جہاں محکمہ پولس کی طرف سے چھوٹے ابا کی پوسٹنگ ہوتی تھی۔ دونوں کا ایک ساتھ منانا جیسے فرض ہو گیا ہو۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ والد صاحب کے نام سینکڑوں خطوط سے بھری ہوئی پیٹیاں دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک خط ایسا ملا جسے پڑھنے کے بعد یہ علم ہو سکا کہ چھوٹے ابا جب کلکتہ میں سینٹ زیویرس کالج کے متعلم تھے، والد صاحب انہیں ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے پانچ

روپے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن ایک ماہ کسی مجبوری کی بنا پر وہ منی آرڈر نہ کر سکے تو چھوٹے ابا نے وہ ساری رقم جو پوسٹ آفس میں جمع تھی، والد صاحب کی تحویل میں کر دی۔ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹے ابا اپنے کالج کے زمانے میں ٹیوشن کے پیسوں سے اپنا کام چلا رہے تھے۔ چنانچہ ان حقائق کے پیشِ نظر اپنی برادری والے باتوں میں ان دو بھائیوں کی شفقت و محبت کی مثال دیا کبھی نہ بھولتے تھے۔

والد صاحب ذیابطیس کے پرانے مریض تھے، پھر بھی میٹھی چیزوں سے پرہیز کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ میرے گھر میں ہر آئے دن بزرگانِ دین اور عزیز و اقربا کا فاتحہ بڑی باقاعدگی سے ہوا کرتا تھا۔ جس کے لئے محلے کی دکان سے گرم گرم جلیبیاں منگوائی جاتی تھیں۔ اور والد صاحب اپنے عارضے کا خیال کئے بغیر دوسروں کے ساتھ خود بھی ان پر اچھی طرح ہاتھ صاف کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرض گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی گیا۔ ایک چھوٹی سی پھنسی بھی نکلتی تو وہ خطرناک صورت اختیار کر لیتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار اسی سلسلے میں ان کے ہاتھ کی ایک انگلی کو کاٹنا پڑا۔ دوسری مرتبہ جب پاؤں میں زخم ہوا تو بڑھتے بڑھتے گینگرین میں تبدیل ہو گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی ڈاکٹر منظور کی قابلیت اور غیر معمولی تجربے نے پاؤں کو کٹنے سے بچا لیا ——— والد صاحب کی شیرینی خوری کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی فصل کے موقع پر بندوسرنام کے گاؤں میں ہوتے اور کسی دن وہاں کوئی پسندیدہ مٹھائی نہ ملتی تو تھوڑا سا گڑ ہی کھا کر تشفی کر لیا کرتے تھے۔

[illegible]ء کا زمانہ تھا جب کہ میں پٹنہ کالج کے پہلے سال کا متعلم تھا۔ سالانہ امتحانات کے دن قریب تھے، پھر بھی نہ جانے کیوں لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت بالکل مائل نہیں ہوتی تھی۔ ہر وقت ایک افسردگی تھی جو مجھے گھیرے رہتی تھی۔ چلتے پھرتے ایسا لگتا تھا جیسے میری آنکھوں کے سامنے کوئی پردا پڑا ہوا ہے۔ انہیں دنوں کی بات ہے ایک رات میں نے ایک ایسا خواب دیکھا جس میں میری حالت اور بھی غیر کر دی۔ خواب عموماً گنجلک ہوا کرتے ہیں۔ کوئی خواب ایسا ہوا کرتا ہے جو ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہتا۔ لیکن میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ نہ صرف شیشے کی طرح صاف و شفاف تھا بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے فلم کے پردے پر پوری ترتیب کے ساتھ کوئی منظر دکھائی دے رہا ہو۔ سگمنڈ فرائڈ کی تھیوری کے مطابق پہلے کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے جو بعد میں کسی نہ کسی صورت میں خواب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن میرے ساتھ کچھ ایسا ہوا کہ میں نے پہلے خواب دیکھا پھر حقیقت سامنے آئی۔

میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ مجھے ایک ٹیلیگرام ملتا ہے جس کے ذریعہ میرے پھوپھی زاد بھائی قاضی محمد عارف مرحوم نے یہ اطلاع دی تھی کہ ان کے ماموں جان یعنی میرے والد صاحب سخت علیل ہیں اس لئے مجھے پہلی ٹرین سے گیا بلوایا گیا تھا۔ چنانچہ اسی دن میں نہایت غم و اندوہ کے عالم میں اسٹیشن پہنچتا ہوں۔ ٹکٹ خریدتا ہوں اور ٹرین میں بیٹھ جاتا ہوں۔ ٹرین تقریباً تین گھنٹے کا سفر طے کر کے جب گیا اسٹیشن پہنچتی ہے تو میں وہاں سے

سیدھا شہر کے جنرل ہوسپٹل میں ڈیزالو۔ (DISS
OLVE) ہو جاتا ہوں جہاں والد صاحب کو دیکھتا
ہوں کہ وہ ایک بیڈ پر بے سدھ پڑے ہوئے ہیں۔
قریب ہی تپائی پر آپریشن کے کچھ اوزار وغیرہ رکھے
ہوئے ہیں۔ اور کئی عزیز رشتے دار اور احباب انتہائی
مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر کھڑے نظر آرہے ہیں
کچھ خواتین بھی وہاں موجود ہیں اور آنسو بہا رہی ہیں۔
چنانچہ اس خواب کو دیکھ کر میرا حال اور بھی
دگرگوں ہو گیا۔ اور دن رات والد صاحب کا خیال
ستانے لگا۔ بہت دنوں سے وہ اپنے معمول کے
مطابق مجھے دیکھنے کے لئے گیا سے پٹنہ بھی نہیں آئے
تھے۔ صرف ایک پوسٹ کارڈ آیا تھا جس میں کچھ ایسا
ہی لکھا تھا ـــــ

"آج کل بڑو سرمیں ہوں۔ فصل کا
زمانہ ہے۔ کچھ دن یہیں قیام رہے گا
"بچوں کی دنیا" کا تازہ شمارہ آیا
ہوا ہے اس میں آپ کا کوئی مضمون
نظر نہیں آیا" چنانچہ کچھ ہی دن بعد
میری زندگی کے اس وحشت ناک
دور میں ڈاکیہ مجھے ایک پوسٹ کارڈ
دیتا ہے جسے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا
ہے کہ والد صاحب سخت علیل ہیں
اور مجھے پہلی ٹرین سے گیا پہنچ جانا
ہے۔ یہ بھی کتنا عجیب و غریب واقعہ
ہے۔

یہ خط انہیں کا لکھا ہوا تھا جنہوں نے
کچھ دن پہلے خواب میں بالکل یہی اطلاع مجھے ٹیلگرام
کے ذریعہ دی تھی۔

چنانچہ میں اپنی قیام گاہ (پریہگہ لاج) سے
نکل کر براہ راست اسٹیشن پہنچتا ہوں۔ ٹکٹ خریدتا
ہوں اور ٹرین میں بیٹھ کر گیا پہنچ جاتا ہوں تو اسٹیشن
سے باہر نکل کر پیدل ہی اپنے گھر کی طرف چل پڑتا
ہوں۔ ابھی آدھا ہی راستہ طے ہوا تھا کہ سامنے
سے ایک کار آکر میرے پاس رک جاتی ہے جس
میں والد صاحب کے دوست ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب
مرحوم تشریف فرما تھے۔ وہ فوراً اپنی کار میں بٹھا لیتے ہیں
اور تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں اسپتال میں پہنچ جاتے
ہیں جہاں والد صاحب کو اسی طرح بیڈ پر پڑا ہوا
بے سدھ دیکھتا ہوں جیسا کہ خواب میں دیکھا تھا۔
عزیز رشتے دار اور احباب بھی وہاں موجود تھے۔ صرف
خواتین نہیں تھیں۔ اور آپریشن کا سامان بھی نظر
نہیں آرہا تھا۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے
اسی ذیابیطیس کے موذی مرض کی بدولت جسم کے کسی
حصے میں بہت بڑا آپریشن ہوا تھا۔ جس کے بعد حالت
بگڑتی ہی چلی گئی۔ ڈاکٹروں کو سخت حیرت تھی کہ
ایسی حالت میں مریض نے اتنا وقت کیسے نکال لیا۔ لیکن
انہیں کیا معلوم کہ والد صاحب کو تو شاید میرا انتظار تھا اور
مرنے سے پہلے مجھے ایکبار جی بھر کے دیکھ لینا چاہتے تھے لیکن
اس وقت حالت یہ تھی کہ نہ تو بینائی ہی باقی تھی اور نہ
طاقت گفتار۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کسی نے جب زور زور سے
آواز میں کہا کہ "عبدالحئی آگئے" تو والد صاحب کی زبان
مبارک سے صرف ایک خفیف آواز نکل پائی۔ "بابو"
اس کے بعد اسی شام ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق والد
صاحب کو گھر پہنچا دیا گیا۔ تو رات کو کسی حصے میں وہ ہم سب

درخت لگائیں۔ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے اہم جان ہے اس کی حفاظت کرنا فرض ہے

(۲) یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے مہیا وسائل کا استعمال پورے ویدک سے کریں

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتے ہوئے اس کی حفاظت آنے والی نسل کے لئے کریں۔

(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہتر لائحہ عمل ہے اس سے فرار نقصان دہ ہوگی

(۵) باڑھ اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات اتنا پراگندہ ہو جائے گا کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا۔

(۶) سرزمین کی وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی اس سرزمین پر پہلے ہوئی تھی انہوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے جس سے انسان کا اس سرزمین پر افزائش ہوئی۔ آج بھی انکی اہمیت برقرار ہے

(۸) درخت لگائیے —— جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں

جاری کردہ۔ محکمہ جنگلات و ماحولیات، بہار

MAY 18 710 (4-6) 93-94

ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی

عصری آگہی کا شاعر — منظر شہاب

منظر شہاب عصری اردو شاعری میں ایک معتبر نام ہے۔ اردو ترقی پسند ادب اور تحریک کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جائے گی جب تک اس میں منظر شہاب، حسن نعیم، مظہر امام، انور عظیم، کلام حیدری اور احمد یوسف کی ادبی کاوشوں کا ذکر موجود نہ ہو۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر کلام حیدری، انور عظیم اور احمد یوسف نے نثری صنف میں اردو افسانے کو نئے رنگ و آہنگ اور نئی تکنیک سے جلا بخشی تو منظر شہاب، حسن نعیم اور مظہر امام نے شعری اصناف کو نئے موضوعات اور نئی طرز اظہار سے روشناس کیا اور دلکشی عطا کی۔

ادب نہ تو تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور نہ سیاسی جماعت کا منشور۔ ادب دراصل زندگی کا وہ آئینہ ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ہمارے خفیہ احساس کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کے فطری جذبات کو [illegible] معنی کا لباس عطا کرنا ادب کا کار خاص ہے۔ وہ مصلح بھی ہے اور درس حیات بھی دیتا ہے۔ شرط اتنی ہے [illegible]

منظر شہاب کی شاعری میں زندگی کے تنوع بہ تنوع موضوعات کی جلوہ گری ملتی ہے۔ واقعات عالم اور گرد و پیش میں رونما ہونے والے سانحات کی تصویر کشی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ انہوں نے کئی سماجی اور سیاسی انقلابات کا مشاہدہ کیا ہے۔ شہاب نے ان سے جو اثرات قبول کئے ہیں۔ ان کو ایماندارانہ طور پر اپنی شاعری کے ذریعہ دلنشیں انداز میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ پراثر اور سحر انگیز ہے جس کا احساس خود انہیں بھی ہے ؎

ترے اشعار میں اعجاز تاثیر ہے شہاب
رگ افکار کو تو خون جگر دیتا ہے

وہ ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں، لیکن مقصدیت کی ہمنوائی کے باوجود ان کی نگاہ ہمیشہ کشادہ رہی ہے کسی سیاسی نظریے نے انہیں پابند کر نہیں رکھا۔ حتیٰ [illegible]

ایک سائنسی نظریہ سمجھا جس میں حالات کے پیش نظر تغیر اور تبدیل کی کارفرمائی ضروری ہے۔ اور جب بھی انہوں نے محسوس کیا کہ اشتراکیت ادعائیت کا شکار ہوتی جا رہی ہے تو برملا اس کا اظہار کیا جس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ انسان دشمن موضوعات کو ادبی لباس پہنانا ان کی شریعت میں کفر سے کم نہیں۔ وہ موضوعات کی صحت کے ساتھ ساتھ طرز اظہار کی صحت پر بھی زور دیتے ہیں۔ پیرایۂ جاں میں انہوں نے اپنے ادبی نظریات کا اظہار کتنے حسین انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

" موضوع سے وفاداری لائق ستائش جذبہ ہے لیکن اس کے اظہار میں شعری لوازمات سے بے اعتنائی کو سراہا نہیں جا سکتا۔ اگر فنکار حرف کی جادوگری اور آہنگ کی مشہود طرازی کا رمز شناس نہیں تو اس کا موضوع خواہ کتنی ہی افادیت کا حامل ہو تخلیقی ادب کا حصہ نہیں بن سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہیت کی تمام تر فنکاری کے باوجود ایسے موضوعات جو سماجی ارتقا میں حارج ہوں تخلیقی ادب کی سطح کو پست کر دیتے ہیں۔ ادب یا کسی فن لطیف میں نا وابستگی کا سوال بے معنی ہے۔ فنکار کبھی معنی کبھی ہیت اور کبھی دونوں سے وابستہ رہتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ منظر شہاب کی شاعری ان کے ادبی نظریات کا آئینہ ہے۔ انہوں نے ہمیشہ موضوع اور ہیئت کے ساتھ باہمی حسی ارتباط کو برقرار رکھا ہے حکایت زیست کو شیریں اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ کہیں کہیں کم رسائی کا بھی احساس ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فسانہ تلخ ہے اور صنو کر لطف سے کہئے
مگر شہاب یہ ایسا درجہ خوش کلام نہیں

مقصدیت اور جمالیات کے توازن سے ان کی شاعری کا روپ نکھرتا ہے۔ اس وصف نے انہیں اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت کا مالک بنا دیا ہے۔

منظر شہاب نے زمیندارانہ ماحول میں پرورش پائی۔ زمینداروں کا دبدبہ، ٹھاٹ باٹ، سامان تعیش اور ان کی پرشکوہ حویلیاں سب کچھ دیکھا۔ لیکن جلد ہی یہ ماحول بدل گیا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ہولناک صورت اختیار کر لی۔ قتل و غارتگری، تباہی و بربادی اور مظالم کی گرم بازاری نے ڈیرہ ڈال دیا۔ خوف و ہراس میں گھرے لوگوں کی ہجرت، زمینداری کا خاتمہ، معاشی ابتلا وغیرہ ایسے حادثات تھے جنہوں نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس طوفان میں ان کا سفینۂ حیات بھی موجوں کے تھپیڑوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ وہ لکھتے ہیں۔

" ان حادثات نے میری روح میں زہر گھول دیا۔ اعتبارات کی دنیا پارہ پارہ ہو گئی۔ اور میں کٹی پتنگ کی طرح فضا میں بے سمت ڈولتا رہا۔ مایوس، تنگ حال، بے زار" (خوں چکاں قصہ مرا)

لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی ان کے ذہن نے مثبت راہ تلاش کر لی۔ مارکسزم کے مطالعہ نے سیاسی اور معاشی آزادی کے نکات کو سمجھنے میں مدد پہنچائی۔ قومی سیاست کو بین الاقوامی سیاسی پس منظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا ہنر سکھایا۔

اشتراکی فکر و نظر نے اس درجہ متاثر کیا کہ وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ ان کے ادبی نظر میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے۔

میں نے ادبی تخلیقات کو نئے مفاہیم کی روشنی
میں دیکھا اور پرکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اشتراک
درد کی تہہ میں افراد کے باہمی رشتوں کا سراغ ملتا
ہے۔ سماجی تقاضے ابھرتے ہیں۔ (خون جگاں قصہ ہرا)
ان کی تخلیقی کاوشوں کا نیا انداز جو کلاسیکی انداز بیان
سے جدا ہے ملاحظہ ہو۔

دلیست گلزار سہی درد کا صحرا بھی تو ہے
اس جزیرے سے لگا آگ کا دریا بھی تو ہے
روز شب ظلم کے پنجوں پہ سسکتے ہوئے دل
ان کے آزار کا کچھ اور تقاضا بھی تو ہے
غم دوراں کو کلیجے سے لگالیں ہم بھی
درد والم کے لئے درد زمانہ بھی تو ہے
منظر شہاب گیسوئے لیلیٰ سنور چکے
لیکن وہی ہیں کاکل دوراں کے پیچ و خم

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوگیا۔ ہندوستان
کی آزادی کا سورج لاکھوں افراد کے خون میں نہا کر نمودار
ہوا۔ حکومت کا جوا بدل گیا جس میں عوام کا بہت معمولی حصہ
تھا۔ زمام حکومت گورے ہاتھوں سے منتقل ہو کر کالے
ہاتھوں میں آگئی۔ فاقہ کشی معاشی استحصال، طبقاتی
کشمکش سابق دستور قائم تھے۔ منظر شہاب نے ہندوستان
کی ناآسودہ آزادی کے متعلق اپنے مجروح جذبات کا اظہار
"جشن کی رات" میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔ اس
نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

لیکن اے دوست شب تار کا منظر ہے وہی
دست افلاک وہی وقت کا خنجر ہے وہی
اب بھی مفلوج ہیں محفل کے رباب و طاؤس
مضمحل شوق کی ہر رگ میں لہو ہے اب تک
جشن کی رات ابھی خواب کی منزل میں ہے

ہندوستان کی معاشی غلامی اور شکست آرزو کی لے ان
کی شاعری میں اکثر و بیشتر تیز ہو جاتی ہے۔ درج ذیل
اشعار میرے قول کی ضمانت ہیں۔

اب اس کو تم بہار کہو یا خزاں کہو
ہیں خون عندلیب سے عارض گلوں کے نم

نہ محبتوں کا حاصل نہ صلہ ہے محنتوں کا
کہ متاع کو مکین پر وہی جبر خسروی ہے

یہ مفلسی کے ہرے کھیت بھوک کی فصلیں
تمہارے راج نے کیا سبز سبز اکال دیا

منظر شہاب کی شاعری میں اشتراکی فکر نے نمایاں کردار
ادا کیا ہے۔ ہم عصر نوجوان دانشوروں کی طرح انہوں نے
بھی اشتراکی انقلاب میں کشش محسوس کی۔ ان کا خیال
تھا کہ طبقاتی نظام کے خاتمہ اور دنیا بھر کے لوگوں کے دکھ
درد کا مداوا سرخ انقلاب کی آمد کے بعد ہی ممکن ہے۔
سوویت روس کے بعد چین، کوریا، ویت نام اور دیگر
ممالک میں اشتراکی حکومت کے قیام اور پرحوصلہ جدوجہد
نے ان کے دل کو ولولوں سے بھر دیا۔ انہیں پرجوش اور
پرمسرت جذبات نے سنہرے لمحے کا شعری پیکر اختیار
کر لیا۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

سنہرے لمحے
نئی سحر کے سنہرے لمحے
رخ جہاں سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں
ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں
افق کے رخسار صیقلوں پر شفق کا غازہ دمک رہا ہے

شفق کا غازہ چہار عالم کو آئینہ سا دکھا رہا ہے

نئی سحر دراصل وہ سحر تھی جو اشتراکی تحریک کے
ذریعہ وجود میں آئی تھی جس نے سرمایہ دارانہ نظام کے
عالیشان عمارتوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اس
ضمن میں صرف دو اور نظموں کا ذکر کروں گا "ساقی نامہ"
اور "حکم امتناعی" یہ وہ نظمیں ہیں جو منظر شہاب کے
اشتراکی افکار کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ساقی نامہ منظر شہاب کے سیاسی مسلک کی کلید
ہے۔ روس، چین، کوریا، ویت نام اور یونان میں اشتراکی
تحریکات کا عروج اور سرخ انقلاب کی جدوجہد اور
کامرانیوں کی حوصلہ انگیز تصویر کشی کی گئی ہے۔ بعض
نقاد کا خیال ہے کہ "ساقی نامہ" دراصل منظر شہاب
کے شعری افکار و فن کا شناخت نامہ ہے اس تخلیق
نے شاعر کو کافی شہرت بخشی۔ جب بھی اس نظم کا ذکر ہوا ہے
اقبال کے ساقی نامہ کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ اور ان
دونوں نظموں کی مماثلت اور مغائرت کا مطالعہ بھی کیا گیا
ہے۔ سید احمد عظیم لکھتے ہیں۔

منظر شہاب کی سیاسی نظموں میں سے زیادہ اہم
"ساقی نامہ" ہے۔ یہ زور بیان اور تخلیقی حسن کا خوبصورت
مرقع ہے۔ روانی ہے کہ اقبال کے "ساقی نامہ" سے کسی
حسرت کچھ نہیں رہتی۔ اقبال نے جو کام عشق سے لیا ہے منظر
شہاب نے وہی کام مسرت سے لیا ہے۔ لیکن عشق میں
جو ماورائیت اور سرمدیت ہے وہ مسرت میں نہیں ہے۔
دراصل یہ اقبال کی مادی روحانیت اور منظر شہاب
کی روحانی مادیت کا فرق ہے۔ اقبال کے "ساقی نامہ"
کی کائنات وسیع تر ہے جبکہ منظر شہاب کے "ساقی نامہ"
کی دنیا محدود ہے" ([illegible]۔ فروری ۱۹۹۱ء)

اپنے مضمون میں معتبر ناقد ڈاکٹر منصور عمر رقم
طراز ہیں۔

"ساقی نامہ" منظر شہاب کی تمام نظموں میں
سے اہم ہے۔ یہ نظم اقبال کی نظم "ساقی نامہ" کے رنگ
میں لکھی گئی ہے اور موضوع اور ہیئت ہر دو اعتبار سے
اقبال کے "ساقی نامہ" سے مماثل ہے۔ اقبال کے ساقی
نامہ کا کینوس ساری دنیا اور عالم اسلام ہے جبکہ
منظر شہاب کے ساقی نامہ کا کینوس صرف چین اور
ہندوستان تک محدود ہے" (زبان و ادب پٹنہ
جولائی اگست ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر منصور عمر کا کہنا ہے کہ منظر شہاب کے
ساقی نامہ کا کینوس صرف چین اور ہندوستان تک محدود
ہے۔ محل نظر ہے۔ کیونکہ اس نظم میں چین اور ہندوستان
کے ساتھ ساتھ روس، ہند چینا، ویت نام اور یونان
میں اشتراکی جدوجہد کا ذکر موجود ہے۔

"ساقی نامہ" جوش، ولولہ، یقین اور رجائیت
کے جذبات سے لبریز نظم ہے۔ روانی بے مثال ہے۔ ایک
ایک مصرعہ سے جیسے زندگی ابھر رہی ہے۔ ساری نظم
پر سحر انگیز فضا چھائی ہوئی ہے۔ شعری لوازمات کے
آبگینے کو بہت سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ اس کا فکری
پہلو بھی قابل توجہ اور لائق ستائش ہے۔ میرے خیال
میں یہ نظم شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ
ہوں ـــــ

وہ مشرق میں سورج ابھرتا ہوا
وہ پھیلا افق کا نکھرتا ہوا
چمکتے ہوئے بحر و نہر [illegible]
[illegible] ہوئے شمس [illegible] کے تار

فضائیں شعاؤں سے پرنور ہیں
فضائیں نہیں، خطِ طور ہیں!

نئے ولولے ہیں، نئی آرزو
تجسس نیا ہے، نئی جستجو
عوام اپنی قسمت پہ نازاں ہیں آج
عوام اپنی نصرت پہ شاداں ہیں آج
مجاہد ہیں، محسن ہیں مشفق ہیں وہ
زمیں پر بہشتوں کے خالق ہیں وہ

آخری بند میں شاعر نے اپنے وطن عزیز ہندوستان کی اقتصادی غلامی کا ذکر کیا ہے۔ گرچہ ہندوستان نے سیاسی آزادی حاصل کرلی ہے لیکن مفلوک الحالی، جہالت، توہم پرستی اور استحصال سے نجات حاصل نہیں ہوئی ہے۔

یہ صنم خانۂ ہند میرا وطن
یہ سارے زمانے میں یکتا چمن
بہت اس کے دل سے اڑی دھول دھول
کہیں تب کھلے ڈال میں پھول پھول
مگر اس گلستاں کی رعنائیاں
وہ حسنِ بہاراں کی تہہ داریاں
ابھی تک ہیں مستور ظلمات میں
تجلی ہے پنہاں حجابات میں
گرچہ ہے بزم اپنی، اپنے ہیں جام
مگر بادۂ طرب سے لالہ ناکام

"حکم امتناعی" سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کی اسیری سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے ان دونوں اشتراکی مجاہدوں کو سلاخوں کے پیچھے بند کردیا تھا۔ اس حادثہ نے دنیا بھر کے ترقی پسند دانشوروں کو مضطرب کردیا اور انہوں نے اس جبر کے خلاف آواز اٹھائی۔ منظر شہاب کے ذہن پر جو تاثرات مرتسم ہوئے انہوں نے حکم امتناعی کا پیکر اختیار کرلیا۔ ایک بند نذر کر رہا ہوں۔

سنا ہے ارضِ خداداد کے صنم خانے
خموش ہیں در و دیوار پر اداسی ہے
شکستِ ساغر و طاؤس کی منادی ہے
فقیہہ تو کارواں حکم امتناعی ہے
اسیر حلقۂ زنجیر میں ہیں ستانے

دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت روس ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا۔ جرمنی، پولینڈ، ہنگری اور کوریا میں اشتراکی حکومتوں کا قیام عمل میں آگیا۔ چین میں سرخ انقلاب نے چیانگ کائی شک کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ انڈوچائنا، کمبوڈیا، انڈونیشیا اور ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک نے زور پکڑ لیا۔ دنیا کے چھٹے حصے کے طول و عرض میں اشتراکیوں کا بول بالا ہوگیا۔ اشتراکیت کے سیلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں ہلا دیں۔ امریکہ کی تجارتی منڈیاں سکڑنے لگیں۔ جنگی اسلحوں کی فروخت کساد بازاری کا شکار ہوگئی۔ اس اقتصادی بحران کا حل تیسری عالمگیر جنگ کے چھڑنے میں ہی مضمر تھا۔ دوسری جانب ترقی پسندوں کا خیال تھا کہ دنیا میں امن قائم رہا تو رجعت پسندوں کا اقتصادی بحران اس قدر شدید ہوجائے گا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور یہ اپنی موت مرجائیں گے۔ چنانچہ سوویت روس کی قیادت میں امن عالم کی تحریک کا آغاز کیا گیا اس تحریک نے

کافی زور پکڑ لیا۔ دنیا کے گوشے گوشے میں امن کا نیلا پرچم
لہرانے لگا۔ ایک نیا عوامی شعور بیدار ہو گیا۔ ادیبوں
شاعروں اور دوسرے دانشوروں نے ادبی تخلیقات
تقاریر اور مباحث کے ذریعہ اس تحریک میں زبردست
روح پھونک دی۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں
بے شمار افسانے ڈرامے ناول اور رپوتاژ لکھے گئے۔ اردو
کے ترقی پسند ادیبوں نے سینکڑوں ادب پارے تخلیق
کئے۔ مقتدر رسائل نے "امن نمبر" نکالے۔ دنیا کے
مختلف زبانوں میں امن عالم سے متعلق ادبی تخلیقات
پر مشتمل ایک ضخیم کتاب "ہم امن چاہتے ہیں" کے نام
سے ہربنس سنگھ دوست (مرحوم) نے جمشید پور سے شائع
کیا۔

منظر شہاب نے بھی جنگ کے خلاف اور امن عالم
کی حمایت میں ایک انتہائی خوبصورت نظم لکھی —
ایک رات۔ بلاشبہ اس موضوع پر انگنت نظمیں
لکھی گئی ہیں جو زیادہ تر بلند آہنگ اور براہ راست
طرز بیان کا شکار ہو گئی ہیں۔ لیکن منظر شہاب کی
نظم ایک رات ایک فنکارانہ تخلیق ہے۔ خوبصورت
علامات، تمثیل، امیجری، تشبیہ، استعارہ، محاکات
اور لطافت نے اس نظم کو ایک اثر انگیز لازوال فن
پارہ کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ بعض ناقدین کا خیال
ہے کہ "ایک رات" منظر شہاب کی سب سے خوبصورت
اور کامیاب ترین تخلیق ہے۔ یہ ایک جامع نظم ہے جس
کے کسی بند یا شعر کو پیش کرنے کی بجائے مکمل نظم کے
مطالعہ کی دعوت دیتا ہوں (پیراہن جاں صفحہ ۲۳)

نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی شہاب نے

پہنایا ہے۔ ان کے خیال میں مظلوم انسانیت کے دکھ
درد کا علاج اشتراکی نظام میں ہی ممکن ہے۔ اس
لئے اس نظام کے قیام کی آرزو ان کی شاعری کے
رگ و پے میں جاری و ساری نظر آتی ہے۔ چند اشعار
ملاحظہ ہوں۔

لعبتانِ چین کے افسانے یہ کہتے ہیں شہاب
چلئے چل کر وہ نرالا شہرِ خوباں دیکھئے

چھین لے جام دست ساقی سے
ناروا کو روا کرے کوئی

ہوا کی سانس ہے بوجھل فضا بھی گم سم ہے
کہیں قریب میں طوفاں رکا رکا سا ہے

کہنے لگے ہیں اب تو موسم شناس سارے
جب تک نہ اٹھے طوفاں موسم نہیں بدلتا

منظر شہاب آؤ جی بھر کے ہم بھی رو لیں
جب سادھنے سے عہد ماتم نہیں بدلتا

منظر شہاب ایک مخلص اشتراکی ہیں۔ انہوں نے مارکسزم
کو ہمیشہ ایک نظریہ سمجھا ہے۔ جس میں تبدیلیاں ناگزیر
ہیں۔ صحیح مارکسزم ادعائیت سے آزاد نظریہ ہے جو
کسی بندھے ٹکے اصول کا پابند نہیں۔ زندگی کی طرح اس
نظریہ حیات میں لچک ضروری ہے۔ ورنہ عمل کے میدان میں
ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں ؎

عمل کی جنگ میں اکثر لچک بھی جاتا ہے
اصول زیست کا شمشیر ہے نیام نہیں

انہوں نے مارکسزم کو اعتقاد کے طور پر تسلیم
نہیں کیا۔ بلکہ اپنے شعور کے دریچے کو ہمیشہ کھلا رکھا
اور جب کبھی محسوس کیا کہ اشتراکیت اپنی کارگذاریں

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اشتراکیت پر اعتماد کے باوصف اکثر تشکیک کا بھی اظہار ہوتا رہا ہے۔ تشکیک کی یہ کیفیت ابتدا سے ہی نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کارواں منتشر سفر ناکام
تیز بانگ درا کرے کوئی

جس کاروانِ زیست کے ہیں منتظر شہاب
وہ بھی حسین خواب کی خوش چہرگی نہ ہو
جنوں نواز گریباں تو سی رہے ہیں مگر
کسے خبر یہ بہ امکانِ اعتبار سلے

سنہ ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان کی سرزمین پر حملہ کر دیا۔ ہند چینی بھائی بھائی کا فلک شگاف نعرہ لگانے والے اب شمشیر بکف ایک دوسرے کے مد مقابل تھے۔ ہم وجودیت کے اصول کے تحت پنچ شیل کا معاہدہ پارہ پارہ ہو گیا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی شدید نظریاتی بحران کا شکار ہو گئی۔ دلی میں تین دنوں تک بحث ومباحثہ کے باوجود بالاتفاق کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ آخرش پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ (سی۔پی۔ایم) کے نام سے ایک نئی، اشتراکی سیاسی جماعت وجود میں آ گئی۔ پھر تو پارٹی کے ٹوٹنے بکھرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اختلافی نظریہ رکھنے والے رہنماؤں کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کے کئی گروپ بن گئے۔ سہولت پسندوں اور مہم بازوں کے درمیان کمیونسٹ پارٹی دن بہ دن انتشار کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ان غیر متوقع واقعات سے منظر شہاب کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ انہوں نے چین کے جارحانہ پالیسی کی سخت مخالفت کی اور اشتراکیت کے سلسلے میں ان کے جذبۂ تشکیک نے شدت اختیار کر لی۔ ملاحظہ ہو۔

دم بخود ہے اشتراکی فکر گاہ
منتشر مسلک جمیعت کی ہوئی
جس کی اک اک بوند کو امرت کہیں
مشتبہ اس جام کی صحت ہوئی

حقیقت یہ ہے کہ منظر شہاب کی اشتراکی شاعری یقین و گمان کے سائے سائے چلتی ہے۔ امید اور نا امیدی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے محسوسات انسانی فطرت سے ہمیشہ قریب نظر آتے ہیں۔ جذبۂ تشکیک نے ان کے نظریات کو نہ صرف کٹھ ملائیت سے بچائے رکھا بلکہ اس سے ان کی شاعری میں احساس کی کسک اور تہہ دار کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ کبھی کبھی ان کی دل شکستگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود اپنے نظریات کی نفی کر رہے ہوں۔ اور اضافی مادیت سے گریز کر کے عین روحانیت میں پناہ لینے کی خواہش مند ہوں۔ ایسے ہی احساسات سے بھرپور تمثیلی اور علامتی پیکر میں ڈھلا ہوا ایک شعر گوش گذار کرنا چاہتا ہوں کہتے ہیں۔

زرد پتوں کی مانند بکھرا کئے سرخ پھولوں کی چاہت میں منظر شہاب
اب تو بہتر ہے سینوں کی انگنائی میں ایک ننھا سا تلسی کا پودا لگائیں

منظر شہاب تقریباً ۳۶ سال سے جمشید پور میں قیام پذیر ہیں۔ وہ آدی باسیوں کی سیاسی سرگرمیوں سے قربت محسوس کرتے ہیں اور سرسبز جنگلوں اور پہاڑوں میں نمو پذیر آدی باسیوں کے سبز انقلاب کی جدوجہد سے واقف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

پہاڑ سے اتر نہ آئے آگ شہروں میں
سنا ہے سبز بگولہ اٹھا اٹھا سا ہے

ہندوستان کی آزادی کے تقریباً ایک دہائی بعد فرقہ پرستی کی عفریت نے پھر سے سر اٹھایا۔ کشت و خوں کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے بلکہ فرقہ پرستوں کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ جمشید پور، رانچی، جبل پور، میرٹھ، بلند شہر، علی گڈھ، احمد آباد، بمبئی اور حیدر آباد بھیانک فسادات ہوئے۔ رفتہ رفتہ پورا ملک اس آگ کی لپیٹ میں آتا جا رہا ہے۔

منظر شہاب بہ نفس نفیس خونی فسادات کے انگاروں پر برہنہ پا گذرے ہیں۔ جمشید پور ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۹ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکی، تباہی بربادی اور ہوس رانی نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ عصبیت کے اس مکروہ کھیل میں پروفیسر ڈاکٹر وکلا اور دیگر دانشور افراد اور سیکولر سیاسی جماعت سے وابستہ کئی شر پسندوں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ منظر شہاب نے یہ سب دلدوز اپنی آنکھوں سے دیکھا، لہو کی آگ میں جلتا گلستان، معصوم کلیوں کے چھلنی کلیجے، مہ جبینوں کی روشن چتائیں، پتھرائی ہوئی چشم غزالاں، پاسبان ساختہ آزاد زنداں، خود اپنے شور میں مدفون فریادیں، خون کی بارشیں، پٹرول کی آگ کا چراغاں، قتل کا سانحہ لکھتی ہوئی پاسبان وردیاں، حسن گل رنگ اور عشق گلنار کے جلتے ہوئے پیرہن۔ یہ سب ایسے محسوسات ہیں جن کو شاعر نے "ہم نہ بھولیں گے" اور "بارشیں خوں کی تیز ہیں" جیسی تخلیقات میں شعری پیکر عطا کیا ہے۔ متذکرہ بالا دونوں نظمیں تشبیہ، استعارہ، علامت، تمثیل، پیکر تراشی اور ... ئے اظہار کی نادرہ کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ فساد کے موضوع پر ایسی مرصع مسجع موثر مکمل اور سارے شعری لوازمات و حسن کاری سے مربوط نظم کم ہی دیکھنے کو ملے گی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے دونوں نظموں کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

کلیجے چھلنی نوک خار سے معصوم کلیوں کے
دریدہ جابجا پھولوں کے داماں ہم نہ بھولیں گے
ستم کے گھاٹ پر روشن چتائیں مہ جبینوں کی
ہوس کی سیج پر خواب خوباں ہم نہ بھولیں گے
نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں نہ جانے کس کو تکتی تھیں
وہ پتھرائی ہوئی چشم غزالاں ہم نہ بھولیں گے
سمٹ آئے تھے گوشوں میں فضائے بے کراں والے
نگہباں ساختہ آزاد زنداں ہم نہ بھولیں گے
خود اپنے شور میں مدفون مجبوروں کی فریادیں
تغافل ہائے اہل اختیاراں ہم نہ بھولیں گے
(ہم نہ بھولیں گے)

رات پٹرول کی آگ سے شہر میں یوں چراغاں ہوا
کانپ کر بجھ گئیں دل کے روشن جھروکوں کی سب بتیاں
بے اماں خلق کرفیو زدہ روز و شب کے اندھیرے میں گم
اپنی گردن میں ڈالے ہوئے اپنے کتبات کی تختیاں
وردیاں بھی لکھ رہی تھیں لہو سے مرے سانحہ قتل کا
اک طرف حملہ آور آستین اک طرف پاسبان وردیاں
(بارشیں خون کی تیز ہیں)

اس ضمن میں منظر شہاب کی نظم "ماتم ذکی انور" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ذکی انور سے منظر شہاب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ جب وہ کریم سٹی کالج جمشید پور کے پرنسپل کے ... فائز ہوئے تو ذکی انور

ان کے شریک کار بن گئے۔ کیونکہ موصوف اس کالج کے شعبۂ
اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ایک عالم
جانتا ہے کہ ذکی انور سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ سیاسی
طور پر وہ گاندھی جی وادی تھے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے
حامی تھے۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اپریل میں رام نومی کے تیوہار
کے موقع سے جب فضا کشیدہ ہو گئی اور ہندو مسلم اتحاد
کو قائم رکھنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو ذکی انور
نے چند رفقا جن میں ہندو حضرات بھی شامل تھے ان کے
تعاون سے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ فرقہ پرستوں
کے خلاف یہ ایک پرامن احتجاج تھا۔

مسلمانوں پر اس بھوک ہڑتال کا اچھا اثر نہیں
پڑا۔ افواہ پھیلادی گئی کہ ذکی انور نے ہندوؤں کی
خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کا ڈھونگ
رچایا ہے بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ ذکی انور ہندوؤں کے ہاتھوں
بک گئے ہیں اور مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کے لئے فریب
کا جال بنایا گیا ہے۔ مسلم فرقہ پرستوں نے بھوک ہڑتال کے
خلاف اتنا مذموم پروپگنڈا کیا کہ پرجوش نوجوانوں
کے ایک گروہ نے بھوک ہڑتال کے خلاف جارحانہ رُخ
اختیار کر لیا اور تقریباً ایک بجے رات میں شرپسندوں
نے توڑ پھوڑ اور مار پیٹ شروع کر دی۔ کرسی ٹیبل اور
دوسرے فرنیچر لوالٹ پلٹ دیا۔ تاثرات کے قلمبندی کے
لئے جو رجسٹر رکھا گیا تھا اسے پارہ پارہ کر دیا۔ گالیوں اور
زدوکوب کے ساتھ ساتھ بدترین نتائج کی دھمکی بھی دی
گئی۔ بھوک ہڑتال کا شیرازہ بکھر گیا۔ ان حادثات نے ذکی
انور کو سخت صدمہ پہنچایا۔ وہ سخت ذہنی اور اعصابی
تشنج میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں فرقہ پرست ہندوؤں اور
فرقہ پرست مسلمانوں دونوں میں ایک سکّے کے دو
رخ نظر آنے لگے اور وہ اپنے ذاتی مکان میں جو ہندو
کے علاقہ میں تھا مقید ہو گئے۔ اس یقین کے ساتھ
ان کے پڑوسی جن سے کئی برسوں سے ارتباط تھا ا
کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کریں گے مگر وا حسرتا!

بدن پہ زخم کے نقش و نگار تھے ایسے
پڑوسیوں نے محبت سے جن کو کاڑھا تھا

تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ مسلمان دوست جنہوں نے
ہڑتال کی حامی بھری تھی اور تادم آخر رفاقت کا وعدہ کیا
جان کے خوف سے گوشہ نشیں ہو گئے اور ذکی انور کو جھلسا
دھوپ میں تنہا چھوڑ دیا۔

اداس چاند کی چھاؤں میں یار ساتھ رہے
وہ آفتاب کی آندھی میں برگ تنہا تھا

ذکی انور کو قتل کر دیا گیا یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس
تمام انسان دوست اور غیر متعصب دانشوروں
توجہ ماتم کیا۔ ذکی انور کو موت کی سزا کیوں دی گئی
آخر اس کا کیا قصور تھا؟ منظر شہاب کی زبان میں سنئے

وہ سر بریدہ تھا اس کا قصور اتنا تھا
اندھیری رات میں مشعل وہ لے کے نکلا تھا

نظم کا آخری شعر جس سے ذکی انور کے غیر متعصب مزا
اور ان کے فرقہ پرست مخالفین کے تیور کی بھرپور عکا
ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بس اتنی بات تھی جس پر خفا تھا دہر کہ وہ
کلس کے شنکھ میں گنبد کا لحن بھرتا تھا

منظر شہاب نے ایک مخلص ترقی پسند شاعر کی طرح ہم
فرقہ پرستی کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ان کی شاعری کا
ایک معتدبہ حصہ ملکی سالمیت اور قومی ہم آہنگی سے
عبارت ہے۔ ہندی بچوں کا قومی ترانہ، دو ملک دو کیا

اے میرے پیارے وطن ایسی نظمیں ہیں جن میں قومیت اور وطن کی سالمیت کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ فرقہ پرستی کے خلاف منظر شہاب کے قلمی جدو جہد پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ چلتے چلتے مزید دو تین اشعار نقل کرنا چاہتا ہوں۔

اے دوست انتقام کے شعلے بجھا کے دیکھ
کس کے لہو سے ہاتھ ہیں کس کے رنگے ہوئے

سورج کہ چاند دونوں کے آئینے شکستہ
پھر بھی مزاج سنگ برہم نہیں بدلتا

گر یوں ہی آگ دامن سے لپٹی رہی تو جلا ڈالے گی
حسن گلرنگ کا پیرہن عشق گلنار کی دھجیاں

منظر شہاب کی شاعری کا اسلوبیاتی مطالعہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ سر دست، اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں شعری لوازمات کا بے حد پاس رکھا ہے۔ موضوعات کے قدو قامت کے اعتبار سے انہیں الفاظ کا ملبوس بخشا ہے اور ہر عہد میں طرز اظہار کے عصری تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ ان کے شعری سفر میں مسلسل تغیر کا عمل جاری رہا ہے۔ انہوں نے ذہن کا دریچہ کھلا رکھا ہے۔ جدید ادب کے نت نئے علائم، تمثیلات اور ڈکشن کو لبیک کہا ہے۔ درج ذیل اشعار ان کے ادبی نظریات کی صاف اور خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

مقلوب ہو گر شاہد معنی کی تجلی
الفاظ کی صد رنگ قبا چاہئے یارو

شاداب نئی رت سے ہے گلزار ادب بھی
پھولوں کو تر و تازہ ہوا چاہئے یارو

قابل ستائش امر یہ ہے کہ منظر شہاب نے اپنے ادبی نظریہ سے ہمیشہ وفا کی ہے اور انہیں خلوص کے ساتھ اپنی تخلیقات میں برتا ہے۔ انہوں نے آزاد قطعات کی شکل میں اردو شاعری کو گراں بہا تحفہ عطا کیا ہے۔

(بقیہ در خشونت سنگھ)

پر پڑی۔ اس کالم میں وہ قرآن شریف کے سولہویں پارہ کی تیسری رکوع یعنی سورہ کہف کی آخری آیات کی ادبی عظمت کا اعتراف نہایت سرشاری کے انداز میں فرماتے نظر آئے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا○

ترجمہ:۔ (اے محمد) کہہ دو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے بیان کے لئے روشنائی بن جائے تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ویسا ہی سمندر مدد کے لئے ہم پھیر لے آئیں۔

اب آخر میں PROPHET (بقول خوشونت سنگھ) علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ اپنے قلم دراز دستی کو ختم کرتا ہوں ؎

ہر کسی نگہے دارد، ہر کسی سخنے دارد
در بزم تو می خیزد افسانہ ز افسانہ

محمد خالد عابدی

عنوان چشتی اور تنقید نامہ

پروفیسر عنوان چشتی کا تازہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ تنقید نامہ کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً ریڈیو سے TALKS کی شکل میں نشر ہوتے رہے ہیں۔ عنوان چشتی لائق ستائش د مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنے گمبھیر مقالات کے ساتھ ریڈیو تقاریر کو بھی مطبوعہ شکل میں محفوظ کر دیا ہے۔ ان TALKS کی نوعیت زیادہ تر تنقیدی ہے۔ اور یہی عنوان چشتی کا موضوع و مقصد بھی ہے۔ "تنقید نامہ" مقالات اور ریڈیو تقاریر کا مجموعہ ہے۔ ریڈیو تقاریر کتاب کے آخر میں ہیں۔

"تنقید نامہ" کا پہلا مضمون "انسانیت بحران کی زد میں" ایک بھرپور نفسیاتی تنقیدی محاسبہ د تجزیہ ہے جس میں اشرف المخلوقات حضرت انسان کی ہمہ قسم کی ترقیات، جہد اور اس نے جو تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، تاریخی، جغرافیائی اور علمی و ادبی سفر کے ساتھ سائنسی اور ایٹمی توانائی میں جو فتوحات حاصل کی ہیں اور اپنے تفاخر پر وہ پھولا نہیں سماتا ہے۔ لیکن اس ارتقائی طویل سفر میں اس کے ساتھ حسد، قتل و غارت گری اور مختلف النوع عصبیتیں بھی ہیں جس میں بالخصوص فرقہ وارانہ اور لسانی عصبیت اس درجہ منافرت پیدا کر رہی ہے کہ انسانیت وجود پر شرمسار و پشیمان ہے۔ عنوان چشتی خواہاں ہے کہ ہمارا آج کا معاشرہ ماضی کی صحت مند اقدار کو اپنے سامنے رکھے تو وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ انسانیت کے بحران کا المیہ عالمی سطح پر ہے لیکن ہمارے ملک ہندوستان میں امن و آشتی کی آج زیادہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہم نے اپنی شرافت کے نعرے، فلک شگاف لگائے ہیں۔ لیکن ہم

نے سیکولرازم کا بھی قتل کیا ہے۔ ہمارے پرچم پر شہیدوں کے خون کے چھینٹے ہیں۔ ان ہی احساسات کا احاطہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

"تنقید نامہ" کا دوسرا مضمون خالص ادبی نوعیت کا ہے۔ موضوع ہے "مرزا غالب" اصلاح سخن" اصلاح شعر کو عملی تنقید کا نام دیا گیا ہے۔ اور اس تنقید میں غالب کا تنقیدی شعور اپنے معاصر میں بھی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مرزا غالب بذات خود ایک اچھے اور مقبول شاعر ضرور تھے لیکن وہ باقاعدہ استاد شاعر کے مرتبے کو نہیں پہنچتے تھے اور نہ یہ ان کی خواہش تھی۔ وہ اپنے انداز بیان میں مست تھے۔ تاہم عنوان چشتی نے غالب کے یہاں سے وہ تنقیدی اشارے اور نکات تلاش کئے ہیں اور ان پر مناسب بحث کر کے ان کی حیثیت متعین کی ہے۔ نیز تنقید کے مروجہ اور بنے ٹکے اصول وقواعد سے ہٹ کر بھی اس کے باطن میں جھانک کر نئے گوشے بھی تلاش کئے ہیں۔

کتاب "تنقید نامہ" کی تیسری پیش کش "مومن، پیکر تراشی" ہے۔ مومن خاں مومن، ذوق، غالب، داغ کے ہم عصر شعراء میں تھے۔ وہ ان معاصرین میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ غالب نے مومن کے ایک شعر کو لے کر (تقریباً) اپنا مکمل دیوان دے کر شہرت دوام نہیں دی ہے۔ بلکہ مومن اپنی شاعری سے اردو ادب میں زندہ ہیں۔ مومن مزاجاً حسن پرست واقع ہوئے تھے اور وہ خود بھی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے جو واقعات منسوب کئے جاتے ہیں ان سے بحث نہ کرتے ہوئے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ مومن کے یہاں پیکر تراشی، داغ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہونا چاہئے تھی۔ مومن کے یہاں جو پیکر تراشی کے نمونے ملتے ہیں ان کے باب میں عنوان چشتی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "مومن کی شاعری میں اعلیٰ درجے کی پیکر تراشی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ان کی بیشتر پیکریت آرائشی انداز کی ہے" (ص ۴۴) بہر حال عنوان چشتی لائق ستائش ہیں کہ انہوں نے مومن کو گھسے پٹے موضوع کے تحت قلمبند نہیں کیا بلکہ ایک ایسے اچھوتے موضوں کو تلاش کیا ہے جس سے مومن اور مومن کی شاعری کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

مولوی عبدالحق۔ "تنقید نگاری" کتاب کا چوتھا مضمون ہے۔ مولوی عبدالحق" مقدمے بازہ مشہور ہیں۔ ان کے تنقیدی سرمایہ میں "فن کار کی شخصیت، اس کے ماحول اور عہد نیز ذریعہ اظہار کو خاصی اہمیت حاصل ہے" (ص ٤٠) اور اس طرح ان کا تنقیدی رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے وابستہ نظر آتا ہے۔ عنوان چشتی نے مولوی عبدالحق کے یہاں نفسیاتی اور سماجی تنقید کی سعی کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ جب کہ مولوی عبدالحق اپنی تنقیدی تحریروں میں زبان وبیان کی صحت ولطافت پر مصر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں عروضی تنقید کا فقدان اور "شعور آہنگ" کو قبول کرنے کا احساس پایا جاتا ہے۔ نیز نئے اسالیب کو پسند بھی کیا ہے۔ عنوان چشتی نے مولوی عبدالحق کے تنقیدی رجحان سے کما حقہ واقف کرایا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنا مطمع نظر بھی واضح کیا ہے۔

پانچواں مضمون "حسن نظامی" شخصیت

اور فکر و فن" کے تحت ہے۔ خواجہ حسن نظامی اردو کے ایک صاحب طرز ادیب کہے جاتے ہیں۔ وہ زبردست مذہبی شخص ہونے کے ساتھ ساتھ تصوف کے رنگ میں بھی رنگے ہوئے تھے۔ وہ جہاں "محفل سماع" کے قائل تھے وہاں گرافون سے موسیقی کے ریکارڈ اور تھیٹر و سینما سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہوں نے متعدد، قلمی چہرے، لکھے ہیں شخصیات کے انتخاب میں تنوع بھی ہے اور بظاہر بے معنی سے موضوعات میں قلم کا وہ جوہر بھی دیکھا یا ہے کہ انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی تحریر کی دو خصوصیات بالعموم ابھر کر سامنے آتی ہیں کہ ان کے یہاں وحدت الوجود اور اسرار معرفت رنگ مجاز میں ہے۔ ان نکات پہ عنوان چشتی نے بہت خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے۔ جس سے مضمون کی وقعت بڑھ گئی ہے۔

مسعود حسین خاں اردو ادب میں بالخصوص لسانیات اور اردو کی تاریخ جیسے موضوعات میں انفرادی شان رکھتے ہیں۔ عنوان چشتی نے "مسعود حسین خاں، مرقع نگاری" عنوان دے کر "ورود مسعود" کی روشنی میں کتاب کے موضوع اور مسعود حسین خاں کے علم و ادب کے منور گوشوں سے اپنی بات کہی ہے۔ مرقع نگار کی حیثیت سے بھی مسعود حسین خاں کامیاب نظر آتے ہیں۔ عنوان چشتی نے اپنے مضمون میں مسعود حسین خاں کا، مرقع نگاری کا اور "ورود مسعود" کا بہتر طور پر تانا بانا تیار کیا ہے کہ اصل کتاب دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا ہے۔

"ہم عصر اردو غزل۔ دہلی میں" اور "جدید اردو غزل، مغربی بنگال میں" یہ دونوں مضمون تقریباً ایک ہی مزاج کے ہیں۔ دہلی اور بنگال کی تہذیب و ثقافت میں بہت فرق ہے۔ جغرافیائی اور معاشرتی پیمانوں سے یہاں کی ہم عصر اردو غزل اور جدید غزل کی پیمائش کی گئی ہے۔ ان مضمونوں کے تجزیے پر تحریکات اور رجحان پر زیادہ زور صرف کیا گیا ہے جب کہ شعری نمونے خاصے اچھے انتخاب کئے ہیں۔ تاہم شہر کے مزاج کی عکاسی زیادہ نہیں ہو سکی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "دہلی کے شاعروں نے ایک طرف کلاسیکی زندہ اور پائندہ روایات کو برقرار رکھا اور دوسری طرف ادب و شعر کے نئے میلانات اور رجحانات کو اپنا لیا ہے۔" (ص ۸۹) اور مغربی بنگال کے بارے میں یہ امر اہمیت کا حامل ہے کہ "مغربی بنگال میں ترقی پسند احتجاج اور نو کلاسیکی دبستان کے شانہ بشانہ جدیدیت کا جو رجحان بھی پنپ رہا ہے وہ اس جدیدیت سے مختلف ہے۔ جو ترسیل کی ناکامی اور اظہار کے وسیلوں کی ناتمامی کا ماتم کرتی اور ژولیدہ بیانی پہ ناز کرتی ہے" (ص ۹۴)

"ابوالکلام آزاد:۔ صوفیانہ رجحان" مولانا ابوالکلام آزاد کا تعارف مذہبی، دینی اور علمی ادبی کے ساتھ ساتھ بہترین سیاسی کے طور پر ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان کے صوفیانہ رجحان پہ بہت کم لکھا گیا ہے۔ عنوان چشتی نے ان کی متصوفانہ فکر پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ اور مولانا آزاد کی مختلف تحریروں سے ایسے حقائق تلاش کئے ہیں جن سے مولانا آزاد کے مزاج میں لچک کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد نے سرمد کی شہادت کو سیاسی قتل قرار دیا ہے۔" انہوں نے اورنگ زیب کی کٹر پالیسی سے بھی اختلاف کرتے ہوئے

سرمد اور دارالشکوہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قومی اتحاد کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔

ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ جہت شخصیت" یہ مضمون قاضی عبدالغفار کی کتاب " آثار ابوالکلام " اور یہ کے مولف قاضی عبدالغفار کے مزاج پرچھا ہے۔ عنوان چشتی نے اس مضمون کے توسط سے یہ بات بھی کہنی چاہی ہے کہ دراصل ہم نے مولانا آزاد کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے کیونکہ قاضی عبدالغفار جب مولانا آزاد کو گنبد بے در اور DEFFECULT PE-RSONALITY - سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اپنے مطالعے کو نفسیاتی مطالعہ کہتے ہیں۔ جب کہ عنوان چشتی کے تجزیے میں وہ اسباب بھی دیئے ہیں جن سے ہم مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے مزاج کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔

ابوالکلام آزاد: نظریہ اتحاد" اس مضمون میں مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی مذہبی و دینی بصیرت کی روشنی میں قومی اتحاد، قومی یکجہتی اور قومی ایکتا کا جذبہ دکھایا گیا ہے۔ مولانا آزاد زبردست قومی اتحاد کے علمبردار تھے۔ ان کی تقاریر اور تحریریں اس امر کا ثبوت ہیں کہ ان کے مزاج اور طبیعت میں بھی کسی طرح کا عصبیت یا بغض نہیں تھا۔ عنوان چشتی نے مولانا آزاد کے یہاں سے وہ جوہر خوب تلاش کیا ہے کہ " اگر مجھے آزادی اور اتحاد میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑے تو میں اتحاد کو قبول کروں گا اور آزادی سے دست بردار ہو جاؤں گا" (ص ۱۲۰)

" مرزا مظہر جان جاناں" کی شخصیت اور فن پر ایک مختصر سا مضمون ہے۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں نقشبندی طریقہ کار کے قائل تھے وہ غیر مسلموں کو بت پرست تسلیم نہیں کرتے بلکہ انہیں "خدا پرست" تسلیم کرتے تھے۔ چاروں وید کو آسمانی کتاب اور رام چندر اور کرشن جی کو اوتار یا پیغمبر خیال کرتے تھے۔ وہ تناسخ یعنی آواگون پر بھی یقین رکھتے تھے۔ اردو میں ان کا شعری سرمایہ کم پایا جاتا ہے۔ عنوان چشتی کے نمونتہ چند اشعار منتخب پیش کئے ہیں۔ عنوان چشتی کے اس مضمون سے مرزا مظہر جان جاناں کا بہت اچھی طرح تعارف ہو جاتا ہے۔

" سراج اورنگ آبادی" یہ مضمون بھی مختصر ترین ہے۔ جس میں ان کو صرف شاعر کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے۔ اور ان کی شاعری کا عروضی مطالعہ بھی کیا ہے۔

" شاہ نصیر" اس استاد الاساتذہ کا نام ہے جس نے شیخ ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، مومن خاں مومن اور الہی بخش خاں معروف وغیرہ کی ذہنی فنی تربیت کی تھی۔ عنوان چشتی نے اپنی کتاب تنقید نامہ میں شاہ نصیر پر دو مختصر مگر اہم مضمون لکھے ہیں۔ ان مضمونوں میں انہوں نے شاہ نصیر کی استادی ان کی قادر الکلامی، زبان دانی، عروضی اور فنی مہارت کے آئینہ میں تعارف و تبصرہ پیش کیا ہے۔ جگہ جگہ شاہ نصیر کے بطور نمونہ اشعار بھی دیئے ہیں جس سے مضمون زیادہ وقیع ہو گیا۔

" مرزا غالب" اس مضمون میں غالب کے آٹھ شعروں کی شعروں کی تشریح عروضی تجزیے کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اور یہ اشعار بالعموم وہ اشعار ہیں جن میں غالب کے کچھ پیچیدہ الفاظ ہیں۔

"احسن مارہروی" داغ کے لائق، اچھے شاعر اور نثر نگار۔ ادبی صحافت میں بھی وہ اپنا مقام رکھتے تھے۔ عنوان چشتی نے احسن مارہروی کا مفصل تعارف اور ان کے کارہائے نمایاں کو تحقیق و تنقید اور تجزیئے کی روشنی میں اس طرح پیش کیا ہے کہ احسن مارہروی ایک بلند پایہ شاعر و نثر نگار تسلیم کئے جائیں گے۔

"سنگِ جاں" زاہدہ زیدی کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے تجزیئے میں عنوان چشتی نے محسوس کیا ہے کہ زاہدہ زیدی کی تخلیقی قوت ایک طرف وجدان سے استفادہ کرتی ہے۔ داخلیت سے کسب نور کرتی ہے۔ واردات ذہنی اور کیفیات باطنی سے فروغ پاتی ہے" (ص ۱۴۸) ان کی قوت تخلیق کا دوسرا سرا شعور سے وابستہ ہے۔ یہاں جذبات سے زیادہ ذہانت کی حکمرانی ہے۔ وجدان پر شعور کو، تاثر پر تعقل کو اور داخلیت پر خارجیت کو فوقیت حاصل ہے" (ص ۱۵۰) عنوان چشتی نے "سنگِ جاں" کی غزلوں کے مقابلے میں کسی قدر نظموں پر اپنا اظہار خیال کیا ہے۔ اور شاعرہ کو مزید فکر کی دعوت دی ہے، جو مفید بھی ہے اور ضروری بھی۔

"تنقید نامہ" کا آخری مضمون احمد صغیر صدیقی کی کتاب "اطراف" پر ہے جو کہ شعری مجموعہ ہے۔ عنوان چشتی بھی ہمارے اخبار و رسائل کے مدیران کی طرح شعری مجموعوں کے سیلاب سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ "یہ واقعہ ہی ہے کہ اردو میں شعری مجموعے کثرت سے بلکہ حشرات الارض کی طرح ابل رہے ہیں۔ عنوان چشتی نے "اطراف" کے شاعر احمد صغیر صدیقی کے یہاں کچھ خوبیاں (تخلیقی اور جمالیاتی پیکر تراشی) تو تلاش کی ہیں۔ لیکن بعض ایسے معائب سخن بھی ثابت کئے ہیں۔ جو کم از کم کتاب کی اشاعت کے وقت دیکھ لئے ہوتے۔ عنوان چشتی نے نئے لکھنے والوں کو توجہ سے پڑھا ہے۔ اور انہیں مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔

دراصل "تنقید نامہ" کی آخری پیش کش وہ سوانحی خاکہ ہے جو جناب افتخار الحسن معروف بہ عنوان چشتی کا مفصل ترین تعارف ہے۔ یہ تعارف پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔

مجموعی طور پر "تنقید نامہ" ہماری تنقیدی تحریروں میں ایک ایسا مفید اضافہ ہے جس میں تنقید، تجزیہ اور تعارف و تبصرہ کے ایسے نمونہ جات جمع ہیں جو آئندہ اردو زبان و ادب کی تاریخ اور جائزہ لیتے وقت معاون ثابت ہوں گے۔

کتاب تنقید نامہ ہر اعتبار سے جاذب نظر ہے۔ کتابت و طباعت معیاری ہے۔ کتابت کی غلطیوں سے بھی کتاب پاک ہے۔ گرد پوش اچھا ہے۔ گرد پوش پر تعارفی عبارت معلوماتی ہے۔ کتاب پانچ سو کی تعداد میں اکتوبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ نفیس سفید کاغذ۔ ۱۶۰ صفحات۔ آفسیٹ پر شائع ہوئی ہے۔ قیمت مناسب ہے اسّی روپے۔

(بقیہ :- ناشاد اورنگ آبادی ...)

خوابوں، آرزوؤں، محرومیوں اور حسرتوں کا آئینہ دار ہے۔ ناشاد اورنگ آبادی نے اپنے شعری سفر کے متعلق کتنے سادہ لیکن موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

میرا بس جو بیس برس کا شعر و ادب سے رشتہ ہے
کیسے کہہ دوں میرا بھی تشکیل ادب میں حصہ ہے

تاج پیامی

پریم چند کا ناول "بیوہ"

ایک تنقیدی جائزہ

پریم چند (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء) سے پہلے اور پریم چند کے زمانہ میں بھی تخیل (imagination) پر مبنی رومانی ناول لکھے جا رہے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم، علی محمود، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ اپنی کہانیوں میں روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے حقائق کو پیش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی دنیا آپ تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے برعکس پریم چند اپنے افسانوں اور ناولوں میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں — وہ کہانیوں میں ذاتی تجربہ کو اہمیت دیتے ہیں جن کے کردار بھی حقیقی ہوں۔ پریم چند نے ہندوستانی سماج میں مختلف قسم کے مسائل پائے اور خامیاں دیکھیں۔ انہیں ناول اور افسانوں کے ذریعہ پیش کیا۔ ان پر سخت گرفت کی اور انہیں دور کرنے کے طریقے بتلائے۔ لیکن یہ سب انہوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں کیا۔ انہوں نے اخلاق کو فن پر قربان نہیں کیا۔

Lord David Cecil ناول نگار کے مسئلہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے۔

" LIFE IS CHAONI , ART IS ORDERLY , THE NOVELIST 'PROBLEM IS TO EVOKE AN ORDERLY CONYOSI-TION WHICH IS ALSO A CONVIN-CING PICTURE OF LIFE."

پریم چند کے یہاں جامع تحریر کے ساتھ زندگی کی ایسی تصویر ملتی ہے جس پر یقین کیا جائے۔ بیوہ میں پیش کردہ زندگی بھی حقیقت سے قریب ہے۔ بیوہ کا مسئلہ ہندوستانی معاشرہ کے لئے ناسور ہے۔ پریم چند جیسا حقیقت پسند ناول نگار یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے کہ اس کا حل پیش کیا جائے۔

F.R. LEOVIS اپنی شہرۂ آفاق کتاب THE GREAT TRADITION میں تحریر کرتا ہے۔
"THE MORAL PRCOCCYSATIONS. CHARACLERISE NOVELIST IS PECULIAR INTREST IN LIFE."
یہاں MORAL PRCOCCUPATIONS سے مراد زندگی کے وہ مسائل ہیں جن سے ایک ناول نگار دلچسپی رکھتا ہے۔ اور انہیں وہ ناول کی کہانی اور اس کے کرداروں کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ بیوہ ناول میں بھی پریم چند بیوہ کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف بیوہ کو ستی کے روپ میں جلتے ہوئے بھی دیکھتے تھے دوسری طرف اگر وہ ستی نہ ہوئی تو اسے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔

پریم چند نے بیوہ ناول میں معاشرہ کے اہم مسئلہ "بیوہ" کو پیش کیا ہے۔ کیا بیوہ اپنے مردہ شوہر کے ساتھ ستی ہو جائے؟ یعنی اس کی لاش کے ساتھ خود جل کر مر جائے؟ یا کسی دوسرے کی دست نگر بن کر زندگی کے دن گزارے۔ بیوہ ناول میں بیوہ مسئلہ کا حل پریم چند نے بیوہ کے لئے آشرم قائم کرکے نکالا ہے۔ آشرم میں ایک جوان بیوہ کو کھانا، کپڑا اور مکان تو مل جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ بھی وہ کچھ اور چاہتی ہے۔ پریم چند آزاد خیال اور "ودھوا ویواہ" کے حامی ہونے کے باوجود اپنے ناول "بیوہ" میں بیوہ کی شادی نہ کرا سکے۔ انہوں نے بیوہ کو بھگتی کا راستہ دکھلایا اور آشرم میں مندر بنوا دیا۔

لیکن کہتے ہیں خود پریم چند نے ایک بیوہ سے شادی کی اور ... [illegible]

مختصر میں بیوہ کی کہانی اور اس کے پلاٹ کو سمجھ لینا چاہئے۔

عورت روتی — کہانی ہے
عورت اپنے شوہر کے مرنے پر روتی — پلاٹ ہے۔
پلاٹ یا ماجرا نگاری واقعات کے منطقی ربط و تسلسل کو کہتے ہیں۔ جس کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے اور کردار کا عمل (Action) وقوع پذیر ہوتا ہے۔

بیوہ کی کہانی اور پلاٹ — لالہ بدری پرشاد شہر کے ایک دولت مند اور مشہور شخص ہیں۔ ان کی بیوی کا نام دیوکی ہے اور لڑکے کا نام کملا پرشاد ہے۔ اس کی شادی سومترا نام کی عورت سے ہو چکی ہے۔ لالہ بدری پرشاد کی بڑی لڑکی کی شادی امرت رائے وکیل سے ہوئی تھی لیکن بیوی کے انتقال کے بعد ان کی نسبت لالہ بدری پرشاد کی دوسری لڑکی پریما سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ کاشی کے آریہ مندر میں پنڈت امرناتھ کی تقریر سن کر امرت رائے کے خیال میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور وہ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ پریما کی شادی امرت رائے کے دوست پروفیسر دان ناتھ سے ہو جاتی ہے۔ لالہ بدری پرشاد کے ہمسایہ میں پورنا نام کی ایک عورت اپنے شوہر پنڈت بسنت کمار کے ساتھ رہتی ہے۔ بسنت کمار کا اچانک پانی میں ڈوب جانے کے سبب انتقال ہو جاتا ہے۔ لالہ بدری پرشاد پنڈت بسنت کمار کی بیوہ پورنا کو بلوا کر اپنے گھر رکھتے ہیں۔ کملا پرشاد کی بیوی سومترا پہلے تو پورنا کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے لیکن کملا پرشاد کو پورنا کی طرف مائل دیکھ کر خفگی کا اظہار کرتی ہے اور پورنا سے کہتی ہے وہ شخص تمہیں دھوکا دے گا۔ کملا پرشاد ... [illegible]

میں لے جاتا ہے اور زبردستی کرتا ہے۔ پورنا اسے کرسی
سے گرا کر بھاگ جاتی ہے۔ ایک بوڑھا شخص پورنا کو امرت
رائے کے بیوی آشرم میں پہنچا دیتا ہے۔

بیوہ کہانی کی بنیاد بسنت کمار کی موت کے سانحہ
سازی پر قائم ہے۔ بسنت کمار کی موت کا ماجرا حقیقی نہیں
مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہانے جاتا ہے۔ وہ کنول کا
پھول توڑنے کے لئے تیرتا ہوا منجدھار میں پہنچ جاتا ہے اور
ڈوب جاتا ہے۔ کنول توڑنے کی بازی تو نہیں تھی کہ اس
نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ زندگی میں اس قسم کے واقعات
کا امکان تو ہے لیکن ادب میں واقعہ کو ہو بہو پیش نہیں
کیا جاتا بلکہ جیسا ہونا چاہئے اس طرح پیش کیا جاتا ہے۔

بیوہ ناول میں پریم چند "ودھوا ویواہ" پر زور
دیتے ہیں۔ کم از کم رنڈوے کنواریوں سے شادی نہ کرکے
بیواؤں سے شادی کریں۔ امرت رائے جو خود ہی ایک
رنڈوا ہے "ودھوا ویواہ" کا حامی ہے لیکن وہ بیوہ عورت
"پورنا" سے شادی نہیں کرتا لیکن بیواؤں کے لئے آشرم
ضرور بنوا دیتا ہے۔ پریم چند جس زمانے میں ناول لکھ رہے
تھے اس وقت "ودھوا ویواہ" کا چرچا بچہ کو دینا جرأت
کی بات تھی اس لئے وہ ہمت نہ کرسکے کہ اپنے ناول میں واقعی
"ودھوا ویواہ" کرا دیں۔ بہرکیف، پریم چند نے بیوہ کے مسئلہ
کو جس طرح ناول میں پیش کیا ہے وہ دعوت غور و فکر دیتا
ہے۔ آج بھی بیوہ شوہر کی لاش کے ساتھ جلائی جاتی ہے
یا آشرم میں قیدیوں کی طرح زندگی بسر کر رہی ہے۔ جوان
بیواؤں کی عزت و آبرو وہاں بھی سلامت نہیں۔ اس اہم
مسئلہ کا حل ہونا چاہئے۔ بیوہ، ایک بے سہارا عورت،
کی پرورش کون کرے گا؟ وہ اپنی آبرو کو قائم رکھتے ہوئے
ایک باعزت زندگی کیسے گزارے؟ ان سوالوں کا حقیقی حل

"ودھوا ویواہ" ہے جس کا اشارہ پریم چند نے "بیوہ"
ناول میں کیا ہے۔

بیوہ ناول میں بیوہ کے بنیادی مسئلہ کے علاوہ
بھی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہے۔ پریم چند
دیہاتی زندگی اور وہاں کے مسائل، ناول اور افسانوں
میں پیش کرنے کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن انہیں شہری زندگی
پیش کرنے پر بھی دست گاہ حاصل ہے۔ "میدان عمل"
"ارملا" وغیرہ کے علاوہ بیوہ میں بھی شہری زندگی کے اقدام و
عمل نظر آتے ہیں۔ شہر کے لوگ عموماً پڑھے لکھے ہوتے
ہیں ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ ان کی نفسیات،
اقدام و عمل کی جھلکیاں بیوہ ناول میں نمایاں ہیں۔

پریم چند کو جس طرح کہانی کہنے میں مہارت
حاصل ہے اسی طرح وہ کردار سازی میں بھی مہارت
رکھتے ہیں۔ بیوہ ناول میں جتنے کردار ہیں وہ سب
الگ الگ فطرت اور نفسیات کے حامل ہیں۔ مردوں میں
لالہ بدری پرشاد، کملا پرشاد امرت رائے اور پروفیسر دان
ناتھ اہم ہیں۔ لالہ بدری پرشاد دولت مند، غیرت مند
نیک دل انسان ہیں لیکن کملا پرشاد کی غلط حرکت
پر سخت گیر بھی بن جاتے ہیں۔ کملا پرشاد کم پڑھا لکھا
کنجوس، بدقماش اور جعلساز ہے۔ امرت رائے اور
پروفیسر دان ناتھ اہم کردار ہیں۔ یہی دونوں بیوہ کہانی
کے روح رواں ہیں۔ امرت رائے دولت مند، تعلیم یافتہ
اور پیشے سے وکیل ہیں لیکن انہیں اس پیشہ سے نفرت
ہے۔ بنائے ہوئے مقدمے بھول کر بھی نہیں لیتے تھے لیکن
جو مقدمہ لیتے اس کے لئے جان لڑا دیتے تھے۔ امرت
رائے اصول پرور آدمی تھے۔ بڑے دھن کے پکے تھے۔
انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا

پریما سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ "ودھوا ویواہ" کے حامی ہو گئے۔ اس کے لئے انہوں نے شہر میں جا بجا تقریریں کیں، فضا سازگار کی۔ اور بیوہ آشرم کے لئے چندہ جمع کئے اور اپنی ساری دولت لگا کر اسے قائم کرتے ہی چھوڑا۔

دوسری طرف پروفیسر دان ناتھ ہیں جو بقول پریم چند "سہل پسند آدمی تھے۔ کسی اصول کے لئے انہوں نے تکلیف اٹھانا سیکھا ہی نہیں تھا"۔ لیکن جب پریما سے ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے اپنے دوست امرت رائے کو نیچا دکھانے کے لئے "ودھوا ویواہ" کے خلاف اور ہندو دھرم کی حمایت میں زبردست تقریریں کی اور کملا پرشاد سے مل کر کوششیں کیں کہ امرت رائے کو چندہ نہ ملے۔ اس درمیان کملا پرشاد "پورنا" جو بیوہ ہو چکی تھی اس کی عزت پر حملہ کرتا ہے پورنا اسے گھائل کر دیتی ہے اور امرت رائے کے آشرم میں پہنچ جاتی ہے۔ اس واقعہ سے پروفیسر دان ناتھ کی بڑی بدنامی ہوتی ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ کملا پرشاد تو جاہل تھا۔ پروفیسر دان ناتھ کے ایما پر ہی امرت رائے کے خلاف ہو گیا تھا۔ کالج کے طلبا بھی پروفیسر دان ناتھ پر آوازے کستے اور سیٹیاں بجاتے۔ آخر میں دان ناتھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ امرت رائے سے مل کر دوستی کی دوبارہ تجدید کرتے ہیں۔

ایک اہم بات پریم چند نے ان دونوں کرداروں کی پیش کش میں یہ رکھی ہے کہ وہ امرت رائے کے بارہ میں خود سب کچھ بتلا دیتے ہیں کسی واقعہ یا کسی بات کا ردعمل اس کی نفسیات پر کیا ہوتا ہے اس کا اظہار نہیں کرتے کا جو ردعمل ہوتا ہے اس کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً دان ناتھ اپنی بیوی پریما سے امرت رائے کے چندہ مانگنے پر ان کی برائی کرتے ہیں۔ اس پر پریما رائے کی حمایت کرتی ہے اس بات کا دان ناتھ پر ردعمل ملاحظہ ہو۔

" دان ناتھ سناٹے میں آ گئے۔ ان کے دل نے کہا۔ نکلی نہ وہی بات یہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا۔ اگر پریما کا امرت رائے سے کوئی واسطہ نہ ہوتا اگر پریما کے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو کیا وہ اتنے تیز الفاظ میں ان کی مخالفت کرتی؟ کبھی نہیں۔ اس کی آنکھوں سے تو چنگاریاں نکلنے لگیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ یہ میری کبھی نہیں ہو گی۔ کبھی نہیں"۔ لیکن فوراً ہی پریما نے جب ان کے موافق بات کی تو انہیں اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ دان ناتھ اپنے ہی خیالات کے تضاد سے اندر ہی اندر ٹوٹے پھوٹتے رہتے تھے

عورتوں میں تین کردار اہم ہیں۔ سومترا، کملا پرشاد کی بیوی۔ کملا پرشاد جتنا ہی بڑا کنجوس سومترا اتنی زیادہ شاہ خرچ۔ اس لئے دونوں میں نہیں پٹتی۔ سومترا اپنی ساس اور شوہر کو جلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ اگر وہ چاہتی تو اپنی محبت سے اپنے شوہر کو آوارہ گردی اور سینما کی بری عادت سے روک سکتی تھی لیکن اس کی ضد مانع ہوتی۔ کملا پرشاد جب پورنا کے ہاتھوں مار کھا کر گھر آیا تو اسے صحیح معنوں میں سومترا کی محبت نصیب ہوئی۔ چونکہ وہ بھی اب حقیقتاً سومترا کا ہو کر آیا تھا۔

پورنا، جو بیوہ ہو جاتی ہے، اس کا کردار ایک عام جوان عورت کی طرح ہے، جو کملا پرشاد کے بہکانے

نرمی سے کرتا ہے۔ وہ اس کی اس حرکت سے محظوظ ہوتی ہے وہ اس کے گال پر انگلی بھی پھیرتا ہے اور گردن میں باہیں ڈال کر ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اعتراض نہیں کرتی۔ وہ اسے اپنی لائی ہوئی ساری پہناتا ہے۔ وہ ساری کا آنچل اپنے سر پر ڈال کر خوش ہوتی ہے۔

ایک جوان بیوہ کا جوان مرد کے کمرہ میں رات کے وقت تنہائی میں جانا پورنا کے کردار کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اگر کملا پرشاد باغ کے مکان میں بھی نرمی سے پیش آتا اور اپنی چاپلوسی جاری رکھتا تو پورنا سے لغزش ہو جاتی اور پورنا وہ قدم کبھی نہیں اٹھاتی جو اس نے کملا پرشاد کے زبردستی کرنے پر اٹھایا یعنی وہ اپنے بچاؤ کے لئے کملا پرشاد کو کرسی اٹھا کر مارتی ہے اسے زخمی کرتی ہے اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ راستہ میں اسے ایک بوڑھا شخص ملتا ہے جو اسے امرت رائے کے آشرم میں پہنچا دیتا ہے۔

عورتوں میں پریما کا کردار بہت جاندار ہے۔ وہ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار عورت ہے۔ وہ موقع کی نزاکت کو سمجھتی ہے اور حالات کو اپنے قابو سے باہر نہیں جانے دیتی۔ پروفیسر دان ناتھ سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ لیکن جب اس کی بڑی بہن جو امرت رائے سے بیاہی تھی، مر جاتی ہے تو پریما کی نسبت امرت رائے سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ وہ امرت رائے کو ہی اپنا آدرش سمجھنے لگتی ہے لیکن جب امرت رائے دوبارہ شادی کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے تو اس کی شادی پروفیسر دان ناتھ سے ہو جاتی ہے۔ اسے تکلیف تو ضرور ہوتی ہے لیکن اس حقیقت سے وہ آگاہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ میں ایک لڑکی کنواری رہ کر زندگی آسانی سے بسر نہیں کر سکتی۔ اسی لئے وہ

پروفیسر دان ناتھ سے شادی کرنے پر خود کو آمادہ کر لیتی ہے۔ وہ دان ناتھ جیسے شکی مزاج شوہر کے ساتھ بھی حسن و خوبی نباہ کرلینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی صائب رائے کو اپنے شوہر کی ناجائز جذبات پر قربان کر دے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ امرت رائے اور دان ناتھ کے حامیوں میں تصادم ہو جانے کا خدشہ ہے تو وہ خود اسٹیج پر پہنچ جاتی ہے اور نہایت عمدہ اور مدلل تقریر کرتی ہے۔ اس کی تقریر سے نہ صرف یہ کہ تصادم ٹل جاتا ہے بلکہ بیوہ کی زبوں حالی اور بیوہ آشرم کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو اس کی تقریر:-

میں آپ کے شہر کے رئیس لالہ بدری پرشاد کی لڑکی ہوں اور اس ناتے سے آپ کی بہن بیٹی ہوں۔ ایشور کے لئے بیٹھ جائیے۔ بہن کو کیا اپنے بھائیوں سے اتنی التجا کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟ یہ جلسہ آج اس لئے کیا گیا ہے کہ آپ سے اس شہر میں ایک ایسا مکان بنانے کے لئے مدد مانگی جائے جہاں ہماری بے کسی و بے یار و مددگار بہنیں اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہوئی آرام سے رہ سکیں۔ کون ایسا محلہ ہے جہاں ایسی دس پانچ بہنیں نہیں دیکھتے؟ کم از کم اس کا اندازہ تو کر ہی سکتے ہیں، وہ جدھر آنکھ اٹھاتی ہیں، ادھر ہی انہیں بھوت کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جوان کی یکسانہ حالت کو اپنی نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیتے۔ ہماری لاکھوں بہنیں اسی طرح صرف زندگی بسر کرنے کے لئے گر جاتی ہیں۔ کیا آپ کو ان پر رحم نہیں آتا؟ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر ان بہنوں کو روکھی سوکھی روٹیوں اور موٹے جھوٹے

کنواری کا بھی سہارا ہے اور وہ آخر وقت تک اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کرتی رہی۔ عورت بہت ہی مجبوری کی حالت میں بد چلن ہوتی ہے۔ اپنی عزت سے زیادہ اسے دنیا کی کسی چیز پر فخر نہیں ہوتا۔ نہ وہ کسی چیز کو اتنی قیمتی نہیں سمجھتی ہے۔ آپ سبھی صاحبوں کی لڑکیاں اور بہنیں ہوں گی۔ کیا ان کے متعلق آپ کا کوئی فرض نہیں ہے؟ آپ لوگوں میں ایسا ایک بھی مرد ہے جو اتنا سنگدل ہو میں یہ نہیں مان سکتی۔ کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اناتھوں کی حفاظت کرنا مذہب کے خلاف ہے یا جو یہ کہتا ہے وہ مذہب کو بدنام کرتا ہے۔ رحم مذہب کی بنیاد ہے۔ میرے بھائی بابو امرت رائے نے ایسا ایک مکان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ اپنی ساری پونجی اس طرح وقف کر چکے ہیں اب وہ اس کام میں آپ کی مدد مانگ رہے ہیں۔ جیسی آدمی کے پاس کچھ ہو اناتھوں کی جائداد [illegible] آج بھکاری بنا کر آپ سے بھیک مانگ رہے ہیں جیب میں کچھ ہو تو اسے بھیک [illegible] سمجھ کر دیجئے بھائی [illegible]

پریما کی اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس نے سامعین کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی کیونکہ ان میں سے کئی ایک بہن یا بیٹی بیوہ تھیں اور انہیں ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی سامعین نہ صرف پریما کی بات سے مسحور ہو گئے بلکہ اسے دل کھول کر چندہ بھی دیا۔

جلسہ برخاست ہوا تو امرت رائے نے پریما سے کہا یہ تم نے کیا غضب کر ڈالا پریما؟ دان ناتھ تمہیں مار ہی ڈالیں گے؟

پریما نے ہنس کر کہا جب ان گنواروں کو منا لیا [illegible]

پریما کی یہ خود اعتمادی حقیقی تھی اور اسی [illegible] اس نے اپنے شوہر دان ناتھ کو منا لیا اور امرت رائے کا ہم نوا بنا دیا۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔

ناول کسی معاشرہ کا ترجمان ہوتا ہے اور معاشرہ کے افراد مختلف فطرت نفسیات اور انداز فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ بیوہ ناول میں جتنے کردار ہیں وہ مختلف فطرت اور رجحان کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں امرت رائے اور پریما کا کردار قابل تعریف ہے۔ بیوہ ناول میں بھی پریم چند نے کردار سازی اور کردار نگاری میں اپنی مہارت اور قدرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان نفسیاتی ناول نگاروں کی طرح کردار کے شعور اور لاشعور کی گتھیوں اور پیچیدگیوں کو ناول کا موضوع نہیں بناتے۔

ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے اور کردار سازی میں مکالموں (Dialogues) کا اہم کام ہوتا ہے۔ مکالموں کے ذریعہ کردار کے ارادے، جذبات اور احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان سے ان کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے بلکہ کردار اور پلاٹ میں تعلق قائم کرتے ہیں۔ مکالمہ کردار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بیوہ ناول میں مکالمہ کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ امرت رائے اور پریما کے مکالموں میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ دان ناتھ کے مکالموں میں طنز کا عنصر نمایاں ہے کملا پرشاد کے مکالموں میں چاپلوسی اور بد قماشی کا اضافہ ہے

(بقیہ: احمد قادری.....)
ایسی کئی اور باتوں سے بھی پورن کماری کے [illegible]
[illegible] بیرا آ ہو نا ضروری ہے اور ان سب باتوں [illegible] کہانی ایک مکمل نہیں ہو پا سکتا — [illegible]

یاور امان (کراچی)

"میں علی حیدر ملک کو نہیں جانتا"

بھائی علی حیدر ملک کی شخصیت نگاری کی ذمہ داری سونپ کر مجھے بڑے اور کڑے امتحان میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو کسی کی شخصی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے۔ یقیناً ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتا ہوگا کیونکہ کافی عرصے تک تو میں یہی سوچتا رہا کہ کہاں سے شروع کروں، کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ پھر یہ کہ پہلے کبھی ایسی چیز لکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس معاملے میں پروفیشنل ہوں کہ فارمولے کے مطابق قلم گھسیٹ دوں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ صاحب ہر شخص کی زندگی میں کچھ آف دی ریکارڈ باتیں بھی ہوتی ہیں، کچھ بشری خامیاں بھی ہوتی ہیں اور [illegible] زمانہ جب کہ لوگ حسد، جلن یا بغض و عداوت میں ان کی یہ خامیاں تلاش کر کے چٹخارے لیتے ہیں تو کیا عجب کہ آف دی ریکارڈ باتوں کے آن دی ریکارڈ آجانے پر کیا ستم ایجاد کر ڈالیں۔

علی حیدر ملک کا ذکر کرتے ہوئے یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ کہیں مجھ پر [illegible] کی طرفداری کا الزام نہ عائد کر دیا جائے لیکن میں سخن فہمی کے لئے طرفداری کو اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ مکمل غیر جانبداری میں منافقت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اور جہاں تک میں انھیں سمجھ پایا ہوں ان کی سرشت میں منافقت نام کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

ملک صاحب کی شخصیت بڑی تہہ دار اور کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ نہ صرف اچھے افسانہ نگار، صحافی اور ٹیچر ہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہیں۔ اور سیاست و سماجی امور میں بھی بڑے سرگرم عمل واقع ہوئے ہیں۔ وہ ایک مشفق استاد، اپنے بچوں کے شفیق باپ اور مخلص و وفا شعار شوہر بھی ہیں۔ جبھی تو انہوں نے اپنے افسانوی مجموعے "زمین بے آسماں" کو اپنی رفیقۂ حیات قیصر سلطانہ صاحبہ کے نام سے منسوب کیا ہے۔

علی حیدر ملک [illegible]
کرتے [illegible] آئے اور [illegible]

کھلنا — سابق مشرقی پاکستان کا ایک چھوٹا مگر اہم شہر واقع ہوا ہے۔ یہ شہر قدرتی بندرگاہ ہونے کے علاوہ پٹ سن کی صنعت اور شپنگ کے کاروبار کے لئے کافی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اگرچہ ان کا پیشۂ آبا زمینداری یا فنِ سپہ گری رہا ہے۔ اور ان کے خاندان کے بیشتر افراد ملازمت کے سلسلے میں فوج یا پولس کے محکمے سے وابستہ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے خاندانی روایت سے انحراف کرتے ہوئے درس و تدریس کو اپنایا اور کھلنا کے کالج میں شعبۂ اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مزاج میں بیک وقت گداز اور کھرے پن کی جو آمیزش پائی جاتی ہے وہ ان کے خاندان کے خمیر سے ہی اٹھ رہی ہے۔

کھلنا کے حوالے سے علی حیدر ملک اس مقولہ کی تمثیل ہیں کہ "وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کرلیا"۔ نئے وطن کے نئے شہر میں غیر شناسا لوگوں کے درمیان جب انہیں پاؤں جمانے کے لئے چند گز زمین مل گئی اور جینے کا سامان مہیا ہوگیا تو پھر ان کے جوہر بھی کھلتے گئے۔ صنعتی شہر ہونے کی وجہ سے کھلنا میں اردو بولنے والوں کی آبادی کثیر تھی۔ لہٰذا یہاں شعر و ادب کے بھی چرچے تھے۔ اور باذوق حضرات کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے "نقوش، فنون، اوراق، سیپ اور افکار جیسے ادبی رسائل کی جتنی کاپیاں وہاں جاتی تھیں وہ فوراً ہی بک جاتی تھیں۔ کچھ ادبی انجمنیں بھی قائم تھیں۔ لیکن ادب کا سارا کاروبار صرف شعری محفلوں یا مشاعروں تک محدود تھا اور نثر نگاری تعداد کی حدوں سے گزر رہی تھی۔ اس زمانے میں صرف شاہد بارکپوری اور ابن حلیم افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ رہے تھے۔ نعمان جہان علی

روڈ پر فیری گھاٹ سے متصل جماعت خانہ کے قریب طلبہ کی نمائندہ انجمن 'بزم شاہین' کا دفتر تھا جس کے زیر انتظام 'ضیائے اردو لائبریری' قائم تھی جس کے لائبریرین ضمیم زمانوی تھے۔ چونکہ یہ خود بھی طالب علم شاعر تھے اس لئے نہ صرف کھلنا کی ادبی سرگرمیوں سے واقف رہتے تھے بلکہ علم و ادب سے متعلق ہر قسم کی کتابوں سے ہمہ وقت مزین بھی ہوتے تھے۔ اس لائبریری میں عبدالحمید ساقی بھی زمانوی کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ پہلی بار ضمیم زمانوی کی ہی زبانی معلوم ہوا کہ صاحب کھلنا میں ایک ایسے شخص کا ورود ہوا ہے جو اردو کا استاد ہونے کے علاوہ ادبی صلاحیتوں کا بھی حامل ہے اور اچھا افسانہ نگار بھی ہے۔ میں چونکہ ان کے کچھ افسانے بھارتی رسائل میں پڑھ چکا تھا۔ اس لئے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ تب تک میں صرف ادب کا قاری ہی تھا۔ حیدر صاحب چونکہ کالج میں لیکچرار تھے اس لئے چند طلبہ سے ہی ان کا براہ راست رابطہ قائم ہوا تھا۔ لیکن ان کی شخصیت کی دھیمی دھیمی خوشبو اب اطراف میں بھی پھیلنے لگی تھی۔ پھر ایک دن فرازی پاڑہ روڈ کے ایک مکان پر 'مجلس فکر نو' کا ایک بڑا بورڈ نظر آیا تو تجسس کا جاگنا ضروری تھا۔ پتہ چلا کہ ملک صاحب نے ہی چند کاروباری حضرات، سرکاری و نیم سرکاری اور بینکوں کے اعلیٰ افسروں کے تعاون سے یہ ادبی ادارہ قائم کیا ہے۔ اب تو ان سے ملنے کی خواہش میں شدت پیدا ہوگئی۔ لیکن ملاقات کی صورت نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ اور دیدار نصیب ہوا بھی تو کچھ اس طرح کہ ذہن میں ان کا جو تصور تھا وہ یک لخت منفی صورت اختیار کرگیا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ انہیں دنوں کھلنا میں 'مجلس فکر نو' کی طرف سے کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ اس کے منتظم و مہتمم

صورت ہی میں۔ کشاں کشاں ہم الحمان بنام شاہین
کا مشاعرہ سننے گئے۔ یہ مشاعرہ کھلنا کے میونسپل ہال
میں ہو رہا تھا۔ لیکن ہم جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ داخلہ
بذریعہ کارڈ ہے۔ اور بے کارڈ حضرات کے لئے ہال کے باہر
مائک کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ جس کا رُخ میونسپل پارک
کی جانب تھا۔ یعنی یہ کہ آپ بے شک پارک میں بیٹھ کر شعر
سننے کے ساتھ مونگ پھلی کھائیں یا چائے پئیں لیکن شاعروں
کا دیدار نہیں کر سکتے۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ تو ایسے ہی ہوا
کہ جیسے ریڈیو پر مشاعرہ سنا جا رہا ہو۔ پھر جب یہ پتہ چلا
کہ یہ پابندی قبلہ علی حیدر ملک کی طرف سے عائد ہوئی ہے تو
مایوسی غم و غصے میں بدلنے لگی۔ اس وقت تک طلبہ کی تعداد
میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر تو صاحب جملے بازی اور
فقروں کی بوچھار کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک
دل جلے نے یہ مصرعہ موزوں کر کے جلے دل کے پھپھولے
پھوڑے سے "یہ اہتمام ہے حیدر کی اِک لگائی کا" جب
بات جملے بازی اور فقروں سے نہیں بنی تو معاملہ پتھراؤ تک
پہنچا۔ جس سے ہال کی کھڑکیوں کے کئی شیشے ٹوٹ گئے
اور مائک کا حلیہ بگڑ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ نقص امن
کا خطرہ پیدا ہو کچھ معزز حضرات کی مداخلت سے ہال میں
جانے کی اجازت مل گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہمیں پچھلی
صفوں میں بیٹھنا ہوگا۔ کیونکہ نشست فرشی تھی۔

لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ علی حیدر ملک نے
نہایت خوش اسلوبی سے نہ صرف بپھرے ہوئے طلبہ کے
مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کر دیا بلکہ شاندار نظامت کا
مظاہرہ کرتے ہوئے اور مشاعرے کو ہوٹنگ سے بچاتے
ہوئے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اس سے پہلے کھلنا کے کسی
مشاعرے میں اتنی زبردست کمپیرنگ کی مثال نہیں قائم
ہوئی تھی۔

اس مشاعرے کی کمپیرنگ نے علی حیدر ملک کو
باضابطہ طور پر کھلنا کے باذوق حضرات سے روشناس
کرایا۔ اس کے بعد تو کھلنا میں ایسی کوئی ادبی یا ثقافتی
تقریب منعقد نہیں ہوئی جس کے کمپیئر علی حیدر ملک نہ ہوں
اعلیٰ کمپیرنگ کی ایک اور مثال انہوں نے اسلامک سوسائٹی
کے ایک سیمینار میں قائم کی۔ اس سیمینار کی ایک خصوصیت
یہ بھی تھی کہ خطابت کے لئے جن دانشوروں کو مدعو کیا گیا
تھا ان کا شمار انگریزی، اردو اور بنگلہ زبان کے ماہرین
میں ہوتا تھا۔ یہ مقررین کو اسی زبان میں متعارف کراتے
ہوئے ڈائس پر بلاتے جس زبان میں انہیں تقریر کرنی ہوتی۔

ایک مشاعرے کی نظامت کرتے ہوئے انہوں
نے سامعین اور شعراء میں اس وقت کھلبلی مچا دی جب
ایک شاعر کے پڑھنے کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ "آج
رات کے بارہ بجے فیض احمد فیض قتل کر دیئے گئے"
لوگوں نے فوراً اپنی اپنی کلائیوں کی طرف دیکھا تو اس
وقت ٹھیک رات کے بارہ بجے تھے۔ لوگ حیران کہ
معاملہ کیا ہے تو انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ
ابھی جو صاحب مشاعرہ لوٹ کر گئے ہیں انہوں نے فیض
کی تازہ غزل اپنے نام سے پڑھ دی ہے۔ اور جس رسالے
میں وہ غزل چھپی ہے وہ رسالہ آج ہی کھلنا کے بک
اسٹال پر آیا ہے۔

اب وہ باضابطہ طور پر شاہین میں آنے لگے تھے۔ اور
[illegible] کے دس گیارہ بجے تک بیٹھتے۔ کبھی کبھی تو رات کے بارہ بجے
جاتے تھے۔ پھر بہت جلد تکلف کی دیوار بھی گر گئی۔ لیکن
ادب قائم رہا۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ وہ آتے ہی بیٹھے
چائے منگواتے اور [illegible]

[illegible] آج بھی دیکھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ادبی گفتگو
پسند تھے بلکہ رنگ محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اظہار خیال
پسند تھے۔ اور جس موضوع پر بولتے تو بے تکان بولتے چلے
لیکن ان کی گفتگو ہمیشہ پر مغز ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا
بعض لڑکوں کو کچھ جاننا ہوتا یا شعر کی تشریح وغیرہ
درکار ہوتی تو وہی موضوع چھیڑ دیا جاتا۔ اس طرح ان
کی گفتگو سے اچھا خاصہ نوٹ آجاتا تھا۔ وہ مباحثے
اور بحث و تمحیص کی بھی ہمت افزائی کرتے اور سوالوں
کے جواب اتنے موثر انداز میں دیتے کہ سوال کرنے والا
ہر طرح سے مطمئن ہو جاتا۔ کسی فلم کا ذکر آگیا تو پھر
موضوع گفتگو فلم ہی بن گیا۔ اس طرح سیاست کے
کوچے میں داخل ہوئے تو سیاست کی بھی سیر کراتے رہتے
دوسری طرف مذہبی گفتگو کا انداز بھی کسی جغادری
مولانا سے کم نہیں ہوتا تھا۔ جس سے لڑکوں کو سیکھنے کا
بھی موقع ملتا ہے اور ان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا
تھا۔ اس طرح "بزم شاہین" اور "مجلس فکر نو" میں
یگانگت اور باہمی تعاون کی ایسی فضا قائم ہو گئی
کہ شناخت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔

غالباً کھلنا میں ادبی تنقیدی نشستوں کا
سلسلہ انہوں نے ہی شروع کیا اور یہ سلسلہ قیام
بنگلہ دیش تک جاری رہا۔ یہ نشستیں کبھی "بزم شاہین"
اور کبھی "مجلس فکر نو" میں منعقد ہوا کرتیں۔ پھر یہ سلسلہ
اتنا مقبول ہوا کہ خالص پور سٹیلائٹ ٹاؤن کی ادبی
انجمنیں بھی تنقیدی نشستوں کا اہتمام کرنے لگیں اور
اس کی بازگشت جیسور میں بھی سنی جانے لگی۔

[illegible] نصیر علی حیدر ملک ہیں تو استاد گورنمنٹ
[illegible] ان کی مقبولیت یکساں

تھی۔ نہ صرف طلبہ بلکہ وہ نوجوان بھی ان کے دائرہ
عقیدت میں شامل ہو گئے جو طالب علم نہیں تھے۔
تنقیدی نشستوں سے ہی انہوں نے نثر نگاری کی
تحریک چلائی۔ افسانہ نگاروں کے علاوہ صحافی بھی پیدا
کئے۔ اور کھلنا پریس کلب میں اردو صحافیوں کی اچھی
تعداد فراہم کر دی کہ ان اراکین کی حیثیت بیلنس آف
پاور کی ہو گئی۔

کھلنا گرلز کالج سے طیبہ امام اور شاہدہ انجم
ابھر کر سامنے آئیں۔ جو دونوں بہنیں تھیں۔ اس طرح کچھ
نوجوانوں نے بھی شہرت پائی۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے
تو یہ لوگوں میں چھپے ٹیلنٹ کی نشاندہی کرتے۔ پھر لکھنے
لکھانے کی طرف مائل کرتے۔ اور ان کی حوصلہ افزائی
بھی کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی کسی کو ایک جملہ لکھ
کر نہیں دیا۔ ایک ایک تخلیق کو کئی کئی بار لکھواتے۔ کہیں
کہیں رد و بدل کے لئے مشورے بھی دیتے اور جب مطمئن
ہو جاتے تو جملوں کی ساخت، املا اور گرامر کی غلطیاں
درست کر دیتے۔

"مجلس فکر نو" کی طرف سے کھلنا کا بڑا اور کامیاب
اردو ڈرامہ "انجام" کے نام سے اسٹیج کر کے انہوں نے
خاص و عام میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ ڈرامہ سوسائٹی سینما
میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں انہوں نے اداکاری
بھی کی تھی جس میں ڈھاکا کی دو مشہور فلمی اداکارائیں
بھی شامل تھیں۔

کھلنا سے اردو کا پہلا اخبار "ساحل" دو چار
شماروں کے بعد ایک تنازعہ کا شکار ہو کر بند ہو گیا
لیکن ہفت روزہ "قوم" کو کئی سال میسر آئے تھے۔
فنانسر اور مدیر اگرچہ محمد سلیم صاحب تھے۔ لیکن [illegible]

...ملک ہی تھے۔ اور شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ "ابن منظور" کے نام سے سیاسی مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ چونکہ انتظامی امور سے براہ راست بھی انہیں [illegible] تھی۔ اس لئے ڈھاکہ سے شاہد کامرانی کو بھی انہوں نے ہی منسلک کروایا تھا اور دوسرے صحافیوں کی بھی خدمات حاصل کی تھیں۔ ہفت روزہ 'قوم' نے اس دور میں جس تدبر اور [illegible] بیداری سے قوم کی رہنمائی کو اپنا شعار بنایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن جذباتی نعروں اور گروہی سیاست کی مخالفت نے اسے بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

'مجلس فکر نو' ہی کے زیر اہتمام انہوں نے 'دبستان مشرق' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ جسے مشرقی پاکستان کے نمائندہ ادباء و شعراء کی تخلیقات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

پھر جب کھلنا میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا تو وہاں بھی اردو کے شعبہ میں ان کی حیثیت غیر سرکاری مشیر کی ہو گئی۔ چونکہ ریجنل ڈائریکٹر اور پروگرام پروڈیوسر بھی بنگالی ہی تھے۔ اس لئے وہ ان کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور مشورے طلب کیا کرتے تھے۔ اس طرح [illegible] کی دنیا سے بھی انہوں نے کئی ٹیلنٹ متعارف کرائے۔

ادبی سرگرمیوں کے ساتھ سماجی اور سیاسی سرگرمیاں بھی ان کی رہین منت رہیں۔ ان کی قائدانہ صلاحیتوں کی شہرت نوجوان طبقہ ہی معترف تھا بلکہ سنجیدہ اور عمر رسیدہ حضرات نے بھی ان سے رہنمائی حاصل کی۔ کھلنا میں اردو بولنے والے نوجوانوں نے "ینگ مینز فیڈریشن" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ جسے متحرک، فعال اور [illegible] عبدالحمید ملک نے کیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے [illegible] مشرقی پاکستان میں ووٹر لسٹ انگریزی [illegible] بنگلہ زبان میں مہیا کیا گیا تھا۔ لیکن پہلی بار ینگ مینز فیڈریشن کی جانب سے اردو ووٹر لسٹ کا مطالبہ کیا گیا اور صوبہ گیر پیمانے پر تحریک چلائی گئی۔ ینگ مینز فیڈریشن والوں نے سب سے پہلے احتجاج کے طور پر کھلنا میں ہڑتال کی پھر دوسرے شہروں میں بھی اس کا رد عمل ہوا اور مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔

اسی طرح 'قومی مجلس' کے نام سے کل مشرقی پاکستان کی بنیاد پر ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا تو قرعہ فال انہیں کے نام نکلا۔ اور وہاں بھی وہ اپنی پوری قائدانہ توانائی کے ساتھ ممتاز و ممیز نظر آئے۔ 'ینگ مینز فیڈریشن' اور 'قومی مجلس' کے قیام کی وجہ سیاست سے جذباتی اور منفی رجحانات کی نفی کرتے ہوئے صحیح اور متوازن راہ قائم کرنا تھی۔

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں اردو بولنے والوں کی حب الوطنی بنگالیوں کی نظر میں جرم کا درجہ حاصل کر گئی تو انہیں بنگالیوں کے عتاب اور مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت پاکستانی فوج بھی بے بس نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ فوری امر تھا۔ ہر جگہ لوگ اپنے طور پر اجتماعی تحفظ کا بندوبست کر رہے تھے۔ ان دنوں بھی ملک صاحب بڑے فعال نظر آئے۔ شہر کے دوسرے علاقوں سے فون پر رابطوں اور مشوروں کا سلسلہ جاری رکھا اور جب محلے کی فون لائن کاٹ دی گئی تو اس وقت بھی ان کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی۔ ان دنوں ہر محلے میں پہرے اور جاگنے کا عمل جاری تھا۔ یہاں بھی وہ محلے کے نوجوانوں کے شانہ بشانہ موجود رہے۔ مورچہ بندی اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں نہ صرف مشوروں سے کام لیا بلکہ عملی طور پر وہ ایک [illegible]

[illegible] بھی نظر آئے۔

وہ انسانوں کی بھی STATUS CONSCIOUS نہیں تھے۔ اور آج بھی انہیں ویسا ہی پاتا ہوں۔ معاشرے کے ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ یکساں دیکھا ہے مجموعی طور پر وہ ایک بے نیاز اور بے لوث انسان ہیں۔ کل بھی وہ لوگوں کی پریشانیوں کو دور کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔ اور آج بھی ان کا یہی حال ہے۔ ان کا اپنا کام بھلے ہی رہ جائے۔ لیکن دوسروں کا کام وہ پہلے کریں گے۔ یوں تو کئی لوگ اس زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن ایک صاحب کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں۔ جو اپنی صلاحیتوں سے زندگی بھر گریجویشن نہیں کر سکے تھے۔ انہیں۔ انہوں نے ایم۔ اے ڈگری سے سرفراز کیا اور ادبی شناخت بھی دلوائی مگر ان صاحب نے انہیں رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ لیکن حیدر بھائی صرف شکایت بھی زبان پر نہیں لاتے۔ اگر کبھی ذکر کیا جائے تو ہوں ہاں کر کے ٹال جاتے ہیں۔ اور یہ بھی ان کے مزاج کا خاصہ ہے کہ جو بات انہیں پسند نہیں یا جسے وہ گوارہ نہیں کرتے اسے اسی طرح خوبصورتی سے ٹال جاتے ہیں۔

یقیناً وہ اپنے پہلو میں درد مند دل بھی رکھتے ہیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں کوئی بے کار ہو گیا تو ان کی یہی کوشش رہی کہ وہ کسی طرح با روزگار ہو جائے۔ صرف حلقۂ احباب پر ہی اس کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ رشتہ دار، روشناسائی اور محلہ داری کی حد تک اس دائرے میں وسعت [illegible] ہے۔ اس ضمن میں بہت سی مثالیں موجود [illegible] سے کسی کی

مدد کرنے سے انہوں نے گریز نہیں کیا۔

مجھ سے ان کی قربت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب قیصر بھابی بھی کھلنا آگئیں تو وہ ان کے ہمراہ نہ صرف ہمارے محلے میں آباد ہوئے بلکہ میرے پڑوسی بھی بن گئے۔ بھابی کی آمد سے پہلے انہوں نے "مقام" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا جس میں انہوں نے رفیقۂ حیات سے دوری کے کرب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا تھا۔ یوں تو بعد کے کئی افسانوں میں بھی انہوں نے رفیقۂ حیات سے گہرے اٹیچمنٹ کا اظہار کیا ہے لیکن "مقام" کچھ اور ہی مزہ دے جاتا ہے۔

ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ اکثر رات گئے گھر لوٹا کرتے تھے۔ غالباً بھابی ان کی اس روش کے پس منظر سے واقف ہو چکی تھیں۔ اس لئے اس معاملے میں وہ کبھی بھی حرف شکایت زبان پہ نہیں لاتیں۔ بلکہ جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کی [illegible] کا خیال رکھتی ہے اسی طرح گھر کے بھیدی ہونے کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ بھابی سگریٹ بھی راشن کی طرح سے ہی گھر میں لا کر رکھتی تھیں۔ شاید میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حیدر بھائی کی آدھی شخصیت بھابی کی ہی [illegible] ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت قابل رشک حد تک موجود ہے۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مرد پوری تنخواہ بیوی کے حوالے کر کے گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں یوں تو گھر کا سارا نظم و نسق بھابی کے ہی ذمہ ہے۔ لیکن گھر کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں کا خیال حیدر بھائی بھی رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ ہم دونوں [illegible] اخبار اور رسائل

وصی محمد وصی

ماہیا شاعری اور دیپک قمر

بنے ہلارے اور پھوٹیاں پھوہار دیپک قمر صاحب کی ماہیا شاعری کے مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں دیپک قمر صاحب نے ڈیڑھ مصرعہ کی ماہیا نظم کو تین برابر کے مصرعوں میں پیش کرکے ہند کو اور پنجاب لوک ادب کی قدیم ترین اور نہایت مرغوب صنف شاعری میں نہایت دل پذیر تجربات کئے ہیں۔

بنے ہلارے کا ماہ وسال اشاعت مئی سنہ ۱۹۹۱ء ہے۔ اس مجموعہ میں صرف ایک تنقیدی رائے ہے جو اردو کے ممتاز ناول و افسانہ نگار جناب جوگندر پال صاحب (دہلی) کی فکر عالیہ کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ دو تعارف نامے ہیں ایک جناب سرور تونسوی صاحب ایڈیٹر شان ہند دہلی کا ہے اور دوسرا تعارف نامہ اس مجموعہ کی تہذیب و ترتیب کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے مجھ خاکسار (وصی محمد وصی) کا ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت پر یہ تو امید تھی کہ اردو حلقوں میں مسرت کا اظہار کیا جائے گا اور اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا لیکن اس مجموعہ کو جتنی پذیرائی حاصل ہوئی وہ امید سے بہت زیادہ نکلی۔

اس مجموعہ کی اشاعت پر پاکستان سے عالی جناب جمیل جالبی صاحب (مقتدرہ اسلام آباد) نے لکھا کہ "آپ نے ایک خوبصورت امتزاج پیش کیا ہے اس کی اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ عالی جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب (سرگودھا) نے لکھا کہ "جہاں تک مجھے علم ہے اردو میں بنے ہلارے ماہیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ماہیا ایک بے حد زرخیز صنف شعر ہے جو پنجابی زبان اور کلچر سے پوری طرح جڑی ہوئی ہوتی ہے آپ نے اسے اردو کی سرزمین میں نشو نما پانے کا موقع فراہم کیا جو ایک قابل قدر بات ہے۔ ہندوستان سے عالی جناب مالک رام صاحب (نئی دہلی) نے لکھا کہ "جناب دیپک قمر کو ان کے اس مستحسن اقدام کے لئے مبارکباد

پیش کرتا ہوں اور ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔"
جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے لکھا کہ "آپ نے ماہیے لکھتے ہوئے ماہیا کی شعری فضا اور موضوع کا بھی حق ادا کیا ہے یہ ایک تاریخی کاوش ہے۔ مبارکباد"

عالی جناب ہیرا لال چوپڑا صاحب (کلکتہ) نے لکھا کہ "دیپک قمر صاحب نے اردو اور پنجابی زبانوں کے ادب میں اپنا منفرد مقام بنا لیا ہے اور میرے جیسا پنجاب کے ادب و ثقافت زبان و تہذیب کا دیوانہ ۸۵ سالہ بوڑھا تو ان کے حق میں دعا ہی کر سکتا ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

جناب کالی داس گپتا رضا صاحب (بمبئی) نے لکھا کہ "آپ کے لہجہ کی انفرادیت مسلم ہے" جناب رام لال صاحب (لکھنؤ) نے لکھا کہ "دیپک قمر نے یہ تجربہ کر کے اردو کی وحشی اور منہ زور گھوڑی کی باگ بڑی کامیابی سے جھٹکتی، کھلی دیسی فضا کی طرف موڑ دی ہے۔

جناب قمر رئیس صاحب (دہلی) نے لکھا کہ "اردو زبان میں یہ منفرد کارنامہ یاد رہے گا۔ اس کے علاوہ ملک اور بیرون ملک سے بے شمار خطوط موصول ہوئے جن میں سے کچھ تراشے پھوئیاں، پھوئیاں پھہار میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ پھوئیاں پھوئیاں پھہار کا ماہ و سال اشاعت جنوری ۱۹۷۹ء ہے۔

پنجابی کے بعد اردو ادب کا حصہ بننے والی اس صنف سخن میں ۔۔۔۔ دیپک قمر صاحب نے بقول محمد سلیم احسن (میانوالی پاکستان) تین کمالات دکھائے ہیں۔ پہلا کمال یہ ہے کہ پنجابی ماہیے میں پہلی سطر بے معنی ہوتی ہے اور وہ سطر محض آہنگ و ترنم کے تقاضے پورا کرتی ہے مگر دیپک قمر صاحب نے پہلی سطر کو بامعنی بنا کر تینوں سطروں میں معنوی یکجائیت پیدا کر دی ہے۔ دوسرا کمال، دیپک قمر صاحب کے ماہیوں کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ روائتی ماہیا حسن و عشق اور ہجر و فراق کے مضمون تک محدود ہوتا ہے لیکن دیپک قمر صاحب نے اپنے ماہیوں کو زندگی کے گوناگوں موضوعات تک وسعت دیدی ہے۔

ہر بات پہ ہنستی ہے
لگتا ہے ابھی اس نے
دنیا نہیں دیکھی ہے

تالاب کنول کا ہے
قدرت نے جو لکھا ہے
دیوان غزل کا ہے

دیپک قمر صاحب نے ماہیا کے موضوعات اور مناظر کو جس فنکاری کے ساتھ مختلف رنگ عطا کئے ہیں ان سے ان کی مسائل زندگی پر گرفت اور ذہنی پرواز کا پتہ چلتا ہے۔ تیسرا کمال یہ ہے کہ دیپک قمر صاحب کے اردو ماہیوں کو پڑھ کر اجنبیت کا ایک مستقل حصہ ہے۔ ان ماہیوں سے وہی لذت و سرور حاصل ہوتا ہے جو پنجابی ماہیوں کے اوصاف میں شامل ہے

دیپک قمر نے ماہیا کے ان دونوں مجموعوں میں بقول حامد سروش (پشاور پاکستان) غضب کی سادگی اور پرکاری سے کام لیا ہے۔ محبت، ہجر، وصال۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں، چھوٹے چھوٹے غم۔ احساس کمہ

احساس تشکر و امتنان۔ غرض زندگی کے جتنے رنگ ہیں سوچ کے جتنے دائرے ہیں وہ سب ان ماہیوں کے منظر نامہ میں ہماری نظروں کے سامنے چھلکتے، بکھرتے مچلتے، بہکتے نظر آجاتے ہیں۔

دیپک قمر صاحب کی شاعری کے یہ دونوں مجموعے اردو میں صنف سخن کے اعتبار سے بھی اور لہجہ کے اعتبار سے بھی بالکل نئے ہیں یہ دونوں مجموعے اعلیٰ شاعری کی نہایت شاندار مثالیں ہیں۔ احساس کی شدت، سوچ کی گہرائی۔ نظر کی وسعت، فنکارانہ جدت و ندرت ان ماہیوں میں اس انداز سے داخل ہوئے ہیں کہ ہر ماہیا خوشبو کی طرح رگ و جاں میں سیدھا اتر جاتا ہے۔ دیپک قمر صاحب کا یہ عظیم کارنامہ ہر لحاظ سے اردو شاعری میں موضوعات۔ تکنیک اور آہنگ کے لئے وسعتوں کی بشارت لے کر وارد ہوا ہے۔ ہم اردو کے صنف سخن میں ماہیوں کے ان دونوں مجموعوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور سیدہ حنا صاحبہ (پشاور پاکستان) کی آواز میں آواز ملا کر یہ کہنا چاہیں گے کہ دیپک قمر صاحب کے ماہیوں کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں شاعر کے بیکراں ہونے کا احساس ملتا ہے۔ جغرافیائی حد بندیوں اور ملاقاتی تجزا بندیوں سے آزاد ایک آفاقی سوچ جو ذہنوں اور دلوں کے درمیان حائل سارے فاصلے مٹا دیتی ہے۔ جہاں جہاں انسان بستے ہیں۔ جہاں جہاں محبت کی حکمرانی ہے، جہاں جہاں سورج نکلتا ہے دیپک قمر صاحب کے ماہیے وہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

وہ سچ نہیں دھوکا ہے
ن ان کو جو بانٹے

وہ فن وہ ادب کیا ہے

* کرما ہی نظر اپنی
تو آ کر نہ آؤ ہولا
کچھ بھیج خبر اپنی

لگتے ہو بھلے سے تم
ہم بھی نہ برے ایسے
لگ جاؤ گلے سے تم

دیپک

پلیبہ :۔ بے باک لہجہ کا شاعر

شاعر مشرق کی انہیں باتوں کو نئی نسل کا شاعر بڑی خوبصورتی سے یوں کہتا ہے۔

اک فقط زندگی ہے جس کے لئے
آخری سانس تک لڑوں گا میں
مجھ کو بھی امتحان دینا ہے
زہر کا ذائقہ چکھوں گا میں

غموں کے راستے ہوں یا اداسی کا سمندر ہو
اداسی رہگزاروں میں کبھی بے دم نہیں ہوتا

سرزمین بہار کے اس نوجوان شاعر کے متعلق میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تشنہ ہے۔ میں ان کی شاعری کا پورے طور پر اجمالی جائزہ نہیں لے رہا ہوں۔ ایک عرصہ سے ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں جگہ پانے والا یہ شاعر آج بھی بڑی بے باکی سے لکھ رہا ہے۔ امید ہے مستقبل کے قلم کار اور نقاد ان کے کلام کے ساتھ پورا انصاف کر سکیں گے۔

دیپک

जीतोदय सेविंग एण्ड इन्वेस्टमेंट कं० लि०

प्रधान कार्यालय—सोलरा हाउस मुरारपुर गया (बिहार)

खाता खोलने, कम्पनी का एजेंट बनने हेतु हम आपका स्वागत करते है।

बम्बई मे इस कम्पनी का कार्यालय श्री एस० शमिम जाँवाज के द्वारा जल्द से जल्द आप की सुविधा और आपको लाभ पहुँचाने के लिए ब्रांच खोली जाएगी।

श्री शमिम जाँवाज गीतकार, कहानीकार के साथ-साथ फिल्मी कलाकार भी है।

बम्बई मे श्री जाँवाज से इस पते पर संपर्क कर सकते है :—

वर्ल्ड प्रोग्रेसिव एडवर्टाइजिंग सेन्टर

डीसेन्ट इन्टेरियर डेकोरेटर्स प्रोप्राइटर—नेलाल अहमद

प्लोट नं० जे० ४६ १६वाँ रास्ता, सांताक्रुज (वेस्ट) बम्बई—४०००५४ फोन नं०—६४६५०६८ :—

हमारी कम्पनी "जीतोदय" सेविंग एण्ड इन्वेस्टमेंट क० लि०, आप के बच्चों के पढने, बच्ची बच्चो शादी, मकान बनाने, व्यापार बढाने में आपकी सहायता करना चाहती है और खाता धारियों सहायता पहुँचा भी रही है।

आप हमारी कंपनी के ब्राँच में आज ही खाता खोलकर लाभ उठाएँ। और एजेन्ट बनकर बेकारी करें।

हमारी कम्पनी आप की जिन्दगी को बेहतर-से-बेहतर बनाना चाहती है।

ब्रांचेज— (१) सोलरा हाउस, गया, (२) बोद्धगया (३) जी० टी० रोड, शोभ (गया) (४) बरवाडो पलामु (५) नाला रोड, पटना (६) धरापर, खिजरसराय (गया) (७) मल्लिक मंजिल, नवादा (८) स्टेशन के पास टनकुप्पा (गया) (९) राजगीर (१०) फुसरो (११) चौक सिटी पटना (१ हाजीपुर।

आप विशेष जानकारी के लिए मिलें या पत्र द्वारा विशेष जानकारी प्राप्त करें।

द्वारा वर्ल्ड प्रोग्रेसिव एडवर्टाईजिंग सेन्टर

विनीत

कम्पनी समूह

With Best Compliments From

اصغر علی انجینیئر

سید احمد قادری کا فن

کہانی کا فن بہت پرانا ہے۔ اور پرانی داستان گوئی سے جدید افسانے تک کا سفر بہت طویل ہے اور پیچیدہ بھی۔ جدید افسانہ تجریدی مراحل سے بھی گذرا اور اس افسانے میں کہانی کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا۔ علامتی، تمثیلی اور تجریدی ہر قسم کے افسانے آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ علامتی، تمثیلی اور تجریدی افسانے بھی بڑے طاقتور ہو سکتے ہیں اگر لکھنے والے میں فنی صلاحیت اور انسانی اقدار کا احترام زندگی کی طرف مثبت رویہ اور ماورائی وژن ہو۔ بنیادی سوال تکنیک کا نہیں فلسفے اور اقدار کا ہے۔ زندگی اور اس سے متعلق واقعات بڑی پیچیدگیوں کے حامل ہیں۔ اور پیچیدہ حقیقت کو برتنے کے لئے مختلف تکنیکیں استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تکنیک کہانی پر حاوی نہیں ہونا چاہئے۔ کہانی تکنیک پر حاوی رہے۔ ہر پیچیدہ مسئلہ جس سے افسانہ نگار عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے ایک تکنیک کا تقاضہ کرتا ہے۔

یہ چند باتیں عرض کرنا ضروری تھا کیونکہ جدیدیت نے افسانے کو کچھ یوں مسخ کیا کہ حقیقت افسانہ بن کر رہ گئی۔ ادھر کچھ نئے لکھنے والوں نے جدیدیت سے اور اس کی لایعنیت سے منہ موڑ کر پھر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ زندگی کی حقیقت اپنے کو منوا کر ہی رہتی ہے۔ ادب بھی وہی زندہ رہے گا اور مقبول ہوگا جو زندگی کی حقیقتوں کو سنجیدگی سے برتے۔ اس کی نفی نہ کرے۔ سید احمد قادری زندگی کی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور زندگی اور اس کے پیچیدہ تقاضوں سے اپنی کہانیوں میں بہ خوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ کہانی ان کے یہاں کہانی ہی رہتی ہے کیوں کہ کہانی کہنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ یہ زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہی ان کی نظریاتی وابستگی ہے۔ سارتر کے مطابق لکھنے کا فعل ہی وابستگی کا اعلان ہے اور قادری کی ہر کہانی یہ اعلان مبہم نہیں

بڑے واضح طور پر ڈھیر سے نہیں بہانگ دہل کرتی ہے
" ریزہ ریزہ خواب " قادری کی بیس کہانیوں
کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں، بعض
اچھی اور بہت اچھی بھی۔ مجموعے کا نام بھی سید احمد
قادری کے زندگی کا اور رویے کا اعلان کرتا ہے ـــ
زندگی ایک سندر سپنا بھی ہے اور انسان کو ریزہ ریزہ
کر دینے والی حقیقت بھی۔ ایک تخلیقی فنکار سندر سپنا
دیکھ کر ریزہ ریزہ کر دینے والی حقیقت کو بھی گوارا بنا
لیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال قادری کی کہانی " سُرخ
جوڑے " ہے۔ یہ کہانی قادری کی بہترین کہانیوں میں
شمار کی جائے گی۔ ایک گورکن اس لئے جنازوں کا
انتظار کرتا رہتا ہے کہ اسے کچھ پیسے ملیں گے اور اس
طرح وہ اپنی جوان بیٹی کے ہاتھ پیلے کر سکے گا۔ رقم پوری
کرنے کے لئے اسے ایک اور جنازے کا انتظار ہے اور وہ
جنازہ اس کی اپنی بیٹی کا ہی آتا ہے جس کے ہاتھ پیلے کرنے
کے لئے وہ بیتاب تھا۔ ایک طرف بیٹی کے ہاتھ پیلے
کرنے کا سندر سپنا اور دوسری طرف اس خواب کو
حقیقت بنانے کے لئے جنازوں کا انتظار! یا اللہ زندگی
کے اس تضاد کو انسان کیسے برداشت کرے۔ حالانکہ
کہانی کا کلائمکس کسی حد تک ناقابل یقین ہے لیکن کہانی
بڑی طاقتور ہے۔ اور زندگی کے تضادات کی شدت کو
پوری شدت سے ابھارتی ہے۔ اس کا مقابلہ کملیشور
کی کہانی " کتنے اچھے دن " سے کیا جا سکتا ہے

قادری کی کچھ کہانیاں بڑی کمزور بھی ہیں۔ افسانہ
نگاری کے فن کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کوئی بھی بات واقعات
کے تانے بانے سے ابھرنی چاہئے۔ کردار کی زبان سے
مکالموں کی صورت میں نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جاگیردارانہ
اور سرمایہ دارانہ سماج میں انسان انسان کا استحصال
کرتا ہے لیکن یہ بات اگر کردار کی زبان سے مکالمے
کی صورت میں ادا کرائی جائے تو افسانے کی کمزوری بن
جائے گی۔ فن کار کو واقعات کو ایسی چابکدستی سے
پیش کرنا چاہئے کہ استحصال کا احساس قاری کے دل
میں پیدا ہو جائے۔ "شہر خموشاں"، "لمحوں کی بازگشت"،
"بند آنکھوں کا سپنا"، وغیرہ جیسی کہانیاں اس کمزوری
کا شکار ہیں۔ " قیدی " اس کے برعکس مزدوری طفلاں
(CHILD LOBOUR) پر اور قالین بافی کے کاروبار
میں بچوں کے بے رحمانہ استحصال پر عمدہ کہانی ہے۔
مصنف نے بچوں کے نازک احساسات اور اپنی تخلیق
پر طمانیت کے جذبات کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔
اسی طرح یادوں کا المیہ بھی " ماضی سے وابستگی اور
یادِ رفتگاں کی تقسیم پر اچھی کہانی ہے۔ " گمشدہ اجالے "
تمثیلی انداز میں لکھی گئی ہے لیکن قادری اس میدان
کے شہسوار نہیں معلوم ہوتے۔ " اداسیاں " ضعیف
العمری کے مسئلے پر بڑے احساس سے لکھی گئی کہانی
کہی جا سکتی ہے۔

قادری میں فنکارانہ صلاحیتیں موجود ہیں،
نظریاتی وابستگی بھی ہے۔ اور مشاہدہ بھی۔ کہانی
کہنے کا فن بھی آتا ہے۔ لیکن ابھی ارتقا کی کئی منزلیں
طے کرنا ہے۔ زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں کو پوری
چابکدستی سے برتنے کے لئے بڑے تجربے اور بہت
گہرے مشاہدے کی ضرورت ہے۔ پھر صنعتی دور میں تیزی
سے ہونے والا تبدیلی کا عمل، تکنالوجی اور اقدار کا
تصادم، بڑے شہروں میں بے ماتگی اور لایعنیت کا
احساس۔ ترقی کے باوجود انسانیت کا گھٹتا ہوا قد یہ سارا

شوقؔ

حسین الحق ۔ ایک بے چین پرندہ

انسان جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے اپنا بچپن نظر آتا ہے۔

ایسا شاید اس لئے ہوتا ہے کہ انسان آخری حد تک دیکھنے کی کوشش کرتا ہے درمیان کا سارا زمانہ بیچ میں بن جاتا ہے اور اسے کھیل کا میدان نظر آتا ہے جہاں وہ فٹبال اور کرکٹ کھیلتا تھا اسکول نظر آتا ہے جہاں وہ پڑھتا تھا، اس کے گھر کا آنگن، گلیاں اور پھل دار درخت، جن پر وہ پتھر اچھالا کرتا تھا۔ حافظے میں یہ چیزیں اس لئے محفوظ ہو جاتی ہیں کہ یہ زمانہ اس کی ہوشمندی یا شعور کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔

میں بھی جب پلٹ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو یہی سب مجھے بھی نظر آتا ہے۔ دوستوں کے چہرے کھیل کے میدان کے ساتھ ڈوبتے ابھرتے ہیں۔ اسکولی دوست کے چہرے اب بھی کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ ادبی دوستوں کے چہرے یاد کرتا ہوں تو نگاہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

حسین الحق۔ کرتا پیجامہ پہنے ہوئے ایک لڑکا جس نے پہلی ملاقات میں مجھے بتایا کہ اس نے بھی ایک کہانی زرد لبو دالکھی ہے، یہ لڑکا میرے لئے نیا بھی تھا اور پرانا بھی۔ نیا اس لئے تھا کہ دوستوں کے حلقے میں نہیں تھا۔ پرانا اس لئے تھا کہ میرے گھر کے سامنے اپنے نانیہال میں اکثر نظر آتا ہے۔ پہلی ملاقات میں مجھے اس کی تیزی اور ذہانت نے متاثر کیا۔ اس وقت چونکہ میں بھی لڑکا تھا اس لئے نہ اس کے علمی گھرانے سے واقف تھا نہ اس کے خاندانی پس منظر سے، یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ حسین کے آبا و اجداد آمداری کے سادات تھے اور کنور سنگھ کی مدد کرنے پر حکومت وقت کے معتوب ہوئے تھے اور انہوں نے آمداری چھوڑ کر سہسرام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

چونکہ میرے ادبی حلقوں میں سب شاعر تھے اس لئے حسین مجھ سے قریب ہوتا گیا یا میں اس سے قریب ہوتا گیا

شوق مشترک نے ابتدائی دنوں میں دونوں کو مہمیز کیا۔ بچپن
کلیاں، غنچے میں لکھ جانے والی کہانیاں اردو اسٹوڈنٹس
فیڈریشن کے قلمی مجلہ نور و نکہت کی ترتیب و تہذیب اور
پھر بچوں کا رسالہ انوار صبح، چھوٹی چھوٹی خوشیاں، چھوٹی
موٹی رنجشیں، شکایتیں اور پر لگا کر اڑتا ہوا بے آواز وقت
خاندانی اثرات بچوں کی نشوونما پر کس قدر اثر انداز
ہوتے ہیں اس کی بہترین مثال حسین میں ملتی ہے اس کا گھرانہ
خانقاہی گھرانا تھا اس لئے اس کی دلچسپیاں بھی عام لڑکوں
سے مختلف تھیں۔ جیسے جنگلوں، پہاڑوں اور وادیوں میں گھومنے
کا شوق تھا حسین بھی ہمارے ساتھ ہوتا مگر صرف ساتھ
دینے کے لئے۔ اسے فطری مناظر سے دلچسپی ضرور تھی مگر
جسمانی مشقت کے بغیر۔ اسی لئے اس نے گلی ڈنڈا، فٹ
بال، کرکٹ، بیڈمنٹن بلکہ کوئی کھیل نہیں کھیلا، دراصل
انسان ایک ہی ورزش میں کامیاب ہوتا ہے۔ جسمانی
یا ذہنی، حسین بچپن ہی سے ذہنی ورزش کرتا رہا اور
یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بچپن میں اپنے والد کے
ساتھ مذہبی جلسوں میں شرکت کرتا اس کے والد چونکہ
عالم اور مقرر تھے اس لئے باپ کی کامیابی بیٹے کا شوق
بن گئی۔ حسین نے بھی تقریریں رٹیں۔ مائک سنبھالا اور
مجمع کو مخاطب کیا، آواز دور تک گئی۔ ممکن ہے فضا
میں اتنی دور نہ گئی ہو جتنی دور خود اس کے اندر گئی۔ اس
آواز نے اس کی آئندہ زندگی میں اہم رول ادا کیا۔ وہ
اپنے اندر کی آواز کا عاشق ہو گیا اور اس عشق نے اسے
اتنا بے خود بنا دیا کہ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتا۔ اسٹیج
سے مجمع کو مخاطب کرنے والے کے سامنے ادبی نشستوں
اور میز گفتگو کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی اس خود اعتمادی
نے اسے نقصان زیادہ پہنچایا۔ ادبی سانحے ہوئے اور
مورچہ دیکلی کئی مہینہ تک اکھاڑہ بنا رہا، بہتوں نے
اپنے آبگینوں کو ٹوٹتا محسوس کیا اور حسین کے مخالفوں
میں شامل ہو گئے۔

روپیہ خدا نہیں ہے مگر خدا کا کام کرتا ہے حسین
شروع سے ایک خدا کا قائل رہا۔ اسی کے حضور سر بسجود
رہا اس لئے دوسرا خدا ان سے روٹھ گیا۔ اس کے والد
مدرسہ خانقاہ میں مدرس تھے۔ معمولی تنخواہ جو غیر معمولی
تاخیر سے ملتی تھی اس معمولی اور غیر معمولی نے ایسی
ناہمواری پیدا کر دی کہ ساری آرزو اور تمنائیں دل میں
دم توڑتی رہیں۔ سوچنے والا ذہن زیادہ شدت سے اپنی
خودکشی دیکھتا رہا مگر حالات کے سامنے جھکا نہیں۔ باپ
کی شفقت کے ساتھ اس کا تنگ دامن دیکھتا رہا۔ اس
لئے باپ سے شاکی نہیں ہوا اور تب اس نے فیصلہ کیا مدرسہ
کی تعلیم عملی زندگی میں مولوی بنا سکتی ہے اور آنے والی
نسل کا مقدر بھی معمولی اور غیر معمولی کے شکنجے میں کراہتا ہوا
خودکشی کرتا رہے گا۔ حسین نے پرائیویٹ میٹرک کا امتحان
پاس کیا اور کالج میں داخل ہو گیا۔ یہاں اسے زمانے کی
تیز رفتاری کا احساس ہوا، بدلتے ہوئے فیشن۔ نئی تراش کے
کپڑے، سائیکلوں اور اسکوٹروں کی تیز رفتاری نے
اسے اور زیادہ اپنی تنگ دامانی کا احساس دلایا۔ زمانے
کی ساری خوشیاں سمیٹنے کا احساس اور شدید ہوا۔
منزلیں طے ہوتی رہیں۔ آئی۔ اے اور بی۔ اے اور پھر فرسٹ
کلاس ایم۔ اے۔

میری لقصور کی آنکھوں نے حسین کا اسی وقت کا
چہرہ دیکھا تھا جب اس نے اپنا رزلٹ دیکھا تھا۔ یہ
صرف امتحان کا رزلٹ نہیں تھا۔ اب تک کی محرومیوں
کا رزلٹ تھا۔ والدین کی تمناؤں کا رزلٹ تھا یعنی

کٹھن منزلیں تھیں۔ کتنے کانٹے تھے راہ میں، چھپے ہوئے بھی
اور نظر آتے ہوئے بھی۔ کتنی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ کتنے میں
طنز تھا۔ کتنا بھاری بوجھ تھا۔ کس کس کی چیزیں لادنی پڑی
تھیں پیٹھ پر۔ میں خود بھی اسی دوسرے خدا کا ٹھکرایا۔
ہوا۔ شہر شہر بھٹک رہا تھا۔ کبھی رانچی، کبھی جھریا کبھی سلی گوڑی
نہ جانے حسین سے اس وقت تعلقات خوشگوار تھے یا کشیدہ
ہمارے تعلقات دھوپ چھاؤں قسم کے رہے ہیں ٹھیک سے
بتانا مشکل ہے کہ بیس پچیس برسوں کی دوستی میں دھوپ زیادہ
رہی ہے یا چھاؤں، مگر ہم کہیں بھی ہوں ایک دوسرے کے
حالات سے باخبر ضرور رہا کرتے تھے۔ توازن کے فقدان نے
حسین کی فطرت کو عجیب بنا دیا۔ مجھے آج تک اندازہ نہ ہو
سکا کہ اسے کب اور کون سی بات بری لگ جائے گی۔ ملاقات
ہوئی ہے باتیں ہوئی ہیں ہم بڑے خوشگوار موڈ میں الگ
ہوئے ہیں، پھر اس نے ملنا چھوڑ دیا۔ معلوم ہوا وہ ناراض
ہو گیا اب ذہن پر لاکھ زور دو۔ کس دن کس موضوع پر
گفتگو ہوئی ہے۔ اختلاف کہاں ہوا ہے۔ کون سی بات
بری لگ سکتی ہے کچھ پتہ ہی نہیں پھر کسی سے معلوم ہوا فلاں
دن میں نے مذاق میں جو بات کہدی تھی وہ بری لگ گئی ہے۔
اب سر پیٹ لینے کو دل چاہے، ارے بھائی یہ بھی کوئی روٹھنے
کی بات تھی۔ روٹھنا ہی تھا تو کسی اختلافی گفتگو پر روٹھتے
جیسے جیسے وقت گزرا حسین کی فطرت کا تضاد اور نمایاں
ہوتا گیا۔ مشرق اور مغرب کے ملاپ نے اسے ڈانواڈول رکھا
افسانے کے بدلتے ہوئے ٹرینڈ نے اسے جدید افسانہ نگار کی
صف میں کھڑا کیا تو دوسری طرف باپ کے انتقال کے بعد اسے
خانقاہ کی سجادگی ملی، اس نے ایک طرف بیوی کا برقع اتروایا
تو دوسری طرف مذہبی اجتماع میں تقریریں کرتا رہا۔ ایک طرف
وہ [illegible] روزے نہیں رکھتا۔ دوسری طرف داڑھی [illegible]

بڑھالی۔ وہ سنی ہے مگر عام سنیوں کی طرح نہیں۔ وہ
مسلمان ہے مگر تصوف کے واسطے سے مذہب کا بالکل الگ
تھلگ تصور رکھنے والا۔

کبھی کبھی میں نے سوچا، یہ اتنا کچھ کیوں ہے؟ کیا
اس لئے کہ اس کے ابتدائی نشو و نما میں توازن کا فقدان
رہا ہے، کہیں اس کی منزل کیوں نہیں؟ کہیں اس کے
دل کو قرار نہیں کیا یہ سارے جھمیلے اپنے بے چین طبعت
کے سکون کے لئے ہیں؟ یا نرگسیت کی کرشمہ سازی ہے؟
یہ دو مختلف کرنٹ طاقت ور کیوں ہیں؟ یہ بات تو سمجھ
میں آتی ہے کہ گھریلو ماحول اور رگوں میں دوڑتے خون نے
حسین کو ایک مذہبی آدمی بنا دیا ہے مگر دوسرا کرنٹ کیا
تعلیم کی وجہ سے ہے؟ یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی حسین
جیسا ذہین شخص انگریزی تعلیم کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوسرے شخصیت کی تعمیر میں حسین
کے پیش نظر کوئی اور ہے جس سے وہ مقابلہ کر رہا
ہے جس کے برابر آنا چاہتا ہے۔ جس کی نظروں میں اعتبار
حاصل کرنا چاہتا ہے اور وہ کوئی مرد نہیں ہو سکتا۔

حسین نے عشق کیا بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ
اسے عشق ہوا یہ غالباً ۶۶-۶۵ کی بات ہے اور آج بیس
برس گزر چکنے کے بعد بھی اس عشق کی شدت میں ذرہ برابر
کمی نہیں ہوئی کل جب ہم Teenage کی منزل میں تھے تب
بھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا اور آج اس کے بالوں میں
سفیدی آنے لگی آج بھی وہ بھرا جاتا ہے اور تڑپ اٹھتا
ہے مگر اس عشق کے سلسلے میں اس کا رویہ افلاطون رہا۔
اول تو یہ کہ میں آج تک نہ جان سکا کہ اس پردہ زنگاری
میں معشوق کون ہے۔ ان بیس برسوں میں اسے بار بار کہیدا
[illegible]

...ر نہیں ہوتا صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ معاملہ رشتہ
...کا ہے۔ اور رشتہ بھی کچھ ٹیڑھا Delicate قسم کا ہے
...رے یہ کہ اس کے عشق کی یادوں میں باتیں ہیں احساس
... اٹھتی جھجکتی لکیریں ہیں۔ جھرنوں کے ترنم کی طرح بکھرتی
...ہے چڑھتی کمان جیسے تیور ہیں مگر لمس نہیں۔ اسی سلسلے
...ہ بلاغریب آدمی ہے اس کے پاس شاید صرف ایک لمس
...ت ہے جس کا تذکرہ اس نے اپنی کہانی عکس عکس ۲
...جہ شاعر میں کیا ہے اس ایک لمس کو چھوڑ کر اس کی
... زندگی کا یہ ورق بالکل سادہ ہے۔

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ حسین شاعری بھی کرتا ہے
...ہ اسے منظر عام پر لاتا تو نہ صرف بہت سے نامور شاعروں
...زیادہ مقبول ہوتا بلکہ یہ تمیز مشکل ہو جاتی کہ وہ زیادہ اچھا
...نہ نگار ہے یا زیادہ اچھا شاعر۔ جیسا کہ ابھی ہوتا ہے
...کر اس کے مضامین سن کر سوچتا ہوں کہ یہ صرف
...مین کا آدمی ہے اور اسے صرف مضامین لکھنا چاہئے۔ مگر
... کہانیاں سنتا ہوں تو پہلا خیال غلط معلوم ہوتا ہے مگر
...ہیں اپنی شاعری کو اپنے عشق کی طرح پوشیدہ رکھا ہے، شاید
...ری اس کے ذاتی محسوسات کی ترجمان ہے عجیب درد کروٹیں
...ہے۔ کسک انگڑائیاں لیتی ہیں جب کسی کا چہرہ کسی کی باتیں
...کی ہنسی کی گونج اس کے ذہن میں ہلچل مچاتی ہے جب رات
...سمان پر چاند پگھلتا ہے نرم نرم ہوائیں بادلوں میں انگلیاں
...تی ہیں اور کہیں دور ریڈیو سے کوئی پرانا گانا ہوا میں بہنے
...ہے تو حسین قلم پکڑ لیتا ہے اس کے جذبات سیال لفظوں
...امہ پہن کر کاغذ پر بہنے لگتے ہیں۔ نظموں میں حسین نہ تو مفکر
...ہے نہ محقق نہ تنقید نگار نہ جدید افسانہ نگار، وہ ٹوٹے
...ے بربط پر گایا جانے والا حزنیہ نغمہ بن جاتا ہے۔ کیسے دن بیت
...اس کا کوئی خط نہیں ملا، کیا یہ چاند وہ بھی دیکھ رہی ہوگی، کیا

...یہ ہوائیں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہوں گی۔ کیا وہ بھی
میری طرح چھت کے سب سے اونچے زینے پر کھڑی ہو کر ہلکا تا
شن رہی ہوگی۔ کتنے دن بیت گئے اسے دیکھے ہوئے، کیا ابھی
تک اس کے چہرے پر شفق پھولتی ہوگی، کچھ سوچ کر حیا سے
پلکیں جھک جاتی ہوں گی۔ بدن میں انگ پھولوں کی ڈالیوں
جیسی لچک ہوگی۔ اے چاند، کیا اب بھی۔ کیا اب بھی۔۔۔۔
کبھی کبھی اس کی نظمیں سن کر مجھے رشک آتا ہے۔

اور وہ مجھے بہت دولت مند نظر آنے لگتا ہے۔ میں نے نہ جانے
کتنے عشق کئے مگر جب بھی دل کو ٹٹولا، کوئی چہرہ، کوئی آنکھیں
کوئی لب یاد نہ آیا۔ سوچ سوچ کر اداس ہونے کی کوشش
کی۔ مگر ایسا کوئی غم نہیں، دراصل میں نے عشق کیا اور کامیاب
رہا۔ حسین کو عشق ہوا اور ناکام رہا۔ میں جیت کر ہار گیا وہ ہار
کر جیت گیا اس کے پاس یادوں کا سرمایہ ہے اور میں تہی دامن۔

حسین کو حملہ کرنے بلکہ جھگڑا کرنے میں مزہ آتا ہے
مجھے اکثر محسوس ہوا حسین صرف جھگڑے کے لئے جھگڑا کرتا ہے
اس جھگڑے سے اس نے جتنا کچھ پایا ہے اس سے زیادہ کھویا
ہے۔ اس زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں برداشت
کرنے میں برف کی سلیں سر پر پگھلانی پڑتی ہیں اور بھی غم ہیں
اور بھی مسائل ہیں نہ ہر کسی کی بات کا جواب دیا جا سکتا ہے نہ
جھگڑا کیا جا سکتا ہے مگر حسین سے کوئی غلط بات برداشت
نہیں ہوتی اور خاص کر ایسی بات جس میں اس کی ذات ملوث ہو
جب تک وہ جوابی حملہ نہ کر لے اسے چین نہیں ملتا۔ میری سمجھ
میں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کڑک کو زندگی سمجھتا ہے۔ اگر مجھ سے
کسی سے سخت کلامی بھی ہو جاتی ہے تو ہفتوں پریشان رہتا ہوں۔
آخر یہ کیسا آدمی ہے جو جھگڑا کر کے پہلے جیسا شانت رہتا ہے۔
نہ چہرے پر شکن ہوتی ہے نہ ذہن میں ہلچل۔
حسین سے کوئی کام کہہ دیکھئے ...

کر دے، اتنے خلوص سے یقین دہانی کرائے گا کہ آپ بالکل مطمئن ہو جائیں گے مگر کیا مجال جو وہ کام کر دے۔ دوسری ملاقات پر بھول گیا تھا کہہ کر مطمئن ہو جائے گا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس سے دوسرے کا کیا نقصان ہوا اور دوسرے اسے کیا کہتے ہیں۔ میں نے جب اسے ٹوکا تو اس لاپرواہی سے جواب دیا۔ آخر لوگ مجھے کام ہی کیوں دیتے ہیں، اسے خود برا کہلوانے میں بھی عار نہیں۔ دراصل وہ ہر گھڑی ہنوز میں رہنا چاہتا ہے۔

عام طور پر دو چار ملاقاتوں کے بعد آدمی ایک دوسرے کو سمجھ جاتا ہے مگر بیس پچیس برسوں کی دوستی کے بعد بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ حسین کیا ہے اور کیسا ہے۔ حسین سجادہ نشین اور مقرر ہے۔ مگر کیا مسلمان بھی ہے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہے وہ افسانہ نگار شاعر اور مضمون نگار ہے مگر کیا واقعی وہ یہ سب ہے؟ اس سے اتنے قدیم تعلقات ہیں مگر کیا وہ دوست بھی ہے، حسین الحق حسین ہے مگر کیا واقعی حسین ہے؟ شاید اسے خود بھی یقین نہیں کہ وہ جو کچھ نظر آتا ہے کیا وہی ہے؟ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب۔

مجھ میں اور حسین میں زمین آسمان کا فرق ہے، میں گوشہ نشین اور وہ مجلسی آدمی، میں ضرورت سے زیادہ حساس اور وہ حد درجہ لاپرواہ، میں کم گو اور وہ زود گفتار، میرے ملنے والوں کا حلقہ محدود اس کا وسیع اور بہت وسیع، میں گالیاں سن کر چپ رہ جانے والا وہ پکار کر گالیاں دینے والا۔ پھر وہ کون سی ان دیکھی ڈور ہے جس نے ہمیں اس سے مضبوطی سے باندھ رکھا ہے کہ میں گیا جاؤں اور حسین سے نہ ملوں وہ سہسرام آئے اور مجھ سے نہ ملے یہ ممکن ہی نہیں۔ اتنا دن گذر جانے کے بعد بھی جب ہم شام کو باہر نکلے ہمارے قدم غیر ارادی طور پر خیر شاہ کے مقبرے کی طرف اٹھ جاتے ہیں، شام کا سرمئی دھندلکا، دور ٹیلے پر کھڑا سوکھا ہوا درخت، اپنے ٹھکانوں کو لوٹتے پرندے، دور سے آتی ہوئی بیل گاڑی کی چرخ چوں ہماری طرف ٹکٹکی لگائے خیر شاہ کا مقبرہ اور بہتا ہوا پانی، ہم دونوں سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہم ان سیڑھیوں پر کب سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید پچیس برسوں سے، یہاں پہلے پہل ہم اپنے والد کی انگلی پکڑے آئے تھے پھر تنہا آئے۔ یہاں ہم نے اپنی معاشی پریشانیوں کا رونا رویا، اسکول اور کالج کے نصاب زیر بحث آئے۔ کہانیوں پر گفتگو ہوئی۔ آئندہ زندگی کا پروگرام بنا ہم خوش ہوئے تو اس سیڑھی پر بیٹھے نظر آئے اداس ہوئے تو یہیں پائے گئے اور آج بھی اسی سیڑھی پر بیٹھے ہیں۔ شارق اس سال چوتھے کلاس میں چلا گیا۔ میں نے حسین کی طرف دیکھا جو مقبرے کی گنبد پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ ہاں شارع نے بھی امتحان پاس کر لیا ہے۔ شام اور گہری ہوئی پرندے اپنے آشیانوں کو جا چکے۔ پانی میں نظر آنے والا مقبرے کا عکس غائب ہو گیا۔ ہوا ساکت ہو گئی۔ درخت سر جھکا کر سو گئے۔ ہم یہاں پھر آئیں گے تب ہماری گفتگو کا موضوع ہوگا۔ آج شارق کی بیوی نے مجھے ایسی بات کہہ دی۔

شارع اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا اس نے سوچا بھی نہیں کہ—
شام ایسی ہی سرمئی رہے گی پرندے اپنے ٹھکانوں کو جائیں گے، مقبرہ اپنی پر اسرار آنکھوں سے ان سیڑھیوں کو تکے گا اور ان سیڑھیوں پر شارق اور شارع اپنے بیٹوں کی انگلیاں پکڑے آئیں گے۔

پانی بہتا رہا ہے۔ پانی بہتا رہے گا ——"

ختم

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس
پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل ریور سائیڈ روڈ
گیا سے شائع کیا

ڈاکٹر امام اعظم

مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں عصری کوائف

مشتاق احمد نوری کا شمار نئی نسل کے افسانہ نگار میں ہوتا ہے۔ افسانے میں ریاضت سے زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور بقول نوری ان کی رہنمائی شفیع مشہدی نے کی ہے مگر نوری کے سوچنے کا انداز اپنا ہے۔ اس کا دکھ اور اس کے احساس بھی اپنے ہیں۔

افسانہ نگاری جب شاعری سے قریب ہونے لگتی ہے تو اس میں بھی ایک معنوی تہہ داری، ماورائی فضا بین السطور میں کچھ باتیں گم ہوتی نظر آتی ہیں۔ نوری نے بھی افسانے میں شاعرانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر کرشن چندر کے بجائے رینبو (Rainbo) کے انداز کی شاعرانہ کیفیت :-

" بچہ جیسے جیسے دودھ پیتا رہا اور شیوانی حال کے چٹیل میدان سے بھاگ نکلی۔ ہفتہ دس دن کے اندر ہی، راشمی نے اپنی صلاحیت کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھا دیا تھا اور شیوانی علمی اعتبار سے جتنا پاتی جا رہی تھی اس رفتار سے دن بدن خود کو کھوتی بھی جا رہی تھی۔ پانے اور کھونے کا عمل ایک ساتھ جاری رہا۔ شیوانی کو ڈر صرف اس بات کا تھا کہ کہیں پانے کا سلسلہ اتنا طویل نہ ہو جائے کہ کھونے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ رہے۔"

(ایک منھی تم۔ تلاش۔ ص ۸۲)

" سینے میں دفن درد آنکھوں کے راستے ابل ابل کر باہر آنے لگا۔ سارے حروف دھندلے ہوتے گئے اور خوابوں کے کینوس پر بکھری ہوئی آڑی ترچھی لکیریں گہری ہوتی چلی گئیں ——— اور پھر سیاہیوں میں ڈوب گئیں ———!!

خوابوں کا کینوس۔ تلاش۔ ص ۱۱۳ تا ۱۲۴

مشتاق احمد نوری نے اپنے افسانوی مجموعہ "تلاش" میں ۱۶ افسانے پیش کئے ہیں۔ کہانی عام طور پر سیدھی سادی

ہے۔ موضوع گرد و پیش کے ماحول ہیں لیکن گرد و پیش کے دائروں کو نوری نے نام دینے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے اندر جو بھی عمل ہوتا ہے وہ لازماً اپنا نقش بناتا ہے خواہ وہ آوازوں کی صورت میں ہو یا پھر مادی ٹھوس حقیقتوں کی صورت میں لیکن سماجی عمل کا کچھ ردعمل ایسا بھی ہوتا ہے جو نقش تو نہیں بناتا لیکن ایک کشمکش کی صورت ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ سماجی عمل کے ردعمل میں پیدا ہونے والی کشمکش کو نوری نے اپنے افسانوں میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دونوں سروں پر ایک احساس محرومی جب طویل ہوتا ہے تو Depression ہوتا ہے اور جب Diversion ہوتا ہے تو ایک انبساط کی لہر آتی جاتی لہروں کی طرح عالم وجود میں آتی ہے۔ نوری نے ایسا محسوس کیا کہ زندگی میں محرومی کی صورت کبھی طویل بھی ہوتی ہے اور کبھی Diversion کا سبب بھی۔ لیکن انسان خوابوں کے جزیرے بناتا ہوا چلتا ہے۔ کبھی سماجی پس منظر میں اور کبھی انفرادی خواہش کی شدت میں۔

نوری کی کہانی کبھی تو گھر آنگن کی کہانی ہے کبھی تخیل کی ان ماورائی دنیا کی حقیقت ہے۔ جس میں کہرے ہوتے ہیں اور کچھ بھی صاف نظر نہیں آتا۔ کہیں شفاف پانی والا جھیل ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے کہیں گدلا پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی کی شکست و ریخت انسان کو کبھی حوصلہ بھی دیتی ہے اور کبھی ایک نامعلوم کرب سے دوچار بھی کر دیتی ہے۔ اختر الایمان نے تو پتھر کے صنم پوجنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ گھبرا کے تو ٹکرا بھی سکیں۔ لیکن آج کا انسان اور نوری کے افسانوں کا انسان تو کوئی بت بھی تراش نہیں سکتا اور ٹکرانے اور [illegible]

ٹکڑوں اور قسطوں میں جیتا ہے تو اس کی اپنی شناخت نہیں ہوتی۔ جیسے کسی ایک ہاتھ کو کسی آدمی کو دکھایا جائے۔ کسی کی ناک پیش کی جائے۔ کسی کا بال تراش کر سامنے لایا جائے تو ان ٹکڑوں سے اس کی شناخت نہیں ہو سکتی جب تک مکمل ایک اکائی کی صورت میں اسے پیش نہیں کر دیا جائے۔ آج کا المیہ یہی ہے کہ انسان مختلف ٹکڑوں میں جی رہا ہے۔ شاید اس کی مجبوری ہے یا حالات کے تقاضے ہیں۔ آفس میں کچھ ہے، گھر پر کچھ، محفلوں میں کچھ، بند کمرے میں کچھ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شناخت کھو گئی ہے۔ نوری کے کرداروں کا بھی یہی حال ہے۔ اور دراصل کو تلاش اسی شناخت کی ہے جو اس عہد کے انسان نے کھو دیا ہے۔ اس تلاش نے نوری کو افسانہ نگار بنا دیا۔ امید ہے کہ یہ تلاش محض تسخیر ذات و کائنات تک محدود نہ رہے گی۔ بلکہ قاری کے لئے تو سوچ کے از سر نو تجزیے اور قدروں کے بارے میں نئی رائے قائم کرنے کے لئے راہیں ہموار کرے گی۔

اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشتاق احمد نوری نے افسانے کے اندر عصر حاضر کے مسائل کو بہت ہی ایمانداری سے پیش کیا ہے نیز یہ کہ زندگی اور افسانے کے درمیان جو فاصلہ تھا اور جس کے بارے میں "بازگشت" میں خود فرماتے ہیں۔

" میں اس مجموعے کی ایک کہانی اپنی ماں کو سنائی ——— ماں نے میری کہانی سن کر صرف اتنا کہا تھا۔ اس میں کہانی کس جگہ ہے بیٹا ——؟" (تلاش ص ۱۲، ۱۳)

اسے پاٹنے کا کام کیا ہے یعنی جب سچائیاں کہانی کا روپ لے لیتی ہیں یا جب کہانی سچ ہونے لگتی ہے تو اسے کہانی نہیں کہا جاتا ... اور افسانہ تو کہانی کی ایک قسم ہے جس میں چھوٹے سے کینوس میں ایک

رؤف خیر

محسن رضا اور "فن ہمارا"

جوش ملیح آبادی نے فیض احمد فیض کے بارے میں کہا
ماکہ " میں تو اپنی کشتی کے بادبان سمیٹ رہا ہوں مگر
کے بعد اس کشتی کو اور توانا ملاح مل جائیں گے "
شں کے یہ الفاظ صرف فیض کے لئے نہیں تھے بلکہ ہر اس
انا لہجے کے لئے ہیں جو اس کشتی کو سلیقے سے کھے رہا ہے ۔
ہیں ایک محسن رضا رضوی بھی ہیں ۔ انہوں نے شعر کو سخن کا
دہ کر لیا جواب ان کا فن ٹھیرا ہے ۔ رضا کی غزل کی عمارت
ادار اور کشادہ صحن رکھتی ہے ۔ (جبکہ اب عمارتیں بے
ن ہو کے رہ گئی ہیں) اس میں جو روشن دان ہیں وہ دھوپ
رخ پر اور کھڑکیاں ہوا کے رُخ پر کھلتی ہیں جن پر خوب
بہت دلکش پردے پڑے ہوئے ہیں ۔

رضا کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ بہت ہے اور اسے برتنے
سلیقہ ان کی ہنر مندی پر دال ہے ۔ رضا چونکہ " ڈاکٹر"
لے سے بھی تعلق رکھتے ہیں اس لئے اک پھول کے مضمون
و رنگ سے باندھنے کی روایت سے بھی کام لیتے ہیں ۔
کی خود اعتمادی جگہ جگہ بولتی دکھائی دیتی ہے

یہ فن تو میرے گھر کا رفیق ازلی ہے
یہ شاعری اجداد کی گودوں کی کھلائی

ہر شخص دل سنبھالنے کا بیٹھا تھا دم بخود
جب تک کہ ان کی بزم میں رضوی میاں رہے

" رضوی میاں " نے اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ وہ ۵ جون
۱۹۶۵ء کو در بھنگہ میں پیدا ہوئے ۔ اپنے پر ان کا یہ
اعتماد غیر کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے ۔

سن کے اشعار تیرے رضوی کے
دیکھ ہر شخص دنگ ہے بابا

رضا کے شعر میں جو تاثر ہے وہ ان کی علمیت اور
جذبے کی تہذیب سے آیا ہے اور یہ دولت کسی کسی کو ملتی
ہے ۔ زبان و بیان پر انھیں خاصی دسترس ہے اور یوں
بھی انہیں مرتضیٰ اظہر رضوی اور اویس احمد دوراں کی
سر پرستی حاصل ہے یہی چیز ان کے لئے فخر و غرور کا باعث بھی
ہے

وہ جس نے مجھ کو دیا علم و آگہی رضوی
اسی نے ذہن میں تھوڑا غرور رکھ چھوڑا

"فن ہمارا" کا شاعر یوں بھی خود نگری و خود آرائی میں مصروف ہے ایسے میں جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، اجتبیٰ رضوی، عنوان چشتی، شاداں فاروقی، علیم اللہ حالی کے علاوہ ان کے دونوں استادوں (اظہر و دوراں) کے ارشادات عالیہ ان کی خود اعتمادی میں اضافہ کا سبب بھی بنتے ہیں۔

سارا اشارہ سارا کنایہ اس چہرے کے نام
حرف و بیاں کا سارا سودا اس چہرے کے نام

رضا نئے لہجے کو دوست رکھتے ہیں مگر روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔

عرفان کارواں کو کہاں ان اداؤں کا
بیٹھا ہوں اور ہاتھ میں کانٹا ہے پاؤں کا

اگرچہ ملنے کو ملتے ہیں سب کے سب مجھ سے
مگر ملا نہ کوئی شخص بے سبب مجھ سے
بکھر کے کتنے ہی خانوں میں بٹ گیا ہوں میں
سنبھل نہ پائے گا اپنا وجود اب مجھ سے
رقابتوں کی گھڑی جلد آنے والی ہے
وہ لحظہ قریب آرہا ہے اب مجھ سے

رضا جدیدیت۔ سے خفا ہیں۔

غزل کے رنگ میں یارو جدیدیت کی سازش سے،
مصر کم شعوری کو نیا آہنگ کہتے ہیں
انھیں خوش رنگ کل کہنا پڑے گا دیکھتے رہیے
ہماری شاعری کو آج جو بے رنگ کہتے ہیں

بہرحال محسن رضا رضوی اپنے فن میں سنجیدہ ہیں ان کے اصنام شعر خوش تراشیدہ اور ان کی فکر بالیدہ ہے۔

زبان و بیان پر دسترس کا دعویٰ کسی کو بھی زیب نہیں دیتا۔ کہیں کہیں رضا سے چوک ہو گئی ہے۔ (تقاضائے شعریت کی وجہ سے) جس پر ان کے اساتذہ صاحبان اویس احمد دوراں اور مرتضیٰ اظہر رضوی کی نظر بھی نہیں گئی جیسے

یوں تو انسان کسی دور میں مشہور نہ تھا
لیکن ایسا بھی نہیں کہ کبھی مذکور نہ تھا

یہاں (کہ) کو (کے) کے وزن پر باندھا گیا ہے۔ اساتذہ فن اسے عیب سمجھتے ہیں۔ اک اور مطلع میں رضا نے (جگہ) کے ساتھ (پہ) استعمال کیا ہے۔ جبکہ جگہ، اس جگہ کہہ دینا کافی ہے۔

اب ہماری آنکھوں میں کس طرح کے منظر ہیں
جس جگہ پہ شیشے تھے اس جگہ پہ پتھر ہیں

اک اور غزل کے مطلع میں (لوگ) غیر ضروری اور حشو ہے

کم ہم سے اس جہان سے لوگ اہل غم گئے
ہم داغ بن کے سینۂ ہستی پہ جم گئے

ویسے بھی سینۂ ہستی کا داغ ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے

رضوی بس ایک تو ہی اکیلا بچا ہے اب
وہ لوگ جو تھے صاحب لوح و قلم گئے

محسن رضا میں اپنی بات تمام جسارت کے ساتھ کہنے کی سچی لگن ہے مگر وہ بے جا اعتماد (OVER CONFIDENCE) سے نکلیں تو اونچا اٹھ سکتے ہیں۔

(بقیہ: عصمت چغتائی)

بھی دیں۔ لیکن اہل ادب اور اہل ہنر کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ اعمال ہمیشہ انسان کے ہمراہ جدا ہوتا ہے لیکن اس کی یادگاریں تادم کائنات یا تہذیب و تمدن زندہ رہتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنان

شگفتہ طلعت سیما کی غزل گوئی

ایک ڈرامے کا سین ہے کہ ایک شخص اسٹیج پر پڑی ایک کتاب کی ورق گردانی کرتا ہے۔ کئی صفحوں کے مطالعے کے بعد اوراق پھاڑ کر پاؤں تلے دبانے لگتا ہے دوسرا شخص جو یہ منظر دیکھتا ہے — "تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟" جواب ملتا ہے کہ یکلخت حسین وادیوں میں کھو جانے کے سامان نہیں ہیں یا غم غلط کرنے کے اسباب مہیا نہیں پاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ تلخیوں، حادثوں اور گمبھیر تجربوں سے گھبرا کر انسان جائے اماں کی تلاش میں رہتا ہے لیکن گردش فلک چین لینے نہیں دیتی۔ اس لئے جو وقت گذر جاتا ہے اس کو غنیمت سمجھ کر تمام کلفتوں سے دور رہ کر حسین وادیوں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ شگفتہ سیما کی شاعری اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں دونوں کیفیتیں پوشیدہ ہیں۔ تلخ حقیقت کے کیپسول میں شیرینی عطا کرنا تاکہ حلق کے پار اتر سکے بڑی فنی ریاضت اور قدرت کی دلیل ہے۔ اس کی طرف سیما توجہ دیتی ہیں اگرچہ اس راہ میں کہیں کہیں قدم ڈگمگائے ہیں جو کسب فن کی خاطر ریاضت کا ثبوت دینے کے باوجود وہ انداز مکمل طور پر نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ جس کی طرف وہ گامزن ہیں۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ اسی طرح ریاضت کا ثبوت دیا تو مستقبل قریب میں یقیناً کامیابی مل سکتی ہے

سیما کی شاعری غزلوں پر محیط ہے اور غزل کے مزاج اور لہجہ سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کرلی ہے۔ شاعرہ جرأت مندی سے کام لیتی ہے اور آلام روزگار کے باوجود دریوزہ گری کو فعل عبث سمجھتی ہے۔

دنیا ترے سہارے کی حاجت نہیں مجھے
جو لڑکھڑا رہے ہیں تو پہلے انہیں سنبھال

سیما کی شاعری میں نرمی اور صرف برف کی طرح پگھلنے کا انداز نہیں ملتا بلکہ جرأت مندی اور سختی کی ایسی آمیزش بھی ہے جو اسے انفرادی شان بخشتی ہے ؎

آگے تو بڑھو دُور نہیں منزل ہستی
سوچو گے پھر دُوری دو گام بہت ہے

کبھی کبھی انسان خود فریبی کو لازمہ حیات اس وجہ سے بنا تا

ہے کہ وعدۂ وفا جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اعتبار کی منزل سے قریب آجاتا ہے اور غریب کاریا مخالف کو بھی دعائیں دینا پڑتی ہیں کہ اس نے زندگی کرنے کی رفتار تیز کر دی ہے اور ستم زیاد کیا تو کرم کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔

جئیں ہزار برس یہ قریب کار جئیں
کھلی ہے آنکھ مری دل پہ چوٹ کھائے ہے

عشق کا جذبہ لامتناہی اور دلفریب ہوتا ہے اور جب کسی کو دل دیا جاتا ہے تو اک روشنی زندگی میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے در کا سوالی بن کر پیار کا بھکشا مانگا جاتا ہے ؎

آنچل آنچل مانگ رہی ہوں میں بھکشا
بن کے تیرے در کی سوالی تیرے نام

اس زمین اور ردیف میں ولی دکنی نے پہلی بار غزل کہی تھی پاکستان کے ممتاز شاعر احمد فراز نے بھی اپنا جوہر دکھایا ہے۔ اس کے بعد بہت سے شاعروں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ احمد فراز کی روایت کو بڑے خوبصورت اور جدید انداز میں فنی خوبیوں کے ساتھ سیما نے برتا ہے۔

طلعت سیما نے اس زمین میں واردات قلب کو بھی ظاہر کیا ہے اور واردات زماں کو بھی۔ زمانے کی بے رحمیوں نے انسان کو اس دیار سے قریب کر دیا ہے کہ جینے کی دعا بھی نہیں چاہتا ؎

سوچ رہی ہوں لمحہ لمحہ
جینے کی یہ کس نے سزا دی
کس طرح ہو رہی ہے بسر زندگی نہ پوچھ
محسوس کر رہی ہوں پرائی ہے کائنات

ان اشعار کا مطالعہ کیجئے تو تجربے کی گہرائی و گیرائی، واردات کی قلبی ترجمانی اور محبوب کی بے اعتنائی میں بھی امید کی کرن ظاہر ہوگی ؎

سیما سے اب وہ بھی خفا ہیں
دشمن نے یہ کیسی ہوا دی ...
ترک تعلق پر بھی اس کو کب میں بھولنے پائی تھی
دیکھا تم نے نام لیا تو آنکھ مری بھر آئی تھی

رات گئے جو خواب تھے میرے، وہ بھی میرے بن دیکھے
صبح اٹھی تو میں نے دیکھا ہر تعبیر پرائی ہے

اس شعر پر نظر ڈالئے جس میں Samel Beckett کی کہانی Waiting for Godalt کی جھلک ملتی ہے۔

راہ میں آنکھیں اپنی بچھائے کب سے سیما بیٹھی ہے
شاید وہ نہیں آنے والا جس کی چٹھی آئی تھی

پروین شاکر کی شاعری کی اک جھلک شگفتہ سیما کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پروین شاکر کا کینوس بہت وسیع ہے اور سیما کا کینوس ابھی Waking پریڈ میں ہے۔ سیما کہتی ہے۔

یاد کرتی ہوں میں تمہیں اکثر
جب کبھی تم مجھے بھلاتے ہو
زندگی راہ بھول جاتی ہے
تم بھی جب مجھ سے روٹھ جاتے ہو

سیما کی غزلوں میں موسیقیت، شیرینی، شگفتگی کا ایسا تاثر ہے جو انفرادی رنگ اور شان عطا کرتا ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں ہنر مندی کا ثبوت دیتی ہے لیکن کہیں کہیں قدم لڑکھڑاتے ہیں جس کا تقاضہ ہے کہ فکر وفن کو زیادہ رلانے ملانے کی کوشش کرے۔ بعض اشعار میں ایسو

پختگی ملتی ہے جو پختہ کلامی سے قریب ہو جاتی ہے ـــــ
زمانے کے نیرنگیوں نے شاعرہ تو نت نئے تجربوں سے
قریب کر دیا ہے اس لئے وہ جب رومانیت کے کنج
سے نکلتی ہے تو کڑوی حقیقتوں سے قریب ہوتی ہے۔

راکھ کی پتہ میں چنگاریاں ہیں بھری
شعلے بھڑکیں گے اک دن ہوا تو چلے

تمام شہر جو آیا ہے گھر جلانے کو
بڑی گراں ہے میری تنہائی زمانے کو

بلند حوصلگی اور جرأت مندی دیکھئے

دیوانے جب ہوش میں آئے
زنداں کی دیوار بھی ڈھائی

کتنا پیارا شعر ہے۔ ترقی پسند مزاج کی بھرپور نمائندگی
کرتا ہے۔ مغرب اور مشرق کی صفت کے بارے میں بہت
کچھ لکھا گیا ہے لیکن مختصر لفظوں میں شاعرہ جس انداز
سے ظاہر کرتی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اسے ملاحظہ کیجئے

مغرب ظلمتِ شب کا جنگل
مشرق نورِ سحر کی وادی
کیسے تھے وہ لوگ جنہوں نے
قاتل کو شمشیر بڑھا دی

کبھی کبھی وہ عصری کیفیتوں کو خوبصورت اور رومان پرور
ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے

کوئی کرن مری جانب بھی ماہتاب وفا
ترس رہے ہیں در و بام مسکرانے کو

آخر میں اس شعر کا اندازہ کیجئے جس میں وفا بھی ہے اور بے وفائی بھی

وہ اک نام جو عنوان زندگی ٹھہرا
مری زبان پہ آیا بہو رلانے کو

دیگر

بقیہ:۔ میں حیدر علی ......

کے چکر کاٹ کر ایمپریس مارکیٹ پہنچے تو انہوں نے چند
سبزیاں، گوشتوں کا قیمہ اور بیٹ کلیجی خریدی تو مجھے
تعجب ہوا۔ وہ کہنے لگے "بھائی، کبھی کبھی گھر سے اپنی
وابستگی کا ثبوت دیتے رہنا چاہئے"

اپنے بچوں سے بھی ان کا رویہ روائتی باپ
کا نہیں ہے۔ بلکہ مشفقانہ اور دوستانہ ہے۔ ان سے
گفتگو بھی نرمی اور محبت سے کرتے ہیں۔ گھر، بیوی،
اور بچوں سے محبت کا انداز میں نے ان سے ہی سیکھا
ہے۔ اور میں اپنے لئے اسے ایک اعزاز سمجھتا ہوں کہ
وہ مجھے اپنا دوست اور بھائی سمجھتے ہیں۔ اس کے
باوجود نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے میں
علی حیدر ملک کو نہیں جانتا۔

انہوں نے جس مشن کا آغاز مرحوم مشرقی
پاکستان کے چھوٹے سے شہر کھلنا، بلکہ مہاتما بدھ
کے شہر گیا سے کیا تھا وہ مشن آج بھی جاری ہے۔
ایک استاد کے روپ میں، ایک ادارے کے روپ
میں یہاں بھی ان کے شاگردوں، دوستوں اور
چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اپنی
ذات میں ایک انجمن ہیں، ایک ادارہ ہیں ـــ اور
میں جو دنیائے ادب کا ایک حقیر ذرہ ہوں تو یہ بھی علی
حیدر ملک کا ہی فیض ہے اور انہیں کے دم سے
میں سید امان اللہ سے پہلے امان ہرگانوی بنا اور اب
یادور امان کی حیثیت سے آپ سے ہمکلام ہوں۔

دیگر

شمشی ٹنڈن

ناشاد اورنگ آبادی کی شاعری

"پرواز سخن" اور "میل کا پتھر" کے تناظر میں

ہندوستان کا صوبہ بہار دور قدیم ہی سے علم و عرفان کا گہوارہ رہا ہے۔ آج بھی جہاں تک اردو زبان کی تدریس کا سوال ہے صوبہ بہار میں صورت حال دیگر ریاستوں سے بہتر ہے۔ بہار کی سرزمین نے مایۂ ناز ادبا و شعرا کو جنم دیا ہے۔ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ بہار کی یہ پوزیشن ہنوز برقرار ہے۔ ممتاز شاعر جناب ناشاد اورنگ آبادی کا مجموعہ کلام بعنوان، "پرواز سخن" منظر عام پر آیا ہے۔ ناشاد اورنگ آبادی کی شخصیت اور شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے "پرواز سخن" کے بعد ناشاد اورنگ آبادی کا ایک اور مجموعہ کلام بعنوان "میل کا پتھر" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ "میل کا پتھر" مجموعہ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ہندی زبان ردیو ناگری رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے تاکہ وہ حضرات جو اردو سے نابلد ہیں لیکن زبان کی شیرینی و لطافت سے متاثر ہیں اردو ادب سے روشناس ہو سکیں۔

ناشاد اورنگ آبادی کے دونوں مجموعہ ہائے کلام یعنی "پرواز سخن" اور "میل کا پتھر" میں حمد شریف، نعت شریف، غزل، نظم، قطعہ گیت وغیرہ اصناف سخن کو جگہ دی گئی ہے۔

ہر مجموعہ کا آغاز حمد شریف سے ہوتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ انسان فانی ہے اور ہر ایک کام کی شروعات اور خاتمہ اسی خالق حقیقی کے نام پر کرتا ہے۔

"حمد" کے اشعار ہی سے خدائے برتر و بزرگ کے تئیں انسان کی عقیدت کے جذبات عیاں ہوتے ہیں کتنی عقیدت سے ناشاد نے اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے۔

میں ترا بندہ ہوں بیشک تو مرا معبود ہے
آنکھ سے پنہاں ہے لیکن ہر جگہ موجود ہے

تیری مرضی ہاے خدا ناشاد کو جیسا رکھے
تیری ہی خلقت ہے ساری تو ہی اک مسجود ہے

بھارت دور قدیم ہی سے طالب علم وعرفاں کے لئے مرکزو محور کی حیثیت رکھتا تھا۔ بھارت صوفیوں، جوگیوں اور رشیوں، منیوں کی عبادت و ریاضت کی جگہ اور محبان وطن کا میدان کارزار ہے۔ وطن کی عظمت کو کتنے خوبصورت اشعار میں قلمبند کیا ہے۔

چشتی، نانک، مہابیر، گوتم نے بھی
اپنے اپدیشوں سے جیتا لوگوں کا من
آنچ بھارت پہ آنے نہ پائے کبھی
یہ سبق دیتے آئے ہیں اہل سخن

یہ ہمارا وطن، یہ ہمارا وطن

ایک گیت کے ذریعہ کتنا خوبصورت اور جذبات سے سرشار پیغام ہر ایک ہم وطن کے لئے دیا ہے۔

اس کی ہی سوندھی مٹی کی خوشبو تھے شری رام
اسی پوتر دھرتی پر آئے شری کرشن گھنشیام
جن کی مرلی کی جگ میں مشہور رہے اب بھی تان
چشتی، نانک، جین اور گوتم سب تھے بڑے مہان
امن واماں کی شکچھا دیتے گیتا و قرآن
گروگرنتھ صاحب کا بھی ایسا ہی ہے فرمان

ہماری تہذیب میں مذہبی اور سماجی تقاریب اور جلسوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ درحقیقت یہ میلے ٹھیلے، جلسے جلوس، تیج، تیوہار ہماری مشترکہ تہذیب ہی کو پیش کرتے ہیں۔

ہولی ہو یا عید ہر ایک ہم وطن کے لئے پیغام مسرت لے کر آتے ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طور پر ان تیوہاروں میں حصہ لیتا ہے۔ اردو زبان کے شعراء نے مذہبی وسماجی تیوہاروں کو موضوع بنا کر اعلیٰ پائے کی تخلیقات تخلیق کی ہیں۔

ناشاد اورنگ آبادی کے کلام میں بھی جا بجا ایسی نظمیں اور اشعار ملتے ہیں جو ہماری مشترکہ تہذیب ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ھولی ــــ

ہولی ہے آج یارو، مل کر خوشی منائیں
ہولی ملن کا مل کے ہم گیت آج گائیں
آتی ہے سال بھر پہ لے کر ہزاروں خوشیاں
سارے دکھوں کو اک دن ہم بھول کیوں نہ جائیں

عید ــــ

ملئے سب سے گلے ناشاد، ہو دشمن یا دوست
کینہ دل میں کوئی رکھتا ہے کہیں عید کے دن

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف سخن ہے۔ اس صنف سخن نے ہی اردو شاعری کو عوام وخاص کے دلوں میں جگہ دلوائی۔ غزل میں عموماً حسن وعشق کو ہی موضوع سخن بنایا جاتا تھا۔ لیکن فلسفہ، اخلاق، پندونصیحت اور دیگر موضوعات بھی غزل کے اشعار میں ڈھلتے رہے ہیں۔ غزل کے ذریعہ اہل سخن نے زندگی کے ہر پہلو کو چھونے کی کوشش کی ہے۔

ناشاد اورنگ آبادی نے بھی اپنے جذبات واحساسات نیز فکر کے اظہار کے لئے غزل ہی کو منتخب کیا ہے۔ لہٰذا ناشاد نے بلاخوف و تامل بہت واضح انداز میں اپنے نقطہ نگاہ کا اعلان کیا ہے۔

ناشاد چھوڑیئے گل وبلبل کی داستاں
حالات حاضرہ پہ کوئی گفتگو کریں

بدل دوائے ناشاد طرز تغزل یہ وطن چاہتا ہے سخن بدلا بدلا

ہمارا معاشرہ روز بہ روز زوال پذیر ہے۔ مذہب، فلسفہ، اخلاق محض دکھاوے کی چیز رہ گئی ہے۔ ہر حساس شہری ہمارے قومی کردار میں ہونے والے تنزل سے فکرمند ہے۔ ناشاد اورنگ آبادی نے بھی اس زوال، تغیر و تبدل پر اپنے کلام کے ذریعہ ردعمل ظاہر کیا ہے۔

گفتار کے غازی ہیں، کردار میں عاصی ہیں
کرتے نہیں جو کہتے ہیں شعلہ بیاں والے

رہا جن کا شیوہ سدا خود فریبی
وہی حق شناسی کا دعوا کرے ہے

پلتے ہیں آس پاس ہی میں آستیں کے سانپ
کچھ اس طرح کے لوگوں سے دامن بچایئے

ناشاد اورنگ آبادی کے کلام میں قارئین کو باندھے رکھنے کا فن موجود ہے۔ اس میں سوز و گداز ہے۔ عام آدمی کی امنگوں اور جذباتوں کی نمائندگی ہے۔ زندگی میں جد و جہد اور نصب العین کے حصول کی تلقین ہے۔ پوری زندگی جوش و خروش سے جینے کا پیغام۔ شاید ذیل میں درج اشعار سے میری رائے کی تصدیق ہو۔

لوگ ہو جائیں گے خود آپ کے غم کے ساتھی
کام غیروں کے برے وقت میں آتے رہئے

شاد ہو جاؤ گے مل کر ایک دن ناشاد سے
دو دلوں کا اور بھی کم فاصلہ ہو جائے گا

آپ سیرت کی جگہ کہتے ہیں کہتے رہئے
میں تو دنیا میں فقط جائے عمل کہتا ہوں

حسن کا عالم نہ پوچھو کیا سے کیا ہو جائے گا
دیکھ لینا ایک دن یہ بت خدا ہو جائے گا

جو ہو سکے تو حیاتِ دوام پیدا کر نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

موت کو لیا جب خوشی کی طرح
موت ہم سے ملی زندگی کی طرح

ناشاد اورنگ آبادی نے قطعات علم عروض سے واقفیت اور زبان پر قدرت کی دلیل دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے سانحۂ ارتحال پر قلمبند کیا گیا۔ قطعہ درج کر رہا ہوں۔

ایک اک کر کے ستارے ٹوٹتے جاتے ہیں تمام
لگ رہا ہے آسماں بے خانماں ہو جائے گا

میر و غالب جا چکے رخصت ہوئے جوش و فراق
کیسے کہہ دوں، بے زباں ہندوستاں ہو جائیگا

ناشاد اورنگ آبادی نے بہت عمدہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ جان سے پیارا وطن، قومی ایکتا، عید ملن، ہولی، کرفیو شاد عظیم آبادی، کلیم الدین احمد اور قمر سنبھل پوری جیسے مشاہیر ادب کی نذر بھی چند نظمیں کی ہیں۔

ناشاد اورنگ آبادی خوش گو اور معتبر شاعر، اردو غزل کا سنگ میل، ناشاد اورنگ آبادی مانوس لب و لہجے اور بالغ نظر شاعر، ناشاد اورنگ آبادی کے جو انہیں اہل علم و قلم [illegible] بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون میں کہیں رقم کیا ہے کہ ناشاد اردو ادب میں اپنے لئے ایک مقام بنا چکے ہیں۔ بقول جناب مظہر امام صاحب ناشاد اورنگ آبادی کے نام اور کلام محتاج تعارف نہیں۔ وہ مانوس لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل کی نئی شعری فضا کی زائیدہ نہ سہی لیکن روایت کی پاسدار ہوتے ہوئے بھی روح عصر کی ترجمانی کرتے ہوئے نہیں جھجکتی۔ ناشاد اورنگ آبادی ایک درد مند دل رکھتے ہیں اس لئے ان کی غزل سماجی زندگی کے نشیب و فراز اور انسان کے

(بقیہ صفحہ ۶۳ پر)

وصال احمد

بیباک لہجہ کا شاعر ــ جمال اویسی

شاعری کیا عطا کرے گی مجھے
شاعری کو عطا کروں گا میں

(جمال اویسی)

مندرجہ بالا شعر پڑھنے کے بعد میر تقی میر کا مندرجہ ذیل شعر یاد آجاتا ہے ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور سچ پوچھیئے تو لفظ "فرمایا" نے اردو نقادوں کا دھیان اپنی طرف بے اختیار کھینچا تھا۔ انہیں میر کی اس شاعرانہ تعلی پر کافی اعتراض بھی ہوا تھا۔ لیکن میر کی عظمت اور بزرگی اور انکی شاعری کی فنی خصوصیت نے سبھی کے ہوش [illegible] دئے تھے۔ گویا انہوں نے آنکھ موند کر میر کے اس شعر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ایک عرصہ سے اردو کے عظیم شاعروں کے ساتھ نقاد آنکھ مچولی کھیلتے آئے ہیں۔ اردو ادب کے صفحات ایسے بہت سارے ناموں سے بھرے ملیں گے جنہیں زمانہ برسوں تک فراموش کرتا رہا۔ لیکن جب ان کے کلام کا گہرائی و گیرائی اور پورے انصاف کے ساتھ مطالعہ کیا گیا تو ایسے شعرا کے نام کو سنہری حروف سے لکھ دیا گیا۔ وقت بہت بڑا نقاد ہوتا ہے جو بڑے سے بڑے شاعر کو بھی نہیں بخشتا۔ یہ کسی بھی شاعر کو یوں ہی شہرت و مقبولیت کی بلندی سے سرفراز نہیں کرتا بلکہ اس کے کلام کو فنی خوبیوں کے میزان پر تول کر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ اردو شعر و ادب کے سمندر میں بہت سے جزیرے ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں لیکن باد سموم سے وہی بچ پاتے ہیں جس کی شاعری میں توانائی ہوتی ہے اور باد مخالف کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

بہار کی سرزمین پر صدیوں سے ایسے شعراء نے جنم لیا ہے جن کے کلام نے لوگوں کے دلوں پر ایک عرصہ تک حکمرانی کی ہے اور آج بھی ان کا کلام بھلایا نہیں جا سکتا۔ آج بھی چند شعراء ایسے ہیں جنہوں نے شاعری کی روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کو

ریب سے قریب تر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو نئی
نسل کے شعراء کی فہرست کچھ طویل ہے لیکن اس فہرست
ں چند ہی نام ایسے ملیں گے جن کا کلام چونکانے والا
ہے۔ خورشید اکبر، شاہد جمیل، عالم خورشید، شاہد
ہم، ابرار رحمانی، محسن رضا رضوی اور غالد عبادی۔
لوگ بہار کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے
ود کو وقت کی بھٹی میں تپا کر شاعری کو نئے سانچے
ں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں
کر کی پختگی، نئے نئے تجربے، مشاہدے اور اضطراری
یفیت پائی جاتی ہے جو فطری چیز ہے۔ بہار کے ان
سا اس شعراء کے درمیان ایک نام ایسا بھی ہے
اگر ان کا ذکر نہیں کیا جائے تو بات بے لطف ہی نہیں
و جائے گی بلکہ نئی نسل کی شاعری کے ساتھ
انصافی بھی ہوگی۔ میرا اشارہ "شاعری کیا عطا
رے گی مجھے ؛ شاعری کو عطا کروں گا میں" کے خالق
ناب جمال اویسی سے ہے جو لگاتار گذشتہ تیرہ[۱۳]
رسوں سے ملک و بیرون ملک کے معیاری ادبی رسائل
چھپ رہے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہنا چاہوں گا
ان کے یہاں بعض باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو کسی دوسرے
اعر کو میسر نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جمال اویسی کا لہجہ
ور سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ نئی نسل کا یہ شاعر
بھی زمانہ کی روائیتوں اور قدروں سے انحراف کرتا نظر
تا ہے تو کبھی اپنے افکار و خیالات کو غزل کے قالب
ڈھال کر باغی بن جاتا ہے۔ تبھی تو ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

ہے لفظ لفظ میرا پتھروں پہ لکھا سچ
مٹا سکو گے کہاں تک میرے قلم کے حروف
بڑے ہی تلخ جہاں سے مرا ہے رشتہ حمادؔ،
نہ لا سکوں گا غزل میں میں جام و جم کے حروف

جہاں کے لوگ ہوں معصوم سادہ
میں ایسے شہر کا شہری نہیں ہوں
مرا لہجہ یوں ہی سفاک ہوگا
وفا، اخلاق کا عادی نہیں ہوں

ممکن ہے کسی غیر کا احسان بھی ہوگا
ہر ساعت ماضی کو سرِ عام سزا دو
مت خوف کرو، تلخ سہی، سچی ہیں باتیں
تم وقت کے آگے یہ غزل جا کے سنا دو

شروع تا آخر ہر شعر شاعر کے کرب و آگہی کا بہترین
عکاس ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ انسانی کردار کے کھوکھلے
پن سے دل برداشتہ ہو گیا ہے۔ چونکہ ایک فنکار سچا
ہوتا ہے اور جب سچی بات کہتا ہے تو لوگ تلملا کر
رہ جاتے ہیں۔ شاعر اپنی دنیا کا ایک طرح سے نقاد
ہوتا ہے۔ وہ حقیقت سے گریز کرتا ہے۔ ظاہر ہے
شاعر کو دنیا کے اتار چڑھاؤ اور اس کے لقبے اور
بناوٹ کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ وہ حقیقت سے
گریز کرنا نہیں چاہتا۔ اور سماجی قید و بند کی پروا
کئے بغیر تلخ و تند کہہ ڈالتا ہے۔" مرا لہجہ یوں ہی
سفاک ہوگا۔ وفا، اخلاق کا عادی نہیں ہوں "۔ دوسری
غزل میں شاعر تنگ آکر اپنے دبے ہوئے جذبات کو
بڑی بے رحمی کے ساتھ اشعار کا جامہ عطا کرتا ہے۔

شان سے لے چلو جنازے کو
ہم نے چاہت کو مار ڈالا ہے
[illegible]

کیا کریں اپنے لب پہ تالا ہے
میری باتیں میں لخت لخت تو کیا
شہر میں کون ہوش والا ہے ؟
خوب کہتا ہے تلخ دنیا کو

میرا اویسی بڑا جیالا ہے

دو ٹوک انداز میں کہہ دینا ہر کسی کی مجال نہیں۔ بڑے سے بڑا شاعر اور فن کار چاہ کر بھی تلخ لہجہ اختیار کرنے سے گریز کرتا ہے یا پھر آنے والی رکاوٹوں کا تصور اس کے قلم کو تھام لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سچی تنقید کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

زمانہ کے بے رحم ہاتھوں سے شاید ہی کوئی بچا ہوگا ہر اِک انسان کی خواہش زمانہ کے مقبرے کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ اس دوڑتی بھاگتی دنیا میں وہی چل سکتا ہے جسے زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کا ہنر معلوم ہو۔ ورنہ خود کو ایڈجسٹ نہ کر پانے پر اس کا وجود کچل کر رہ جائے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے رنگ ڈھنگ اور تیور عجیب ہیں۔ اور جنہیں پہچاننا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے یہ دنیا کبھی ساری خوشیاں ہمارے قدموں میں سمیٹ دیتی ہے تو کبھی ہم سے سب کچھ چھین لیتی ہے۔ گویا دنیا ایک معمّہ ہے جس کا حل کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس نگری میں مفاد پرست بستے ہیں جو اپنے فائدے کے لئے دوسروں کا استحصال کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ شاعر ان سب باتوں کو دیکھ کر تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے۔

پاس آ کے بڑے پیار سے شانوں کو ملے گی
جب دور کھڑی ہوگی بہت زور ہنسے گی

دنیا کا سمجھنا تو [illegible]

یہ ہاتھ میں لے گی کبھی قدموں میں رکھے گی

یہی اشعار نہیں اور بھی کتنے شعر ملیں گے جن میں اس نوجوان شاعر کے جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے گا۔ یہ آزاد خیالی کا شیدائی اور مشرقی تہذیب کا پروردہ کہیں سے بھی تنگ نظری کا شکار نظر نہیں آتا۔ وہ ہر چیز کو سیکولر ذہن سے سوچنے کا عادی ہے۔ آج ہندوستان کی سیاست، معاشرہ اور کلچر جس راہ پر چل پڑے ہیں وہ کسی المیہ سے کم نہیں۔ سیاسی جوڑ توڑ آج کے رہنماؤں کا مقدر بن چکی ہے ہر جگہ نئے نئے فتنے برپا ہو رہے ہیں۔ گندی سازشیں رچی جا رہی ہیں۔ عوام کے جذبات کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں کہیں ذہنی سکون نہیں۔ کامیابی انہیں کے قدم چوم رہی ہے جنہوں نے خوشامد اور لالچ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔ اخلاقی قدریں پامال ہوتی جا رہی ہیں۔ مذہب، سیاست، اخلاق سب کے سب مال و زر کے میزان پر تولے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی زہر آلود فضا کو دیکھ کر شاعر کا حساس دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ یہ شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پھاڑ کر اسناد تعلیمی لیاقت کے جمال
اک دکان کھولو سیاست کی سرِ بازار تم

میں جب کبھی بھی اویسی صاحب کا یہ شعر گنگناتا ہوں تو مجھے اچانک نظیر اکبر آبادی کی یاد شدت سے آنے لگتی ہے۔ نظیر جنہیں بعض فنی خوبیوں کی بنا پر اردو شاعری کے آسمان پر تنہا درخشندہ ستارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نظیر اپنی عمر کی آخری منزل تک خوشامد اور لالچ جیسی بلاؤں سے گریز کرتے رہے۔ یہاں

تک کہ انہوں نے خود کو صرف عوام کے ساتھ جوڑے
رکھا اور اسی لئے انہیں عوامی شاعر کے نام سے بھی
جانا جاتا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو غالب اور ذوق کے
مانند دربار سے اپنا رشتہ جوڑ کر شاعر دربار بن
سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی خودداری اور انا کو بکنے
نہیں دیا۔ اس دور کی گندی سیاست نے ہر کسی کو
بے قرار و بے خواب کر رکھا ہے جہاں اہل قلم اور ذی
ہوش اشخاص کی کوئی اہمیت نہیں۔ قدم قدم پر ان کی
صلاحیت اور ان کے جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے
چونکہ میں نے شروع ہی میں یہ عرض کر دیا ہے کہ آج
کی نئی نسل کے پاس وقت کم اور مسائل زیادہ ہیں۔ اور
ہر شاعر حد سے زیادہ فرسٹریٹ ہو رہا ہے۔ انہیں
مسائل کی کوکھ سے جب ادیبی جیسا فنکار پیدا ہوتا
ہے تو اس کے فن میں تلخیوں کا نشتر کچھ زیادہ ہی تیز
ہو جاتا ہے اور یہی نشتر پڑھنے اور سننے والوں کے جسم و
جان کو چھید دیتا ہے۔

جمال اویسی کی زندگی شروع سے ہی نشیب و فراز
اور نت نئے حادثات کا مرقع رہی ہے۔ پل پل انہیں مختلف
مسائل سے دوچار بھی ہونا پڑا ہے۔ یوں کہئے کہ انہوں
نے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی زندگی کا
ایک بڑا حصہ رومانی فضا میں گزرا ہے۔ اور سچ تو یہ
ہے کہ اس عمر میں ہر شاعر کا شعری لہجہ کچھ نہ کچھ رومانی ہو
جاتا ہے۔ رومانی شعراء اپنے کلام میں حسین دوشیزاؤں کے
جسمانی خدوخال اور ان کی قاتل اداؤں کو الفاظ میں
پرو کر بڑے موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس
پیش کش میں سطحیت ہوتی ہے اور لذت جنس کا عامیانہ
اظہار ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب پڑھتے وقت کوئی تاثر
پیش نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اپنے مقصد میں پوری طرح
کامیاب ہو پاتے ہیں۔ بیشتر شعراء کے کلام میں محبوب
کی روائتیں جسمانی خدوخال، نزاکت، جفا اور وعدہ
فراموشی کی تکرار ہوا کرتی ہے۔ ان میں کوئی ایسا رومانی تجربہ
نہیں ملتا جس کو پڑھنے کے بعد ہمارے منہ سے بے ساختہ
آہ، یا واہ نکل جائے۔ مثال کے طور پر جاں نثار اختر
کا یہ بے پناہ شعر دیکھئے ؎

جب رات گئے کوئی کرن میرے برابر
چپ چاپ سے سو جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

اور اسی طرح کا رومانی احساس جمال اویسی صاحب کے اس
شعر میں بھی بدرجہ اتم موجود نظر آئے گا۔

اس نے لہرا دیا حنائی ہاتھ
وقت رخصت چھلک گئے ہم بھی

یہ کسک اور شعریت بس یہیں تک محدود نہیں ہے
بلکہ یہ اویسی صاحب کی غزلوں میں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی
ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھئے

ان کے رونے کا کیا سبب ہوگا
سخت تنہائی ہو گئی ہوگی
آگئی ہوگی یاد آوارہ
اور پلکیں بھگو گئی ہوگی
ہم متاع حیات کیا ڈھونڈیں
تیری گلیوں میں کھو گئی ہوگی

ان سب شعروں میں نہ تو نادر تشبیہیں، استعارے اور کنائے
ہیں اور نہ ہی ان میں الفاظ تراشی کے حربوں سے کام لیا گیا
ہے۔ یہ اشعار سیدھے سادے اور عام فہم ہیں۔ ان میں
ہماری گفتگو کی زبان ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے۔

تجھ سے ملنے کو جی چاہتا ہے جی

آڑے آتا ہے فاصلوں کا جھنجھٹ
ایک مدت پہ مل رہے ہیں ہم
شکوہ کرتا ہے دردِ دلوں کا جھنجھٹ
کھوکھلی شخصیت کی ہے تمثیل
کچی مٹی کے برتنوں کا جھنجھٹ

اکیلے جینے والوں کا کوئی ہمدم نہیں ہوتا
وہ غم کے چاہنے والے ہوں ان کو غم نہیں ہوتا
میں شب بھر جاگ کر جلتا ہوں تنہائی کے خیمہ میں
چراغِ راہ کی مانند میں مدھم نہیں ہوتا
اچانک چلتے چلتے ساتھ کوئی چھوڑ دیتا ہے
کسی کی بے وفائی کا مجھے اب غم نہیں ہوتا

اردو شاعری میں غزل اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے جس پر یہاں بحث مقصود نہیں، یہ ایک نازک صنفِ سخن ہے اور اس کی نازکی کا پورا پورا خیال رکھ کر ہی شاعر اپنا کوئی خیال پیش کرتا ہے۔ غزل میں اگر نازک خیالی نہ ہو تو سارہ مزہ کرکرا ہو جاتا ہے اور اس طرح غزل قارئین کے دل پر کوئی تاثر نہیں چھوڑ پاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اویس صاحب نے غزل کی ساری شرائط کو مدِ نظر رکھ کر اشعار کہے ہیں۔ کہیں بھی ان کا لہجہ ایسا نہیں ہے جس کو پڑھنے کے بعد بوریت معلوم ہو اس کے برعکس ان کے کلام میں روانی اور تسلسل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا کا بہاؤ ہے جو ایک سمت سے آتا ہے اور دوسری سمت چلا جاتا ہے۔ یہ فنی خوبیاں بھی ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتیں۔ شاعر الفاظ کی آنکھ مچولی میں کبھی فن کو مقصد پر تو کبھی مقصد کو فن پر حاوی کر دیتا ہے۔ دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا بڑا مشکل کام ہے۔ جمال اویسی کے مندرجہ ذیل اشعار میں احساسات کی دنیا آباد ہے۔ انہوں نے زندگی کا نزدیک سے مشاہدہ کیا ہے۔ ہر شئے میں زندگی کی حرکت دیکھی ہے۔ موجود سے ناموجود تک ان کی نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمال اویسی کے بعض اشعار وجدانی احساس دلاتے ہیں اور دنیا کی ہر شئے کے متعلق سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی دعوت دے جاتے ہیں۔ اب یہ اشعار دیکھئے۔

اک عرصہ ہوا روٹھ کے پیڑوں سے گئے تھے
جنگل میں کئی سال پہ لوٹے ہیں پرندے
دن بھر کی تھکن ساتھ لئے زیست کے مارے
ہر شام مری چھت سے گزرتے ہیں پرندے

میں ایک گُل نایاب گلشن نہ مرا کوئی
کھلتا ہوں دریچوں میں آنگن نہ مرا کوئی
دنیائے محبت میں مظلوم ہوں مدت سے
میں دشت تپاں جیسا ساون نہ مرا کوئی

اگر زندگی میں عزائم نہ ہوں تو وہ زندگی موت بن جاتی ہے عمل و حرکت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ روزِ اول سے ہی انسان کی فطرت میں تغیر اور تبدیلی کا مادہ رہا ہے۔ گویا انسان کی طبیعت میں یکسانیت یا ٹھہراؤ نام کی چیز نہیں ہے۔ وہ ایک چیز پالے کے بعد پھر دوسری چیز کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ اور اس سے زندگی کی ترقی ہوتی ہے۔ تبھی تو شاعرِ مشرق کہتا ہے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
کہ ملبیل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

([illegible])

بانی:- حافظ عبدالرحمٰن بسمل سسنہاروی ٭ یادگار:- زین العابدین اختر و ادریس سسنہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مشتاق
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر:- مسعود منظر
- ایڈیٹر:- جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر:- خورشید ہاشمی

معاونین:- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
- کتابت:- سید عبدالاحد گیاوی

فہرست

شمارہ ۱۲ جلد ۵۳

بدلِ اشتراک

- فی شمارہ .... ۵ روپے
- زرِ سالانہ .... ۵۰ روپے
- لائف ممبری .... ۱۰۰۰ روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ سُہیل
۷ یونیورسٹی روڈ، گیا

فون نمبر:- ۲۱۵۷۳

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام

حصولیابی کے نئے اقدامات

۲۰ نکاتی پروگرام کا خاص مقصد ہے غریبی کے خلاف شدید جنگ، ریاست میں اس پروگرام کے اہم نشانے مقرر کئے گئے ہیں اور پوری توجہ کے ساتھ ہر سطح پر اس کی حصولیابی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس پروگرام کے تحت ۹۳-۱۹۹۲ء میں حاصل شدہ کامیابیاں اور حصولیابیاں درج ذیل ہیں :۔

ـــــ سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت 2,64,252 خاندان کو مستفیض کیا گیا # جواہر روزگار یوجنا کے تحت 1036.16 لاکھ مانو دیوس کا انتظام کیا گیا # 10239 لگھو گرامین اور شلپی کے تحت اکائیاں تشکیل دی گئیں # بھومی سدھار یوجنا کے تحت [illegible] ایکڑ فاضل زمین تقسیم کی گئی # ریاست کے 188,5 گاؤں میں صاف پینے کے پانی کی سپلائی کا انتظام کیا گیا # "دو بچوں کا خاندان" کے نظریہ کے تحت 303656 لوگوں کی نس بندی کرائی گئی # بچوں کا ٹیکہ کرن پروگرام کے تحت ڈی۔پی۔ٹی کے 2075852 پولیو کے 2054708، بی۔سی۔جی کے 2273722 اور میزلس کے 1951592 ٹیکے لگائے گئے ـــــ 20,930 آنگن باڑی مراکز کی تشکیل کی گئی # مختلف یوجناؤں اور پروگراموں کے تحت 1,63,189 انوسوچت جاتی اور 1,33,267 انوسوچت جن جاتی کے خاندانوں کو مستفیض کیا گیا # بے گھر لوگوں کے درمیان 21,628 مکانات تعمیر کئے گئے # اندرا آواس یوجنا کے تحت انوسوچت جاتی اور جن جاتی لوگوں کے لئے 27858 مکانات تعمیر کئے گئے # اقتصادی نقطۂ نظر سے کمزور اور اقلیتی طبقہ کے لوگوں کے لئے 694، اور 268 بالترتیب مکانوں کی تعمیر اور تقسیم کی گئی ـــــ تنگ بستیوں میں سدھار پروگرام کے تحت گندی بستیوں میں رہنے والے 7,464 لوگوں کے لئے پینے کا پانی، علاوہ انتظام، نالی سدھار، استنان گھر، پائے خانے گلی کی تعمیر، بجلی وغیرہ کی سہولتیں مہیا کرائی گئیں ـــــ 20337 ہیکٹر میں 979.20 لاکھ پودے لگائے گئے ہیں ـــــ جن وترن پرنالی کی 686 دکانیں کھولی گئیں۔

258 گاؤں کا بجلی کرن، 2592 پمپ سیٹوں کو بجلی سے جوڑنا
8,097 اچھی قسم کے چولہوں کی تعمیر
نیز 3502 بائیو گیس لگائے گئے۔

P.RD - 3374.(20-11)93-94

نمود

نواب سید علی مظفر ریاست بہار کے ان باقیات الصالحات میں تھے جن کا تعلق تہذیبی اور ثقافتی حیثیت سے اس طبقے سے تھا جو داد و دہش، علم و فضل، تمدن و تہذیب، شرافت و امارت، رکھ رکھاؤ اور وقار و تمکنت کی گوناگوں خصوصیات کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ ان کا خانوادہ اپنے اعزاز و احترام اور علوئے مرتبت کی وجہ سے کئی پشتوں سے ممتاز رہا ہے اور گیا کی سرزمین کی علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی فضا کے لئے ناگزیر رہا ہے۔

مظفر نواب نے جب جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اس وقت سے آج تک متعدد سماجی، سیاسی اور تمدنی انقلابات نے تغیرات کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے لیکن ذاتی حالات کے تمام تر نشیب و فراز میں بھی انہوں نے خاندانی وجاہت اور نسبی شرافت کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت، خوش خلقی، خوش گفتاری، فراست، ظرافت،

فقرہ تراشی و خوش دلی اور شعر و ادب کے بے مثال ذوق و شوق کی وجہ سے قرب و جوار میں مشہور بھی تھے اور ہر دلعزیز بھی۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو دولت و ثروت کا ایک انبار پایا اور جب آنکھیں بند کیں تو اس وقت تک دنیا والوں میں اپنا سب کچھ بانٹ چکے تھے۔

سید علی مظفر (مظفر نواب) ہم سبھوں سے اتوار ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو رخصت ہو گئے۔ خدائے تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے، آمین۔ ان کے انتقال پر ملال سے شہر گیا کے علمی و ادبی اور تہذیبی و معاشرتی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے بظاہر اس کے پر ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔

ادارۂ سہیل کے اصرار پر انہوں نے غزل اور غزل گو شعراء کے سلسلے میں اپنا گراں قدر تفصیلی مقالہ "پراگندہ طبع لوگ" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ قسطیں اِدھر سہیل میں شائع ہوتی رہی ہیں اب تک اس کی ۱۳ قسطیں شائع ہو چکی ہیں جنہیں اہل ادب نے خاص طور پر پسند کیا ہے۔ چند قسطیں اور ادارہ سہیل کے پاس محفوظ ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ان تمام قسطوں کے بعد اس تحریر کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ ـــــ خدا کرے ہم اپنے اس منصوبے کو پائے تکمیل تک پہنچا سکیں۔

ادارہ سہیل مظفر نواب کے سانحۂ ارتحال پر نمناک ہے اور ان کے اعزہ کی خدمت میں بصمیم قلب تعزیت پیش کرتا ہے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ٭ غنچۂ نورستہ تیرے گھر کی دربانی کرے

اصغر علی انجینیئر

پریم چند - حیات اور فن

قسط ۱۴

— پریم چند اور آزادی نسواں —

پریم چند کا رویہ آزادی نسواں کی جانب کچھ مبہم بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ آج ہم اکثر مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات کی بات کرتے ہیں اور عورتوں کو ہر میدان میں مردوں کے مساوی حقوق دینا چاہتے ہیں۔ پریم چند کھل کر اس قسم کی مکمل مساوات کی حمایت کرتے نظر نہیں آتے۔ جہاں تک عورتوں پر مظالم اور زیادتیوں کا سوال ہے وہ سینہ سپر ہو کر ان کے لئے لڑتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بال وواہ کے خلاف اور بیوہ عورتوں کی شادی کے حق میں بلائی گئی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسے اپنی کئی کہانیوں کا موضوع بھی بنایا۔ خود بھی جیسا کہ کتاب کے شروع میں بتایا جا چکا ہے دوسری شادی ایک بال ودھوا سے کی۔ وہ بیاہ شادی کے معاملے میں ذات پات کی تقسیم کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

جس طرح ماتا دین سلیا چمارن سے تعلقات قائم کرتا ہے اور آخر برہمن ہونے کے باوجود اسی کے جھونپڑے میں آ رہتا ہے اسی طرح وہ ان عورتوں سے بھی پوری ہمدردی رکھتے ہیں جو عصمت فروشی پر مجبور ہوتی ہیں اور اسے بھی اپنے ایک ناول "بازار حسن" کا موضوع بنایا ہے۔ اسی ناول میں انہوں نے جہیز کی گھناؤنی رسم پر بھی حملہ کیا ہے۔ دراصل جہیز لعنت پر اس ناول کے مرکزی کردار سمن کو بازار حسن کی زینت بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سمن پر اس گھناؤنے پیشے کی خرابیاں جب ظاہر ہوتی ہیں تو وہ اس تعفن ریز ماحول سے پدم سنگھ اور وٹھل داس کی ہمدردی اور سہارے سے وہ آشرم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پریم چند نے اس ناول میں طوائفوں کی اصلاح کی راہ میں جو کٹھنائیاں ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔

لیکن پریم چند مغربی ممالک کی طرح عورتوں کی غیر محدود آزادی کے قائل نہیں ہیں وہ اسے ایک فرض شناس گھریلو بیوی اور ایثار کی دیوی کے روپ میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے تو پریم چند عام طور پر اور بلا تفریق جنس ایثار اور قربانی کو تکمیل ذات کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن عورتوں میں وہ اس جذبے کو خاص طور پر ابھارنا چاہتے ہیں۔ گئودان میں مالتی اور مہتا کی محبت میں یہی پہلو جلوہ گر ہے اور میدان عمل میں سکھدا اور سکینہ دونوں ہی اسی جذبے کی آئینہ دار ہیں لیکن سکینہ میں یہ جذبہ سکھدا سے بڑھ کر ہے اور اسی لئے امرکانت کا رخ سکینہ کی طرف ہے۔ سکھدا کہتی ہے۔

"میرے دل میں تو کبھی تسلیم کی یہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میں ان سے ہنس کر بولنے اور اپنے حسن و شباب کی نمائش ہی میں پڑی رہ گئی۔ نہ کبھی پریم کیا نہ کبھی پریم پایا۔ مجھے برسوں میں جو چیز ملی وہ اسے (سکینہ کو) منٹوں میں مل گئی۔"

ان کے ناول "نرملا" کا مرکزی کردار نرملا بھی ایثار اور قربانی کا کردار ہے وہ نو عمر ہے اور اس کی شادی طوطا رام سے ہوتی ہے جو ایک بوڑھا وکیل ہے اور جوان بیٹے کا باپ ہے۔ لیکن نرملا اس دائم المریض بوڑھے وکیل کے ساتھ بھی ایک فرض شناس بیوی کی طرح سلوک کرتی ہے وہ ساری محرومیوں کی آگ میں سلگتی رہتی ہے لیکن کبھی حرف شکوہ زبان پر نہیں لاتی۔ طوطا رام جب اپنی جوانمردی کے اسے فرضی قصے سناتا ہے تو نرملا سوچتی ہے "بے چارہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہے یہ سارا سوانگ صرف اسی لئے تو ہے کہ میں اپنا غم بھول جاؤں۔ آخر اب بھاگ تو بدل سکتا نہیں۔ اس بے چارے کو کیوں جلاؤں"

گئودان میں مالتی بہت آزاد ہے۔ مردوں میں بڑی آزادی سے گھلتی ملتی ہے، ان کا مذاق اڑاتی ہے، ان پر اپنی برتری جتاتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے مغرب زدہ ہے۔ لیکن آخر وہ مہتا کی محبت میں گرفتار ہو کر عورتوں کے متعلق اس کے خیالات کی قائل ہو جاتی ہے اور اپنی سطحی فیشن پرستی کو چھوڑ کر ایثار و قربانی کی مثال پیش کرتی ہے مہتا جو عورتوں کے معاملے میں پریم چند کے ہی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ فیشن پرست اور مغرب زدہ عورت کو شراب اور فرض شناس گھریلو عورت کو پانی سے تشبیہ دیتے ہوئے کھنا کی بیوی گوبندہ سے کہتا ہے: "شراب اگر لوگوں کو پاگل کر دیتی ہے تو کیا! سے پانی سے بہتر سمجھا جائے جو پیاس بجھاتا ہے۔ جلاتا ہے اور تسکین دیتا ہے؟" اسی طرح مہتا سے آزادیٔ نسواں کے جلسے میں پریم چند نے جن خیالات کا اظہار کرایا ہے وہ عورتوں سے متعلق دراصل ان کے ہی خیالات ہیں۔

"اور یہ مردوں کی سازش ہے۔ عورتوں کو اونچی چوٹی سے گھسیٹ کر اپنے برابر بنانے کے لئے ان مردوں کے برابر جو بزدل ہیں، جن میں ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے۔ جو آزادانہ نفس پرستی کی لہر میں سانڈوں کی طرح دوسروں کے ہرے بھرے کھیتوں میں منھ مار کر اپنی کمینہ خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مغرب میں ان کی سازش کامیاب ہو گئی اور عورتیں تتلیاں بن گئیں۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے کہ اس تیاگ اور تپسیا کی سرزمین ہندوستان میں بھی کچھ وہی ہوا بہہ چلی ہے۔ خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ بہنوں پر وہ جادو بڑی تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ دراصل پریم چند نے آزادیٔ نسواں کی جس تصور کو یہاں پیش کیا ہے اس کا تعلق اعلیٰ طبقوں کی مغرب زدہ

سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ قسط ۱۲

سید فضل احمد کریم فضلی

فضلی صاحب سے شرف ملاقات کا موقع تو عرصہ دراز کے بعد کراچی کی ایک نشست میں ملا۔ مگر سنہ ۴۰ء میں کلکتہ میں تیار کردہ فلم "قیدی" نے ہندوستان بھر میں ایک فلمی ادارہ کا نام ابھر کر آ گیا۔ یہ فلم فضلی برادران FAZLI - BROTHERS کی پیش کش تھی۔ رمولا RAMOLA اس فلم سے پہلے کیدار شرما (KEDAR SHARMA) کی فلم "دل ہی تو ہے" میں اپنی چونکا دینے والی اور بے ساختہ مکالمہ کی ادائیگی کی وجہ سے ہندوستان بھر میں دلوں پر چھا چکی تھی۔ قیدی کی ہیروئن بھی رمولا ہی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد فضلی برادران کے متعلق بھی عوام (فلم بیں) کو اشتیاق ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ الہ آباد کے رہنے والے فضل احمد کریم — سید فضل حسنین اور سبطین فضلی نے یہ ادارہ قائم کیا۔ اول الذکر تو ایک آئی سی ایس I.C.S. آفیسر تھے اور حکومت بنگال میں سکریٹری کے عہدے پر تھے۔ ان کا فلمی تعاون تھا۔ روح رواں فضل حسنین صاحب تھے — جنہوں نے قیدی ڈائرکٹ (DIRECT) کی تھی۔ اس فلم میں گانے آرزو لکھنوی کے تھے۔ مگر ایک غزل فضلی صاحب (فضل احمد کریم) کی بھی تھی۔ "خنجر لئے ہوئے ہو کہ ساغر لئے ہوئے۔ آ جا کسی طرح رُخِ انور لئے ہوئے"
اس میں ایک شعر بہت پسند آیا۔ "شیشے میں ہے شراب تمنا بھری ہوئی۔ قسمت کھڑی ہے ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے"
تقریباً دس سال کے بعد جب میرا قیام بمبئی میں تھا میری فلم "کھیل" تقریباً مکمل ہونے والی تھی اس زمانے میں حسنین صاحب سے ملاقات کا موقعہ ان کو ایک یو پی دہلی U.P. DELHI سرکٹ (CIRCUIT) کے ڈسٹری بیوٹرز DISTRIBUTERS میری قیام گاہ پر لائے۔ حسنین صاحب کی عزت [illegible] کی [illegible] ایک فلم فیشن (FASHION) [illegible] بنا دیا تھا۔ اس فلم میں حیندر موہنی اور [illegible] [illegible] گیا

تھا حسین صاحب کم گو ضرور تھے مگر سچی بات کہتے ہوئے نہیں جھجکتے تھے۔ مجسم اخلاق اور پھر سبطین فضلی سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستان جا چکے تھے۔ مگر بمبئی کسی کام سے آئے تھے۔ وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ لیجئے گفتگو سید فضل احمد کریم کی شاعری سے دوسری طرف مڑ گئی۔ تو اب کچھ باتیں شاعری کی ہوں۔ قیدی کے بعد میں نے کلکتہ سے ان کا دیوان بھی منگا لیا تھا (افسوس میرے بمبئی کے قیام میں گیا سے میرے مکان سے کتابوں، پکے گانے کے کچھ ریکارڈوں کے ساتھ غائب ہو گیا) ہاں تو اب کچھ اشعار جو یاد ہیں لکھ رہا ہوں۔ ایک غزل ذو قافیتین کی سنئے۔ شعر شاید ایک ہی یاد ہو یا دوسرا بھی یاد آ جائے گا تو لکھ دوں گا

رہ وفا میں جو آج تک ہم کیا کئے ہیں کیا کریں گے
یہی نہ دل جلے لوگ ہم کو کہا کئے ہیں کہا کریں گے
ہے جو گلچیں کا دست خونیں نہ اس سے بد بیں ہوں آگے
بہار آئی تو سارے غنچے کھلا کئے ہیں کھلا کریں گے

دوسرے شعر میں شاید کچھ میری یادداشت دھوکہ دے رہی ہو تو اگر کسی قاری کی نظر سے یہ غزل گزری ہو تو میری استدعا ہے کہ تصحیح کر دیں۔ دوسری غزل کے چند اشعار یاد آ گئے ہیں ان کو بھی سن لیجئے۔

دل سے خود پوچھ کر تو جنس گراں ہے کہ نہیں
فکر کیا کوئی خریدار یہاں ہے کہ نہیں
دل کے اندر ہی رہی منزل سلمائے یقیں
بیچ میں مرحلۂ وہم و گماں ہے کہ نہیں
ہم نے مانا کہ محبت ہے مصیبت لیکن
دیکھنا یہ ہے طبیعت پہ گراں ہے کہ نہیں

زبان کی سلاست کے ساتھ اپنی بات کہنے کا ڈھنگ اتنا سادہ ہی نہیں بلکہ اشعار پڑھتے وقت (داغ جیسی بے ساختگی نہ سہی) ایسا محسوس ہوتا کہ شعر کہنے میں کوئی محنت نہیں کی گئی (Effortlessly) اشعار موزوں ہوئے ہوں۔ دو اشعار اور یاد آئے۔

یاں پھاڑ کے کھا جاتا ہے اک بھائی کو بھائی
انسان کا سا ہم نے درندہ نہیں دیکھا
اس بزم سے کیوں مجھ کو اٹھاتے ہو ابھی سے
جی بھر کے ابھی میں نے تماشا نہیں دیکھا

چلتے چلتے پھر دو اشعار یاد آ گئے ہیں اس لئے عرض کر رہا ہوں۔

ابر رحمت میں برق پنہاں ہے
کیسے پھر آدمی ڈرا نہ کرے
آسماں کو برا نہ لگ جائے
پھول سے کہہ دو یوں ہنسا نہ کرے

غرض فضلی صاحب ایسے شاعر ضرور تھے جن کا کلام ادبی ذوق رکھنے والوں کو پسند آئے گا۔ اردو کے مایۂ ناز شاعر نہ سہی پھر بھی ایک خاص انداز سے شعر کہنا اور شعر میں صرف قافیہ پیمائی ہی نہیں بلکہ کسی شعر میں آپ ان کی ہنرمندی پر بے ساختہ واہ واہ کہہ اٹھیں تو کسی شعر میں جذبات کا پر اثر بیان متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(جاری)

اردو ہماری اور ہم سب
کی ایک حسین و دلکش زبان ہے
اسے دل کھول کر فروغ دیجئے

غلام ربانی
(رانچی)

قومی یکجہتی اور اردو ادب

قومی یکجہتی کے معنی انضمام کے نہیں ہیں ——
"یکجہتی" کا لفظ واضح طور پر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ
مختلف فرقے، مذاہب، تہذیبیں، علاقے ایک سمت کو
اپنائیں ایک منزل کی طرف بڑھیں۔ کثرت میں وحدت اور
یک رنگی چمن میں جلوہ صد رنگ کی کیفیت یکجہتی کا صحیح
تصور پیش کرتی ہے۔ یہ احساس کہ سب قبائے سبز میں
نظر آئیں یا ہر ایک زعفرانی لباس میں دکھائی دے یا
ملک میں ہمالہ کی وادی سے اٹھنے والی باد شمال ہی چلے
یا بندھیاچل کے اس پار سے آنے والی گھٹائیں ہی چھائی
رہیں —— قومی یکجہتی کے صحت مندانہ اور عقلی اساس
کے منافی ہے۔ یہ تصور انضمام کا ہو سکتا ہے اور یہ یک
رنگی ایسی بے کیفی پیدا کر سکتی ہے جس کا انجام چمن
کو بجلیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا ہی ہو سکتا ہے یا
آشیانے کو پھر قفس میں تبدیل کرنا ہو سکتا ہے۔
قومی یکجہتی کے تصورات کو مثبت و منفی بنیادوں
پر سوچنا ہوگا۔ مثبت بنیادوں پر سوچنا ہوگا۔ مثبت
بنیادوں پر قومی یکجہتی کے مفہوم میں ہندوستانیت کا احساس
باہمی احترام اور رواداری، وسیع النظری اور منفی بنیادوں
پر علیحدگی پسند رجحانات سے گریز ہر طرح کے تعصب اور
تنگ نظری سے بچانا شامل ہے۔ اردو شاعری کی روایات
میں قلی قطب شاہ کے دور سے لے کر دور حاضر تک ——
ہندوستانیت کا سچا احساس، وسیع النظری، آزاد مشربی
اور باہمی احترام کا جذبہ ملتا ہے جس میں بسنت، ہولی،
محرم، دسہرہ، دیوالی کے تہواروں کا ذکر، ملبوسات
زیورات، سامان آرائش، تلمیحات میں ہندوستانی
اساطیر اور اسی کے ساتھ وہ ہزارہا اشعار بھی اردو کا
سرمایہ ہیں جو دیر و حرم کا تفرقہ مٹا کر انسانیت کی تلقین
کرتے نظر آتے ہیں۔ اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے
جس کے یہاں علیحدگی پسند یا متعصبانہ رویہ ملتا ہے۔
لاکھوں اشعار کی بھیڑ میں شوقی کی ایک مثنوی اور

مومن کی مثنوی "جہادیہ" ایسی نظمیں ہیں جن میں کہیں کہیں یہ رنگ ملتا ہے ورنہ کسی اور کے ہاں بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کوئی پہلو نہیں ہے جسے قومی یکجہتی کے منافی کہا جا سکے اور اس کا سبب یہی ہے کہ اردو کا وجود ہی قومی یکجہتی کی اساس پر ہوا تھا۔

اردو جو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت بھی ہے اس کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین میں پڑی، پھلی پھولی اور قدیم تاحال کثرت میں وحدت پیدا کرنے کا موثر وسیلہ بھی رہی۔ اس کی خمیر ہندو اور مسلمانوں کے صدیوں کے باہمی ربط اور میل جول سے تیار ہوا اور اس کی اشاعت و آبیاری میں ملک کے تمام طبقوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت، رنگ و نسل اور فکر و نظر کے اپنا تعاون دیا۔ چنانچہ ذہنی و علاقائی حد بندیوں سے بالاتر اس مخلصانہ خدمات نے اردو کو ایک مکمل زبان کا درجہ عطا کیا۔ وسیع و عریض ہندوستان کے تمام خطوں میں اور سبھی طبقوں کے لوگوں میں آج بھی یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نیز دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مد مقابل روبرو کھڑا ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ان ہی خصوصیات کے سبب پروفیسر رشید احمد صدیقی کہتے ہیں۔

" ہندوستان کو سلطنت مغلیہ کی سب سے بڑی دین تاج محل، غالب اور اردو زبان ہیں۔ اردو نہ صرف ہندوستانی قومیت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے بلکہ اس ملک کی دوسری زبانوں پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ مشرق وسطی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایشائی یکجہتی کی [illegible]

چنانچہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہماری قومی یکجہتی کی تکمیل میں اردو کا بہت بڑا فروغ رہا ہے۔ ہماری قومی یکجہتی کی تشکیل میں اردو کے کردار کا پس منظر کا تعلق ہندوستان کے تاریخ ماضی سے بھی بہت گہرا رہا ہے۔

مسلمانوں اور دیگر اقوام کے باہمی طور طریق رہن سہن، رسم و رواج، زبان و بیان اور علمی و ادبی نیز سماجی ذوق و ارتباط سے جو نئی زبان وجود میں آئی وہ اردو تھی۔ اور جو نئی تہذیب ابھری وہ خالص ہندوستانی تہذیب کہلائی۔ بقول تارا چند :-

" مسلم ذہن ہندوانہ رنگ و روپ قبول کرنے لگا اور اس نے فارسی و ترکی الفاظ کو سیکھا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کو مقامی محاوروں میں جگہ دی۔ اس لین دین کا منافع ہماری تہذیب کے خزانے میں " اردو زبان " کی شکل میں شامل ہوا۔"

ہندوستانی کلچر کا ارتقا ۔ ڈاکٹر تارا چند صفحہ ۴۸)

چنانچہ مذکورہ دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری قومی یکجہتی کی تعمیر و تشکیل میں اردو زبان اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا تعلق چولی اور دامن کی طرح وابستہ رہا۔ لہذا مسلم حکمرانوں نے ہندوستانی تہذیب و روایت کے عین مطابق اردو زبان کی سرپرستی کی۔ اس لئے علم و فن، شعر و شاعری اور سنگیت و موسیقی میں زبان و تہذیب کی جھلک آج بھی نمایاں طور پر موجود ہے اور دیگر زبانوں نے فنکاروں کی طرح اردو زبان کے ادیب شعراء نے بھی عوامی بیداری کی خدمات انجام دیئے اور جنگ آزادی میں قلمی طور پر شریک ہو کر ہماری یکجہتی

کو جو استحکام بخشتا وہ اپنی مثال آپ ہے
پس ثابت ہوا کہ اردو ادب، اردو زبان کی طرح سیکولر ہے۔ سوال یہ ہے سیکولرزم کیا ہے؟ سیکولرزم کا اردو مترادف کیا ہے؟ اس پر بحث ہو سکتی ہے لیکن اس کا مفہوم معمولی فرق کے ساتھ ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کے پیش نگاہ یہ نہ لامذہبیت ہے اور نہ مذاہب کی مخالفت، نہ اس قسم کی تعقل پرستی جو مذہب کے بعض ظاہری اور مابعد الطبیعاتی پہلوؤں کو مشکوک قرار دیتی ہے بلکہ اس کا تصور یہ ہے کہ جو مسائل ملک کے سبھی باشندوں کو متاثر کرتے ہیں ان کے سلسلے میں کسی خاص مذہب (چاہے وہ اکثریت ہی کا مذہب کیوں نہ ہو) کو ترجیح دیئے بغیر ایک غیر مذہبی، دنیوی، عقلی اور مادی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرہ چاہے یک مذہبی ہو یا کثیر المذاہب، ارباب حکومت یا صاحبان اقتدار عام مفاد اور قیود، حقوق اور فرائض کے معاملہ میں کسی مذہبی نقطۂ نظر کو ترجیحی حیثیت نہیں دیں گے یہی نہیں بلکہ جہاں اور جب کبھی مذہب، جارحانہ رویہ اختیار کرے گا۔ مذاہب کی آزادی کے مخالف نہ ہوتے ہوئے بھی حکومت اسے امن عامہ اور عمومی مفاد کو نقصان پہنچانے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی تاکہ کسی خاص مذاہب کی طرف اس کا توجہی میلان نظر نہ ہو۔

قومی یکجہتی کے سلسلے میں اردو زبان و ادب کا جو حصہ رہا ہے اس کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خاں کہتے ہیں۔

" یہ امر یقینی ہے کہ حالی کی نظم "حب وطن" کا ہر ہر مصرع اس گہری محبت کا غماز ہے جو اردو کے شاعر کو اپنے وطن سے رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر خراج تحسین خاک وطن کو اور کیا دیا جا سکتا ہے؟

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی کے اس جذبۂ حب الوطن کے پس منظر میں قائد عصر سر سید احمد خاں کا وسیع المشربی وہ تصور تھا جو اس ملک کو دلہن تصور کرتا تھا جس کی ایک آنکھ ہندو تھی تو دوسری مسلمان۔ ہر صورت میں ایک کا زیاں اس دلہن کو کانا اور دوسرے کا اس کو بھینگا بناتا ہے۔

" سید و حالی کی اس روایت حب وطن کو اقبال نے اپنی وطنی و قومی شاعری کے دور میں شد و مد کے ساتھ جاری رکھا۔ ان کے پیش نظر وطن کی آزادی کا مسئلہ بھی تھا اور ہندو مسلم اتحاد بھی۔ ان موضوعات پر ان کی نظمیں ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ہمالہ، نانک اور رام قابل ذکر ہیں۔ لیکن جو دلسوزی "نیا شوالہ" میں جھلکتی ہے وہ اقبال کے عظیم وطنی و قومی شاعر ہونے کی دلیل ہے"

(اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب " ڈاکٹر کامل قریشی صفحہ ۱۲۱)

دہلی

غالب

شاعر راز ہائے سینہ گداز

گلشن مومن

ایک شاعر جلیل اور عظیم
اک متفکر، دلیل اور ندیم
نور تقدیم جس کا ذوق سلیم

ایک شاعر جدید اور قدیم
طور کیف و سرور کا تھا کلیم
جس کی فطرت شعور کی تقسیم

گل نغمہ بھی تھا وہ پردہ ساز — شاعر راز ہائے سینہ گداز
ہم گیر اس کے شعر کے اعجاز — اور فلک بوس فکر کی پرواز
عالم نکتہ داں و نکتہ نواز — سربسر ناز سربسر انداز
تنگ دستی میں بھی نوا پرداز — فاقہ مستی میں بھی مزاج نواز
گلشن ہند کا وہ زمزمہ ساز — منکشف جس پہ تھی حقیقت راز
جس کی تہہ دار فکر سوز و گداز — جس کا انداز لطف راز و نیاز
جس کو آرائش خم کاکل — وجہ اندیشہ ہائے دور دراز
جس کے ذہن رسا کی حلقہ بگوش — قدرت تار، ندرت انداز
ہند کا لوح اس کی سوچ میں تھا — گرچہ تھا مست بادہ شیراز
وہ کہ تھا نظم و نثر میں یکساں — صاحب طرز، صاحب اعجاز
آج تک گونجتی ہے دنیا میں — اس کے دل کی شکست کی آواز
اسد اللہ خاں وہ عاشق شوخ — میرا نوشہ، رند شاہد باز
انہیں فکر ہزار پہلو میں — گر پرستار، گر بت طناز
جلوہ افگن ہیں اس کے شعروں میں — جادہ زیست کے نشیب و فراز
اس کی تخئیل طرحدار و جمیل — اس کا احساس ایک یکہ تاز
کتنے ہی دفتروں پہ بھاری ہے — اس کے رنگیں کلام کا اعجاز
درحقیقت زبان اردو ہے — اس کے دم سے جہاں میں سرافراز
گرچہ مومن وہ شاعر خوش فن — تھا حق آگاہ جس کے رنگ مجاز
ایک تھا، ایک ہی رہے گا وہ — ہے کہاں اور ایسا حسن طراز
اس کا ہمسر ہوا نہیں پیدا — سب پہ غالب ہے غالب ممتاز

کیف ماضی و نور آئندہ
تا ابد زندہ اور تابندہ

سامنے جس کے مرگ شرمندہ
نام اس کا رہے گا رخشندہ

★

دوہے

● ضیاء الانجم

دروازہ مت کھولئے بھول کے آدھی رات
چور نہ بیٹھا ہو کہیں، ضیا لگائے گھات

دوہے کیا ہیں اے ضیا جیسوں مجذوب کی بڑ
ڈھونڈے سے ملتی نہیں، امر بیل کی جڑ

رہتے نہیں ہیں دن برے، سدا کسی کے ساتھ
کبھی کے ہوتے دن بڑے، کبھی کی ہوتی رات

مٹی کا یہ ٹھیکرا اس کی اپنی شان
قائم تو ہے اے ضیا اس کی اک پہچان

دنیا کو ہے جھیلنا تو جو سر رکھیئے دو
ایک رہے کاندھو پر قائم اک پاکٹ میں ہو

دل میں درد ہے ہجر کا لب پر ہے مسکان
مشکل کب ہے زندگی، جینا کب آسان

کرتے باتیں گیان کی بڑے بڑے نادان
جیسے ان کی جیب میں بیٹھا ہو بھگوان
ہونی تو ہو کر رہی لاکھوں کیا اپائے
ڈھیلا چھوٹا ہاتھ سے واپس ہاتھ نہ آئے
تنکا تنکا جوڑ کے بھون کیا تعمیر
دشمن پھونک کے چل دیئے خاک ہوئی جاگیر
جو کچھ دیکھا خواب تھا جو سنا وہ جھوٹ
ہم نے بیر کے پیڑ میں پھلتے دیکھا پھوٹ
دوش نہ دیجئے غیر کا سب کیجیے ابھیمان
انساں کا انساں ہی ہوتا ہے شیطان
خلا سے آگے بھی گیا اڑ کر ضیا خیال
اپنی دھرتی کا مگر جان نہ پایا حال
پائی بھر کی سکھ نہیں نا دھیلے بھر کی آس
بجھے گی کیسے اے سکھی من اندر کی پیاس
ہوتا ہے ہر بات کا کوئی ایک اصول
باقی سب بکواس ہے تر تاویل فضول

کیوں برگد کی چھاؤں میں، نہیں ملا نروان
دھوپ نہ جھیلی مشق کی کیا آئے گا گیان

وصل کی لذت سے ہوا دل جیب مالا مال
کھنچوائی درویش نے اپنے تن کی کھال

ضیاور امان

کراچی

غزلیں

(۱)

بھلا یہ نیند کیسی ہے جو آنکھوں تک نہیں آتی
بدن کی پیاس کتنی ہے کہ بکھیر کچھ نہیں پاتی

کلی سے پھول بننے کا سفر بس ایک لمحہ ہے
اگر رستے میں آجائے اچانک موڑ جذباتی

میں جب نادان بچے کی طرح افسردہ ہوتا ہوں
میری فطرت امیدوں کے کھلونوں سے ہے بہلاتی

میں گھر کی چھاؤں میں محفوظ تو ہوں دھوپ سے لیکن
گزرتی ہے ہوا کمرے سے میرے آگ برساتی

میں خود ہی حوصلے کو ہار بیٹھا زندگی ورنہ
میری ٹوٹی ہوئی کشتی سے دنیا پار کر جاتی

ملے ہیں کیا عداوت اور نفرت ہم کو ورثے میں
اگر یہ جھوٹ ہے دل سے کدورت کیوں نہیں جاتی

امانؔ اب تو سفر ہی زندگی کا نام ہے شاید
مسلسل میں سفر میں ہوں مگر منزل نہیں آتی

(۲)

جو اس پہ بیت گیا ہے عذاب چھپ جائے
وہ چاہتا ہے کہ اس کی کتاب چھپ جائے

سوال یہ ہے کہ خوشبو کہاں سے لاؤ گے
کسی بھی رنگ میں کوئی گلاب چھپ جائے

جبیں پہ داغ سجائے ہو بندگی کا مگر
عجب نہیں کہ عمل کا حساب چھپ جائے

یہ حادثہ ہو کہ تیرے کتابی چہرے کے
کسی ورق پہ مرا اضطراب چھپ جائے

منافقین کی فہرست میں خدا نہ کرے
تمہارا نام بصد آب و تاب چھپ جائے

وہ دن بھی آئے گا جب شہر کی ہتھیلی پر
ستمگروں کے لئے انقلاب چھپ جائے

امانؔ پیاس کی شدت سے ریگ صحرا پر
نظر فریب نہ کوئی سراب چھپ جائے

تسکینِ قلب و چشم کی ساعت کہیں جسے
وہ صبح آئے صبحِ مسرت کہیں جسے

خوشبو کی ایک موج بھی ایسی نہیں ملی
دیوار و در کی خواہشِ حسرت کہیں جسے

شاداب ہے ابھی وہ تمنا کا اک شجر
آوارگانِ دشت کی راحت کہیں جسے

اپنے ہی گھر میں غیر سے لگنے لگے ہیں ہم
یہ وہ نگر ہے وادیٔ عشرت کہیں جسے

آنکھوں کو خواب زار نہ ایسا کبھی ملا
رنگِ جمال حاصلِ نکہت کہیں جسے

لا انتہا ہیں دردِ تمنا کی وسعتیں
وہ حد کہاں کہ سرحدِ ہجرت کہیں جسے

رشتوں کا ہر درخت ہے آسیب کا شکار
آئے کہیں سے سنگِ ملامت کہیں جسے

لکھئے سعید ایسی غزل عہدِ نو کے نام
فکر و نظر کی رفعت و عظمت کہیں جسے

سعید عارف
بہرائچ

آگ دریاؤں سے گذرتا رہوں
میں مسافر ہوں دھوپ جلتا رہوں

اپنی پیشانی پہ فنا لکھ کر
وقت کی قبر میں اترتا رہوں

حکمِ عالم پناہ ہے مجھ کو
اک قصیدہ میں روز پڑھتا رہوں

چاندنی کے سنہرے کاغذ پر
پھول سا تیرا نام لکھتا رہوں

مقتلِ جاں میں شور ہوتا رہے
میں اناؤں سے جنگ لڑتا رہوں

شاہراہوں پہ کب تلک آخر
حادثوں کا شمار کرتا رہوں

روز نیزے پہ میرا سر اچھلے
روز سچ بات پھر بھی کہتا رہوں

موسمِ گل تمہارے چاروں طرف
اور میں بارشوں میں جلتا رہوں

ڈاکٹر آفاق فاخری
فیض آباد

نعمان شوق
آرہ

وہی ہم ہیں، وہی گرتے ہوئے مینار مولانا
مگر اونچی ہوئی تو آپ کی دستار مولانا
دعا کے زور سے ہی سر نہ ہوگا معرکہ کوئی
کہاں رکھ دی اٹھا کر آپ نے تلوار مولانا
کسی دن ان سے ہندوستان بھی خالی کرالیں گے
چلو مسجد تو دینے کو ہوئے تیار مولانا
سمجھ جائے گی دنیا آپ کے چہرے کی لالی سے
ابھی تک کیوں ہماری قوم ہے بیمار مولانا
اگر ابلیس کی سرکار بن جاتی ہے مرکز میں
وزارت کے وہاں بھی ہوں گے دعویدار مولانا
عدو کو زیر کرنا تو بہت آسان ہے لیکن
ہماری پشت پر ہے آپ کی تلوار مولانا
ڈراتے ہیں ہمیں دوزخ سے اپنی سوچئے حضرت
ہمارے سامنے ہے آپ کا کردار مولانا

عین الحق ناشاد اورنگ آبادی
سمستی پور

ہیں مشہور جن کی سیہ کاریاں
سکھاتے ہیں مجھ کو وفاداریاں
بہت ہو چکیں اب ختم کیجئے
چلیں گی نہ اب یہ اداکاریاں
مرے خوں سے رنگین کر کے لباس
دکھاوے کی کرتے ہیں غمخواریاں
شجر کاٹنے میں جو معروف تھے
وہی کر رہے ہیں شجرکاریاں
جلانے کی سوچو نہ میرا مکاں
جلا دیں گی تجھ کو بھی چنگاریاں
میں ناشاد ہوں شاد ہو جاؤں گا
مرے کام آئیں گی دلداریاں

جینت پرمار

نکل بھاگنے کے لئے منتظر
بدن کے شکستہ کھنڈر سے قمر
کبوتر کی آنکھوں میں پھیلا ڈر
چمکتے ہیں بلی کے ناخن نظر
سیہ فرش پر عکس مرجھا گئے
ہواؤں میں گم ہو گیا ہے ظفر
کوئی سایہ پتھر سے ٹکرا گیا
گرا ہانپتا وقت کی پیٹھ پر
چمکنے لگیں لمس کی تتلیاں
رگوں میں ہوا خواہشوں کا سفر
ہر اک پھول کا جسم ننگا کیا
مگر ہاتھ آئے نہ تتلی کے پر
زمیں میرے قدموں سے ہٹنے لگی
خلا میں جو چمکی کوئی رہ گزر

❀

غزلیں

جمال اویسی، دربھنگہ

وہی بکھری فضا ہے اور میں ہوں
لرزتا آئینہ ہے اور میں ہوں
گھرا ہوں رات کی تنہائیوں میں
مرے گھر کا دیا ہے اور میں ہوں
تری باتوں میں کتنی گتھیاں ہیں!
مرا لہجہ کھلا ہے اور میں ہوں
بڑا پُر کیف منظر ہے یہاں کا
دعا کا سلسلہ ہے اور میں ہوں
چتا کی آگ باقی ہے اویسیؔ
سمے ٹھہرا ہوا ہے اور میں ہوں

ان کے رونے کا کیا سبب ہوگا
سخت تنہائی ہو گئی ہوگی
آ گئی ہوگی یاد آوارہ!
اور پلکیں بھگو گئی ہوگی
روشنی راستوں کی رہبر تھی
رہگزاروں میں سو گئی ہوگی
ہم متاعِ حیات کیا ڈھونڈیں
تیرہ گلیوں میں کھو گئی ہوگی
شام کل تک تھی میری باہوں میں
آج غیروں کی ہو گئی ہوگی

❀

غزلیں

اظہر نیّر
بھلائی نگر

ہر ایک راہ میں امکانِ حادثہ ہے ابھی
کہ کھو نہ جاؤں اندھیرے میں سوچتا ہے ابھی

وہ کھو گیا ہے کہیں بھیڑ میں تو کیا کیجئے
جو دکھ ہے اس کے نہ ملنے کا وہ جدا ہے ابھی

ہر ایک شخص کے چہرے پہ خوف طاری ہے
نہ جانے کون اندھیرے میں چیختا ہے ابھی

سکون تیرے تصور سے جس کو ملتا ہے
وہ تیری دید کو لیکن ترس رہا ہے ابھی

تمام عمر وہ چلتا رہا ہے صحرا میں
گھنے درخت کے سائے میں جو کھڑا ہے ابھی

ٹھہر گئے ہو سرِ راہ کس لئے آخر
چلے بھی جاؤ کہ کوئی بلا رہا ہے ابھی

نہ دیکھو بھول سے نیّرؔ نقاب سے باہر
لہولہان مناظر کا سلسلہ ہے ابھی

کفیل الوریٰ
آرہ

کئی صدی سے میں تنہا یونہی اڑان میں تھا
زمیں تھی پست کہ میں نیلے آسمان میں تھا

جو رات ڈس گیا جلتے ہوئے چراغوں کو
وہی اندھیرا چھپا دن کے سائبان میں تھا

جو دیکھنا ہے تو جی بھر کے دیکھ لو مجھ کو
کہ یہ تماشا بھی ہونا مرے گمان میں تھا

لگی ہے آگ لہو رنگ منظروں کی قسم
لپک رہا ہے جو شعلہ مرے مکان میں تھا

جو سایہ جسم سے لپٹا وہ ہم سفر ٹھہرا
اکیلے پن کا مگر سلسلہ بھی دھیان میں تھا

خطا ہوا ہے نشانہ تو غم نہیں انورؔ
کہ ایک تیر تو باقی ابھی کمان میں تھا

مشرف عالم ذوقی

مسلمان قسط ۱

(غلامی کے آخری دنوں سے ۱۹۸۶ء تک)

نواب الطاف حسین کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ گزرا ہوا کل جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وقت بدل چکا ہے نواب صاحب .... تم اس نئے وقت کی آواز کیوں نہیں سن پا رہے ہو۔ لیکن نئے وقت یا بدلتے حالات کی ستم ظریفی ان کے چہرے پر لکھی تھی۔ چہرہ آڑی ترچھی لکیروں سے بھرا ہوا۔ پرانی یادوں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا تھا۔

اندر کا آدمی جیسے اچانک ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا .....

وہ دن ختم ہو گئے الطاف حسین ....
ختم ہو گئے ....
پرانے دنوں کو اب بھول جاؤ الطاف حسین..
بھول جاؤ......

ذہن میں جیسے نگاڑے بج رہے تھے ... ڈھم ... ڈھم .... ڈھم ..... حویلی کی رونق اور آب و تاب نوجوانی تک قائم تھی۔ فرنگیوں کی حکومت تھی تو نواب کے ٹھاٹ باٹ ہی نرالے تھے .... آزادی نے یہ سب اچھے دن چھین لئے زندگی نے کیسے کیسے دن دکھائے تھے... کوٹھی کی جھڑتی دیواروں اور بے رونق ہوتی محرابوں کو دیکھ رہے تھے۔

اور جیسے یہ جھڑتی دیواریں اور محرابیں ان سے محو ہمکلام تھیں۔

میاں الطاف حسین! وہ لوگ کہاں گم ہو گئے جن پر ناز کیا کرتے تھے تم ....؟ فرنگیوں کی پھیکی ہوئی، چوسی گئی گٹھلیاں بھی کام نہیں تمہارے؟ اس نئی ہوا کا مقابلہ کیسے کرو گے؟ لوگ جان چکے ہیں کہ اب اس شاہانہ بدن میں الجھنوں اور فکر کے ہزاروں پیوند لگ چکے ہیں .... سب کچھ جیسے نیلام ہونے کو آ گیا ہے۔ تمہیں احساس ہے الطاف حسین .....

اپنے لڑکوں سے ملے ہو کبھی۔ آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کی ہے؟ آنکھوں میں جھانکا ہے؟ نفرت کے شعلوں کی جھانس محسوس کی ہے کبھی ——

اب اس بے خودی کے مصنوعی لبادہ کو اتار پھینکو الطاف حسین .....

الٰہی —— جیسے اپنے کپڑوں سے بُو اٹھتی محسوس ہوتی... انہیں لگتا ہے، وہ باہر نکلتے ہیں اور لوگ ان کی ختم ہوتی نوابی شان کا مذاق اڑاتے ہیں... دیکھو وہ جا رہا ہے، بگڑا نواب، پھوٹی کوڑی کا محتاج نواب... ارے میاں ہاتھی بھی مر گیا۔ رسی بھی جل گئی۔ اب صرف جھوٹی نوابی شان رہ گئی ہے۔ اس کو ڈھو رہے ہیں نواب الطاف حسین۔

وہ جیسے پسینے پسینے ہو گئے۔ چونکے اس وقت، جب پاس آکر ثمینہ بیگم کھڑی ہو گئیں۔

خیالوں، خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر نواب صاحب نے دیکھا... ان جانی پہچانی آنکھوں میں بھی، اسی نفرت کے دھدھکتے شعلے تھے، جو اب بدلتے حالات کے ساتھ ان کا مقدر بنتے جا رہے تھے۔

ٹہلتے ہوئے نواب صاحب اچانک پلٹے۔

ثمینہ بیگم نے آگے بڑھ کر پان کا طشت بڑھایا۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

بُرا نہ مانئے تو ایک بات کہوں۔ پان اب کم کر دیجئے نواب صاحب۔ مہنگے ہو گئے ہیں۔

مہنگے ہو گئے ہیں؟

نواب صاحب ایکدم سے چونک گئے... جیسے اس لفظ کی ذلت پر غور کر رہے ہوں۔ اندر کی کشمکش نے ان

کیا کیا کم کروں بیگم صاحبہ۔ کیا کیا کم کروں۔ اب کہو گی ایک وقت کا کھانا کم کر دیجئے۔ گرانی آگئی ہے،

وہ دن بھی آسکتے ہیں نواب صاحب ....،

ہمیشہ چپ رہنے والی اس جان کو آج جانے کہاں سے زبان مل گئی تھی۔

کیا؟

نواب صاحب غصے سے تھر تھر کانپنے لگے۔

تم کیا جانو ہماری شان و شوکت۔ بیگم صاحبہ۔ وہ لفظ ہی نہیں ہیں ہمارے پاس کہ اس سنہرے دور کو لفظوں میں اتار سکوں۔ ہم ہمیشہ دینے والے ہاتھ رہے ہیں۔ نواب عاشق حسین کی حویلی تھی یہ۔ جہاں سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہ گیا۔ اور آج نواب عاشق حسین کے وارثوں کے نصیب میں یہ دن دیکھنا لکھا ہوا ہے کہ ان سے کہا جا رہا ہے — پان کم کر دیجئے نواب صاحب — مہنگے ہو گئے ہیں۔

ثمینہ بیگم نے غور سے نواب صاحب کا چہرہ دیکھا۔ آج برسوں بعد جیسے ان کے صبر کا باندھ پوری طرح ٹوٹ گیا وہ زور سے دہاڑیں —— جب نو من تیل تھا تب رادھا ناچتی تھی نواب صاحب — آپ ہیں کہاں، آج نہ نو من تیل ہے نہ رادھا ناچے گی۔ کل دینے والے ہاتھ تھے تو گھر بھی چیزوں سے بھرا تھا۔ آج مانگنے والوں کو کیا دیں گے آپ؟ بنئے، دودھ والوں کا ادھار چڑھتا ہے تو گوالے سے آئی آمدنی کا انتظار کرنا پڑتا ہے — کیسے جھوٹ بولتی ہوں میں — آپ کے ہاتھوں کو کبھی یہ بھی توفیق ہوئی کہ میرے واسطے دو کانچ کی چوڑیاں ہی لے آتے۔ بیوی ہونے کا بھی کون ساحق دیا ہے آپ نے۔ دادا پردادا کی بھی کبھی جاگیریں نہ ہوتیں تو آج پورا خاندان سڑکوں پر

بولئے، جھوٹ بولتی ہوں میں ——
جواب دیجئے نواب صاحب ——
نواب صاحب جیسے اچانک غصے میں بھر گئے۔
کہنے لگے کیا —— ثمینہ بیگم کی باتوں میں جھوٹ ہی کیا تھا۔ بولتے
بولتے ثمینہ بیگم کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔ آنکھوں میں امڈے
آنسو کے قطرے کو بڑی مشکل سے ضبط کیا۔
پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں
نواب صاحب۔ حیرت زدہ خالی دروازہ کو گھور
رہے تھے۔

قریشہ کالج سے لوٹی تو اس کا پارہ چڑھا ہوا
تھا۔ وہ فرسٹ ایر میں تھی۔ کمرہ میں لوٹی تو انور کتابوں
میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ قریشہ نے کتابیں اتنی زور سے پھینکیں
کہ انور ایکدم سے چونک گیا۔
بات کیا ہے قریشہ؟
قریشہ کے قدموں کی مانوس آہٹ پہچان کر افروز
بھی چلی آئی۔
قریشہ زور سے بولی —— یہ ملک اب رہنے کے لائق
نہیں ہے۔
ہوا کیا؟
میں پوچھتی ہوں کتنے لوگ ہیں ایسے —— مٹھی بھر ——
مٹھی بھرنا —— پھر مٹھی بھر لوگوں کا الزام پوری قوم پہ کیوں
عاید ہوتا ہے۔
تم پہیلیاں بجھاؤ گی یا کچھ کہو گی بھی۔
سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کہوں —— کیسے کہوں۔
میری ایک سہیلی ہے —— ونیتا —— آج میرا اس سے جھگڑا
ہوگیا —— وہ کہتی ہے کہ کرکٹ میں جب پاکستان جیتتا ہے تب
تم خوش ہوتے ہو۔ مسلمانوں کو ہندوستان سے زیادہ پیار
پاکستان سے ہے۔ پاکستان کے ہارنے پر تم ماتم مناتے ہو
اور جیت کی خوشی میں پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔
پاکستان سے ہماری عقیدت ہے۔ اس کی ایک
وجہ تو یہ ہے کہ وہاں ہم میں سے، بہت سے لوگوں کے عزیز
اور رشتہ دار رہتے ہیں۔ دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح
وہ بھی ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ لیکن جہاں وہ مسلمان تنگ
نظر ہیں جو ایسے مٹھی بھر لوگوں کو ہندوستان کے تمام
مسلمانوں کی آواز سمجھتے ہیں،
انور معصومیت سے بولا۔ اس میں اس قدر ناراض
ہونے کی کیا بات ہے قریشہ۔ چند غلط لوگ ادھر بھی ہیں اور
بھی —— ہندوستان جیتتا ہے تو تم کس قدر ایکسائیٹڈ ہوتی
ہو۔ ہوتی ہو کہ نہیں ——؟
ہوتی ہوں —— مگر ایسا سوچنے والے؟
یہی لوگ تو بوند بوند کرکے ایک سرکش جماعت میں
بدل جاتے ہیں۔ ملک میں ہونے والے خون خرابے کے ذمہ دار
ہیں یہی لوگ —— کیوں افروز —— تمہارا کیا خیال ہے؟
میں کیا جانوں —— افروز دھیرے سے مسکائی ——
آپ لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتی ——
مگر سوچتی ہوں آپ کی باتوں میں دم ہے۔ یہی ہونا چاہئے۔
بہت دیر بعد افروز نے اس بحث میں حصہ لیا تھا۔
صحیح بات یا فیصلہ کی کمی میں کوئی غلط بات ذہن پر
بیٹھتی چلی جاتی ہے۔ جیسے طوائف۔
اچانک وہ ٹھہر گئی۔ قریشہ اور انور حیرت سے
اسے دیکھنے لگے۔ لیکن افروز کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی
پھیلی ہوئی تھی۔
کوئی طوائف اگر کسی مجبوری سے اس پیشہ میں
آگئی ہے تو ایک بار کے بعد وہ اس دلدل میں پھنستی ہی چلی

جاتی ہے — اس لئے کہ تب اسے یہ سمجھانے والا کوئی نہیں
ہوتا کہ اس دلدل کی کوئی حد نہیں ہے — اور یہ کہ —
صبح کے بھولے کو شام کو گھر واپس آنے کے لئے عمر کی کوئی
قید نہیں ہے۔ طوائف یہی بات نہیں سوچ پاتی — اور وہ
کند ذہن مسلمان بھی — اور وہ ہندو بھی — جو سب کو
ایک ترازو میں تولتے ہیں۔

افروز کو اچانک لگا —— وہ کچھ زیادہ ہی
بول گئی ہے — اتنی زور سے شرم آئی کہ اس نے ہتھیلیوں
سے منہ چھپا لیا۔

انور اور قریشہ نے، اس کے چپ ہوتے ہی زور
سے تالیاں بجائیں —

قریشہ بولی — میں سمجھتی تھی کہ میری بنو کے منہ
میں زبان ہی نہیں ہے۔

انور کو بھی حیرت تھی — تم بالکل ہمارے ہی خیال
کی ہو افروز،

افروز دوبارہ مسکرائی — صحیح اور غلط خیال کیا
ہے بھائی جان — سب سے بڑی چیز تو انسانیت ہے۔

بولنے کو اتنا تو بول گئی افروز لیکن اندر ہی اندر
وہ ڈر بھی رہی تھی۔ کہیں قریشہ اور انور حقیقت نہ سمجھ
جائیں کہ وہ ... کون ہے ... نواب صاحب کی ناجائز اولاد۔

اس بیچ شہر کا ماحول تھوڑا سا ٹھیک ہوا تھا ——
سلمان میاں کی گرفتاری کے بعد بھی ان کے لوگوں نے کافی
ہنگامے کئے تھے۔ شہر میں بدامنی پھیلانے کے ذمہ دار بھی وہی
تھے۔ جلوس بھی ان کی ہی قیادت میں نکلا تھا۔ پتھراؤ اور
ہنگامے کے بعد وہ کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ لیکن پولس
جب قرقی ضبطی کو آئی تو انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے ——

پولس فورس اور انتظامیہ نے دوبارہ ہونے والے دنگوں
کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا۔

ماحول اب کچھ کچھ ٹھیک تھا۔

افروز نوابی خاندان کے کھوکھلے پن اور مرے ہوئے
ہاتھی کی حقیقت جان چکی تھی۔ وہ وقت کے انتظار میں تھی
کہ کب نواب صاحب خالی ہوں اور وہ ان سے اپنے واپس
جانے کی بات کرے

مگر نواب صاحب کی تو دنیا ہی مختلف تھی۔ بائی اماں
کے گذر جانے کے بعد، اب ان کی باہری مصروفیت، بھی تقریباً
بند ہو چکی تھی —— دن بھر کمرے میں پڑے رہتے۔ کسی سے
نہ کچھ بولتے نہ سنتے۔ ایک انور ہی تھا جو لے دے کر نئی نئی
گفتگو لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن نواب صاحب ہمیشہ ہی ایسی
گفتگوؤں سے کنی کاٹنے کی کوشش کرتے۔

شام کے وقت گولہ سے اسحاق سبزی والے کا چھوٹا
بھائی بھولو آیا تھا۔ بھولو کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کئی
قتل کر چکا ہے۔ چہرے سے بھی وہ بدمعاش دکھتا تھا۔ بھولو
نے مہینے کے پیسے انور کے ہاتھوں میں تھمائے پھر کڑک کر
بولا ——

" انور بابو —— سب حساب کتاب برابر ——"

" مطلب —؟"

انور ایکدم سے چونک گیا۔

بھولو تیوریاں چڑھا کر بولا — مطلب ای کہ ہمارا
گھاٹا جا رہا ہے۔ ہم نواب صاحب کو اب ٹیکس نہیں دیں
گے۔ جو کرنا ہے کر لیں — ہم بھی تیار ہیں۔

بھولو نے آنکھیں دکھائیں اور دندناتا ہوا چلا گیا
انور غصے میں، مٹھیوں میں روپے دابے اندر آیا۔ اتفاق

چائے پی رہے تھے۔

امی جان نے غصے میں بھرے ہوئے انور کو دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔

کیا بات ہے انور؟

بھولو پیسے دیکر گیا ہے۔ آئندہ ماہ سے پیسے نہیں دے گا۔

• کیا مطلب؟

نواب صاحب کی چائے چھلک کر ان کی چھچاتی شیروانی پر گری تھی۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تو صرف ایک شروعات ہے ابا حضور۔ بھولو دوسرے سے کہے گا۔ دوسرے تیسرے سے، پھر گولہ سے ہونے والی آمدنی کا واحد ذریعہ بھی بند ہو جائے گا۔ پھر کہاں سے کھائیں گے آپ؟ حویلی کو کتنے دن تک چاٹیں گے۔

حویلی .... حویلی .... حویلی ......

غصے سے بھرے ہوئے نواب صاحب نے شیشے کا کپ اور طشتری دیوار پر دے ماری۔ یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا لوگوں نے۔ وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔

بیچ دو حویلی — ننگے ہو جاؤ — فقیر ہو جاؤ۔

جہنم میں جاؤ — تم — تم سب لوگ

اور سب کو حیرت زدہ چھوڑ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

(باقی آئندہ)

براہ کرم اپنے مضامین اور خطوط صاف اور خوش خط ارسال کریں

(بقیہ :۔ پریم چند)

عورتوں سے ہے اور ان کی یہ تنقید اس نقطۂ نظر میں ایک حد تک حق بجانب بھی ہے۔ کیونکہ اعلیٰ طبقوں کی ان فیشن پرست عورتوں نے آزادی اور مساوات کا بڑا ہی کھوکھلا تصور قائم کیا ہے وہ مساوات کی ذمہ داریوں سے قطعاً بے پرواہ ہیں لیکن پریم چند نے اوپری طبقوں کی فیشن پرست عورتوں کے تصور آزاد کو لے کر اپنی رائے قائم کر لی اور آزادئ نسواں اور جنسی مساوات کا محدود تصور بنا لیا۔ عورتوں پر گھر کی تمام ذمے داریاں عاید کر کے انہیں گھر سے باہر کی دوسری سماجی ذمہ داریوں اور حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ہندوستان میں بھی غریب طبقوں کی عورتیں آج بھی زندگی کی جدوجہد میں ہر طرح سے مردوں کی شریک ہیں۔ خود پریم چند کے ایسے کردار وہ دھنیا ہو یا سلیا گھر سے باہر اپنی روزی روٹی کماتی ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہوتی ہیں۔ وہ گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتیں۔ دراصل پریم چند کا گھریلو عورت کا آئیڈیل ہندوستان کے اس دور کے متوسط طبقے کا آئیڈیل تھا۔

" ادبی نقوش " کا تازہ شمارہ شائع ہو چکا

رابطہ :۔ مکتبہ غوثیہ، نیو کریم گنج، گیا

جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ ضرور ارسال کریں

نسیم بن آسی

پہلی تاریخ
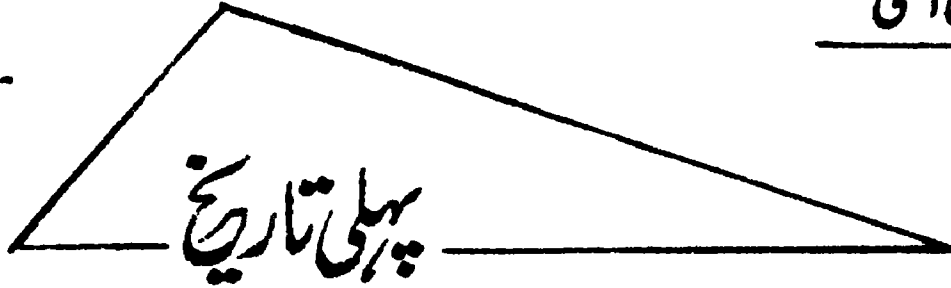
دوپہر کو جیسے ہی رشید بابو لنچ کے لئے اٹھے، آفس میں فون آیا۔ رشید سے کہ ان کی ماں نہیں رہیں۔ یہ سنتے ہی ان کے اندر کا سارا کرب ان کے چہرے پر آگیا۔ پھر وہ نمی جو دیر سے کہیں رکی تھی۔ یکایک ان کی آنکھوں میں آگئی۔ پھر وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کے سامنے ماں کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ تھا۔ ابھی مہینے کا آخری ہفتہ تھا اور تنخواہ پہلی تاریخ کو ملنے والی تھی۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے صاحب کے پاس گئے۔

"صاحب! مجھے چھٹی چاہیئے!"

"کیوں؟"

"میری ماں ——"

"میں سمجھ گیا۔ وہ بیمار ہے۔"

"نہیں، ان کا انتقال ہوگیا!"

"کیسے معلوم!"

"گھر سے فون آیا ہے۔"

"تمہارے گھر میں فون بھی ہے؟"

"پڑوس میں ہے صاحب!"

"ٹھیک ہے جا سکتے ہو۔ لیکن یہ بات سچ نہیں ہوئی تو پھر کبھی چھٹی نہیں ملے گی۔ آج تم نے شاید پانچویں بار ماں کے نام پر چھٹی مانگی ہے۔"

"صاحب —— تین سال سے ماں چارپائی پر پڑی تھی۔ بس آج کل ہو رہا تھا۔ مجھے تو دن میں کئی بار اس کے مرجانے کا گمان ہوتا رہا ہے۔"

"اچھا جاؤ۔ ڈونٹ ویسٹ ٹائم!"

صاحب نے پھر منہ میں سگریٹ دبالیا ——

رشید بابو اپنے شانوں کو جھکائے آفس سے نکل گئے۔ دھوپ تیز تھی جس کی آنچ انہیں بھی لگ رہی تھی۔ پچاس کی سرحد چھو رہی ہو تو ہر موسم اثر انداز ہونے لگتا۔ انہوں نے اپنی پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور اسے اپنے سر پر باندھ لیا۔ وہ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ پسینہ ان کے چہرہ کی گرد دھونے کی ناکام کوشش کرنے لگا جو کسی طرح دھل بھی نہیں رہا تھا۔ ایسے تو ان کی پوری زندگی دھوپ میں گزری تھی لیکن آج کی دھوپ کچھ اور ہی تھی۔ جب ہی [illegible] سے آواز آئی

رشید بابو —! آج بہت جلد گھر جا رہے ہو — دفتر میں کام وام نہیں ہے کیا —؟ انہوں نے رکتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لکھن ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا جس کی دکان سے وہ اکثر سامان وغیرہ خریدا کرتے تھے — بھئی میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے — گھر جا رہا ہوں — لکھن نے ماں کی موت کی خبر سنتے ہی اپنا چہرہ مصنوعی طور پر غمگین بنا لیا، اور اپنے سر کو جھکا لیا — جیسے اپنی کسی غلطی کا ازالہ کر رہا ہو —

کبھی فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور پلک جھپکتے ہی طے ہو جاتے ہیں۔ لیکن آج گھر کا فاصلہ کچھ ایسا طویل ہو گیا تھا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اب جو قدم اٹھ رہے تھے — آج کیا کیا انتظام کرنا ہوگا — کفن کا کپڑا، گورکن کی مزدوری، اور مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام — باپ کے انتقال کے وقت اتنی مہنگائی کہاں تھی — آج کل تو ہر چیز کی قیمت [illegible] مجبور ہے۔ اب تو کوئی پیدا ہوتا ہے جب بھی سوچنا پڑتا ہے [illegible] — گھر میں چھ نفوس کا خرچ ہے [illegible] بچے — گڈو نے اسی سال بی اے [illegible] اور وکی کے لئے ٹیوشن کا بھی [illegible] ان کا علاج اور مہمانوں کا آنا جانا — سب اسی محدود تنخواہ میں کرنا [illegible] مہینہ کا آخری ہفتہ شروع ہوتے ہی زرینہ کی سماعت خراش آواز کانوں میں پڑنے لگتی — منی کا تیل ختم ہو چلا ہے۔ آٹا بس چار ہی دن کے لئے ہے۔ پپو کا بستہ بھی اب ختم ہے [illegible] زرینہ کی یہی آواز جو پہلے کانوں میں رس گھولتی تھی اب کانٹے [illegible] ہے۔

انہوں نے اپنے روپیوں کا حساب لگایا۔ ایک دس کا نوٹ الماری میں پڑا ہے، چار پانچ سو بینک میں ہوں گے دس روپے صبح ہی زرینہ کو دے چکا ہوں۔ ابھی خرچ تو نہیں ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اتنے سے کیا ہوتا ہے — انہیں ایک ایک خیال ہوا، زرینہ کے پاس ضرور کچھ رقم ہوگی۔ اکثر بیویاں مردوں کی نگاہ سے چھپا کر کچھ پس انداز کرتی ہیں۔

ڈگری کالج کے پاس کچھ جوان لڑکیاں خوشبو بکھیرتی ہوئی گزر گئیں — انسان عمر سے کچھ بھی ہو — اس کا دل ہمیشہ جوان رہتا ہے — انہیں دیکھ کر رشید بابو کی سانسوں کا زیر و بم تیز ہو گیا۔ کچھ دیر ان کے پیچھے خوشبو لیتے ہی چلوں — ایسی خوشبو گھر میں کہاں نصیب ہوتی ہے — بیوی کے پاس تو ہر وقت پیاز، ہینگ اور پسینے کی گندھ ہی آتی رہتی ہے۔

کچھ دور چلنے کے بعد لڑکیاں ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں — انہوں نے دیکھا، ایک دکان سے کوئی ماں اپنے بچے کو ٹافیاں دلا رہی ہے — وہ گزرتے ہوئے وقت کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے — اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلاتی ہوئی ماں کا چہرہ ان کے سامنے آ گیا — جس میں ممتا بھرا پیارا ہی پیار ہے — عمر نے چہرہ پر جھریوں کا جال بن ڈالا ہے۔ پھر بھی گورا رنگ اور خد و خال عمر رفتہ کو آواز دے رہے ہیں — ماں بچوں کے بہت ضد کرنے پر بہت چھپا کر رکھے ہوئے پیسے بھی خرچ کر دیتی ہے —!

وہ جیسے ہی گھر پہنچے، ان کے کانوں میں آواز آئی۔

— ارے بھائی! بہت دیر کر دی [illegible] سے گھر آئے ہیں؟

" اب کیا دیر ہے۔ [illegible]

" جلدی کرو۔ نہیں تو قبرستان سے لوٹنے میں دیر ہو جائے گی!" کسی بزرگ کی تیسری آواز

رشید بابو نے ایک نگاہ لوگوں پر ڈالی اور گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ دیکھا گھر میں محلے کی بہت سی عورتیں جمع ہیں —

دنیا کی رسم ہے ۔ خوشی میں بھلے ہی کسی کا ساتھ مت دو، غم میں ساتھ دینا چاہیئے ۔۔۔ وہ سب ان کی ماں کی خوبیوں کا ذکر رہی تھیں ۔ جب تک آدمی چلتا پھرتا ہے ، اس کی خوبیاں بھی چلتی پھرتی ہیں ۔ لیکن اس کے لاش بنتے ہی اس کی ساری خوبیاں ہر ایک کی زبان پر جاری ہو جاتی ہیں ۔۔۔ تو کیا آدمی کو اپنی خوبیوں کا شمار کرانے کے لئے اس کا لاش بننا ضروری ہے ۔۔۔ ؟

ان کی نگاہ بیوی پر پڑی جو عورتوں کے درمیان بیٹھی تھی ۔ اس کی آواز سے انہیں معلوم ہوا ۔ وہ رو رہی نہیں ۔۔۔ وہ رونے کی کوئی رسم ادا کر رہی ہے ۔۔۔ تین سال سے وہ روہی تو رہی ہے ۔۔۔ پھر آج کون سی نئی بات ہو گئی ۔۔۔

یہ ادھر کیوں نہیں آتی ۔۔۔ بڑی موٹی عقل کی ہوتی ہیں یہ عورتیں بھی ۔۔۔ انہوں نے گڈو سے کہہ کر اسے بلایا ۔۔۔

" وہیں چپک گئیں ؟ "

جب وہ آئی تو انہوں نے اسے اکیلے میں لے جا کر ۔۔۔ " کچھ پیسے ویسے ہوں تو نکالو جلدی سے ! "

" پیسے اور میرے پاس ۔۔۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ کبھی خرچ سے ایک پائی بھی زیادہ دی ہے ؟ "

" یہ وقت بحث کرنے کا نہیں ہے ۔۔۔ ہوں تو جلدی سے نکال دو ۔ "

" ہوتے تو کیا اس وقت بھی انکار کرتی ۔ مردوں کو بھی اعتبار ہوا ہے عورتوں پر ۔۔۔ " وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگی ۔

انہوں نے ماں کی لاش کی طرف دیکھا ۔۔۔ جہاں ان کی دونوں بہنیں بیٹھی رو رہی تھیں ۔ چاچی ، پھوپھی اور دوسری عورتیں بہنوں کو سمجھاتے ہوئے ان کے آنسو پونچھ رہی تھیں ۔۔۔ اور چپ کرانے کے بہانے ان کے آنسوؤں میں اور اضافہ کر رہی تھیں ۔۔۔ ببلو ، وکی اور منی سب ہی رو رہے تھے ، انہوں نے سوچا ، اف وہی نہیں رو رہے ہیں ۔۔۔ ان کے پاس وقت کہاں کہ ماں کے پاس بیٹھ کر دو آنسو بہا لیں ۔۔۔ !

" اپنے زیور ہی دو ۔۔۔ ! "

" زیور اماں کے علاج میں بک گئے جو بچے تھے ۔ ماں کے علاج میں فروخت ہو گئے ۔ اب بچا ہی کیا ہے ۔

رشید بابو کی آنکھوں میں دن ہی میں اندھیرا چھا گیا ۔ زمین گھومتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ وہ اکھڑے ہوئے دل کے ساتھ برآمدے میں آ گئے ۔۔۔ انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا ، جس ماں نے ان کے لئے سب کچھ کیا ، اس کے لئے وہ ایک کفن نہیں خرید سکتے ۔۔۔ ان کا اپنا آپ انہیں بہت بے معنی معلوم ہونے لگا ۔ کسی کو پتہ بھی چل جائے تو لوگ کیا کہیں گے ۔۔۔ ؟

جب ہی ایک لڑکے نے آ کر خبر دی ۔۔۔ " قبر تیار ہو گئی ۔۔۔ جلدی کیجئے ۔ "

رشید بابو سوچنے لگے ، واقعی بہت دیر ہو گئی ۔ اور اب تک کفن بھی نہیں آیا ۔۔۔ انہوں نے جلدی سے ایک رشتے دار کو کچھ روپے دیئے اور انہیں کچھ ضروری سامان لانے کے لئے بازار بھیج دیا ۔۔۔ اور خود اپنے تخیل میں کپڑے کے کسی دکاندار کو سمجھا لیا جس سے وہ ادھار کفن لینے کی بات سوچنے لگے ۔۔۔ لیکن دوسروں کے سامنے وہ یہ بات ظاہر نہیں ہونا دینا چاہتے تھے ۔ آدمی کو اپنوں کے سامنے عزت کا زیادہ خیال ہوتا ہے ، لیکن دوسروں کے سامنے نہیں ۔۔۔ اس لئے وہ کفن لینے کے لئے اکیلے ہی گھر سے نکل پڑے ۔۔۔

گھر سے بازار تک ایک پکی سڑک چلی گئی تھی۔ جس پر وہ دن رات آئے گئے تھے۔ لیکن وہی سڑک آج انہیں اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس پر چلتے ہوئے وہ تھک سے گئے تھے۔ سڑک پر جو بھی قدم رکھتا تھا۔ اس میں لغزش تھی۔ ایسا شاید بہت پریشانی میں ہوتا ہے۔ جب آدمی کے اندر شراب سی کوئی بے خودی آجاتی ہے — اور وہ بغیر پئے ہی لڑکھڑانے لگتا ہے —!

ایسے گھر سے بازار کا فاصلہ کچھ دور نہیں تھا۔ سورج آسمان کے کسی گوشے سے اسے طویل بنا رہا تھا — آج آسمان پر بادل کا کوئی ہلکا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ جس سے سورج بالکل آزاد تھا۔ اور اپنی پوری حدت زمین تک پہنچا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف مکان، کھیت اور میدان سورج کی گرمی کو جذب کرنے میں ناکام تھے اور تنگ آکر اسے باہر پھینک رہے تھے — موسم کی اس بے رحمی سے بے خبر رشید بابو جیسے ہی اسکول کے پاس آئے انہیں فضلو مل گیا۔ جو دن بھر ریلوے کی ڈیوٹی کرنے کے بعد شام کو سائیکل سے گھر آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا چہرہ پسینہ سے نہایا ہوا تھا۔ اس نے سائیکل روک کر کہا —

مجھے ڈیوٹی ہی پر ماں کے انتقال کی خبر مل گئی تھی

آپ کہاں جا رہے ہیں — ؟

"کفن لینے —!"

کفن لینے کی بات انہوں نے بڑے اداس لہجے میں کہی۔ اس لئے کہ اس میں اُدھار آڑے آگیا تھا، پھر وہ ادھار مل جائے گا یہ وثوق سے کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ فضلو نے اخلاقاً کہا — "کیا میں بھی چلوں — ؟" لیکن رشید بابو نے ٹال دیا — "نہیں تم گھر ہی چلو۔ وہاں بھی بہت کام ہیں —" اصل میں رشید بابو کفن خریدنے میں کسی کو شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جس سے ادھار کفن کی بات افشا نہ ہو جائے۔

پانی ٹنکی کے پاس آکر انہیں وہی بدمعاش کتے نظر آگئے۔ جو کبھی کبھی لوگوں کو پریشان کرتے تھے — وہ نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ اور اپنے اندر کی گرمی منہ کھول کر باہر نکال رہے تھے۔ رشید بابو کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنے سروں کو ذرا سا اوپر کیا اور بھوں کی آواز کے ساتھ انہیں عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ایک کتا ہوتا تو کوئی بات نہیں لیکن یہاں تو کئی کتے تھے جو محاذ بنا کر حملہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ یہ محلہ ہی ایسا تھا۔ جہاں انسان کم اور کتے زیادہ نظر آتے تھے۔ اصل میں کتوں کو کسی سے چڑ نہیں ہوتی ہے۔ انہیں ان کتوں سے بیر ہوتا ہے جو شاید انسانوں کے اندر بھی انہیں نظر آجاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر وہ بھونکتے ہیں اور انہیں کاٹنے کے لئے دوڑتے ہیں۔ رشید بابو کو کتوں نے گھیر لیا۔ اب وہ آگے جا سکتے تھے نہ پیچھے بھاگ سکتے تھے۔ وہ بھونکتے ہوئے ان کی طرف لپک رہے تھے۔ جس سے رشید بابو کو چودہ سوئیاں نظر آرہی تھیں۔ کہتے کسی چیز سے بھلے ہی نہ ڈریں، لیکن اینٹ پتھر سے ضرور ڈرتے ہیں۔ لیکن وہاں رشید بابو کو کوئی اینٹ پتھر بھی نظر نہ آیا۔ اس لئے وہ جھوٹے ہی ان پر اینٹ اور پتھر چلانے کی نقل کرنے لگے۔ جس سے کچھ ہی دیر بعد کتے گلیوں میں دبک گئے اور وہیں سے بھونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہوں نے وقتی شکست تو قبول کر لی ہے لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں —!

سڑک پار کر کے رشید بابو موہن کٹرہ کی طرف مڑ گئے۔ جہاں ان کے ایک جان پہچان گردھاری لال کی کپڑے کی دکان تھی جو گاہک نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت خالی

ہی نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی گردھاری لال حسب معمول خالی ہی بیٹھا تھا۔ رشید بابو اس کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گئے۔ اور اپنی سانسوں میں توازن پیدا کرنے لگے کچھ دیر بعد وہ اپنے اصل مقصد پر آ گئے۔۔۔۔ اور گردھاری لال سے ادھار کفن کی بات کہنے لگے جس کے روپے پہلی تاریخ کو تنخواہ ملنے کے بعد ادا ہو جاتے تھے۔ گردھاری لال اسی وقت راضی ہو گیا۔ اس لئے کہ ادھار بکری بھی غنیمت تھی۔۔۔ کفن لے کر جب رشید بابو دکان سے نیچے اترنے لگے تو گردھاری لال نے اٹھا انہیں سلام بھی کیا۔ جس سے رشید بابو خوش بھی ہوئے اور رنجیدہ بھی۔۔۔! وہ بظاہر مطمئن تھے۔ لیکن ایک فکر اور تھی۔ گورکنوں کی مزدوری۔۔۔ جو ان کے دماغ کو سکون لینے نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے سوچا، وہ گردھاری لال سے کچھ روپے بھی ادھار مانگ لیں۔ لیکن کفن ادھار لینے کے بعد روپے مانگنے کی ہمت نہ ہوئی۔

رشید بابو کفن لے کر گھر آئے۔ اس وقت محلے پڑوس والے اور رشتہ داران کا بیقراری سے انتظار کر رہے تھے۔۔۔ اور بور ہو رہے تھے۔۔۔ لیکن کفن دیکھتے ہی ان چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن رشید بابو کا چہرہ اسی طرح مرا مرا اور زرد زرد تھا جیسے مزید پانی کی ضرورت جو نہیں مل رہا تھا۔۔۔!

دالان میں فرش پر چٹائی بچھا کر رمضان میاں کفن کاٹنے لگے۔ یہ کام وہ ایک مدت سے کرتے آ رہے تھے اور اب ان کی عمر پچاس سے اوپر ہو رہی تھی۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا اور ان کی داڑھی مونچھوں کے بال زیادہ تر کالے تھے جس سے ان کا چہرہ کچھ بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ صرف ان کی وجہ سے دوسرے لوگ کفن کاٹنے کے کام سے غافل تھے۔ اور یہ بات لوگوں کے لئے باعث فکر تھی کہ ان کے مرنے کے بعد کفن کون کاٹے گا؟

کچھ لوگ مسجد سے تابوت لینے چلے گئے۔ اندر میت کو غسل بھی دیا جانے لگا۔ جنازہ میں شریک ہونے والے کچھ لوگ باہر کھڑے تھے۔ کچھ اندر اور باہر بیٹھے تھے۔ اور بے صبری سے میت کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔ صحن میں محلے اور پڑوس کی عورتوں کا ہجوم تھا۔ جو گھر والوں کو تسلی دے رہی تھیں۔ کوئی بات نہیں۔ بوڑھی موت تھی۔۔۔ بن گیا۔۔۔ اس پر بھی گھر والے رو رہے تھے۔ اور بلا وجہ پاگل ہو رہے تھے۔

میت لے کر جب لوگ چلنے لگے تو ایک بار پھر عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آئیں۔ جسے رشید بابو روک بھی نہ سکے۔ صرف آنکھوں میں آنسو لئے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ سب سے پہلے رشید بابو نے کندھا دیا پھر باری باری سب لوگ کندھا دینے لگے۔ اس طرح وہ ایک وقت میں دو کام انجام دے رہے تھے۔ ایک طرف وہ دنیا کی رسم ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف ثواب حاصل کر رہے تھے۔

جنازہ محلہ سے باہر آیا۔ اس وقت شام کا سورج افق کی صلیب پر چڑھنے کی تیاری کر رہا تھا۔۔۔ جنازہ کے پیچھے چلنے والوں میں بوڑھے نعیم خلیفہ بھی تھے جو پیری سالی کے باوجود آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ لگائے ایک ڈنڈا کے سہارے دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ اپنے انجام سے بے خبر۔۔۔ اپنی منزل سے بے فکر۔۔۔ کسی منچلے نے ہانک لگائی۔۔۔ خلیفہ! تمہاری باری کب آئے گی۔۔۔ خلیفہ نے چونک کر دیکھا۔ اور ان کا چہرہ غصہ سے تانبا ہو گیا۔ مرا مرا سے ہم

کیوں نہیں دفن ہو جاتے ــــ ان کا بس چلتا تو وہ محلے کے ان سارے لڑکوں کو دفن کر دیتے جو انہیں پریشان کرتے تھے ــ لیکن وہ اپنی مجبوری کی وجہ سے صرف بگڑ کر رہ جاتے ۔ ایسے موقع پر رشید بابو نعیم خلیفہ کے لئے ڈھال بن جاتے تھے ۔ رشید بابو نے اس لڑکے کو ڈانٹا تو وہ سٹپٹا کر چپ ہو گیا اور بھیڑ میں چھپنے لگا ۔

قبرستان جیسے قریب آتا گیا رشید بابو کی فکر میں اضافہ ہوتا گیا ــــ اور وہ دل میں خدا کو یاد کرنے لگے جو اکثر مصیبت ہی کے وقت یاد آتا ہے ۔ گورکن مزدوری کے لئے ان کے سامنے آ کر کھڑے ہو جائیں گے تو وہ کیا جواب دیں گے ۔ یہ خیال ان کے دماغ کو کسی آسیب کی طرح پریشان کر رہا تھا ۔

قبرستان کے قریب پہنچ کر میت کو نماز جنازہ کے لئے ایک جگہ رکھ دی گئی ۔ جو لوگ نماز پڑھنے والے تھے ، وہ رک گئے ۔ دوسرے لوگ قبر کے پاس پہنچ گئے اور بلا وجہ وہاں رائے مشورہ دینے لگے جس کو کسی کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ نماز جنازہ کے بعد میت کو قبر کے پاس لے جایا گیا ۔ میت کو قبر میں کون اتارے گا ۔ اس کے لئے لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ۔ رشید بابو نے سوچا ۔ وہ خود ہی قبر میں اتر جائیں ۔ لیکن تین آدمی اس کے لئے تیار ہو گئے اور انہوں نے رشید بابو کو منع کر دیا ۔ پھر وہ جلدی سے قبر میں اتر گئے ۔ دوسرے کاموں کے لئے لوگ بھلے ہی نہ ملیں لیکن ایسے موقع پر لوگ جلدی مل جاتے ہیں ۔ اور صرف اپنی تعریف کے احساس ہی سے خوش ہوتے ہیں ۔

مٹی دے کر لوگ لوٹ ہی رہے تھے کہ کیچڑ میں سنے ہاتھ پاؤں لئے گورکن رشید بابو کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ۔

" مالک ! اب ہم لوگوں کا بھی حساب کر دیجئے ۔"

رشید بابو ادھر اُدھر دیکھنے لگے ۔ اب وہ کچھ بولنا بھی چاہتے تھے تو آواز ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی ۔ اتنے لوگوں کے سامنے وہ کیا کہیں ــ آخر انہوں نے مشکل سے کہا ــ

" پہلی تاریخ کو آنا ۔ اس دن تنخواہ ملتی ہے ۔"

رشید بابو کو امید نہیں تھی کہ گورکن مان جائیں گے ، لیکن وہ مان گئے اور گھر چلے گئے ۔ لیکن رشید بابو وہیں ٹوٹ کر بکھر گئے ــــ جس بات کو وہ چھپانا چاہتے تھے ، وہ اتنے لوگوں کے سامنے ظاہر ہو گئی ــــ وہ ماں کی موت پر گورکنوں کی مزدوری بھی نہیں دے سکے ــ لوگ کیا سوچیں گے ــ اتنی کوشش کے باوجود آخر وہ ذلیل ہو گئے ۔

سورج مغرب کی آغوش میں دم توڑ رہا تھا ۔ رشید بابو نے ماں کی قبر کی طرف دیکھا ــ جو خود تو نجات پا گئی تھی ، لیکن انہیں اکیلا چھوڑ گئی تھی ۔ تین سال سے ٹکر کھاتی ہوئی یہ موت پہلی تاریخ تک ٹل جاتی تو کیا ہو جاتا ــ ؟

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی)

نام کتاب :- بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا
۱۲۰۴ء تا ۱۸۵۷ء

نوعیت :- تحقیق

مصنف :- اختر اورینوی

ضخامت :- ۳۷۴ قیمت :- ۱۸ روپے

پتہ :- ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

زبان خواہ کوئی بھی ہو اس کی ساخت، ابتدا، عروج اور ارتقا، کا مسئلہ ایک اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو متعدد ماہرین لسانیات نے اس کی لسانی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں مختلف نظریات وخیالات سامنے آئے ہیں اور جدید تحقیقات کی روشنی میں تو انہیں اس کی لسانی حقیقت کی جڑ تک پہنچنے میں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی ہے ان میں اختر اورینوی صاحب کا نام بھی خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک" میں صوبہ بہار جیسا مردم خیز خطہ کے زبان وادب پر گراں قدر تحقیقی کام کرکے اردو زبان وادب کی اہم اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

متذکرہ بالا کتاب اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ چار مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول سے ماقبل مقدمہ پیش کیا گیا ہے جو فلسفۂ زبان واقوام، اردو زبان کے آغاز کے پس منظر کا احاطہ کرتا ہے۔ اور پھر اس میں اردو زبان کے ارتقاء پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب اول میں بہار میں اردو زبان کی ابتدا ر وارتقا کا تفصیلی ذکر ہے اور باب دوئم بہار میں اردو ادب پر مشتمل ہے۔ اولاً بہار میں اردو ادب کا اختصار کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اور پھر بہار کے ۳۵ اہم اور مشاہیر شعراء کا ذکر مع حالات زندگی اور نمونۂ کلام کیا گیا ہے۔ باب سوئم میں بہار میں اردو نثر نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بہار کے ۱۳ مقبول نقادان کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی نمونہ ہائے عبارت بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اور باب چہارم میں بہار میں اردو ادب کے عام میلانات پر مختصراً روشنی

ڈالی گئی ہے۔

بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء" میں اختر اورینوی صاحب نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا ہے اور یہ کتاب کافی محنت اور جدوجہد کے بعد سامنے آئی ہے۔ وہ یوں کہ قدیم وابتدائی شعراء و نقادان کے حالات زندگی اور ان کے تخلیقی سرمائے سے دوہے، فقرے۔ گجندولے، ملفوظات، جھاڑ پھونک، عبادتیں، تالیفات وتصنیفات وغیرہ کی فراہمی کوئی سہل وآسان کام نہیں۔ ایک کامیاب اور صبر آزما محقق ہی ایسا کر سکتا ہے۔ یوں تو اس میں بعض جگہ چند تحقیقی لغزشیں بھی موجود ہیں۔ (مثلاً صراط مستقیم کو اختر اورینوی صاحب نے عمادالدین قلندر پھلواروی کا رسالہ بتایا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اردو نثر نگاری کا آغاز ۱۰۸۱ھ م ۱۶۷۰ء میں رسالہ مستقیم معروف بہ سیدھا رستہ کی تصنیف سے ہوا ہے لیکن دور حاضر کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے اس رسالے کو جعلی قرار دیا ہے) تاہم یہ کتاب تحقیق کی راہ میں مشعل راہ سے کم نہیں۔ یوں بھی تحقیقی مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے دراصل یہ حقیقت کی بازیافت ہے اور خود بقول قاضی عبدالودود تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش کا نام ہے اور ہر ابتدائی کوشش ایک حقیقت ہی معلوم ہوتی ہے اور بعد ازاں زمانے کی رفتار کے ساتھ دھندلی پڑجاتی ہے اور پھر ایک نئی کوشش کے زیر اثر ایک نئی حقیقت سامنے آتی ہے۔

بہر کیف یہ کتاب تاریخ کے باب میں ایک واضح مقام کی حامل ہے اور زمانے کی رفتار کے باوجود بھی ہر دور میں اس کی عظمت واہمیت قائم ودائم رہے گی اور تشنگان علم وادب کو سیراب کرتی رہے گی۔

● ڈاکٹر فرحانہ شاہین

نام کتاب :- کڈپہ میں اردو

نوعیت :- تحقیق وتنقید

مصنف :- مولانا ظہیر احمد باقوی راہی فدائی۔

ضخامت :- ۱۲۰ — قیمت :- ڈیلکس ایڈیشن ۸۰ روپے

معمولی ۳۰ روپے

پتہ :- علیم صبا نویدی ۸۶ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ مدراس ۶۰۰۰۰۲

اردو ایک نوزائیدہ اور کمسن زبان ہے۔ باوجود اس کے یہ اپنے نہاں خانے میں بے پناہ وسعت اور گہرائی رکھتی ہے۔ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ یہ اپنی ارتقائی منزل کی طرف گامزن ہے جس کے زیر اثر ہر دور میں اردو ادب کو شاندار فروغ حاصل ہوا۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی گوشے، تخلیق، تنقید اور تحقیق سے ہو۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی "کڈپہ میں اردو" ہے۔ یہ مولانا ظہیر احمد باقوی، راہی فدائی کا قابل قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے کیونکہ اس کی داغ بیل انہیں کے مبارک ہاتھوں پڑی۔ کڈپہ صوبہ آندھرا پردیش کا ایک مشہور ومعروف اور تاریخی ضلع ہے۔ سرزمین کڈپہ سے تعلق رکھنے والے صوفیائے کرام نے بھی اس کی نشو ونما میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ بھلا ان کی اس کارکردگی کو کیوں کر فراموش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ظہیر احمد باقوی راہی فدائی صاحب

کی دور رس نگاہ یہاں تک جا پہنچی اور انہوں نے اپنی
کتاب "کڑپہ میں اردو" میں ان کی خدمات کو اجاگر کرکے
اپنے تئیں ایک اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے ہیں۔
یہ کتاب تحقیق کے باب میں ایک اہم اضافے
کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں سنہ ۱۱۲۰ھ / سنہ ۱۷۰۸ء
سے ۱۳۷۵ھ / سنہ ۱۹۵۵ء تک کے اکیاون اہم اور
باکمال شعرا کا ذکر ہوا ہے۔ ہر شاعر کے حالات زندگی پر
کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور نمونہ کلام کی
پیش کش کے ساتھ ساتھ کلام پر اچھا خاصہ تجزیہ بھی
پیش کیا گیا ہے جس سے ان کی معیاری تنقیدی بصیرت
بھی جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ کتاب
تحقیق و تنقید کا حسین و دلکش امتزاج ہے۔ راہی
فدائی صاحب نے تحقیقی سفر طے کرتے ہوئے کئی اہم
گمشدہ کڑیوں کو تلاش کیا ہے اور ان تمام کڑیوں
کو سلسلہ وار جوڑ کر ادبی زنجیر کی شکل دی ہے۔ جو
جدید معلومات میں اہم اضافہ بھی کرتی ہے۔ زبان و بیان کے
اعتبار سے بھی یہ کتاب اپنی امتیازی شان و شوکت
کی حامل ہے۔ انہوں نے پیچیدگیٔ الفاظ و بیان سے گریز
کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کی عام مروجہ زبان و بیان پر
عمل پیرا ہو کر سادگی اور سلاست سے کام لیا ہے۔ اور
اس طرح انہوں نے قاری کے ذہن کو اپنی پوری گرفت
میں لینے کی کوشش کی ہے اور بحر نافہمی میں غوطہ کھانے
سے بچا لیا ہے۔

ان تمام باطنی اوصاف کے علاوہ یہ کتاب ظاہری
خوبیوں سے بھی آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کا سرورق
دلکش و دیدہ زیب اور عمدہ ہے جو کتاب کو
دیرپا محفوظ رکھنے میں معاون ہو سکتا ہے اور
اس کی قیمت بھی موزوں و مناسب ہے۔

● ڈاکٹر فرحانہ شاہین

ششماہی علم و ادب (دوسری جلد تیسرا شمارہ)

مدیر اعلیٰ:۔ چودھری حسان الزماں
مدیر: طارق متین
صفحات:۔ ۹۶ ؛ قیمت فی شمارہ ۱۲ روپے

پتہ:۔ علم و ادب، لکھمنیا، بیگوسرائے۔ ۸۵۱۲۱۱

طارق متین کی ادارت میں شائع ہونے والا
ششماہی جریدہ "علم و ادب" اب ایک معتبر رسالے کی
شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ عام طور سے سہ ماہی اور ششماہی
رسائل بے قاعدگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر علم و ادب
کے تینوں شمارے اب تک پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع
ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے معیار کو بھی خوب
سے خوب تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سابقہ شماروں کی طرح زیر نظر شمارے میں بھی
ایک مہمان مدیر کا اداریہ شامل ہے۔ اس شمارے کے مہمان
مدیر دور حاضر کے مشہور افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی
ہیں۔ یہ مہمان اداریہ ماہنامہ "شاعر" کے خصوصی نمبر
کے حوالے سے مدیر کو لکھے گئے طویل خط کا اقتباس
ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مہمان مدیر نے سہل پسندی
سے کام لیتے ہوئے اپنے خط کے اقتباس کو اداریہ کی
شکل میں پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے جدید کہانیوں کے
سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے صد
فی صد اتفاق کیا جا سکتا ہے مگر ان کی یہ بات غلط
ہے کہ آج اردو میں اچھی اور بڑی کہانیاں نہیں لکھی

جارہی ہیں۔

زیر نظر شمارے میں تین مضامین شامل ہیں— انانیت اور غیرت (ابراہیم اشک) طلوعِ اسلام — ایک جائزہ (منظر اعجاز) اور اردو داستانیں اور میرامن (شعیب رضا وارثی)۔ ان میں ابراہیم اشک اور منظر اعجاز کے مضامین قابل توجہ ہیں جبکہ شعیب رضا وارثی کے مضامین میں نیا کچھ نہیں ہے۔

شعری حصے میں ساجدہ زیدی، ڈاکٹر محمد حسن، اندر سروپ دت نادان، ظہیر غازی پوری، علقمہ شبلی، سلیم انصاری، شمیم قاسمی اور کوثر مظہری کی نظمیں اور فضا ابن فیضی، کالی داس گپتا رضا، کرشن موہن، مہدی پرتاپ گڈھی، ناز قادری، ڈاکٹر سجاد مرزا، آشفتہ چنگیزی، ضمیر درویش، ارشد کمال، رئیس الدین رئیس، عابد کربلائی، شہپر رسول، صدف جعفری، ارشد عبدالحمید اور شکیل دسنوی کی غزلیں شامل ہیں۔ راقم الحروف کو اندر سروپ دت نادان اور سلیم انصاری کی نظمیں اور عابد کربلائی اور شکیل دسنوی کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔

افسانوں میں سب سے اثر انگیز افسانہ قیصر اقبال کا "میری موت" ہے۔ آج دنیا میں ہر طرف وحشت بربریت کا دور دورا ہے۔ انسانی زندگی اب سے قبل اتنی غیر محفوظ کبھی نہ تھی۔ گھر ہو یا باہر ہر آن موت کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ افسانہ نگار نے عالمی تناظر میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

جوگندر پال کا افسانہ "انتقال" اس سے قبل "شب خون" میں شائع ہو چکا ہے۔ شائع شدہ تخلیق کی دوبارہ اشاعت ایک ادبی کرپشن ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب زندگی اور سماج کا آئینہ دار ہے اور جب ہمارے روزمرہ کی زندگی میں ہر طرف کرپشن پھیلا ہوا ہے تو بھلا ادب اس سے کس طرح محفوظ رہتا۔ چنانچہ اب Established افسانہ نگار اپنی ایک ہی تخلیق کو مختلف رسائل میں شائع کرواتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں۔ یہ ایک قبیح حرکت ہے۔ اس پر روک لگنی چاہئے۔

ابواللیث جاوید کا "تیسری سمت کا مسافر" جدید اسلوب میں لکھا گیا اچھا افسانہ ہے۔

نثری حصے میں ڈاکٹر آفتاب احمد کا انشائیہ "لفظ بے توقیر" بھی شامل ہے۔ انشا ایک ذہنی ترنگ ہے اور اس ترنگ میں انشائیہ نگار بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ آفتاب احمد نے قابل احترام اساتذہ کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ استعداد زمانہ نے ایک باوقار لفظ کو لفظ بے توقیر بنا کر رکھ دیا ہے

کتابت و طباعت مناسب ہے۔ اس رسالے کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تاکہ یہ ایک صحت مند ادبی رسالے کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔

● اقبال حسن آزاد، مونگیر

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل ریفور سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا

شہرِ خیال

○ قارئین کرام میری تحریر بہ عنوان "دہلی کے چار شعرا بہ نظر انتقاد" (مشمولہ شمارہ ۳/۵۳) میں در آئے سہو کی تصحیح فرمائیں۔ سہو کتابت ہے اور بس۔

"مجھ اتنے پاس سے ہو کر گزر گیا ایک شخص
کہ مجھ سے جیسے مجھے دور کر گیا ایک شخص

مطلع میں دو عیوب ہیں۔ پہلا دوسرے مصرع میں مذکورہ ایک شخص، پہلے مصرع کا ایک شخص معلوم نہیں ہوتا اور اگر ایک ہی تسلیم کر لیا جائے تو دوسرے مصرعے کا ایک شخص (ردیف) بیکار محض ہو جاتا ہے..."

کا سلیس کی حکمت عملی پر ہنود کے تحت اداریہ مستحسن ہے۔ اس ضمن میں ایک گذارش یہ ہے کہ ہماری سیاست پیشہ ورانہ ہو چکی ہے۔ فرقہ پرستی ذات پات کے افتراق جیسی لعنتیں اسی سے عبارت ہیں۔ عوام نہیں لڑتے ہیں۔ انہیں لڑایا جاتا ہے۔ حصول اقتدار کی ہوس نے بے شمار منادر و مساجد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے — پبلک ان ہوس کاروں کا اصلی روپ ایک نہ ایک دن دیکھنے میں کامیاب ہوگی۔

● تارا چرن رستوگی
(گوہاٹی)

○ سہیل کا حالیہ شمارہ ہر لحاظ سے بلند معیار کا مظہر ہے۔ مضامین، کہانیاں اور حصہ نظم اعلیٰ ادب کے نمونے ہیں۔ نظموں میں اگرچہ کوئی امتیازی کاوش تو زیر نظر نہیں ہوئی۔ لیکن نثری حصہ میں آپ کا اداریہ "نازک مرحلہ" اودے سرن ارمان صاحب کا "درد کا سفر" اور مشرف عالم ذوقی کا بالاقساط ناول "مسلمان" عمدہ ادب پارے ہیں۔ "درد کا سفر" اچھی کہانی ہے اور یہ کئی نفسیاتی اور معاشی حقیقتوں پر سے نقاب اٹھاتی ہے نیز مشرقی اقدار کی افادیت اور پاکیزگی کو اور بھی مسلم کرتی ہے۔

غزلیات میں شرون کمار ورما کی دو بہت پیاری غزلیں آپ نے شامل کی ہیں۔ عصری مسائل پر شرون کمار گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور بہت سلیقے سے غزل میں جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر کہتے ہیں۔ کیا اچھی باتیں کہی ہیں انھوں نے۔

خوش فہمیوں سے دل کو سنبھالو گے کب تلک
اک روز گر پڑے گی یہ دیوار دیکھنا

اپنی تو دوستو یہی عادت خراب ہے
نفرت میں پیار، بغض میں ایثار دیکھنا

شاخِ بالا پر بسیرا کرنے والے سوچ لے
آندھیوں کی زد میں تیرا آشیاں بھی آئے گا

اصغر علی انجینئر پسند ہو پریم چند کی عظیم شخصیت کے
تابناک پہلوؤں کو اپنے مضامین میں اجاگر کر رہے ہیں۔
پریم چند خطبۂ صدارت کے حوالے ترقی پسند تحریک کے
ابتدائی مراحل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان مضامین کے
ذریعہ آپ پریم چند پر کیچڑ اچھالنے والے بعض متعصب
گزیدہ ذہنوں کا تنقید کر رہے ہیں جو مستحسن اقدام ہے

● شہاب ملت، شملہ

○ آپ کے اس شمارہ نمبر ۳، جلد ۵۳ میں دو
چیزیں بے حد پسند آئیں۔ آپ کا اداریہ اور ڈاکٹر تاراچرن
رستوگی کی صاف گوئی "دہلی کے چار شعرا ..... کے عنوان
سے!

دنیا کی سیاسی تاریخ میں شاید ہی کوئی سیاسی
پارٹی اتنی منافق اور ریاکار ثابت ہوئی ہو جتنی کہ ہماری
انڈین نیشنل کانگریس ہے اور المیہ یہ ہے کہ ساری
زندگی اس کی نذر کر دینے کے بعد بڑھاپے میں یہ پتا چلتا ہے
کہ کانگریس نہ نیشنل ہے نہ سیکولر اور نہ جمہوری قدروں
ہی سے اسے کوئی دلچسپی ہے ۱۸۸۵ء سے کانگریس کا
نصب العین ہی یہ رہا ہے کہ ہندو مسلم میں اتحاد قائم ہو اور
ملک خود کفیل ہو۔ انہی دو باتوں سے ہر کانگریسی کے اپنے
مفاد کو تقویت ملتی ہے۔

کیا بات کہی ہے! ڈاکٹر رستوگی کے منہ میں گھی شکر۔
یہ چاروں نہ نثر لکھنا جانتے ہیں اور نہ شعر کہنا۔ چونکہ
یہ چاروں بارسوخ ہیں اور مصلحت پسند، اس لئے اس
مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں جو ان کے لئے نہیں بنا تھا۔ واقعہ
یہ ہے کہ جنم جنم کے بھوکے انسان دنیا کمانا خوب جانتے
ہیں اس لئے یہ چاروں بھی دونوں ہاتھوں سے دنیا سمیٹ
رہے ہیں۔

مسعود منظر سچ تو یہ ہے کہ اگر برسر اقتدار سیاسی
پارٹی معقول اور مخلص ہوتی تو آج بھینس کو انگور کے
بچے نہ کھلائے جاتے اور ہرن کی پیٹھ پر گھاس نہ لادی جاتی۔

● شمس کنول، علی گڑھ

○ سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ جس کے لئے میں
آپ کا ممنون ہوں۔ اس شمارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد
صاحب کی بابری مسجد پر نظم نے دل و دماغ کو متاثر کیا۔
آپ نے اس نظم کو بڑا نمایاں شائع کیا ہے جس کے لئے آپ
مبارکباد کے مستحق ہیں پروفیسر آزاد کی یہ نظم ہندوستان
کے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس پرآشوب
دور میں جبکہ ہندو فرقہ پرستی اپنے عروج پر ہے۔ پروفیسر
آزاد جیسے سیکولر مزاج رکھنے والے زندہ ہیں جو کہ نفرت پر
نہیں، محبت پر یقین رکھتے ہیں۔ کانگریس کی حکمت عملی پر آپ
کا تحریر کردہ اداریہ حقیقت پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا مضمون "دہلی کے چار
شعرا، بہ نظر انتقاد" کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس
مضمون میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کا کوئی معیار ہو بڑی
عجلت میں یا ذاتی رنجش کے سبب موصوف نے مضمون
لکھ دیا ہے۔ جن چار شعرا کا ذکر انہوں نے کیا ہے اور ان
کی شاعری میں جو کمیاں گنوائی ہیں وہ بے سبب ہیں خاص
طور پر دہلی کے ان دو شعرا کے بارے میں جو اردو ادب
میں اپنا مقام بنا چکے ہیں ان کا اپنے مضمون میں یہ کہنا
کہ ان کے کلام میں ایسا کچھ نہیں ہے جو کہ ان کے کلام
معیار میں اضافہ کرے غلط بات ہے۔ اس سلسلے میں
میری ذاتی رائے ہے کہ نثر نگار اگر شاعر ہے تو بھی وہ

اچھی اور بری شاعری کی شناخت کر سکتا ہے؟ اس لئے میں بڑے ادب سے رستوگی صاحب سے یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ پہلے وہ شعر کہنا شروع کر دیں پھر شعراء کے کلام کے اچھا یا برا ہونے کے فن سے وہ آشنا ہو سکیں گے اور صحیح تنقید کر سکیں گے۔

پریم چند پر اصغر علی انجینیر کا ARTICBE پسند آیا۔ محترمہ نسرین حامد صاحبہ کی نظمیں اچھی لگیں۔

● ملک زادہ جاوید، نوئیڈا

○ ماہنامہ سہیل شمارہ ۱۱ باصرانواز ہوا سر فہرست جناب تارا چرن رستوگی صاحب کا ”دلی کے چار شعراء“ بہ نقطہ انتقاد مضامین پر مشتمل ہے۔ اس طرح کے تنقیدی و اصلاحی مضامین سے ادب کو فیض پہنچ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مضامین و غزل بہتر ہیں۔ جناب راشد انور راشد کے دوہے ہر اعتبار سے نادرست ہی لگتا ہے جناب دوہے کے آداب سے واقف نہیں۔

● ضیاء الانجم، جبل پور

○ ۲۸ دسمبر سے اب تک چار مکانات خالی کئے ہیں اور ۱۰ اپریل کو پانچویں مکان میں وارد ہوا ہوں۔ فسادات کا شکار ہونے سے بچے بھی تو نقل مکانی کی نذر ہونا ہی پڑا۔ صدحیف بہت پہلے مجھے جواب دے دینا چاہئے تھا۔ چھ دسمبر ۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کا دن کہنا کچھ نہ کہنے کے برابر ہے اس دن تو بہت کچھ کھو گیا، لٹ گیا، مٹ گیا۔ مسجد تو پھر سے بنائی جا سکتی ہے مگر بھارت ماتا کے ماتھے پر لگا ہوا کلنک کا ٹیکا کیوں کر مٹایا جا سکتا ہے؟ یہ ایک سوال ہے اور اس کا جواب جنونیوں کو نہیں بلکہ ہر ہوش مند کو دینا ہے۔ مسجد کے ملبے تلے دبی ہوئی بلکہ دم توڑتی ہوئی بھارتیہ سنسکرتی کی ارتھی اٹھانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے۔ ویسے مشیت بھاری ہے۔

آپ نے فسادات کے فوراً بعد یہ لکھا تھا اور خدا کا واسطہ دے کر لکھا تھا کہ مفصل حالات سے آگاہ کروں اور پھر بھی تاخیر ہو گئی اس لئے وضاحتی بیان ضروری ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں اپنے آپ کو آدھا گڑا ہوا سمجھ رہا تھا اب بھی دھیرے دھیرے مٹی ہٹا ہٹا کر اوپر آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر یہ تحریر غیر مربوط لگے، جملے شکستگی کا شکار ہوں اور مفہوم لہولہان دکھائی دے تو بھی برادرانہ درگذر سے کام لیں۔ کیوں کہ ؎

ہر بات ٹوٹ پھوٹ کی تصویر کیوں نہ ہو
دیکھا ہوا فسادری گفتگو میں ہے

گلیوں کے ہاتھ غور سے دیکھو تو کچھ کھلے
معصوم سسکیوں کی مہک رنگ و بو میں ہے

(قرار)

● شبیر احمد قرار، بمبئی

○ سہیل کے دونوں نمبر مل گئے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ سے ملاقات تمام عمر یاد رہے گی۔ سہیل ایک رسالے کا نام نہیں ایک روایت کا نام ہے اس سے انگنت لوگ جڑے ہوئے ہیں۔

آپ مادر اردو کے ان سپوتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے کبھی اس کے سر سے چادر نہیں سرکنے دی خدا آپ کو حوصلہ اور صحت دے تاکہ آپ سہیل کے حوالے سے مادر اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ آمین — شارق عدیل

○ سہیل شمارہ ۳ موصول ہوا۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ پسند آیا ہی سالگا۔ بیالیس صفحات کے رسالے میں ہر ماہ تین قسط وار تخلیقات دیکھ کر طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ ایک وقت میں ایک قسط وار مضمون کافی ہے۔

اس دفعہ حسین الحق نے بھی مایوس کیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس افسانے کو زبردستی آگے بڑھا رہے ہیں۔

جوگندر پال کا کتھا یاترا پہلے بھی کہیں شائع ہو چکا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے "مسلمان" کے بارے میں کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ زدہ نویسی بھی ایک خبط ہے۔

مختار احمد عاصی اور نثار جیراج پوری کی غزلیں پسند آئیں۔

● اقبال حسن آزاد، مونگیر

○ سہیل کا شمارہ ۳ ملا۔ بشکریہ

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے لائبریری میں اس کے شمارے اکثر و بیشتر سرچشمۂ بصیرت ہوا کرتے ہیں۔ بلاشبہ بہار کی سرزمین سے ایک شاندار ادبی جریدہ نکال رہے ہیں۔ متذکرہ شمارہ میں ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا مضمون میری نگاہ میں بہت عمدہ ہے۔ جناب اصغر علی انجینئر نے بھی متاثر کیا۔

● نسیم عزیزی، ہوڑہ

○ عنایت کردہ "سہیل" ملا۔

غزل کی اشاعت کے لئے ممنون ہوں۔

سہیل اس عہد میں بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مذکورہ شمارہ کئی اعتبار سے لائق مطالعہ ہے۔

تاراچرن رستوگی کا مضمون "دہلی کے چار شعراء ۔ ۔ ۔ اور جگن ناتھ آزاد کی" بابری مسجد "نظم" کی جان ہے۔

میرے لائق کوئی کام ہو تو ضرور یاد کریں

● بسمل عارفی، سمستی پور

تازہ سہیل ملا۔ واقعی آپ محنت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی صاحب کا مضمون پڑھا۔ دہلی کے چار شعراء کو انھوں نے ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ چاروں شعراء بہت اعلیٰ پائے کے شعراء ہیں۔ لیکن ان میں سے کم از کم دو شعراء تو ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ راج نرائن رآز اور رفعت سروش دونوں نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں پر اظہار خیال فرمانے کی کیا تک اور کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ آخری بات یہ کہ جب مذکورہ چاروں شعراء بقول ڈاکٹر تاراچرن رستوگی "آشفتگیٔ جذبہ میں کشید کی ہوئی خرد آگہی" سے بھرپور شعر نہیں کہتے تو ان پر قلم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی ؟؟ مضمون کو پڑھ کر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ رستوگی صاحب آخر چاہتے کیا ہیں۔ ان کی تحریر مخاصمانہ جذبات کی چغلی کھاتی ہے۔ ایسی چیزوں کی اشاعت سے آپ کو پرہیز کرنا چاہئے۔ آپ کا رسالہ تو خالص ادبی رسالہ ہے اور یہ لمبے عرصے سے اپنی ایک مخصوص ڈگر پر چل رہا ہے

● شبیر رسول
علی گڈھ

"سہیل" کا شمارہ ۳ جلد ۴۳ نظر سے گذرا۔
ابت، طباعت اور معیار پر آپ نے خصوصی توجہ دینا
روع کردی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون " دہلی کے
یار شعراء بہ نظر انتقاد" مطالعہ میں آیا۔ رستوگی صاحب
و آخر ہو کیا گیا ہے؟ موصوف کو ہمیشہ خرابیاں
ہی کیوں نظر آتی ہیں؟ علامہ اقبال کے سلسلے میں بھی
ن کا رویہ ہمیشہ منفی رہا ہے۔ ذاتی پسند و ناپسند
ی بنیاد پر کئے ہوئے فیصلوں کو مختلف شعراء کی
شاعری پر منطبق نہیں کرنا چاہئے بلکہ دودھ کا
دودھ اور پانی کا پانی کرنا چاہئے۔ ورنہ اصل تنقید
کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
جگن ناتھ آزاد کی نظم "بابری مسجد"
ہندوستانی کے دل کی پکار ہے۔ دیگر نثری اور
منظوم نگارشات بھی خوب ہیں۔ "سہیل" کے لئے
نیک خواہشات کے ساتھ۔

● نسیم الاسلام صہبا، علی گڑھ

محترم ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب

تسلیم

مخمور سعیدی، راج نرائن راز، عنوان چشتی
اور رفعت سروش صاحبان کی شاعری سے متعلق آپ
کا تحریر پڑھ کر دکھ ہوا کہ آپ جیسی شخصیت ایسے سستے
مکالمات والی تنقیص بھی لکھ سکتی ہے کیونکہ آپ نے
درج شدہ اشعار کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے ذاتی
مخاصمت کی بو آتی ہے۔ کھلے ذہن کی تنقید کہیں نہیں
دکھائی دیتی یوں بھی اردو تنقید یکطرفگی اور جانبدارانہ
تنقید کے لئے بدنام ہے اور آپ نے دہلی کے چار شعراء
بہ نظر انتقاد" لکھ کر اس میں ایک اور داغ کا اضافہ
کر دیا ہے۔ اگر واقعی آپ ایمانداری سے ان شعراء پر
بہ نظر تنقید کچھ لکھنا چاہتے تھے تو ان کی مجموعی شاعری
پر سیر حاصل بات کرنی چاہئے تھی۔ چند قطع چند اشعار
نہ تو کسی کے معیار کو ظاہر کر سکتے ہیں نہ اس کی فکر کا
مکمل احاطہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے تجزیہ کرتے ہوئے
جگہ جگہ پر گیپ چھوڑ دیئے ہیں۔ کہیں یا تو شعر کو سمجھنے
کی کوشش ہی نہیں کی ہے یا عدم معلومات کا اظہار کر کے
آگے بڑھ گئے ہیں۔ بعض اشعار میں اصلاح کی سطحی
کوشش نے بھی آپ کی شخصیت اور تحریر دونوں کو
نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے جب سے شاعری کے میدان
میں قدم رکھا ہے آپ کی تحریریں پڑھتا رہا ہوں۔ پہلی
بار ایسا لگا کہ آپ نے اپنے معیار کی بلندی سے اتر کر
بات کی ہے۔ مخمور سعیدی کی غزل کا مطلع ہے۔

سُن لی صدائے کوہ ندا اور چل پڑے
ہم سے کسی نے کچھ نہ کہا اور چل پڑے

اولاً آپ نے "کوہ ندا" کے بارے میں اپنی عدم معلومات
کا اظہار کیا ہے اور بعد میں بغیر کسی وجہ کے اس مطلع
کو بھدا کہا ہے۔ جبکہ اس مطلع کی تمام معنویت
"کوہ ندا" میں پوشیدہ ہے قصہ حاتم طائی سے حاصل
شدہ ایک علامت ہے۔ اس قصہ میں بتایا گیا ہے کہ
"کوہ ندا" پر ایک دیو تھا جو روزانہ بستی کے ایک آدمی
کو کھا جاتا تھا۔ جبکہ دل بستی والے کسی آدمی کو [illegible]

وہ بستی پر حملہ کر دیتا۔ اجتماعی طور پر مرنے کے خوف
سے بستی والوں نے ہر گھر کی باری مقرر کر دی تھی،
جس دن جس گھر کی باری ہوتی اس کا ایک فرد پہاڑ
سے آنے والی موت کی آواز کو سن کر کسی کے کہے بغیر
موت کی آغوش میں سونے کے لئے چل پڑتا ہے اِس
عہد میں انسان سماج نام کی مشین کا پرزہ بن کر رہ
گیا ہے۔ اس کا اپنی کوئی مرضی نہیں وہ آزادی سے سانس
لینے سے بھی محروم ہے۔ دن شروع ہوتے ہی وہ سماج
کی مشین میں فٹ ہو کر گردش کرنے لگتا ہے۔ انسان
کی اس بے بسی و بیچارگی کا اظہار اس مطلع میں
ہوا ہے یہ شاعری بڑی نہ سہی لیکن اپنے عصر کی خوبصورت
اور معیاری معنویت سے بھرپور شاعری ہے۔ مجبور سعیدی
کی دوسری غزل سے

اس کے ملنے کا احتمال سا کچھ
ہجر میں عالم وصال سا کچھ
حاصلِ عشق کیا کہیں کیا ہے
ہاتھ آیا ہے بے مثال سا کچھ

اردو شاعری کی روایات سے معمولی طور پر بھی واقف
کوئی شخص ایسا تبصرہ نہ کرے گا جیسا کہ آپ نے کیا
ہے۔ مطلع اور شعر دونوں میں "سا کچھ" کی ردیف
کا بھرپور معنویت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ ملنے
کے احتمال سے پیدا وصال کی کیفیت عجیب ذہنی سیرابی
اور کشمکش دونوں کو جنم دیتی ہے یہی مطلع کا حسن
ہے۔ اب رہا حاصلِ عشق اور بے مثال سا کچھ ہاتھ
آنے کا معاملہ تو اس میں کچھ بھی لا یعنی خاص نہیں۔
سمجھو کہ عشق کا حاصل یا تو وصل ہوتا ہے یا پھر ہجر
کے صبر آزما لمحات۔ اردو غزل کا اختصاری سلسلہ اردو

شاعری میں غم کو عشق کا بہترین حاصل سمجھا گیا ہے
اسے بے مثال دولت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔
ان مثالوں سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ
آپ نے کسی ذاتی معاملہ کے سبب جذباتی ہو کر مذکورہ
تحریر لکھی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ایسی سطحی تحریروں
سے اپنی شخصیت کو مجروح نہ کریں۔

ادب کا ایک طالب علم
● عبدالمتین نیاز، بھوپال

مظفر نواب صاحب جنوری کے مہینے میں بمبئی
آئے تھے جب پورا شہر فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ ان
دنوں میں اپنی فیملی کے ساتھ جان بچا کر اپنے ایک انتہائی
شریف النفس ہندو دوست کے ہوٹل واقع میرین ڈرائیو
میں مقیم تھا۔ نواب صاحب (سید علی مظفر) نرگس مرحومہ
کے بھائی اختر حسین صاحب کے فلیٹ میں ٹھہرے تھے۔
ٹہلتے ٹہلتے وہاں سے ہر شام وہ میرے گھر میں آجاتے اور
ہم دونوں کبھی شعر و شاعری کی حسین وادیوں میں گھوما
کرتے اور کبھی ان کی دینی باتیں میری معلومات میں اچھا خاصہ
اضافہ کرتیں۔ پھر وہ مئی کے مہینہ میں بمبئی تشریف لائے تو
یہ منحوس خبر ملی کہ انہیں کینسر جیسے موذی مرض نے بری طرح
جکڑ رکھا ہے۔ وہ اس مرتبہ ہر شام مغرب کی نماز پڑھ کر
مجھے اپنے ساتھ گیلارڈ لے جاتے جہاں چائے ناشتے کے
دوران کبھی ادبی گفتگو ہوتی تو کبھی سیاست کی باتیں نہ
جانے کیوں اختر حسین صاحب کے فلیٹ سے نکل کر وہ اس
تیزی سے چلتے تھے جیسے ان کی گاڑی چھوٹنے ہی والی ہو
جب میں گیلارڈ سے باہر نکل کر ان سے کہتا کہ علاج کے
لئے کیا سوچا ہے تو وہ مسکرا کر جواب دیتے کہ میں بالکل

اچھا ہوں۔ کوئی اور بات کیجئے۔ پھر چرچ گیٹ کی ایک مخصوص دکان پر رک جاتے اور پان بنواتے۔ سگار پینا بھی انہوں نے ترک نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ گیا جا کر ان کی بیماری ایسا ٹرن لے گی کہ وہ اتنی جلدی یار دوستوں کی محفل سے اٹھ کر ہمیشہ کے لئے چلے جائیں گے۔

نواب صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہیں اردو کے سینکڑوں اشعار یاد تھے جن پر ان کا عالمانہ تبصرہ سننے کے قابل ہوتا تھا۔ پٹنہ کے "زبان ادب" میں وہ اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی داستان لکھ رہے تھے جو ادھوری رہ گئی۔ "سہیل" میں شائع ہونے والے مضامین کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ کاش وہ کچھ دن اور زندہ رہتے۔

● قیصر عثمانی، بمبئی

بانی :- حافظ عبدالرحمٰن بسمل شنہابادی ☆ بیادگار :- زین العابدین محمود ادیب شنہابادی

سُہیل گیا
ماہنامہ

فہرست

شمارہ ۷ جلد ۵۳

بدلِ اشتراک
فی شمارہ .... ۶ روپے
زرِ سالانہ .... ۵۰ روپے
تاحیات ممبری .... ۱۰۰۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل گیا
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا-۸۲۳۰۰۱
فون ۲۱۸۶۳

مذہب اور سیاست

ہندوستان میں آزادی کے بعد آج تک مذہب کی آڑ میں کام کرنے والی تخریب کار اور فسطائی طاقت کو بڑھاوا دیا جاتا رہا ہے۔ ترقی پسند اور وطن دوست جماعتوں نے ارباب اقتدار کے اس خطرناک رویے کی ہمیشہ تنقید کی ہے۔ اس کے مہلک نتائج سے بار بار متنبہ کیا گیا ہے۔ مگر صاحبان اقتدار تو کرسیوں کے پجاری ہیں۔ صالح سیاست کا کام تو یہ ہونا چاہئے کہ عوام کو مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھایا جائے۔ اور ہر ایسے عنصر کی شدومد سے مخالفت کی جائے جو بالآخر قوم و وطن کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر منصب اقتدار کے بھوکے سیاست کو تو اپنے حلوے مانڈے سے تعلق ہونا چاہئے۔ انھیں یہ دیکھنے کی فرصت کہاں کہ ملک کدھر جا رہا ہے۔

آج جب فسطائی طاقتوں نے اپنے قدم جمالئے ہیں تو صاحبان اقتدار کو ہوش آیا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اب ملک میں مذہبی جذبات کا استحصال کر کے انتخاب میں فائدہ نہ اٹھایا جائے اور پورے ملک کو دائیں بازو کی رجعت پسند طاقتوں کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ یہ ہوش بھی انہیں آیا ہے جب ان کے قدم سے زمین کھسکنے لگی ہے اور ان کی کرسیاں لڑکھڑانے لگی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آج بھی وہ وطن دوستی اور ملک کی حفاظت و سالمیت کے جذبے کو فوقیت نہیں دیتے بلکہ صرف اپنی سیاسی بازی جیتنے کے لئے بظاہر فسطائی طاقتوں کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔

چنانچہ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے لئے خصوصی بل کی تجویز ہے۔ لیکن اب تک خود اقتدار میں اتنی تباہی پیدا کی جا چکی ہے کہ شاید یہ بل بھی اس کا تدارک نہ کر سکے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا آئین پہلے سے ہی ایسی تخریب کار طاقتوں سے محفوظ رہنے کی ضمانت دیتا ہے۔ لیکن آئین کے حصے کو سمجھنے سمجھانے اور اسے نافذ کرنے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں گئی۔

اب بھی اگر ہم اپنے جامع و مانع آئین پر ایمانداری سے عمل کریں تو کسی خصوصی بل کے بغیر بھی اس بڑھتے سیلاب کو روکا جا سکتا ہے۔

مسعود منظر

اصغر علی انجینئر

پریم چند ۔ حیات اور فن

آخری قسط

پریم چند کے فن کا اجمالی جائزہ

ہم نے پریم چند کے مذکورہ بالا خطبے میں ان کے فنی نظریات سے ان ہی کے الفاظ میں واقفیت حاصل کی ۔ اب ہم ان کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر ان کے فن کا اجمالی جائزہ لیں گے ۔ یہاں محدود طوالت کے پیش نظر ان کے فن کا تفصیلی جائزہ لینا یا ان کی تخلیقات کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔ اسی لئے ہم چند اہم تصنیفات کو سامنے رکھ کر ان کے فن پر اجمالی گفتگو کر سکیں گے ۔

جدید کہانی کے ارتقاء میں پریم چند کا اہم حصہ ہے اس سے شاید ہی کوئی نقاد انکار کی جرأت کر سکے گا ۔ یہ حصہ کس قدر اہم ہے اس بات پر البتہ اختلاف ہو سکتا ہے ۔ یقیناً پریم چند کے بعد کہانی اور ناول کے فن نے بہت کچھ ترقی کی ہے اور فنی اور تکنیکی اعتبار سے کئی بہتر کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود پریم چند کی اہمیت جدید کہانی کی تاریخ میں اپنی جگہ مسلم ہے ۔ پریم چند نے کہانی کے فن کو محض داستان یا افسوں طرازی کے جنگل سے نکال کر ایک نئے راستے پر ڈال دیا ۔ اور اسے زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر کر دیا ۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو اور ہندی کہانی کو پریم چند نے جدید فکشن کو حقیقت نگاری سے روشناس کرایا ۔

حقیقت نگاری کی اصطلاح کو واضح کر دینا ضروری ہے ۔ دراصل یہ تصور ہم نے یوروپی ادب سے لیا ہے ۔ یہ انگریزی اصطلاح REALISM کا ترجمہ ہے ۔ یوروپی ادب میں ایک دور میں رومانیت کا دور دورہ تھا ۔ رومانوی طرز تحریر بظاہر ہے تخیل اور اس کی پرواز پر زیادہ زور دیتا ہے ، معروضی حقیقت پر نہیں ۔ لیکن ۱۹ویں صدی سے یورپ میں بعض ادیبوں نے اس تخیل پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور ادب میں معروضی حقیقت کی عکاسی پر زور دینا شروع کیا ۔ ان ادیبوں کے لئے حقیقت نگاری کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ۔ ظاہر

ہے ان ادیبوں کا زور محض تخیل کی پرواز کے مقابلے میں زندگی کے حقائق کی عکاسی پر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے تخلیقات میں تخیل کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اگر ادب میں تخیل کا عمل دخل نہ ہو تو محض فوٹوگرافی ہو کر رہ جائے گی۔ فوٹوگرافی ایک میکانکی عمل ہے۔ اور ادب ایک تخلیقی عمل اور تخلیقی عمل تخیل کی مدد کے بغیر [illegible] بعض ادیب انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں اور تکنیک کو تخلیقی عمل پر زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ رومانیت کے خلاف بھی احتجاج اسوقت شروع ہوا جب ادب محض تخیل کی پرواز کا نام رہ گیا اور معروضی حقیقت کو قطعاً نظر انداز کیا جانے لگا۔ اس طرح بعض حقیقت نگاروں نے ادب کو محض فوٹوگرافی بنا کر رکھ دیا۔ اچھے تخلیقی عمل میں معروضی حقائق کا اور تخیل کا بڑا متوازن امتزاج ہوتا ہے۔

ہم اوپر کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ شروع میں پریم چند خود رومانیت کے زیر اثر لکھتے تھے اور ان کی تخلیقات بھی داستان طرازی اور قصہ گوئی کے دائرے تک محدود تھی۔ لیکن پریم چند نے بہت جلد اس طرز تحریر کی محدودیت کو محسوس کر لیا اور سوزِ وطن کی کہانیاں ان کے لئے ایک نیا ادبی موڑ بن گئیں۔ سوزِ وطن کی کہانیوں میں پریم چند نے حقیقت نگاری کے سمت میں پہلا قدم بڑھایا اور اسی لئے پریم چند کے ادبی ارتقا میں سوزِ وطن کی اپنی اہمیت ہے۔ ایک مرتبہ پریم چند نے حقیقت نگاری کی سمت میں قدم بڑھایا پھر پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ دراصل یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس سمت میں اپنا فن پختہ تر کرتے چلے گئے۔ یہاں چند لفظوں میں حقیقت نگاری کا انتقادی تصنیف نگاری اور سماجی وادی حقیقت نگاری کا فرق واضح کر دینا بھی ضروری ہوگا۔ حقیقت نگار وہ ہے جو معروضی حقائق کی اپنی تخلیقات کے ذریعہ عکاسی کرے جبکہ انتقادی حقیقت نگار۔ (CRITICAL REAL[IST]) وہ ہے جو سماج میں پائی جانے والی طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور معاشی ناانصافیوں کا واضح شعور رکھتا ہو۔ اور ان خرابیوں اور ناانصافیوں سے پیدا ہونے والے انسانی کرب کو کامیابی کے ساتھ اپنی تخلیقات کے ذریعہ پیش کر سکے۔ اس کے برخلاف سماج وادی حقیقت نگار وہ ہے جو نہ صرف طبقاتی سماج اور اس سے پیدا ہونے والی ناانصافیوں اور انسانی کرب کا شعور رکھتا ہو بلکہ وہ اس طبقاتی سماج کو بدل کر ایک غیر طبقاتی سماج وجود میں لانے کا بھی شعور رکھتا ہو۔

پریم چند نے ان ارتقائی منازل کو یکے بعد دیگرے طے کیا۔ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو وہ داستان طرازی اور تخیل پرستی کے اثر میں تھے۔ اس مرحلے سے گذر کر وہ حقیقت نگاری کی طرف آئے اور بہت جلد انہوں نے برطانوی سامراج کے زیر حکومت ہندوستانی سماج میں پائی جانے والی خرابیوں اور معاشی نابرابری سے پیدا ہونے والے مسائل کا شعور حاصل کر لیا۔ ان کے اس دور کے اکثر افسانوں اور ناولوں میں انتقادی شعور کی جھلک ملتی ہے گویا اب پریم چند انتقادی حقیقت نگاری کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ شروع ہی سے پریم چند کو مظلوم اور محکوم طبقوں سے ہمدردی تھی ادبی کیریر کے اپنے اس دور میں اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعہ بھرپور طریقے سے ان طبقوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

ان کے شاہکار "گئودان" میں بھی اس طبقاتی شعور کی واضح جھلک ملتی ہے۔ "گئودان" میں دراصل پریم چند سوشلسٹ ریلزم کے قریب آتے دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گئودان ان کی انتقادی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے البتہ ان کا آخری ناول منگل سوتر جو نامکمل ہی رہا ان کا سب سے اہم ناول ہوتا اور شاید سوشلسٹ ریلزم کی مثال بھی۔ لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی اور اس ناول کو وہ مکمل نہ کر سکے۔ جیسا کہ مہاجنی تہذیب والے مضمون سے اور ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں دیئے گئے خطبہ صدارت سے ظاہر ہے وہ عمر کے اس مرحلے میں سوشلزم کے مکمل حامی ہو چکے تھے اس لئے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس ناول (یعنی منگل سوتر) میں ضرور غیر طبقاتی سماج کی تقسیم سے بحث کرتے اور اس طرح سوشلسٹ ریلزم کی تکنیک کو اپناتے۔

جہاں تک انتقادی حقیقت نگاری کا تعلق ہے اس کی بہترین مثالیں ہمیں پریم چند کے یہاں ملتی ہیں۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اس کی بڑی نکھری ہوئی صورت ہمیں ان کے یہاں نظر آئے گی۔ ان کے دور اول کی کہانیوں اور ناولوں کو چھوڑ دیا جائے تو پریم چند کے ناول ہمیں محض نظریاتی کے مقابلے میں ٹھوس یکطرفہ کے بجائے کئی جہتوں والے۔ ٹھہرے ہوئے کے بجائے ارتقا پذیر اور مابعد الطبیعاتی کے مقابلے میں تاریخی یعنی وقت کو حقیقی تسلیم کرنے والے نظر آئیں گے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک انتقادی حقیقت نگار کے یہاں ان خصوصیات کا پایا جانا بے حد ضروری ہے۔

بعض لوگوں نے حقیقت نگاری کو فوٹوگرافک تکنک کا معروضی حقیقت کی جوں کی توں عکاسی کرنا سمجھ لیا ہے۔ ایسے ادیبوں کے یہاں حقیقت نگاری کا اپنا محدود تصور قائم ہو گیا کہ اس میں میکانکی عکاسی کے علاوہ کسی اور تکنک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی لیکن یہ پریم چند کی عظمت کا ثبوت ہے کہ ہمیں ان کے یہاں حقیقت نگاری کا ایسا میکانکی تصور نہیں ملتا حقیقت وہی نہیں ہے جیسا ہم آپ پاتے ہیں بلکہ وہ ایک بدلتا ہوا اور بدلنے والا عمل بھی ہے، ایک نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کا تصور بھی۔ خود پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے "میں حقیقت پسند نہیں ہوں (اسی میکانیکی معنی میں) کہانی میں جیتے جیوں کی تیوں رکھی جائے تو سوانح عمری ہو جائے گی۔ دستکار کی طرح ادیب کا حقیقت پسند ہونا ضروری نہیں ہے، وہ ہو بھی نہیں سکتا۔ ادب کی تخلیق گروہ انسانی کو آگے بڑھانے اٹھانے کے لئے مستعد ہے ــــ مسالیت ضرور ہو لیکن حقیقت پسندی اور اقدار کے برعکس نہ ہو اس طرح حقیقت پسند بھی مثالت کو نہ بھولے تو بہتر ہے"، اس طرح یہ بات واضح ہے کہ پریم چند حقیقت نگاری کو فوٹوگرافی یا سوانح عمری کے معنی میں تسلیم نہیں کرتے بلکہ انسان اور انسانی سماج کو اضافہ اور آگے بڑھانے کے معنی میں مانتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ حقیقت کی طرف انتقادی رویہ اختیار کرنا اور تبدیلی کے عمل کو زور دیکر نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کیجو جو انسان کے ظاہر و باطن کو زیادہ حسین اور صحتمند بنائے۔ اپنی تخلیقات میں پیش کرنا ہی صحیح معنی میں حقیقت نگاری کے زمرے میں شامل ہے اور یہ حقیقت نگاری زیادہ جاندار اور ماضی اور مستقبل سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہوتی ہے

یہاں فن کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو بڑا اہم ہے۔ اور حقیقت نگاری کو ایک اور سطح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ادیب محض سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ امکانی حقیقت کا بھی ایک تصور قائم کرتا ہے۔ اور اس کی تخلیقات میں ہمیں موجود اور امکانی حقیقت میں ٹکراؤ اور تناؤ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ زندگی سے متعلق ادیب کا اپنا ایک وژن ہوتا ہے اور اس وژن کے پیش نظر موجودہ حقیقت اسے غیر اطمینان بخش نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ ایک امکانی دنیا کا تصور قائم کرتا ہے جہاں ہر بات اس کے وژن کے مطابق اور اطمینان بخش ہوگی۔ موجودہ حقیقت اسے بدصورت نظر آتی ہے اور اسے وہ اپنی تخلیقات میں زیادہ بدصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور امکانی دنیا کو اور زیادہ خوبصورت تاکہ موجود اور امکان میں تناؤ پیدا ہو۔ یہ تناؤ جتنا شدید ہوگا اس کے تخلیق کی جمالیاتی کیفیت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ پریم چند بھی اس بات کا پورا احساس رکھتے تھے۔ وہ ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ ذہنی انکشاف اور جذبات کی تطہیر کا بھی ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" ادب سے حاصل ہونے والی تفریح میں جذبات کی تطہیر کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اگر تطہیر کا مقصد سامنے رکھا جائے تو کشش کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم داخلی ذہنی کیفیت دکھاتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہمیں کوئی فلسفہ پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ ہم خوبصورت کو اور خوبصورت اور بدصورت کو اور بدصورت بنا سکیں "

دراصل یہی ایک فن کار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ بدصورت موجودہ حقیقت اور خوبصورت امکان میں شدت سے تناؤ پیدا کرے اور اپنے قاری کی داخلی کیفیت کو بھرپور طریقے سے متاثر کرے تاکہ اس پر ایک نئی حقیقت کا یوں امکانی حقیقت ہے۔ انکشاف ہو جائے۔ اور اس بات کو پریم چند ادب کے مقاصد میں شامل کرتے ہیں۔

پریم چند نے ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جب ہندوستان ایک زبردست بحرانی دور سے گذر رہا تھا برطانوی حکومت نے صدیوں پرانے ہندوستانی سماج میں نئے پیداواری رشتے اور ایک حد تک، نئی پیداواری طاقتوں کو جنم دے کر حرکت پیدا کر دی تھی یہ ماضی کی طرح محض حکمرانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی، برطانوی حکومت نے ایک نئے سماجی نظام کو بھی جنم دیا تھا۔ پریم چند کی دوربین نگاہوں نے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ ایک کامیاب ادیب کے لئے سماجی تبدیلی کے عمل اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر گہری نظر رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور سے ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ان میں ان مسائل کو سمونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پریم چند اس راز سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی تیز بیں نگاہیں سماجی تبدیلی کے عمل اور اس سے پیدا شدہ دیہاتی ہندوستان میں پائے جانے والے تضادات اور دیہاتوں میں رہنے والے مفلس عوام کی داخلی زندگی میں خام مواد تلاش کرتی ہیں۔ ہندوستان کی اصل طاقت کا سرچشمہ انہیں دیہات کے ان مفلس عوام میں نظر آیا جو اپنی زندگی میں معمولی سی خوشگواری کی تمنا اپنے سینوں سے لگائے آخر موت کی آغوش

میں سماجاتے ہیں۔ گئودان میں ہوری ایک ایسا ہی کردار ہے۔ ہوری کی ایک چھوٹی سی تمنا جو روایتی معاشرے میں ہر ہندوستانی کسان کی ہوتی ہے ایک گائے حاصل کرنے کی تمنا: یہ تمنا ہوری کی زندگی کے جدوجہد کا محور ہے اور پریم چند اس ناول میں دیہاتی زندگی کے تمام تضادات اور تلخیوں کو بھرپور طریقے سے پیش کرتے ہیں۔

جمالیات کے کئی اہم اجزا وہ ہیں اور ایک لڑکی

بدلتے ہوئے سماج کے مختلف مسائل پر تخلیقی ادب کا موضوع بنایا جاتا ہے تو یہ بات خاص اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ جمالیات کے کن عناصر پر زور دیا جائے۔ جب ایک سماج تبدیلی کے عمل سے دوچار ہوتا ہے تو کسی انسان اس عمل سے مختلف طریقوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب برطانوی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی اور نئی معاشی اور سماجی قوتیں وجود میں آئیں تو ان سے کروڑوں عوام متاثر ہوئے۔ شہروں میں برطانوی کارخانوں کا مال درآمد ہونے لگا اور لاکھوں چھوٹے دستکار اس سے تباہ ہو گئے۔ اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ دیہاتوں پر برطانوی دلیدوارڈی نظام نے دیہات کے قدیم خود مختار کردار کو تباہ کر کے جاگیردارانہ نظام کو ایک نئی شکل دی جس سے غریب کسانوں کے استحصال میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان تبدیلیوں سے پرانے سماجی اور انسانی رشتے بھی متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے لاکھوں عوام کو اس عمل نے اپنی زد میں لیا اور پرانے نظام حیات اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے نے اس دور کے متاثرہ عوام میں کرب اور بے چینی کی کیفیت پیدا کی۔ پریم چند کے کردار انہی متاثرہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے افسانوں اور ناولوں میں تبدیلی کے اس عمل سے پیدا ہونے والے کرب کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل جمالیات کا یہ بڑا ہی مشکل اور پیچیدہ پہلو ہے۔ اور اس سے وہی پوری ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کی سماجی تبدیلیوں کی تہ در تہ پیچیدگیوں پر پوری گرفت ہو۔

پریم چند سماجی حالات اور اس میں پیدا ہونے والے تبدیلی کے عمل پر جو گرفت رکھتے تھے وہ ان کے ناول گئودان سے خاص طور سے ظاہر ہے۔ چوگان ہستی اور میدان عمل بھی اچھے ناولوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان ناولوں میں اکثر کردار پریم چند کے نظریات کا شکار نظر آتے ہیں۔ چوگان ہستی کے سورداس اور میدان عمل کے امرکانت دونوں کی یہی کمزوری ہے جبکہ گئودان میں ہوری ہو یا رائے صاحب، گوبر ہو یا مہتا، حالات کی پیچیدگیوں اور سماجی عمل سے ان کے کردار کا خمیر اٹھتا ہے۔ اور اسی میں فنکار کی پختگی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گئودان میں خامیاں نہیں ہیں۔ اس میں بھی کئی جھول ہیں اور مسٹر ڈرامہ بھی کئی موڑ مصنوعی بھی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے اہم کردار تہ در تہ پیچیدگی رکھتے ہیں اور فنکار کی پختگی کی ہم سے داد وصول کرتے ہیں۔ دراصل اس ناول کے تانے بانے میں وہ تمام سماجی، سیاسی اور معاشی قوتیں گتھی ہوئی ہیں جن کے مجموعے کا نام ہندوستانی دیہات ہے (اس میں ان کے تضادات اور ٹکراؤ بھی شامل ہیں) کوئی عظیم فنکار ان طاقتوں اور ان کے تضادات اور ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل کو نظر انداز کر کے بڑا ناول نہیں لکھ سکتا۔

بقیہ — صفحہ [illegible] پر

مرحوم سید علی مظفر

پراگندہ طبع لوگ

قسط ۱۵

نیاز حیدر

نیاز حیدر بمبئی کے دوران قیام
ملاقات ہوئی میرا دفتر (شاہین پکچرس) فیمس سینے
بلڈنگ مہالکشمی میں FAMOUS CINE BUILD-
ING, MAHALAKSHMI تھا۔ اس میں فلم سازوں
کے پچاسوں دفاتر تھے چند سال RK FILMS کا بھی دفتر
تھا۔ پھر چمبور منتقل ہوگیا۔ نیاز حیدر میرے دفتر مجھ سے
ملنے آئے۔ نگار سلطانہ میری فلم میں کام کر رہی تھیں۔
نیاز حیدر ان کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ نگار سلطانہ
فلمی اداکارہ تو تھیں ہی مگر ساتھ ساتھ ان میں ادبی
ذوق بے پناہ تھا۔ شعرا خاص طور پر اور ادیبوں کی
بے حد عزت کرتی تھیں۔ نیاز حیدر سے پہلے دفتر میں چند
شعرا سے ملنے کا موقع ملا۔ مگر جو بات نیاز حیدر میں
تھی وہ یہ کہ ان کی گفتگو وغیرہ سے قطعی طور پر یہ
ثابت تھا کہ وہ فلم کے لئے گانا لکھنے نہیں آئے تھے۔ اور
نہ اس کے خواہشمند تھے۔ نگار نے بتایا تھا کہ مجھے شعر و
ادب سے دلچسپی ہے اس لئے انہوں نے زحمت
کی تھی۔ وہ بالکل کاروباری انداز سے بے نیاز تھے۔ جس
دوست یا ادب نواز کے گھر گئے اور اس نے روک لیا تو
چند دن وہیں قیام کرتے۔ اس معاملے میں بے تکلف تھے
غالباً ذوق کے شعر کی جیتی جاگتی عکاسی کرتے۔ تکلف
میں ہے تکلیف سراسرلے ذوق۔ آرام سے ہیں وہ جو
تکلف نہیں کرتے۔ اکثر ان کے والد صاحب ان کو تلاش
کرتے ہوئے میرے دفتر آتے تو میں، انہیں بٹھا لیتا کہ آپ
آرام سے چائے پیجئے رہا صاحبزادے (یعنی نیاز حیدر)
کی تلاش بے کار ہے خود آجائیں گے۔ اپنے والد صاحب
سے بھی نیاز حیدر ہی نے مخصوص بلکہ منفرد ڈھنگ سے
ملایا تھا۔ تو میں ان کے والد صاحب سے کہتا کہ آپ کی تشویش
اپنے صاحبزادے کے لئے مجھے ایک شعر کی یاد دلاتی ہے۔

سنا ہے قیس کے والد یہ فرماتے تھے رو رو کر
نہ جانے کون سے جنگل میں برخوردار بیٹھے ہیں

اب کچھ باتیں ان کی شاعری کے متعلق بھی سن لیں۔ نظمیں کہتے تھے اور پڑھنے کا ڈھنگ نہایت موثر تھا۔ بایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر نہایت جوش اور امنڈتے ہوئے جذبات سے سناتے تھے۔ مجمع پر سناٹا چھا جاتا اور ایک ساتھ واہ واہ کی صدا بلند ہوتی۔ تخیل کی پرواز سے سننے والا بے چین ہو جاتا۔ ایک نظم تھی جس کا ٹیپ کا مصرع تھا۔ "اندھیرے کے سیہ کاروں اجالا ہونے والا ہے" ہدف برطانیہ۔ ایران کی دخل اندازی پر (کوئی بند تو کیا مصرع بھی یاد نہیں) یہ اظہار خیال کہ قالینوں کی سرزمین سے چنگاریاں نکلیں یا مصر کے بارے میں تخیل کی پرواز ملاحظہ ہو۔ مصر میں فراعنہ کی لاشیں محفوظ کی جاتی رہیں اس پس منظر میں دیکھئے کس طرح انگریزوں پر تنقید کرتے ہیں کہ اس زمین سے ہٹ جاؤ۔ بند یاد نہیں مگر شاید ایک آدھ مصرع سنا سکوں۔

زلیخا کا وطن ناپاک بد صورت سیاست سے
جہاں فرعون کے لاشے کو رکھتے تھے حفاظت سے
یہیں پر جیل مرے گا کس قدر تقدیر والا ہے
اندھیرے کے سیہ کاروں اجالا ہونے والا ہے

ان کی معرکۃ الآرا نظموں میں ایک نظم وہ بھی ہے جو انہوں نے جیل میں کہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے افراد جیل بھیجے گئے۔ شاعروں میں بمبئی جیل کی رونق بڑھانے کے لئے سرکار نے مجروح سلطانپوری اور نیاز حیدر کا انتخاب کیا۔ وہاں ایک نظم کہی "زنداں کے مٹائے جانے تک پابندی زنداں اور سہی"۔ اس کے دو چار بند دیکھیں اس لئے بھی کہ مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ آپ تو پڑھ چکے ہوں گے مگر اپنی پسند کی تشفی کے لئے لکھ رہا ہوں کس حسن سے ہر بند کے بعد ٹیپ کے مصرع کی خون جگر سے پرورش کرتے ہیں۔

میری ہی نوائے تابندہ انوار سحر پھیلاتی ہے
آواز مری للکار مری تحریک وطن بن جاتی ہے
گیتوں کی بغاوت خیز تپش مزدور کا دل گرماتی ہے
میرے ہی قلم کی آگ ہے جو دہقاں کا لہو کھولاتی ہے
بزدل ہے جو تم سے ڈر جائے تعزیر کے عنواں اور سہی
زنداں کے مٹائے جانے تک پابندی زنداں اور سہی

آواز جو حاصل کی میں نے محکوم خموش چٹانوں سے
پھانسی کے بھیانک پھندوں سے مقتول جواں ارمانوں سے
آواز جو اکثر آتی ہے لٹنے والے کھلیانوں سے
آواز جو ڈھل کر آتی ہے فولاد کے صنعت خانوں سے
تم روک نہیں سکتے ان کو اقدام پشیماں اور سہی
زنداں کے مٹائے . . . .

جیلوں کے مقفل دروازے شاہد ہیں کہ میں مجبور نہیں
سنگین حصاروں نے دیکھا آواز مری محصور نہیں
بے باک نظر کی راہوں میں حائل کوئی دستور نہیں
ٹھکرائی ہوئی سرکار ہے یہ سرکار مجھے منظور نہیں
بدلیں تو بدلنے دو پہرے تھکتے ہوئے درباں اور سہی
زنداں کے مٹانے . . . .

آزاد بنے پھرتے ہو مگر چہرے پہ جبیں ہے بھی کہ نہیں
تن تن کے بہت چلتے ہو مگر قدموں پہ یقیں ہے بھی کہ نہیں
قرباں سبک رفتاری کے رفتار کہیں ہے بھی کہ نہیں
پیروں کے تلے سرکار ذرا دیکھو تو زمیں ہے بھی کہ نہیں
تاریخ معاف نہیں کرتی بیداد کے عنواں اور سہی
زنداں کے مٹائے جانے تک . . . .

علی عباس ازل
بمبئی

انجانے عقیدے

کچھ عقیدے ہم سوچ سمجھ کے، عقل سے پرکھ کے مانتے ہیں اور کچھ کو قبول کرتے وقت ہم اپنی فکر کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔ آخر الذکر کو انجانے، نامعلوم مخفی یا جبلی عقیدے کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کو مانتے ہوئے بھی ہم ان کے بارے میں بالکل لاعلم یا انجان ہوتے ہیں۔ یہ عقیدے کیا ہیں، کیسے بنتے ہیں اور وہ کون سے محرکات ہیں جن کی وجہ سے آج کل انجانے عقیدوں اور ان کے ماننے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ان سوالوں سے مختصراً بحث کی گئی ہے۔ انجانے عقیدوں کا تعین کرنے والے عناصر عقلی نہیں ہوتے نفسیاتی اور سماجی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان عقائد کی ابتدا اور ان کے ترکیبی محرکات یعنی میکانیت (MECHANISM) کو سمجھنے میں نفسیات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ عمرانیات یا سماجیات میں بھی مخفی عقیدہ ایک دلچسپ وقوعہ (PHENOMENON) سمجھا جاتا ہے کیونکہ مذہبی عقاید اور سماج کے ادھر ادھر سرکتے ہیں جو کمی بیشی ہوتی ہے وقوعہ اس کو ظاہر کرنے کے لئے ایک اشاریے کا کام کرتا ہے۔ معروضی نقطۂ نظر سے انجانے عقیدے فی الحال غیر مدلل عقائد سے لے کر ان عقیدوں تک پھیلے دکھائی دیتے ہیں جو بالکل ہی لغو ثابت کئے جا سکتے ہیں۔

ایسے مخفی عقاید جو کسی ادارے کی شکل میں منظم ہو جاتے ہیں اپنے ماننے والوں کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو روائتی مذہب کا ہے۔ یہ عقیدے کاذب علمیات یعنی جھوٹے اور مصنوعی علوم اور نام نہاد سائنس (SCIENTOLOGY)، علم کشف، شیطانیات یا سفلیات سے منسلک ہیں۔ اور عام توہمات کے برعکس مذہب سے زیادہ مماثل ہیں۔ اور ایسی ضروریات پوری کرتے ہیں جو عام طور پر مذہب کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح کے عقائدی نظام اپنے عقیدت مندوں سے اکثر و بیشتر مکمل وابستگی چاہتے ہیں خواہ یہ عارضی ہو یا مستقل۔

بعض عقیدے فراری تفریح — ESCAPIST — ENTERTAINMENT) مثلاً خیالی سائنسی

ادب یا تخیلاتی پروازوں (FANTASY) میں
دلچسپی لینے کی وجہ سے بھی بنتے ہیں۔ بعض نیز اہم
ذاتی عقیدے ہوتے ہیں۔ جو ادھر ادھر سے حاصل کی ہوئی
غلط معلومات کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔ عقیدوں کو
معین کرنے والے یہ عناصر کسی مخصوص عقیدے میں
یقین کی مختلف سطحوں پر الگ الگ ڈھنگ سے
اثر انداز ہوتے ہیں اور ایسے عقیدوں کو ماننے کی وجوہ
بھی لوگوں کے مختلف گروہوں میں مختلف ہوتی ہیں۔
انجانے عقیدوں کی تشکیل میں عام ابلاغی ذرائع
بھی آج ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ لوگ ریڈیو، فلم
اور ٹی۔وی۔ سے متاثر ضرور ہوتے ہیں مگر اخبار اور رسالے
ان سے کہیں زیادہ موثر اور مقبول ذریعے ہیں جو جعلی
عقائد اور نام نہاد سائنسی موضوعات کی تنقید کرنے
کے بجائے انہیں سراہتے رہتے ہیں۔ ایک عام آدمی
جب معتبر اخباروں میں اڑن طشتریوں یا نامعلوم
طائری اشیا (U.F.O) وغیرہ کے بارے میں
پڑھتا ہے، جب موقر جریدے اسے باباؤں، یوگیوں
اور سوامیوں کی کرامات کے متعلق بتاتے ہیں اور جب
اس کو "روحانی علاج" کی نئی سرحدیں دکھائی جاتی ہیں
تو ان پر یقین کرنے کے لئے اسے جواز مل جاتا ہے۔ پھر وہ
اسے چنڈو خانے کی بات نہیں سمجھتا اخبار میں چھپی ہوئی
خبر مانتا ہے۔ ابلاغی ذرائع میں اس طرح کی رپورٹنگ
ایک حد تک تو سائنسی خبر نگاری موجود نہ ہوسکنے کی
وجہ سے ہوسکتی ہے مگر اخبارات اور رسالے مخفی واقعات
کے سلسلے میں عموماً غلط بیانی سے اس لئے کام لیتے ہیں کہ
ان کی بکری زیادہ ہو اور زیادہ پیسہ کمایا جائے۔ عام
ابلاغی ذرائع کے سبب ان عقیدوں کا پرچار ہوتا ہے

تو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس طرح کے خیالات سچ بھی ہیں [?]
آج کے معاشرے میں ان کی حیثیت ایسی ہو گئی ہے کہ [?]
انہیں غیر معمولی یا معمول سے متجاوز (PARANORMAL)
مانا جا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ جن چیزوں کو وقوعوں کو
ہمارے ترسیلی ذرائع مصلحتاً ماورائے معمول بتاتے
ہیں ان میں سے بیشتر کی تشریح کسی سائنسی سبب یا
فریب نظری (ILLUSION) سے کی جاسکتی ہے۔
ابلاغی وسائل اور دوسرے خارجی اثرات
کے علاوہ خود ہماری نفسیاتی ساخت میں بھی بعض
ایسی کمزوریاں ہیں جو ان عقیدوں کی پرورش کرتی ہیں۔
ادراکی نفسیات (COGNITIVE PSYCHOLOGY)
یہ بتاتی ہے کہ نتیجہ اخذ کرنے کے عمل میں انسانی ذہن خود
اپنی ایسی کمزوریوں سے متاثر ہوتا ہے جو انجانے عقیدوں
کے علاوہ دوسرے غلط عقائد یا نظریوں کی تہہ میں
ہوتی ہے۔ یہ کمزوریاں آفاقی ہیں۔ فیصلہ اور مسائل
حل کرنے کے ذہنی عمل پر سائنسی تحقیق و تجزیے
کے بعد انسان کا وجدانی یا کشفی قوت تمیز (INTU-
-ITIVE REASONING) کی کوئی اچھی تصویر
سامنے نہیں آتی۔ یہ رخ نظر آیا کہ اگر ہمارے ذہن میں
پہلے سے کچھ تعصبات موجود ہیں تو ان کی غذا پا کر نئے
انجانے عقیدوں کی تشکیل آسانی سے ہوتی ہے۔ مثلاً
ہم نے کوئی ایسا خواب دیکھا جس سے ملتا جلتا حادثہ
یا واقعہ حقیقی زندگی میں پیش آیا تو ہم اپنے قیاس
(COGNITIVE QUIRK) جھکاؤ یا رجحان
کی بنیاد پر ان دونوں میں مماثلت کے بارے میں سوچتے
بھی ہیں اور متاثر بھی ہوتے ہیں اور ایسی مثالوں کو رد
کر دیتے ہیں جو خواب و حقیقت کے درمیان کوئی مطابقت

ظاہر نہیں کرتیں۔ اور دیکھا ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہوتے
ہیں کہ اس طرح کے واقعات محض اتفاق ہیں۔ یعنی
ہمارے خیال کے مطابق خواب و خارج میں مماثلت
کا امکان جب ہی ہو سکتا ہے جب وجہ فوق فطری
(SUPERNATURAL) ہو!

اتفاقی یا ادراکی تعصب (COGNIT-
IVE BIAS) کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب
کسی واقعے کی توجیہہ ہمارے جانے پہچانے اسباب سے
نہیں ہو پاتی تو ہم اس کے لئے کوئی پر اسرار وجہ تلاش
کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی رہائشی مقام منحوس و آسیب زدہ
مشہور ہو جاتے ہیں۔ کنویں، باؤڑیاں، حویلیاں، پرانے
قلعے اور سنسان راستے وغیرہ فوق فطری اسباب
ہو (جیسے کسی زہریلی گیس کی موجودگی یا کچھ لوگوں کی اپنے
مفاد کی خاطر ایسی حرکتیں جن سے خوف و دہشت پیدا ہو)
سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن ان کے لئے کسی فوق
بشری طاقت کو ذمے دار قرار دیا جائے تو ہم وجدانی طور
سے فوراً مان لیتے ہیں کیونکہ اس قسم کے خیالات جیسے
بھوت، چڑیل کا تصور ذہن میں پہلے سے ڈیرا جمائے ہوئے
ہیں۔ یہ کشش میلان ان بہت سے قدرتی یا انسانی اسباب
کو جو کسی نادر واقعے یا انہونی کو جنم دیتے ہیں تلاش کرنے
کے بجائے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ جبلی عقیدوں میں یہ
سختی اور اعتقاد کی پختگی ایک عام وقوعہ ہے۔ اس
لٹرپن کے کئی سبب ہو سکتے ہیں مثلاً ہماری وجدانی
قوت تمیز کی غلطیاں دکھائی دینے والے واہموں کی طرح
ہو سکتی ہیں۔ جیسے ریل کی پٹڑیاں متوازی ہوتے ہوئے
بھی ہمیں کسی نقطے پر ملتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمیں یہ
شک ہو بھی کہ ہمارا ادراک غلطی کر رہا ہے تب بھی
وجدانی حیثیت سے غلطی ہمیں دبائے رہتی ہے۔ اور
اس وجہ سے کسی ذہنی مسئلے کا عقلی تجزیہ مشکل ہو
جاتا ہے۔ ہم اپنے ماحول کی بناوٹ اور اس میں ہونے
والے وقوعوں کے متعلق اپنے وجدان سے کچھ نظریے
قائم کر لیتے ہیں (جن کی مثالیں ابھی دی گئی ہیں) اب
اگر ایسے حقائق سامنے آئیں جو ان عقیدوں کو جھٹلا
رہے ہوں تو ہم ان شہادتوں کو ماننے سے انکار کر
دیتے ہیں۔ جو بت خود ہم نے بنا لئے ہیں ان پر ضرب
لگے تو اپنی شخصیت ہی ٹوٹتی نظر آتی ہے۔

نفسیات کے عالموں نے تجربوں اور مشاہدوں
سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں عام
انجانے عقیدے جن میں توہمات بھی شامل ہیں دو
وجوہ سے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ اول ماحول کی غیر
یقینی صورت جو ہم میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ
صورت حال پر ہمارا کوئی زور و اختیار نہیں ہے۔
دوئم انجانے عقیدوں یا توہم کی آسانی سے دستیابی
یعنی اس کی سستی قیمت۔ حالات کی غیر یقینی صورت
بے بسی و بے چارگی کا جو احساس ہم میں پیدا کر دیتی ہے
انجانے عقیدے اس کی نفی کرتے ہیں کیونکہ ان کو اپنا کر
ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب جو بھی ہوگا ہماری بہتری
کے لئے ہوگا۔ ہماری خواہش کے مطابق ہوگا۔ اس
طرح یہ عقیدے ہماری ایک شدید ذہنی و جذباتی ضرورت
پوری کرتے ہیں ان کو ڈھونڈنے کے لئے کہیں دور نہیں
جانا پڑتا اور نہ ہی یہ ہم سے تسلی و تشفی کی کوئی خاص
قیمت طلب کرتے ہیں۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہم ایسے تمام
کاموں کے لئے جن کی نوعیت خطرناک یا حاصل

غیر یقینی ہے کوئی نہ کوئی تو ہما[illegible] رسم ضرور ادا کرتے ہیں، مثلاً ہمارے بچے روز اسکول یا کالج جاتے ہیں تو ہم اس طرف دھیان بھی نہیں دیتے کیونکہ یہ ایک معمول ہے لیکن یہی بچے اگر کوہ پیمائی کے لئے جا رہے ہوں تو ہم فکر مند ہو جاتے ہیں اور ان کی خیر و سلامتی کے لئے کوئی نہ کوئی رسم ادا کرتے ہیں۔ کوکن کی پٹی میں رہنے والے مچھیروں کی عورتیں اکثر ایک ہاتھ میں کنگن پہنتی ہیں دوسرا کنگن یعنی آدھا سہاگ انہوں نے سمندر دیوتا کی نذر کر دیا ہے کیونکہ کھلے سمندر میں ماہی گیری آج بھی خطرناک اور حاصل غیر یقینی ہے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی صورتوں میں ہم کسی عقیدے کو اپنا کر اور اس کے اظہار کے لئے کوئی رسم ادا کر کے اپنے خوف اور وسوسوں سے کتنی سستی قیمت پر چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ نامعلوم عقیدوں کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ روحانی علاج جیسے گنڈے تعویذ، ٹونے ٹوٹکے، جھاڑ پھونک، منتر پڑھی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں "بد روحوں" کو بھگانے کے لئے جسم کی زد و کوب وغیرہ میں عقیدہ رکھنے والے بھی کسی اوجھا، عثمان یا سیانے کے پاس عموماً اس وقت جاتے ہیں جب یا تو مادی یعنی طبی علاج دستیاب نہیں ہوتا یا کامیاب نہیں ہوتا۔ درگاہوں، مزاروں، تیرتھوں پر بھی زیادہ تر اسی طرح کے کیس نظر آتے ہیں۔

انجانے عقیدوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اپنے ماننے والوں سے عقیدت کی بھاری قیمت وصول کرتی ہے۔ یہ عقیدے شیطانی، سفلی یا تانترک عملیات سے متعلق ہیں اور ان کا مقصد دوسروں کو زیر کرنا یا ان کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہونچا کر اپنے لئے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے یعنی یہ عقیدے بنیادی حیثیت سے مطلب پرستی اور خود غرضی پر مبنی ہیں۔ ان کے ماننے والوں کو نہ صرف جذباتی ہیجان اور خوف سے گذرنا پڑتا ہے بلکہ مالی اور کبھی کبھی جانی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ہمارا شہر میں پر بھنی ضلع کا ایک نہایت بھیانک واقعہ کوئی آٹھ دس سال پہلے اخباروں میں آیا تھا۔ ایک عورت نے اپنا بانجھ پن دور کرنے کے لئے تانترک عقیدوں کا سہارا لیا اور یکے بعد دیگرے گیارہ کنواری اور کم سن لڑکیوں کو مختلف مقامات سے اغوا کرا کے ان کے خون کی بلی دی۔ خوش قسمتی سے پولس سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی اور جرم میں ملوث کئی اشخاص کو سزا ملی۔ کچھ کو عمر قید ہوئی اور غالباً دو آدمیوں کو پھانسی دی گئی عام آدمی اس طرح کے عقیدوں کی سچائی میں یقین بھلے ہی کر لے مگر عملی حیثیت سے جہاں تک ممکن ہو وہ ان سے دور رہتا ہے کہ انجانے عقیدوں کو ماننے کی جتنی ضرورت ہے قیمت اس سے زیادہ دینا پڑے تو وہ انہیں بھاری پتھر کی طرح چوم کے چھوڑ دیتا ہے۔
جہاں آزمائے ہوئے طریقے کام آسکتے ہیں وہاں لوگ توہمات کو بہت ہی کم مداخلت کرنے دیتے ہیں مثلاً جوتش وغیرہ سے ہم اپنے لئے موزوں شریک حیات، راس آنے والا مکان، انگوٹھی کے لئے کوئی بھاگوان قیمتی پتھر جیسے ہیرا پنا وغیرہ تو ڈھونڈتے ہیں اور کسی کام کی شروعات یا بیوپار کے لئے مناسب وقت یعنی مہورت بھی نکالتے ہیں کیونکہ ان تمام غیر یقینی صورتوں میں ہم کو کوئی اور طریقہ مطمئن نہیں کرتا

مگر ہم اس وقت ستاروں پر بالکل بھروسہ نہیں کرتے جیب کوگوں سے ان ہی اشیار کے لئے مالی یا قانونی معاملہ کرتے ہیں۔ یعنی تجرباتی عمل اور عقلی رسائی سے جہاں نتائج برآمد ہوں وہاں ہم انجانے عقیدوں کو بیچ میں نہیں لاتے کیونکہ یہاں ہم سائنسی طریقہ کار کو جس میں متبادل مفروضوں کو ٹھیک سے تولنا اور پرکھنا بھی شامل ہے اصولی اور قانونی بنا لیتے ہیں۔ جیسے پولس کا تفتیشی کام، قانون جرم و سزا اور امراض کی طبی تشخیص وغیرہ میں ـــــ مگر غیر یقینی یا مشتبہ حالات میں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، انجانے عقیدے پیدا ہوتے ہیں اور پھیلتے پھولتے ہیں۔ ایسے ہی نا معتبر حالات کی ایک نہایت تشویشناک صورت گذشتہ تیس پینتیس سال سے ہم اپنے اطراف بنتے اور بڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں نا قابل اعتبار سیاسی، معاشی اور سماجی حالات ۱۹۶۰ء سے بہت نمایاں ہو گئے ہیں۔ بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں، کمزور ملکوں پر ہر طرح کے بے جا دباؤ، ایشیا میں ہر طرف جنگیں، یورپ میں اشتراکی ریاستوں کا زوال، ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں اپنے اندرونی تضادات اور تناؤ اور تیسری دنیا کے ممالک میں سامراج سے نجات کے بعد بھی مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھ جانے سے بے چینی، پراگندگی، جھنجھلاہٹ اور مایوسی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

غیر محفوظیت کا احساس بہت زیادہ ہو جانے سے انفرادی زندگی کی اقدار بہت اہم بن گئی ہیں۔ دولت کی اہمیت یوں تو ہمیشہ سے ہے مگر آج کل قدر

یہ ہے کہ ایسے ناجائز طریقوں سے حاصل کرنا بھی اتنا ہی جائز ہے۔ اب امریکہ کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ جو دولت مند ہے بس وہی عقلمند ہے۔ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بیکاری، نسل، ذات پات اور فرقوں کے فسادات، تشدد کی ہر طبقے میں مقبولیت بھیانک جرائم میں بے تحاشہ اضافہ اور زندگی کو ہیچ سمجھنے کا رویہ بھی وہ اسباب ہیں جو سماجی تبدیلیوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ نفسا نفسی کے اس ماحول میں نوجوانوں نے اپنے تمدن سے بے زاری اور انحراف کی تحریکیں پیدا کر دی ہیں۔ جو نہ صرف انفرادی فکر و عمل میں بلکہ سماجی بندھنوں سے بھی مکمل آزادی چاہتی ہیں۔ مثلاً جنسی معاملات میں ــ ہپی، پنک (PUNKS) اور اسی قماش کے دوسرے رنگوں میں رنگے ہوئے لوگ مثلاً رجنیش، آنند مارگئے، ستیہ سائیں بابا کے چیلے وغیرہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بڑی تعداد میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ نشہ آور زہریلی اشیا کے استعمال کا اپنا ہی ایک کلچر بن گیا ہے جو ہر جگہ کالجوں اور کلبوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا حالات نے بیک وقت جمع ہو کر جس غیر یقینی ماحول کو جنم دیا ہے اس سے آفاقی سطح پر مذہبی احیاء، بنیاد پرستی۔ اصنام پرستی، پادری پروہت، پیر پرستی اور کرشماتی عقیدوں کو بہت فروغ ملا ہے۔ یہ تمام تحریکیں اور رجحانات انجانے عقائد کے ساتھ نہ صرف زمانی اعتبار سے بلکہ اپنی ساختی خصوصیات میں بھی چسپاں نظر آتے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معاشرے کے رجحانات یا تو انجانے عقیدوں کو پیدا کرتے ہیں یا ان کی افزائش میں سب سے زیادہ مدد کرتے ہیں ـــــ

دیکھئے

سید بشارت علی
سوریہ پیٹ۔ آندھرا پردیش

رختِ سفر باندھو

اٹھو رختِ سفر باندھو
کہاں مہلت جو اک سائے میں سستا لو
بس اک پرکار کی گردش
وجود اپنا ہے نقطوں سے
ابھی تو قوس بھی پورا نہ بن پایا

یہ سارے منتشر اجزا
انہیں تو ایک ہی سانچے میں ڈھلنا ہے
اکائی ٹوٹ کر بکھری تھی
ایک ہی رنگ نے تو سات رنگوں کی کماں کھینچی
یہ کثرت راستہ ہے صرف وحدت کا
ازل کو پھر عدم میں جذب ہونا ہے
یہ شور و غا، ہاؤ ہو، ہنگامہ آرائی
بس اک نقطہ
ہماری یہ رفاقت ایک دو پل کی

[illegible]
ہماری [illegible] معدوم
اٹھو رختِ سفر باندھو!

نئی ہیئت

ہوا یوں
سبھی نے چہروں کو بدل ڈالا
نگاہوں نے بھی اپنے رنگ بدلے
اب کہاں لہجے میں پہلے سے وہ پیچ و خم
وہی الفاظ
دہرائے ہوئے جملے
مگر مفہوم جیسے بدلے بدلے سے

وہ سب ہی دوسرے ملکوں کے افسانے سناتے ہیں
وہ سب اک دوسرے کو جانتے کب ہیں
یہ لگتا ہے کہ صدیوں سے شناسا ہیں

مگر لمحوں کی تاریکی میں
یہ چہرے، نگاہیں اور یہ الفاظ اور لہجے
نیا اک روپ دھاریں گے
یہ سارے عکس دھندلا کر
نئی ہیئت میں آ جائیں گے
تو سب اک دوسرے کو
اپنا عادی کر ہی ڈالیں گے

بوسنیا کے پس منظر میں تین نظمیں

(۱)

خدا
اگر سچ مچ تو
قادر مطلق ہے
میں!
تجھ سے عاجزی کرتی ہوں
میری مٹیوں کو بے نمو کر دے
میری کوکھ میں آگ بھر دے
کیوں کہ میں
اب ایک ایسی زمین ہوں
جو اپنے کسانوں سے چھین لی گئی ہے!!

(۲)

مائیں
آسمان کی طرف
اپنے ہاتھ اٹھا کر
دعائیں مانگ رہی ہیں
اپنے اَن جنمے بچوں کے لئے
موت کی دعائیں ....
کیونکہ!
انہیں معلوم ہے
کہ انکی پیدائش پر
ان کی چھاتیوں میں دودھ نہیں اترنے والا
کبھی نہیں

(۳)

شرم گاہ .....
آنکھیں بن گئی ہیں
اور آنکھیں ....
شرم گاہ!
پھر بھی کوئی نہیں کہتا
ہم شرمندہ ہیں بوسنیا!!

خورشید طلب
جی۔ایم ۱۰ آتش کار گلی، جمشید پور، بوکارو
– ۸۲۹۱۰۴ –

غزلیں

• نشتر اکبرآبادی، پونا

دل کو آئینہ کے مانند بنائے رکھئے
اس عمارت کو سلیقے سے سجائے رکھئے

اس سے پہلے کہ سویرے کو نگاہیں ترسیں
جنگ سے اپنی زمینوں کو بچائے رکھئے

جانے کب رات کا سینہ کوئی زخمی کردے
اپنے سینے سے پڑوسی کو لگائے رکھئے

صحن کعبہ ہو، کہ کاشی کی مقدس دھرتی
ان چراغوں کو ہواؤں سے بچائے رکھئے

کون کہتا ہے جیا جائے معمہ بن کر
ایک دیوار تکلف کی اٹھائے رکھئے

عشق نے اب کے برس گھر میں قدم رکھا ہے
وقت کو چاند کی کشتی میں بٹھائے رکھئے

• اختر شاہجہاں پوری
شاہ جہاں پور

بہت گماں تھا ہمیں دور جاہلانہ گیا
بزرگ آئے تو تعظیم کو اٹھا نہ گیا

قبا دریدہ ہے مجروح دل انا زخمی
وہ کج کلاہی وہ اندازِ خسروانہ گیا

ہم اس کی بات پہ لبیک کہہ نہیں پائے
بس اتنی بات پہ برسوں کا دوستانہ گیا

ہزار سیل حوادث گزر گئے ہوں گے
رہِ وفا سے مگر میرا نقش پا نہ گیا

میں اپنے چہرے پہ ماضی تلاش کرتا ہوں
اسی خیال سے آئینہ دیکھنا نہ گیا

میں اپنی بھوک پہ قادر تھا اور وہ بے حال
مگر نوالہ اسے ایک بھی دیا نہ گیا

غزل عوام میں مقبول ہو گئی اختر
مگر زمانے سے اقبالِ شاعرانہ گیا

....دیکھا کئے

• محمد ادریس مونس، بھوپال

زندہ انسانوں کی جلتی ہولیاں دیکھا گئے
خون کی چھنتی ہوئی پچکاریاں دیکھا کئے
عصمتیں لٹتی رہیں، آبادیاں مٹتی رہیں
وارثانِ ملک یہ اٹکھیلیاں دیکھا کئے

چیخ اٹھی ہیں درندے "مرگئی انسانیت"
کیسی کیسی ظلم کی انگڑائیاں دیکھا کئے
آشتی کی، امن کی، انصاف کی آئین کی
آہ! کس کس نے اڑائیں دھجیاں دیکھا گئے

گلشن جمہور میں جمہوریت کے خون سے
حاکم جمہور کی گلکاریاں دیکھا کئے
فتنۂ دست عدو کی داستاں سنتے رہے
اور حنائی ہاتھ کی مجبوریاں دیکھا کئے

رقص حیوانی زمیں پر آہرمن کے ساز پر
آسماں دیکھا کیا۔ کروبیاں دیکھا کئے
دم بھرا کرتے ہیں جو انسانیت کا رات دن
حیف! ہم ان کی فقط سرگوشیاں دیکھا کئے

گردشِ دوراں ہے یہ کچھ دوش قسمت کا نہیں
صبح کی امید پر اندھیاریاں دیکھا کئے
صبر و استقلال میں ہر کامیابی کی کلید
گرچہ مانا آج تک ناکامیاں دیکھا کئے

صبر و استقلال ہی سے ہم کو جینا ہے مگر
غم نہیں مونس اگر محرومیاں دیکھا کئے

رباعیات

• تسلیم نیازی، عالم نگر، برہانپور ۷۵

خسرو کی گود میں پلی ہے اردو
دردانۂ مخزن ولی ہے اردو
لہجے میں میر کے نکھر کر تسلیم
غالب کی فکر میں ڈھلی ہے اردو

ہیت جھڑ کی رت میں بھی بسنتی ہی رہی
وسعت کے پیالے میں چھنتی ہی رہی
ہر چند کہ دشمنوں نے کچلا اس کو
اردو یہ بگڑ بگڑ کے بنتی ہی رہی

اک دور میں یہ سطوتِ شاہی بھی رہی
اک دور میں نعرۂ سپاہی بھی رہی
مظلوم کے حق میں رہی مژدہ اردو
ظالم کے لئے وجہ تباہی بھی رہی

● ظفر امام، بتیا

ہمارے دل چراغوں کی طرح ہر شام جلتے ہیں
اندھیری رات میں امید کے ٹکڑوں پہ پلتے ہیں
بھلے ہی لوٹ کے ہم ہاتھ خالی گھر کو آجائیں
مگر مجبوریاں سر پہ لئے گھر سے نکلتے ہیں
دعاؤں پہ ہماری زندگی مشکل سے گذرے گی
ہم اپنے ساتھ اپنے کارنامے لے کے چلتے ہیں
ہمارے ہاں اندھیروں کا گذر ممکن نہیں ہوگا
ہمارے گھر میں روزانہ نئے سورج نکلتے ہیں
ہمیں پہچان کر بھی ڈھونڈنا بےکار ہے کیوں کہ
ہمارے شہر میں موسم نہیں چہرے بدلتے ہیں

سچ بات کہنے کی بھی جسارت نہ کر سکے
عزت مآب لوگ قیادت نہ کر سکے
ہم نے رسوم غیر کو آنکھوں میں دی جگہ
تسلیم اپنے گھر کی روایت نہ کر سکے
سنجیدہ ہو کے رہ گئے حالات کے تحت
بچپن میں ہم تو کوئی شرارت نہ کر سکے
اپنی جبیں تھی ایک مگر آستاں ہزار
اتنے خدا ملے کہ عبادت نہ کر سکے
مجبوریوں نے باندھ دیئے ہاتھ اس طرح
کوئی بھی کام حسب لیاقت نہ کر سکے
"عالی جناب" اس پہ ہیں ناراض ان دنوں
بزم مشاعرہ کی صدارت نہ کر سکے
ایسے عظیم لوگ بھی رہتے ہیں شہر میں
اپنے ضمیر کی جو تجارت نہ کر سکے

● شارق عدیل، علی گڈھ

ھوپ سینٹے بھیگے بادل ڈول رہے ہیں دھیرے دھیرے
ول ہوا کے کانوں میں رس گھول رہے ہیں دھیرے دھیرے
ات گئے تک دیر سے سونا شوق نہیں ہے مجبوری ہے
لم زہر بے خوابی مجھ میں گھول رہے ہیں دھیرے دھیرے
ون سنے آواز غزل کی ان گونگے بہرے شہروں میں
اب عبث لفظوں کو زباں پر تول رہے ہیں دھیرے دھیرے
وقت سے پہلے ٹوٹ نہ جائے رابطہ ہوا سے ان سانسوں کا
ھر کی اپنے کمرے کی ہم کھول رہے ہیں دھیرے دھیرے
نیندوں کے سیلاب میں شارق بہہ جائے گی دنیا ساری
نگری نگری گھور اندھیرے ڈول رہے ہیں دھیرے دھیرے

شرون کمار ورما

امرتسر (پنجاب)

بدلتے رنگ

[یہ کہانی جس علاقہ اور واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ پہلی بار میں نے ۱۹۵۶ء میں دیکھا تھا۔ اب ۲۷ برسوں کے بعد وہاں بہت تبدیلی آچکی ہے۔ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کچھ کل اور کچھ آج کو ملا کر میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ پچھلے دنوں دھرم شالہ جا کر کرشن کمار طور سے ملا تو انہیں بھی یہی شکایت تھی کہ وہاں آج بھی بوریت اور خالی پن کا احساس تھا — وہی Adjustment کی بات ہے۔ ان ۲۷ سالوں میں ادھر پچاسوں بار ہو آیا ہوں۔ پرانا اور نیا ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ عیسائیوں کا تبلیغی سنٹر بند ہو چکا ہے۔ چرچ میں تھا س نہیں ہوتا۔ قبروں کے کتبے گذری کہانیاں سناتے ہیں۔ جھیل کا وہی برا حال ہے۔ زندگی بیک وقت حرکت میں ہے اور ساکن بھی۔ سیاح زیادہ آنے لگے ہیں۔ لیکن دو دن یہاں رہنا آج بھی مشکل ہے۔ یہ کانگڑہ اور کلو ویلی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ کشمیر میں حالات خراب ہو جانے سے ادھر کی سیاحت بڑھ گئی ہے۔

لیکن ان باتوں کا کہانی سے کیا تعلق پھر بھی — شرون کمار ورما]

فضل نے سگریٹ سلگایا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

اونگھتا ہوا وہ پہاڑی قصبہ کسی قریب المرگ مریض سا لگا۔ فضل کو لگا جیسے وہ اس کا فاتحہ پڑھنے کھڑا ہو۔ یہ کیا ادھا گلاس خالی ہے، والا فلسفہ ہے

اس نے رلیسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف دیکھا وہ کل سے خالی تھی — تمام کمرے مقفل۔ چوکیدار گھاس پر دری بچھائے لیٹا تھا اور اس کی بیوی چھوٹی بچی کا سر گھٹنوں میں دبائے اس کے بالوں سے جوئیں نکال رہی تھی — کیا زندگی ہے —

نے اداسی سے سوچا۔ کچھ دوستوں سے اس علاقہ کی تعریف سن کر وہ جہاں آگیا تھا۔ کیا تھا وہاں تعریف کے قابل۔ ننگی ڈھلوانیں، ٹھہری ٹھہری سی زندگی ـــ کسی گندے تالاب کی طرح۔ ۔ کالونوں میں اونگھتے، کانپول کا انتظار کرتے تاجر ـــ دبلی پتلی، زرد رو عورتیں ـــ جہاں خوبصورت عورتیں نہ ہوں۔ وہاں زندگی خوبصورت نہیں ہو سکتی ـــ اس نے کہیں پڑھا تھا۔

شملہ ہوٹل ـــ جس کے کمرہ نمبر تین میں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے ٹھہرا ہوا تھا، خالی پڑا تھا۔ کسی غیر معروف میڈیسن کمپنی کا ٹورنگ ایجنٹ، چار گھنٹوں میں ہی بور ہو کر بھاگ گیا تھا۔ وہ گول مٹول ناٹے قد کی گوری چٹی عورت، جسے دیکھ کر اسے بڑھیا تیل میں تلے اُجلے کپڑوں کا خیال آتا تھا۔ پیچھے صحن میں کھڑی تھی جب وہ چائے کے لئے کچن گیا تھا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ اس اشتہاری مسکراہٹ کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ وہ اس راہ کا مسافر ہی نہیں تھا ـــ پھر ـــ اتنی سفید عورت تو بالکل پھیکی ہوگی ـــ یہ جملہ اس نے اپنی ڈائری میں اسے دیکھنے کے بعد لکھ لیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، اسے ہمیشہ یہی احساس رہا کہ خریدی ہوئی عورت، مرد کو کچھ نہیں دیتی سوائے احساسِ محرومی اور غلاظت کے۔

اور اب میں بور ہو رہا تھا۔ خود سے الجھ رہا تھا کہ کیوں چلا آیا یہاں۔ اور بھی بہت سے مقامات ہیں اس دیس میں، اس جوئیں مارتی رنگیلی ہوئی عورت کو دیکھ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شملہ چلا جائے گا۔ کچھ نہیں تو آج اور اسکنڈل پوائنٹ کی رونق سے جی تو بہلے گا ـــ وہ اپنے دوست کو لکھ دے گا کہ وہ وہاں سے بھاگ رہا ہے۔ یہاں سروس سے ـــ شملہ میں مشترکہ دوست رمیز کے مکان پر اس کا انتظار کرے گا۔ وہ خط لکھنے کے خیال سے بیکر آگیا۔

ڈاک خانے انلینڈ لیٹر لینے اور ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ چوکیدار اور اس کی بیوی نے پُر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن جب اس نے کمرہ کے بجائے ان کی کو چوکیدار نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔ ایک پہاڑی کو ٹھیک پر بیٹھا مسلسل کالیں کالیں کر رہا تھا۔ نرمل باہر آگیا۔ وہاں یکسوئی سے خط لکھنا محال محسوس ہوا تھا۔

سیونتھ ڈے سوسائٹی کا تبلیغی لٹریچر فروخت کرنے والی دکان میں بیٹھے بوڑھے نے روزری (ROSARY) سے دھیان ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور اشارے سے بلا لیا۔

"کل تم تھامس میں شامل نہ ہوئے۔ بعد میں فادر اور میں چائے پر تمہارا انتظار کرتے رہے۔ آنا چاہئے تھا تمہیں، وعدہ کر کے۔"

نرمل کو شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ ایک دم کوئی عذر بھی تلاش نہیں کر سکا ـــ نہ تو اسے عیسائیت میں خاص دلچسپی تھی اور نہ تھامس میں شرکت کا شوق۔ اس نے تو یونہی بوریت اور خالی پن سے بچنے کے خیال سے وعدہ کر لیا تھا۔

"کل صبح ہی سے ہی ڈائریا، کی شکایت ہو گئی تھی۔ نکلا ہی نہیں کمرے سے۔" یہ دوسری بات تو سچ تھی۔ لیکن پہلا بیان جھوٹ تھا۔ اس بوڑھے سے کہا کہتا۔ تمہارے اس قصباتی ہل اسٹیشن پر آکر بور ہوا ہوں۔ ایک بھی چہرہ ایسا نظر نہیں آیا جو اڑتے پرندے کے

سپر باندھ لے۔ بوڑھے

بوڑھے نے جیسے اس کے جھوٹ کو تاڑ کر آنکھیں موندلیں۔ اس کی نحیف انگلیوں میں دوزری پھر چلنے لگی تھی۔

"اچھا چلتا ہوں۔"

بوڑھے نے آنکھیں تو نہیں کھولیں سر اثبات میں ہلا دیا۔

دکان سے اتر کر نرمل نے خیالات سے سوچا۔ چرچ جانے میں کیا حرج تھا۔ ایک نیک آدمی سے ملاقات ہو جاتی۔ ڈھنگ کی چائے کی ایک پیالی بھی پی لیتا۔ کچھ وقت اچھا گزر جاتا۔

وہ جیسے اپنا بوجھ اٹھائے بازار سے گزرتا رہا۔ اسے اپنے وجود پر اوس سی پڑنے کا احساس ہوتا رہا۔ دکانوں میں سامان تھا۔ پھر بھی خالی خالی سی لگ رہی تھیں۔ دکانداروں کو جیسے گاہکوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ آخر ان دکانوں کا مصرف کیا ہے۔ یہ لوگ گھر بار کیسے چلاتے ہوں گے۔ ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ فضولیات سوچ رہا ہے۔ اسے کیا۔ بھوکے تو نہیں مرتے۔ قناعت اور سکون بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ اس نے ذہن کو ان بے کار سے خیالات سے نجات دلانے کے لئے سگریٹ کا سہارا لیا۔

چوک میں پہنچ کر وہ پھر جیسے بے کار ہو گیا۔ کھڑا بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔۔۔ ایک سپاہی ڈیوٹی سے ہٹ کر چائے کی ایک دکان کے باہر جا کھڑا ہوا تھا۔ اب اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ جیسے خاص طور پر اس کی نگرانی اور جاسوسی پر متعین کیا گیا ہو۔ نرمل کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے جی میں آیا۔۔۔ اس سپاہی سے پوچھے۔ کیوں جناب، آپ کو کیا تکلیف ہے۔ کیا کبھی کوئی شریف آدمی نہیں دیکھا۔ لیکن اسے ایک بزرگ کی نصیحت بروقت یاد آ گئی۔ پولیس والوں سے ہمیشہ دور رہو۔۔۔ نہ ان کی دشمنی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی۔

پولیس کا سپاہی شاید اس پر نظر رکھ رہا تھا، ڈانٹنے کی فکر میں تھا۔ اس کے باقی جاہز تو یہی بتا رہے تھے۔ پولیس کے لفڑے سے بچنے کیلئے وہ اوپر جانے والی بس جو ایک پل کو چوک میں رکتی تھی، میں سوار ہو گیا۔

وہ چرچ کے سامنے بس سے اتر گیا۔ مقامی لوگوں سے سنا تھا کہ وہ ایک خوبصورت، پروقار اور شاندار عمارت تھی۔ وہ سڑک سے اتر کر چرچ کی طرف بڑھ گیا۔ چرچ بند تھا۔ کھڑکیوں کے منقش شیشے یسوع مسیح اور پاک مریم کی کہانی سنا رہے تھے۔ وہ چرچ میں چکر لگا کر قبرستان کی طرف اتر گیا۔ ایک بہت بڑی بیل (BELL) چبوترے پر آہنی سلاخوں کے سہارے لٹک رہی تھی۔ اس نے سوچا اس کی زنجیر کھینچ کر اس کی سریلی آواز سنے۔ اس بوڑھے نے بتایا تھا کہ اس بیل کی گونج دور اور دیر تک سنائی دیتی ہے اور اس میں عجیب سی نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن نرمل نے زنجیر کھینچ کر چھوڑ دی۔ خواہ مخواہ وہاں سوئے لوگ پریشان ہوں گے۔ وہ قبروں کے بیچ بنے راستوں پر چلتا کتبے پڑھتا رہا۔ وہ ایک چوڑے سے پتھر پر جا بیٹھا۔۔۔ جیب سے وہ انلینڈ لیٹر نکالا۔ لکھا۔۔۔ پیارے دوست، اس وقت میں عیسائیوں کے قبرستان میں بیٹھا ہوں۔ چاروں طرف قبریں ہیں۔ کتبے ہیں۔ سوکھے پتے ہیں اور ٹہنیاں

میں۔ سناٹا ہے اور سب قبریں برسوں پرانی ہیں۔ یعنی
اب یہاں عیسائی زیادہ نہیں رہے ۔۔۔ یہ تھا راجہ تھا
پرجا ۔۔۔ آج کل تو ہریجن اور شیڈیول ٹرائب کا ہونے
میں بہتری ہے ۔۔ اس نے لکھنا بند کر دیا۔ یہ سب وہ
کیا لکھ رہا ہے۔ اسے تو اپنے دوست کو صرف اتنا لکھنا
تھا کہ اس اوبنگئے ہل اسٹیشن پر اس کا جی ذرا نہیں
لگا اور وہ جا رہا ہے۔ اسے لگا کہ بہت سے لوگ ایک
ساتھ چیخ اور رو رہے ہیں۔ وہ ڈر کر تیزی سے سڑک
کی طرف چل دیا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے قبرستان کی
طرف دیکھا۔ اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی قبریں اور خاموشی۔
اس نے سگریٹ سلگایا اور چھاؤنی کی طرف چل دیا۔
ان دنوں وہاں شاید مدراسی رجمنٹ ڈیرہ ڈالے تھی۔
ناٹے قد کی کالی عورتیں۔ موٹے موٹے بین نقش۔ جیسی
کوکو ویسے بچے۔

چوک میں تبتیوں کی بھیڑ لگی تھی گورے رنگ
چوڑے چہرے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چپٹے ناک ۔۔۔
رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ درمیانہ قد۔ گٹھیلے
بدن ۔۔ ایک جابر کے ظلم و ستم کا شکار، اپنے گھروں سے
نکالے ہوئے مہاجر جو خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے کی
کوشش کر رہے تھے۔ چائنیز فوڈ ۔۔ بیئر بار ۔۔ تبتی
جڑی بوٹیاں، منکے، دیسی اور بدیسی مال ۔۔۔

وہ ایک بیئر بار میں جا بیٹھا۔ کچھ تبتی نوجوان
کچھ غیر ملکی ہپیز، چرس کا دھواں، بیئر کی خوشبو، مغربی
موسیقی۔ کھویا ہوا افق (LOST HORIZON)
"تم لوگ اپنے ساتھ کوئی 'یاک' نہیں لائے۔"
نرمل نے ایک تبتی لڑکے سے پوچھا۔

لڑکا ہنس دیا ۔۔ اس نے اپنی زبان میں یہ بات
شاید اپنے ساتھیوں سے بھی کہی۔ وہ سب ہنس دیئے۔
ایک کلچر ختم ہو رہا ہے ۔۔ نرمل نے دکھ سے سوچا ۔۔ اور
بیئر ختم کر کے باہر آ گیا۔

کچھ دیر وہ بے مطلب تنگ سے بازار میں گھومتا
رہا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں میں تبتی عورتیں اور بوڑھے
مال بیچ رہے تھے۔ مغربی ممالک سے ایڈز میں ملا ہوا
سامان۔ جینز، جیکٹ، مصنوعات، کراکری، کٹلری،
تبتی غالیچے اور بیڈز۔

جب تھک گیا تو نیچے آنے والی بس میں سوار
ہو گیا۔

ہوٹل میں داخل ہوا تو وہی گوری، پھیکی سی عورت
مسکراہٹ کے چراغ ہونٹوں پر روشن کئے مل گئی۔

"بہت لمبی سیر کی لگتی ہے۔"

"نہیں۔ بس یونہی۔" وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
زینے میں رک کر اس نے لڑکے کو آواز دے کر چائے لانے
کے لئے کہا ۔۔

"میرے کمرے میں آؤ، بڑھیا چائے پلاؤں گی۔"

وہ بغیر کچھ کہے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ خالی سا بستر پر دراز ہو گیا۔
لڑکا چائے دے گیا۔ جسم میں ذرا گرمی آئی تو وہ خط مکمل
کرنے بیٹھ گیا۔

۔۔۔ یہ تم نے مجھے کہاں بھیج دیا ۔۔ پورا ہل اسٹیشن
ہی کسی بڑی قبر کی طرح لگتا ہے۔ یہاں تو رہنا مشکل ہو رہا
ہے۔ میں صبح پہلی بس سے شملہ چلا جاؤں گا۔ وہیں ملاقات
ہوگی ۔۔

خط مکمل کر کے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ریسٹ ہاؤس

میں زندگی کے آثار نظر آئے۔ ایک کمرے اور برآمدے کی تمام بتیاں روشن تھیں اور چوکیدار پھرتی سے آجا رہا تھا۔ ایک بچہ کمرے سے نکلا۔ ایک نسوانی آواز نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ مدھم روشنی میں آواز کے پیچھے چہرہ تو نہیں دیکھ سکا لیکن وہ آواز کھنکتی ہوئی اور پرکشش تھی۔ وہ جیسے کھڑکی میں تصویر بن گیا۔

جب وہ کھانا کھانے کے لئے بازار میں گیا تو وہ گول مٹول سی عورت ہوٹل میں ٹھہرے ایک کپڑا ایجنٹ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ عورت نے فخر کے ساتھ کسی فاتح کی طرح نرمل کی طرف دیکھا اور اس ایجنٹ کی باہوں میں باہیں ڈال دیں۔

وہ بچہ جسے اس نے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ اب ایک لڑکی کے ساتھ ایک جنرل اسٹور کے باہر کھڑا ملک چاکلیٹ کے لئے ضد کر رہا تھا۔ لڑکی جوان اور خوبصورت تھی۔ دشت میں پھول کھلا ہو جیسے۔ سڑک نے شاید اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اور اپنی حرکات اور کلمات سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ نرمل کو اس کی یہ ادا اچھی لگی۔

وہ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے سے ہو کر چوکیدار کے کوارٹر تک گیا۔ چوکیدار بازار گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی سے اسے معلوم ہو گیا کہ اس شام ایک فیملی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی۔ مرد عورت ایک لڑکی اور لڑکا۔ چوکیدار ان کے لئے کھانے کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ جب اس نے پوچھا کہ کیا اسے بھی وہاں کھانا مل سکتا ہے تو عورت نے کہا۔

"مشکل ہے بابوجی۔ آرڈر پہ ہی بنتا ہے۔ جیادہ لوگ تو آتے نہیں۔"

وہ مایوس سا لوٹ آیا۔ اس نے سوچا غلطی کی۔ اسے ٹھہرنا ہی ریسٹ ہاؤس میں چاہئے تھا۔ شملہ ہوٹل بھی کوئی جگہ ہے۔ وہ تبلیغی لٹریچر بیچنے والا بوڑھا ایک تبتی لامہ کے ساتھ باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ آ ملے ہیں سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک۔ وہ لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ بازار میں جیسے ونڈو شاپنگ کر رہی تھی۔

"اچھی جگہ ہے۔" لڑکی نے بھائی سے کہا۔ "ڈفرنٹ فرام دہلی میں ہبل آف سٹی لائف۔ شانتی ملتی ہے یہاں آکر"

وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ دو تین دن یہاں رہو پھر کوئی رائے دینا۔ لیکن اس معاشرے میں کسی غیر مرد کا کسی لڑکی سے اس طرح بات کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جب وہ بہن بھائی ایک پروویژن سٹور میں داخل ہوئے تو وہ بھی اندر چلا گیا۔ لڑکے کو اپنی من پسند چاکلیٹ کی تلاش تھی۔ جو شاید مل نہیں رہی تھی۔

"ایڈجسٹ کرنا سیکھو ببلو۔" بہن نے بڑپن سے کہا

"اپنے اپنے ٹسٹ کی بات ہے دیدی۔"

"ڈونٹ بی کریزی۔"

"انکل یہاں دیکھنے لائق کون کون سی جگہیں ہیں۔"

لڑکی نے دکاندار سے پوچھا۔

"جگہیں۔" دکاندار جیسے سوچ میں پڑ گیا۔ "یہاں کیا رکھا ہے۔ ادھر لوگ کم ہی آتے ہیں۔"

"ہیں کیوں نہیں۔" نرمل سے رہا نہیں گیا۔ "ادھر چرچ ہے۔ قبرستان ہے۔ تبتی مندر ہے اور وہ جھیل۔"

"کہاں۔ کہاں ہے جھیل۔" لڑکی نے اتاولے پن

نے پوچھا۔

"یہاں سے کوئی دس میل دور کیلومیٹر کے فاصلے پر؟"

"اسے تو ڈیولپ ہی نہیں کیا گیا" کاندار نے کہا

"نہ سہی جھیل تو ہے — بہت خوبصورت اور رومانٹک واتاورن ہے وہاں کا۔" لفظ رومانٹک ... رومانٹک پر لڑکی نے گہری، ترچھی نظر سے نرمل کی طرف دیکھا۔

"آپ گئے ہیں وہاں —؟"

"ارادہ ہے جانے کا۔"

"تو آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ جگہ خوبصورت اور رومانٹک ہے۔" لڑکی نے سوال کیا۔

"ہم لوگ صبح چلیں گے۔" لڑکی نے نرمل کی طرف دیکھا جیسے یہ بات وہ اس سے کہہ رہی ہو۔

چوکیدار ان دونوں کو ڈھونڈتا ہوا آگیا اور وہ اس کے ساتھ چلے گئے۔ نرمل نے بازار سے کھانا کھایا اور ایک فلمی دھن گنگناتا ہوٹل لوٹ آیا۔ اسی کمرا ایجنٹ کا کمرہ اندر سے بند تھا اور اندر سے اس عورت کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی — اپنے کمرے کی کھڑکی سے ریسٹ ہاؤس کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ ہاں، یہ جگہ شہر کے شور و غل اور بھیڑ سے تو مختلف ہے۔ شانت اور خوبصورت بھی۔ اس نے اب تک اسے اس زاویے سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہر جگہ کا اپنا حسن ہوتا ہے — شملہ میں کیا رکھا ہے۔ وہی شہروں والی بھیڑ، بھاگم بھاگ، دفتری سازشیں سیاسی پینترے بازی۔ اس کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ صبح وہ بھی جھیل پر جائے گا۔ کیا ہوا اگر خشک ہو چکی ہے۔ [illegible] طلب ہے۔ وہاں کا واتاورن تو اچھا ہے۔ یہ اس نے اس عورت سے پہلے دن سنا تھا۔ جب اس نے [illegible] سے جھیل پر چلنے کے لئے کہا تھا — آدمی کو ایڈجسٹ کرنا آنا چاہئے۔ بازار بند ہونے لگا تھا — لوگ گھروں میں جا دبکے تھے۔ وہ بھی کمبل لپیٹ کر سو گیا۔

صبح جب وہ جھیل پر جانے کے لئے نیچے اترا تو کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان نے پوچھا۔

"سر آپ کا بل بنا دوں —؟"

"نہیں — کچھ کام نکل آیا ہے۔ شاید ایک دو دن ٹھہرنا پڑے۔"

"او کے سر —"

بس میں وہ اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے پیدل ہی جھیل تک گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کچھ بندر درختوں پر جھول رہے تھے۔ اس نے جھیل کا ایک چکر لگایا۔ کل والا خط نکالا — پڑھا اور ایک سطر کا اضافہ کر دیا — جگہ بری نہیں۔ آدمی کو نیچر کے ساتھ رہنا اور اس کی خاموش زبان سمجھنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ میں اس وقت جھیل کے کنارے بیٹھا ہوں۔ خشک ہے، ٹورسٹ بھی ادھر نہیں آتا لیکن جگہ پرسکون اور خوبصورت ہے۔ میں تمہارا انتظار اسی مقام پر کروں گا — آجاؤ۔

خط مکمل کر کے اس نے سڑک کی طرف دیکھا جو دور تک خالی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ بندروں کی ٹولی خرمستیوں میں مشغول تھی۔ وہ بار بار سڑک اور خالی جھیل کی طرف دیکھتا۔ وقت بھی جیسے ٹھہر گیا تھا — دو تین بوڑھے آئے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد گھنٹہ بھر کوئی نہیں آیا۔ اس کا سگریٹ کا پیکٹ بھی ختم ہو گیا۔ بندر بھی درختوں پر اچھلتے کودتے خوراک کی تلاش میں آبادی کی طرف چلے گئے تھے — وہ واپس آگیا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان سے اس نے بل بنانے کے

مشرف عالم ذوقی
دھلی

مسلمان

ترجمہ: تسنیم فاطمہ

قسط نمبر ۱۰

(شہزادی کے آخری دنوں سے ۱۹۸۶ء تک)

افروز کو رات بھر نیند نہیں آئی
آج اس نے نواب صاحب کا عجیب وغریب چہرہ دیکھا تھا۔ اس چہرے کے بارے میں تو اس نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ اس ماحول میں تو وہ رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ سب کیا ہے؟ باہر رہ کر تو وہ ان کے بارے میں کیا کیا سوچتی آئی تھی۔ اور اندر سے حقیقت کیا تھی۔ وہ یہ گھر چھوڑ دے گی اور راجدھانی نکل جائے گی۔
افروز کا یہ آخری فیصلہ تھا۔
اس دن وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی۔ پہلا کام یہ کیا کہ باورچی خانے میں جا کر سب کے لئے چائے بنا ڈالی۔ ابھی سب سو رہے تھے۔ نواب صاحب کے کمرے سے کھٹر پٹر کی آواز آ رہی تھی۔ یعنی وہ جاگ رہے تھے۔ افروز کو سب کے سامنے اپنی حماقت سے عجیب طرح کے چور ہونے کا

احساس ہوا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ امی جان کو سچ سچ بتا دیگی۔
وہ کون ہے....؟
کہاں سے آئی ہے؟
اس کی اصلیت کیا ہے؟
وہ جو بھی ہے، اس میں خود اس کا کیا قصور؟
قریشہ، انور اور امی جان کو چائے پہنچانے کے بعد نواب صاحب کے کمرے میں پہنچی۔ نواب صاحب اس وقت اپنی خاندانی شمشیر لئے ہوئے تھے۔ شمشیر کو زنگ کھا گئی تھی۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر، چھو کر دیکھ رہے تھے۔ اس کی آہٹ سن کر نواب صاحب نے نظریں اٹھائیں۔
'چائے....' وہ آہستہ سے بولی
'رکھ دو'

شمشیر کافی وزنی تھی۔ اس کی دھار اب کند ہو چکی تھی۔ وہ یوں ہی کھڑی رہی۔ نواب صاحب نے پھر سر اٹھایا

"تم گئی نہیں ۔ ؟"

"میں ۔ میں کچھ کہنے آئی تھی۔" افروز نے ہمت سے کام لیا۔

"کیا ہے ۔ ؟" نواب صاحب ابھی بھی شمشیر سے کھیل رہے تھے۔

"میں ۔ جانا چاہتی ہوں ۔ آپ نے کہا تھا۔"

"ہاں ۔ پتہ کے بارے میں ۔ وہاں پرانی دلی میں میرے ایک دوست مولوی عنایت اللہ رہتے ہیں ۔ خاندانی آدمی ہیں۔ وہ تمہارا کوئی نہ کوئی انتظام کر دیں گے۔"

"شکریہ ۔"

نواب صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک بے خیالی میں یونہی کھڑی رہی۔ پتہ نہیں، کس جذبہ کے تحت اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر وہ تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئی۔

امی جان پرانے کپڑوں کی گانٹھیں کھول رہی تھیں۔ افروز آہستہ آہستہ چل کر امی جان کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"میں جا رہی ہوں امی جان ۔"

اچانک ۔ امی جان کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ چہرے پر لرزہ طاری ہوا ۔

"کیا کہتی ہو ۔ ۔ ۔ افروز ۔"

یہ وہی پیار اور اپنا پن کے بول تھے، جسے سننے کے لئے وہ کچھ دیر کے لئے نواب صاحب کے پاس ٹھہری تھی۔

"ہاں ۔ آج چلی جاؤں گی۔"

"تم بھی تو اس گھر کی فرد ہو افروز ۔"

"نہیں امی ۔ میں نے آپ سے سچ چھپایا تھا۔"

افروز کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیر رہے تھے۔ "میں وہ نہیں ہوں امی، جو آپ سمجھتی ہیں۔"

اور اچانک وہ ہوا کہ وہ ۔ ۔ ۔ تصور بھی نہ کر سکی ۔ امی نے اپنی شفقت کا خزانہ کھول دیا۔ پیار سے بانہوں میں لپٹا لیا ۔

"میں جانتی ہوں ۔ تم کون ہو بیٹی ۔ کیا محض اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے۔"

"امی ۔ وہ پتھر کے بت کی طرح امی کو دیکھتی رہ گئی ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"مجھے تو اسی دن سے پتہ تھا بچی ۔ نواب صاحب لوگوں میں گناہ کرنے کو تو ہمت ہوتی ہے۔ پر سچ بولنے کی نہیں۔ تم اس خاندان کی چشم و چراغ ہو افروز۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"امی ۔ اس کے لفظ تھرتھرا گئے ۔ میرا جانا ضروری ہے امی جان ۔ ورنہ میں بہت ٹوٹ جاؤں گی۔ میں نے صدقے کی زندگی نہیں جینی امی جان ۔ میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں ۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں ۔ ۔ ۔ کچھ کر سکنے کے قابل ہوں یا نہیں ۔"

"تم جاؤ گی افروز اور ضرور جاؤ گی۔" دروازے پر آنکھوں میں آنسو لئے انور کھڑا تھا۔

اس کے پیچھے حیرت زدہ قریشہ کھڑی تھی۔ قریشہ نے اسے گلے سے لگا لیا ۔ کہنے کو تو یہ بھی بہت کچھ ہے افروز۔ لیکن تمہاری خواہش ہے تو جاؤ۔ لیکن وعدہ کرو تم ان رشتوں کو قائم رکھو گی۔"

وعدہ ۔۔"
ہنستے ہنستے اچانک افروز رو پڑی
اور اس کے ٹھیک دو دنوں بعد وہ دلی کے
لئے روانہ ہوگئی ۔

دلی ۔۔ (۱۹۸۶-۱۹۹۰)

مولوی عنایت اللہ کے گھر کا باہری کمرہ اس وقت زیادہ تر داڑھی والے لوگوں سے بھرا ہوا تھا ۔
دوپہر کی تپش اپنے شباب پر تھی ۔ یہ پرانی دلی کا علاقہ تھا ۔ جدھر سے بھی گزرے ، خیال آتا تھا ، کیا یہ وہی دلی ہے جسے مغلیہ بادشاہوں نے اپنے گلے سے لگا رکھا تھا ۔ جس کے بارے میں کیسی کیسی داستانیں مشہور تھیں پرانی دلی ۔۔۔ جس کے تصور ہی سے پرانی دلی کی رونقیں یاد آجاتیں ۔ وہ پرانی تہذیب کے عکس ، وہ چہل پہل ، تہذیب تو جیسے یہاں گود دان کھیلی تھی ۔ پلی تھی ، بڑھی تھی ۔ سجی ہوئی دکانیں ۔ شاہی دکانوں کی گزرتی سواریاں ۔۔۔ کہیں کسی موڑ سے ابھرتی ہوئی تیز آواز ۔
با ادب باملاحظہ ہوشیار ۔ بادشاہ سلامت کی سواری آرہی ہے ۔
لیکن وہ دلی کہاں تھی ۔ وہ خواب و خیال والی ۔ وہ ست رنگے تصور والی ۔ یہاں تو رنگ ہی بدلا تھا ۔ گندگی کے ڈھیر تھے بے ہنگم شور تھے ۔ گوشت اور مچھلیوں کی سڑاندھ تھی ۔ فضا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی لبسائن ، بو تھی ۔ ناک پر رومال رکھے بغیر چلنا محال تھا ۔
وہ دلی کہاں تھی ۔
غالب و ذوق کی دلی
داغ کی دلی ۔۔۔
تہذیب کا مرکز دلی ۔۔۔
وہ دلی تو کہیں کتابوں میں گم ہوگئی تھی ۔ یہاں تو گندی گندی گلیاں تھیں ۔ وہ تاجر ۔ جن کی زبانوں سے کبھی پھول ٹپکا کرتے تھے ۔ وہ تاجر بھی تو تاریخ کی کتابوں میں ہی گم ہوگئے ۔ ہاں ۔۔ اب شور تھے ، ہنگامے تھے اور گندی گندی گلیاں تھیں ۔ بدبو تھی اور دلی تھی ۔ بادشاہوں والی دلی ۔۔ پرانی دلی ۔۔۔
مولوی عنایت اللہ کا مکان ۔۔۔
اب بارہ دری ، دیوانِ خاص ، دیوانِ عام جیسے لفظ بھی اٹھ گئے تھے ۔
درگاہ پیر کی حویلی ۔۔۔ اب مولوی عنایت کا مکان کہلاتی تھی ۔۔۔ اور مولوی عنایت بھی کون ۔۔۔ ارے وہی جن کے لڑکے کی صدر میں دو دو دکانیں ہیں وہ نوابی شان کہاں ۔۔۔ وہ ٹھسّے دار ، لچکدار زبان کہاں ۔ اردو کہاں ۔۔ مولوی عنایت کے لڑکے تو رُکھڑی تجارتی زبان جانتے ہیں ۔۔ وہی بولتے ہیں ۔
پرانے دنوں کی یادیں اکثر گم ہوجایا کرتے مولوی عنایت ۔۔ تب ایک درد بھری آواز کہیں دل کے اندر سے نکلتی ۔۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کو آنکھیں ترستیاں ہیں

وہ ایک تیز آہ بھر کر کہتے ۔۔۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

پرانی یاد آنکھیں نم کرتیں تو ہمیشہ کی طرح ایک سخن تکیہ ان کی زبان پر آجاتا ۔ رومالی روٹی گئی ۔ ساری حیاتی آگئی ۔۔۔

وہ وقت کے ساتھ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے
بدن سے لحیم شحیم۔ زیادہ تو گھر پر ہی رہتے تھے۔ سفید ملبوس زیادہ پسند تھا۔ سر پر ایک گول سی ٹوپی ہر وقت موجود رہتی تو بدلتے وقت کا مرثیہ پڑھتی رہتی اب تو بڑی سی داڑھی بھی تھی۔ ناک پر ہر وقت غصہ بیٹھا رہتا۔ کیا پتہ کب کس بات پر بگڑ جائیں۔
اس دن اچانک بیٹھے بٹھائے، پڑوس کے منظیر بھائی کے لڑکے پر بگڑ گئے۔ بات کھانے سے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوئی۔
زیادہ گرم ہوتے تو ناک سے بولتے تھے مولوی عنایت اللہ ——
"تم کیا جانوں میاں منہ کے ذائقے۔ وہ سال نہ ممکین نہ ——— سادی چپاتیں آ گئیں۔ میاں مجروں یا غالب کے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ کتنی داکر بھی کس ادب سے گماں لیا کرتے ہیں۔ زباں کو تو یہاں کی ہر یانوی اور پنجابی نے مل کر خراب کر دیا ہے۔ ہم تو اس دور میں بڑے بوڑھوں سے آنکھیں ملانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتے تھے۔ سارا قصور تو مسلمانوں کا ہے۔ میاں عیش میں سب کچھ لٹا دیں۔ سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا ہوا۔ رئیس اور جاگیر تو ایک طرف میاں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بچی کھچی تہذیب بھی لٹا دیں ——

آپ وہ رونق چڑھا کے دیکھ لیا
تم کو بھی آزما کے دیکھ لیا

(بقیہ: سمجھوتہ)

کھا رہے ——
"کام کی تلاش میں میں ادھر بھٹکتا رہا۔؟
اور ادھر چھٹوا ——— ؟ پھر بسنتی ...؟
بسنتی تو نے تو ہمیں برباد کر دیا رے —" وہ اپنا بال نوچنے لگا —" تو نے چھٹوا کو کیوں مرنے دیا رے؟" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ——
چھٹوا کی طرح اور سب بھی نہ بھوک کی شدت سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں — ختم ہو جائیں... برباد ہو جائیں...۔ میں نے خود کو برباد کر لیا۔
"پر شاید نہیں مانتی اسے اپنی بربادی"
"میں نے تو اپنے اور جنوں بچوں کو بچا لیا ہے"
بسنتی پھر سے لکھیا کے قریب آ کر بیٹھ گئی ہے۔ لکھیا اب کسی حد تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا شاید اس نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

(بقیہ بدلتے رنگ)

لے لیا اور کمرے میں جا کر سامان پیک کیا۔ وہ خط کھولا اور آخری سطر لکھی۔ کچھ نہیں، جھیل بھی کچھ نہیں — پانی کے بغیر تو گڑھا ہی ہے۔ اب شملہ میں ہی ملاقات ہوگی۔ ابھی اسی وقت جا رہا ہوں۔
ہوٹل سے نکل کر وہ بس میں سوار ہو گیا

عفت اقبال
دار اقبال، شیخ عالم بیگ، جہان آباد ۸۰۴۴۰۸

سمجھوتے

چل، ..... چل ری حرامزادی....
کمینی۔ سور کی اولاد..... لکھیا اپنی پوری طاقت کے ساتھ بسنتی کو گھسیٹتا ہوا نے کر آیا اور دھکے دے کر زمین پر گرا دیا۔ بسنتی منہ کے بل ایک طرف ڈھک گئی۔ پھر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کونے میں پڑا ڈنڈا اٹھایا اور بے تحاشہ پیٹنے لگا۔ پیٹنے کے دوران بھی خوب گالیاں دیتا رہا۔ اپنے بچاؤ کے لئے بسنتی چیختی چلاتی رہی..... رحم کی بھیک مانگتی رہی مگر سب بے سود — بچے الگ ڈر کے مارے ایک کونے میں دبکے رہے۔ جب پیٹتے پیٹتے تھک گیا تب ڈنڈے کو ایک طرف پھینک کر خود باہر نکل گیا غصے میں...!

چارپائی پر پڑی بسنتی اب بھی کراہ رہی ہے، ڈنڈے کی چوٹ سے ہاتھ پاؤں، پیٹھ جہاں تہاں نیلا پڑ گیا تھا۔

مجھے بھی کیا سوجھی تھی آج جو کھانا دینے چلی گئی۔ میں تو خیر خواہی میں ہی گئی تھی اس کے۔ سوچا دو روز ہی ہوئے کہ کہیں جی نہ اوب گیا ہوگا اس کا۔ سو روٹی لے کر چلی گئی۔

روٹی کی پوٹلی ہاتھ میں تھامے میں اجنبی سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی بالکل سنسان جگہ معلوم پڑ رہی تھی۔ کہاں آ گئی میں.....؟ یہاں تو کوئی نہیں دکھ رہا ہے۔ سوا اینٹ، پتھر، بالو کے ڈھیر، سیمنٹ کی بوریاں وغیرہ کے — پھر کام کدھر ہو رہا ہوگا؟ میں عجیب الجھن میں پڑ گئی۔ مگر لکھیا نے یہی جگہ تو بتائی تھی۔ تو کیا میں غلط جگہ پر آ گئی۔ تبھی میں ایک مردانہ آواز پر چونکی۔

"کیا ہے — سامنے کے کمرے سے کوئی پوچھ رہا تھا میں ادھر ہی چلی گئی شاید کچھ پتہ چلے.....!

"کیا بات ہے —؟ اس نے پھر پوچھا...!

صاحب جی! روٹی لائی تھی — لکھیا کدھر ہے؟ میں کمرے کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔

لکھیا.....؟ اس نے کھاتے پر لکھنا بند کر کے پوچھا۔

"کون ہے تو لکھیا کی ــــ" اس نے مجھے سر سے
پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا۔
بستی بھلے ہی درجنوں بچوں کی ماں تھی۔ مگر
جوانی اب بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری پڑی تھی۔ بستی
قدرت کی صناعی کا غیر معمولی نمونہ تھی۔ پرکشش گداز جسم
اور پھٹ میلی ساڑی میں لپٹے ہوئے سینے کی ابھار اسے
اور حسین بنا رہے تھے۔
"عورت ہوں اس کی" اس نے سر جھکا کر جواب
دیا۔
"آجا... ادھر آجا، ابھی کام چل رہا ہے۔ اوپر
پانچ منزل پر ہوگا لکھیا۔ صاحب جی نے زیر تعمیر عمارت
کی طرف اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر میں کھانے کی چھٹی ہوگی۔
تب لکھیا خود ہی نیچے آجائے گا۔ تو کاہے کو پریشان
ہوگی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے، اور پھر وہ تو ابھی کام
میں مشغول ہوگا ــــ آ... ادھر ہی اندر آکر بیٹھ جا۔ باہر
دھوپ میں کاہے کو اپنا بدن جلائے گی۔ اس نے بڑے نرم
لہجے میں کہا تھا۔ میں اندر جا کر زمین میں بیٹھ گئی۔ آتے
آتے پاؤں بھی دکھنے لگے تھے۔ سوچا اچھا ہے تھوڑا سستا
لوں۔ پھر لوٹنا بھی ہے۔
کچھ ہی دیر میں صاحب جی کی نگاہ میرے جسم
سے پار ہوتی ہوئی مجھے محسوس ہوئی۔ میں سہم اٹھی۔ اور
اپنے جسم کو اپنے آپ میں چھپانے کی ناکام کوشش کرنے
لگی۔
پھر تو شاید غضب ہو جاتا جب عین وقت پر
کھانے کی چھٹی نہ ہوتی۔ مزدوروں کی ٹولیاں ادھر ہی
آتا دیکھ کر صاحب جی سنبھل چکے تھے۔ اور میں ایک جھٹکے
کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ روٹی کی پوٹلی کو تھامے

میں ہکا بکا سی کھڑی رہی۔
سب ایک ایک کر کے آتے گئے لائن بنا کر۔ صاحب
جی سبھی کو پیسہ بانٹ رہے تھے مگر ان کا من کہیں اور
تھا... بار بار ان کی بے چین نظر ادھر ہی اٹھت
دیکھ کر میں کافی پریشان ہو رہی تھی۔ میں بے چین سی
کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لکھیا کو ڈھونڈ رہی تھی۔
مزدوروں کی لائن اب ختم ہونے کو تھی، میری بے چینی
بڑھی، تبھی لکھیا دکھائی پڑ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری
جان میں جان آگئی۔ پھر جلدی سے میں نے اپنی پریشانی
کو چھپا لیا۔
مگر شاید لکھیا بھانپ گیا۔ جب میں نے اسے
پیار سے روٹی کی پوٹلی بڑھائی تب اس نے بدلے
مجھے یہ سوغات دیا۔
لاکھ چاہ کر بھی میں اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ درد
میں شدت سے اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ کس بے دردی
سے پیٹا تھا ظالم نے مجھے۔ اس کے درجنوں بچوں کی
ماں ہوں میں۔ مجھ پر بھروسہ نہیں اُسے ؟
گاؤں میں سوکھے کی وجہ سے لوگ کافی پریشان
تھے۔ زیادہ تر لوگ شہر نکل پڑے۔ لکھیا نے بھی آخر
پریشان ہو کر اپنی گٹھری باندھ لی۔
لوٹے گا کب تک...؟ بستی فکر مند ہو کر
پوچھ رہی تھی۔
آجاؤں گا جلد ہی۔ بس کام ملنے کی دیر ہے۔ بچوں
کا خیال رکھنا۔
بستی بچوں کے بیچ بت بنی کھڑی رہی۔ ایک
انجانی سی خوشی بھی ہو رہی تھی اسے۔ شاید ہمارا
قسمت کھل جائے... کھڑا ان ساری سپنے

بچوں کو بھوکا نہ سونا پڑے ... جسم ڈھکنے کو قاعدے کا کپڑا نصیب ہو جائے سبھی کو .... اور اپنے کو ایک قاعدے کی کھولی جو برسات میں بھی نہ ٹپکے۔

آج دوسرا دن تھا ۔ ـــــ لکھیا کا کچھ پتہ نہ تھا ۔ ساتھ جانے والے ساتھی بھی اب تک نہ لوٹے تھے۔ بسنتی کافی پریشان تھی ۔ بچوں کے بیچ وہ خود کو کسی طرح سنبھالے ہوئے تھی ۔ تیسرا، چوتھا، پانچواں ... اور اس طرح کئی دن گذر گئے ۔

آج کئی دنوں بعد لکھیا گھر لوٹ آیا میلے کپڑے، بوسیدہ اور میلی پگڑی سے چند ایک تار علیحدہ ہو کر لٹک رہے تھے ۔ اور اس کی سیاہ خشک ٹانگیں جو غبار آلود تھیں نصف تک دھوتی سے باہر تھیں ۔ اس کی خستہ حالی کو صاف ظاہر کر رہے تھے ۔ اس نے اپنے توقع کے خلاف بچوں کو پایا ۔ سبھی بچے ہنس کھیل رہے تھے ۔ سبھی کافی خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے سب اس قدر مگن تھے اپنے آپ میں کہ میری موجودگی کا کسی کو احساس تک نہ ہوا ۔ پھر میں ہی ان سب کے بیچ جا کر کھڑا ہو گیا

"ماں کہاں ہے ـــــ؟" میں نے بسنتی کو نہ پا کر پوچھا۔

"ماں باہر گئی ہے ـــ کام پر ــ" چار پانچ بچے ایک ساتھ بول پڑے ۔

"بابو تم آگئے ـــــ؟"

"کچھ لائے نہیں ـــــ؟"

"اتنے دن کیوں لگا دی تم نے؟" ایک ہی ساتھ کئی سوال کر بیٹھے پر جب میری جانب سے کوئی جواب نہ ملا انہیں تو خود ہی بول پڑے۔

ماں بہت پریشان تھی ۔ مگر اب ہم بہت خوش ہیں ۔ ماں کو کام مل گیا ہے ۔ ہمیں دونوں وقت بھر پیٹ کھانا دیتی ہے ماں ۔ جرا دیر سے گھر لوٹتی ہے، شاید ڈھیر سا کام کرتی ہے

لکھیا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر زمیں پر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا ۔ اپنا سر آگے کو جھکا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ یکدم کوئی خیال اسے پریشان کرنے لگا ۔ اور وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑانے لگا

"کہاں گئی ہو گی بسنتی ـــــ؟"

"ماں آگئی ـــــ ماں آگئی" سبھی بچے ایک ساتھ چلا پڑے ۔

"باپ آیا تیرا ـــــ؟" معمول کے مطابق بسنتی نے آتے ہی پوچھا۔

"ہاں ماں ۔ بابو آگیا ۔ وہ رہا ـــ باپ کی طرف اشارہ کیا اس نے ۔

"آگیا تو ـــــ؟" لکھیا کو یکدم سے دیکھ کر بسنتی کچھ ہڑبڑا سی گئی ۔

"کب آیا ـــــ؟" بسنتی نے اپنا پلو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"اتنے دن کہاں رہا؟ کچھ کام دام ملا؟"

"نہیں ـــ!" مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گیا

"اچھا چل ہاتھ پاؤں دھو لے، پھر کچھ کھا پی لے ۔ بسنتی اپنے مرد کے قریب آ کر بیٹھ گئی ۔ کچھ دیر دونوں چپ رہے ـــ

"تو چپ کیوں ہے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا تجھے تو کام مل گیا نا ـــــ؟"

لکھیا اسے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔
اس کی لال لال آنکھیں اب نکل آنے کو تھیں۔ اس کے اس
طرح گھورنے سے بسنتی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
" کہاں جا کام تجھے ___ کہاں جاتی ہے تو ___ بول
___ بول ری، حرامجادی ___ کس کے پاس جاتی ہے تو"
اپنا منہ کالا کرنے ___ یکدم دھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا
لکھیا ___ اور پھر چوٹی کھینچ کر لاتوں اور گھونسوں کی بارش
کرنے لگا ___ یکایک وار سے بسنتی گھبرا سی گئی۔ بیٹھی
بیٹھی منہ کے بل گر پڑی، لاتوں اور گھونسوں سے بے چین
ہو اٹھی۔ اب تجھے جندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" یہ
کہتے ہوئے لکھیا نے اس کی گردن دبوچ لی اور اپنی گرفت
سخت کرنے لگا۔ بسنتی ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ
اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔
" پاگل ہو گیا ہے تو یکدم ___ سر پھر گیا ہے تیرا۔
سر پھرا کہیں کا ___ نہ بول نہ چال ___ آتے ہی۔۔؟۔۔
بسنتی نے اپنے بکھرے بال اور اکھڑی سانس کو درست
کرتے ہوئے بولی۔
لکھیا زور زور سے ہانپنے لگا۔ معلوم پڑ رہا
تھا میلوں کا سفر دوڑ کر طے کرتا ہوا آیا ہو۔ بھوکوں مارا
مارا پھرنے سے ویسے بھی لکھیا بری طرح نڈھال ہو چکا تھا۔
" ہاں جاتی ہوں میں ___ وہیں جاتی ہوں جہاں
تیرے لئے روٹی لے کر گئی تھی جب تو مجبوری پر تھا۔ انہیں
صاحب جی کے پاس جاتی ہوں۔" بسنتی چیخ چیخ کر
بولے جا رہی تھی۔ پھر سانس درست کرتے ہوئے
بولی ___ کیا کرے گا تو؟ ہاں! کیا کرے گا تو
بول ___ تجھے تو نہ اپنی فکر ہے نہ ان درجنوں بچوں
کی ___ میں نے تو کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا لیکن
تم سے دو وقت کی روٹی جٹانا بھی محال ہو گیا۔
" نیچ ___ کمینی ۔۔۔۔۔ ذلیل ۔۔۔ زبان
چلاتی ہے ۔۔۔" لکھیا پھر دہاڑنے لگا۔
" نیچ ___ کمینی ۔۔۔ ذلیل ۔۔۔ میں یا تم مرد جات؟
تم سب مرد جات نیچ ۔۔۔ کمینے اور ذلیل ہو ___
میں تو کام کے واسطے ہی گئی تھی ___ میں کوئی اپنے
شوق سے گئی تھی بھیترے درجنوں بچوں کی خاطر۔۔۔
" چپ رہ کر سور ___ بچوں کا سہارا لیتی ہے۔"
لکھیا بسنتی کی بات بیچ ہی میں کاٹ کر پھر گرج
اٹھا۔ لکھیا اب بھی ہانپے جا رہا تھا۔
" چپ کر تو ___ میں اب چپ نہیں رہنے والی۔
کس کے بھروسے درجنوں کو جنمایا ہے تو نے؟ جب
تو غیر گیا تھا تب سیر بھر آٹا کے علاوہ اور کیا رکھ چھوڑا
تھا تو ___ ہم سب کیا کیڑے مکوڑے ہیں ___ سیر بھر
آٹا اب تک چاٹتے۔ پھر ان درجنوں کا دوزکھ تجھے
ہی بھرنا تھا نہ ___ ؟ میں نے کیا برا کیا ___ ؟ وقت
اور حالات سے سمجھوتہ ہی تو کیا ___ تجھے کچھ کھبر ہو
ہے؟ تو نے اپنے سارے بچوں کو ہاپا کر ___ ؟ سب
ہا کتھے ___ ؟ تو نے اپنے سب سے پیارے اور لاڈلے
چھٹوا کو دیکھا ___ ؟"
لکھیا ایکدم چونکا۔" اسے کیا ہوا رے؟
" نہیں رہا وہ اب سنار سے بیچ ___ میری آنکھوں
کے سامنے بھوک کی شدت سے تڑپ تڑپ کر ___
آگے کچھ بول نہیں پائی بسنتی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو
لگی ___
دھم سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا لکھیا بھی۔ ہائے
رے بھگوان ___ ؟ درجنوں میں چھٹوا سب سے

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

دعائے نیم شبی (افسانوی مجموعہ)

مصنف :۔ معین شاہد
صفحات :۔ ۱۲۸ ۔ قیمت :۔ تیس روپے
ناشر:۔ مکتبہ آدرش، آبگلہ، جنیادگنج، گیا۔
۸۲۳۰۰۲

زیرِ نظر کتاب "دعائے نیم شبی" معین شاہد صاحب کے تیسرے افسانوی مجموعے کا نام ہے۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے "کاجل اور آنسو" اور تیسری آنکھ منظرِ عام پر آکر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

"دعائے نیم شبی" بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے جن میں سولہ خوبصورت افسانے ہیں۔ ہر افسانہ مکمل، بھرپور، پُراثر اور اپنی مثال آپ ہے اور افسانہ نگاری کی فنی صلاحیت اور مہارت کی عکاس ہے۔ معین شاہد صاحب کی گرفت اپنے اردگرد کے ماحول، معاشرے اور زندگی پر بے حد سخت ہے۔ وہ زندگی کے سخت سے سخت مسائل کو اپنے افسانوں میں اُجاگر کرنے کا فن جانتے ہیں اور بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے عام فہم زبان و بیان اور انتہائی سادے اسلوب سے ادا کر ڈالتے ہیں جو قارئین کو نہ صرف متوجہ کرتے بلکہ خود میں سمو لیتے ہیں۔ وہ قصہ گوئی اور ماجرا سازی کا بہترین فن پیش کرتے ہیں۔

معین شاہد صاحب کی کہانیاں دیہی علاقوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ دیہاتی زندگی، وہاں کے ماحول، مسائل، طرزِ رہائش، رکھ رکھاؤ، روز و شب، مشغولیت و مصروفیت، شادی بیاہ، مرنے جینے پر ان کی نگاہ بڑی گہری ہے جس کو وہ اپنی فنی مہارت، تجربات اور چابکدستی سے بے حد پُراثر بنا کر اپنی کہانیوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ معین شاہد کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری خود کو اس آنگن میں کھڑا پاتا ہے جس آنگن کی بات ہو رہی ہو۔ وہ خود کو اس سانچے میں ڈھلا ہوا محسوس کرتا ہے اور اسے لگتا ہے یہ خود اس کی آپ بیتی ہے۔ کہانیوں میں حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اس نگر کی بول چال اور حرکات و سکنات جس انداز میں پیش کی جاتی ہے اور جو حقیقی تاثر اس سے نمایاں ہوتا

ہے وہ قابل تعریف ہے ۔۔۔ اسے محسوس کرنے کے لئے "دعائے نیم شبی" کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں ۔۔۔

دیہاتی زندگی، وہاں کے مسائل اور وہاں کے حالات و واقعات، دکھ درد، راحت و خوشی سبھی کچھ "دعائے نیم شبی" کے شمولہ افسانوں میں ملے گا اور بڑی شدت سے ملے گا۔

"دعائے نیم شبی" صرف کتاب کا ہی نام نہیں ۔۔۔ کتاب کے پہلے افسانے کا بھی نام ہے۔ افسانہ بے حد پراثر اور دوسرے افسانوں کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے ۔۔۔ ترغیب دیتا ہے ۔۔۔ "دعائے نیم شبی" ایک بانجھ عورت کی کہانی ہے ۔۔۔ اور اس بانجھ عورت کی کہانی کے پس منظر میں معین شاہد صاحب جو تاثر اپنے قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں اس میں سو فیصد کامیاب ہیں ۔۔۔ بانجھ عورت کی دعاؤں سے بارش ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو لیکن اس کے پس پردہ جو تعمیری پہلو ہے اور جو احساس ابھرتا ہے، جو تاثر ملتا ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لئے بغیر نہیں رہتا۔

"دعائے نیم شبی" کہانی کا ہر کردار بڑا ہی جاندار ہے۔ ہر کردار کے افکار و گفتار، تہذیب، مقام اور فطری خواہشات اور انسانی جبلت کا ایک شاہکار نظر آتا ہے۔ والدین کو اپنے بیٹے کا اولاد سے محروم ہونے کا درد و کرب اور پریشانیاں اور دوسری طرف ایک وفادار شوہر اور قدرت کے آگے سر جھکانے والا انسان اور اپنے والدین کو تسلی دینے اور خوش کر دینے والا بیٹا ۔۔۔ ایسا کردار ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے ۔۔۔ اور خود بانجھ عورت تو پوری کہانی پر چھائی ہوئی ہوتی ہے

معین شاہد صاحب کے اس مجموعے کی ایک دو کہانیوں میں کچھ اکھڑا پن ضرور ہے جو ان کی عمدہ کہانیوں کے درمیان بطور سند رکھی جا سکتی ہے مگر اس سے معین شاہد کی فنکارانہ صلاحیت، ان کے سادہ اور متاثر کن اسلوب بیان، انکی حقیقت پسندی، مشاہدے اور افکار و خیالات پر آنچ نہیں آسکتا۔ اسی طرح بعض کہانیوں میں ہندی الفاظ کہانیوں کے تاثر کو بگاڑتے نظر آتے ہیں جن کو داخل کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی، اردو الفاظ سے بھی کام چلایا جا سکتا تھا اور اردو الفاظ اپنے ذخیروں سے محروم نہیں۔ ہاں، اس مقام پر ہندی الفاظ ضرور خوبصورت لگتے ہیں جہاں اس کی شدید ضرورت ہو۔

معین شاہد صاحب کی کہانیوں میں کہانی پن بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے اور چونکہ ان کی کہانیاں دیہاتی پس منظر میں تخلیق پاتی ہیں اس لئے بڑی شدت سے پریم چند کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ان کی کہانیوں میں منشی جی کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ معین شاہد صاحب جیسا معتبر افسانہ نگار اپنے قلم سے منشی جی کی روایتوں کو زندہ رکھنے اور ان کی طرز نگارش کو آنے والی نسل تک پہنچانے میں معاون ہے۔ یقینی طور پر وہ منشی پریم چند اسکول کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔

بہرحال ۔۔۔ "دعائے نیم شبی" اور اس کے ہر افسانے اپنے خالق کی مہارت اور خداداد صلاحیت کی زندہ مثال ہیں اور ہر اعتبار سے عمدہ ہیں۔

سرورق عمدہ اور جاندار ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔ گرانی کے پیش نظر قیمت تیس روپے مناسب ہے۔

● سید عبدالاحد آزاد، گیا

اُردو داستان :۔ تحقیق و تنقید

تحلیق :۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی
ضخامت :۔ ۲۶۴ ٭ قیمت :۔ ۶۵ روپے
پتہ :۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
تقسیم کار :۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ (۲) الماس کتاب گھر، لکھن پور، اشرگنج مونگیر (بہار)

"اردو داستان تحقیق و تنقید" دو سو چونسٹھ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی کی تازہ تصنیف ہے۔ جسے انھوں نے خلوص وانہماک، محنت لگن اور استقلال سے تحریر کیا ہے۔ کتاب کی ترتیب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک میں اردو کی اہم منظوم داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ہے اور دوسرے حصہ میں چند خاص منثور داستانیں ہیں۔ اس سے پہلے "قصہ، کہانی کا آغاز و ارتقاء" عنوان کے تحت کہانی کا مفہوم، اس کے مختلف مدارج وغیرہ کا تفصیلی مطالعہ ہے۔ کتاب کا مطالعہ شروع کرتے ہی ہماری دلچسپی میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ ہر باب کے اوراق و صفحات ہماری توجہ و دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس طرح کتاب کے آخیر تک یہ چیز قائم رہتی ہے۔

"قصہ کہانی کا آغاز و ارتقاء" میں مغربی ممالک اور ہندوستان میں اس کے ارتقائی سفر کا تحقیقی اور مفصل جائزہ لیا ہے۔ یہاں اس طرف اشارہ کردوں کہ قمر الہدیٰ فریدی صاحب نے مغربی ممالک کے قدیم قصوں کے نام، مصنف، زمانۂ تصنیف اور اس کے مشمولات وغیرہ کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ مغربی ممالک میں "۳۰۰۰ آغاز و ارتقا کا زمانہ ۵۰۰۰ ق م تا سولہویں، سترہویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ گویا ایک طویل عرصہ ہے جس کا بیان مختصراً کیا ہے۔ جبکہ ہندوستان میں کہانی کی ابتداء و ارتقاء کا عہد ۱۵۰۰ ق م تا چودہویں صدی تک ہے۔ اس کم مدت کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ وید، اُپنشد، مہابھارت اور رامائن کے ذریعہ قصہ کا بتدریج ارتقا اور ان کے مشتملات کا خلاصہ بیان کرنے کے ساتھ ہی نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بودھ مذہب کے زیر اثر قصہ کا فروغ اور کشمیر میں لکھی جانے والی کہانیوں کے متعلق زیادہ تفاصیل سے کام لیا ہے اور اس پر بھی تذکرۂ ناتمام کہہ کر اس حصہ کو ختم کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں اس کی توجیہہ اس طرح کریں کہ مغربی ممالک میں قصہ کہانی کا عہد تو طویل ہے لیکن تحریری شکل میں تعداد کم ملتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اس کی طرف اشارہ کر دینا ناگزیر تھا۔

داستان کسے کہتے ہیں؟ اس کی کیا خوبیاں ہیں؟ اور فنی لوازمات مثلاً کردار نگاری، واقعہ نگاری منظر نگاری، مبالغہ نگاری، عصری تہذیب و معاشرت کی مرقع کشی اور زبان و بیان وغیرہ سے نہ صرف بحث کی ہے بلکہ داستان میں ان کی موجودگی، عدم موجودگی وغیرہ کی بھی بحث اٹھائی ہے اور پیش رو محققین و ناقدین کے بعض اختلافات اور اعتراضات کا مدلل اور وضاحتی انداز میں جواب دیا ہے۔ مثلاً فن داستان کے متعلق اس پہلو پر اصرار ہوتا ہے کہ اس میں تخیل کی فراوانی ہوتی ہے۔ بلکہ تخیل ہی کے ذریعہ پوری داستان کا تانا بانا بنا جاتا ہے جس کا زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

اس بحث کو نہایت مدلل اور متوازی انداز میں اٹھایا اور پیش کیا گیا ہے۔

"اردو کی منظوم داستانیں" کتاب کا تیسرا حصہ ہے جس میں دکن اور شمال کی منظوم داستانوں کا تاریخی و تحقیقی بیان ہے۔ تفصیلی مطالعے کے ضمن میں "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ دکنی اردو کی پہلی اور اہم منظوم داستان "کدم راؤ پدم راؤ" اور پھر تاریخی ترتیب سے دکن کی منظوم داستانوں مثلاً صنعتی کے "قصہ بے نظیر" یا قصہ تمیم انصاری" نصرتی کی "گلشن عشق" وجہی کی "قطب مشتری" غواصی کی "مینا ستونتی" "سیف الملوک و بدیع الجمال" جنیدی کی "ماہ پیکر" ابن نشاطی کی "پھول بن" طبعی کی "بہرام و گل اندام" وغیرہ کا خلاصہ نقل کیا ہے ساتھ ہی مصنفین کے ناموں کے اختلافات اور سن تصنیف کے اختلافات کو بھی موضوع بحث بنایا اور تحقیق و تفحص کے ذریعہ ان اختلافات کے صحیح حل پیش کئے۔ تاہم دکنی منظوم داستانوں میں بہ اعتبار زبان جو تبدیلی و ترقی رونما ہو رہی تھی اس کی جانب نشاندہی نہیں ملتی ہے۔

شمالی ہند کی قدیم داستانوں کے ابتدائی نمونوں کا ذکر کرتے ہوئے دو اہم منظوم داستانوں "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مثنوی "سحر البیان" کی وہ کون سی خوبیاں اور صفات ہیں جس نے اردو ادب میں اسے شاہکار کا درجہ عطا کیا۔ اس پہلو سے مفصل بحث ملتی ہے۔ اس سلسلے میں منظر نگاری کو اولیت دی ہے۔ میر حسن نے اس مثنوی میں جو محاکات نگاری کی ہے اور جزئیات نگاری کی وساطت سے جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ قاری و ناظرین کی دل بستگی اور شوق و دلچسپی میں نہ صرف اضافہ کرتا ہے بلکہ بار بار پڑھنے اور سننے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اس مثنوی میں بھی فریدی صاحب نے مدلل اور تجزیاتی انداز اختیار کیا اور جہاں اختلافات نظر آئے وہاں نہایت متوازی طریقہ اپنایا اور شائستہ انداز میں اپنے خیالات بیان کئے ہیں۔ مثنوی کے قصہ میں جب شہزادی، شہزادہ کو لے کر چلی جاتی ہے اور پیش گوئیوں کی بات سچ نکلتی ہے تو اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر یقین و اعتماد کی کیا ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں فریدی صاحب کے دلائل اور انکی قابل توجہ و تعریف ہیں۔

"منثور داستانیں" کتاب کا آخری باب ہے اس حصہ میں دکن کی نثری داستانوں کی تاریخی و تحقیقی حیثیت و اہمیت اور پھر شمالی ہند کی داستانوں مثلاً "نو طرز مرصع" "نو آئین ہندی"، "قصہ مہر افروز و دلبر" "عجائب القصص" اور "آرائش محفل" وغیرہ کا خلاصہ بیان کیا ہے اور ان کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ لکھی جانے والی منثور داستانوں کا مطالعہ ہے دہلی، کلکتہ اور لکھنؤ کے علاوہ رامپور کی داستانوں کا مطالعہ بھی قابل توجہ و تعریف ہے۔ اردو کی اہم منثور داستانوں میں "سب رس" "باغ و بہار"، "فسانۂ عجائب" "داستان امیر حمزہ"، اور "بوستان خیال" کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

"آخری بات" عنوان کے تحت فریدی صاحب نے ماضی میں داستان کی ضرورت و اہمیت اور اس کے اثرات کا نہایت جامع اور مدلل طریقے سے ذکر کیا ہے اور اس پہلو کو واضح کیا ہے کہ آج سائنسی و صنعتی زندگی و ماحول میں بھی داستان نے افسانوی ادب پر اثر ڈالا ہے۔

جس کا ثبوت بعض افسانہ نگاروں کے افسانوں میں داستانی اسلوب اور داستانی قصّہ کا رنگ ہے اس طرح کتاب کے مطالعہ کے بعد استاد محترم پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب کے اس خیال کی تائید و حمایت کرنی پڑتی ہے کہ

" ڈاکٹر فریدی کے تنقیدی شعور میں بہت پختگی آگئی ہے اور ان کا انداز تحریر زیادہ شگفتہ، زیادہ مدلل اور زیادہ دلکش ہو گیا ہے "۔

فریدی صاحب نے کتاب میں جا بجا تحقیق و تنقید کا جو انداز اختیار کیا اور اعتدال و توازن کی جو مثال پیش کی ہے وہ ان کی شخصیت ـ محنت ـ لگن اور خلوص کی آئینہ دار ہے ـ

فریدی صاحب کی زبان نہایت شستہ اور شگفتہ ہے ـ چھوٹے چھوٹے جملوں کے استعمال سے عبارت میں رنگینی و دلکشی پیدا ہو گئی ہے ـ تشبیہ و استعارات کا مناسب استعمال بھی ملتا ہے جس سے تحریر میں اور تازگی پیدا ہو گئی ہے ـ

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں داستان سے متعلق جو مواد اور معلومات موجود ہیں وہ بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور فریدی صاحب نے بڑے خلوص محنت اور تحقیق و تفحص کے بعد پیش کیا ہے ـ یہ کتاب داستانی ادب کے مطالعہ میں معاون، مفید اور ناگزیر ہوگی ـ

● جاوید اختر، علی گڑھ

خاکستر دل (شعری مجموعہ)

شاعر و ناشر :- اخلاق سہسوانی

صفحات :- ۱۶۰ ▲ قیمت :- ۲۵ روپے

ملنے کے پتے :- (۱) اخلاق سہسوانی، سہسوان، ضلع بدایوں - یوپی - ۲۴۳۶۳۸

" خاکستر دل " اخلاق سہسوانی کا پہلا مجموعہ کلام ہے ـ جس میں حمد، نعت، غزل، نظم، قطعہ، رباعی اور بیت جیسے اصناف موجود ہیں ـ کتاب کے ابتدائی صفحات میں ادب کے ناقدین، مشاہیر کے ارشادات عالیہ بھی شامل ہیں جو اخلاق سہسوانی کے شعور فن پر روشنی ڈالتے ہیں بقول حضرت بیکل اتساہی :-

" غزل کی جادو اثری اور ہنرمندی کو اخلاق نے کمال فن کے ساتھ برقرار رکھا ہے "

ڈاکٹر قمر رئیس کے الفاظ میں :- " اخلاق سہسوانی یوں تو اپنے لہجہ اور اسلوب میں کلاسیکی انداز کے شاعر ہیں لیکن ان کے متعدد اشعار میں عہد حاضر کے انسان کا درد و کرب بھی جھلک اٹھتا ہے ـ ان کے کلام میں یاس و محزونی کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جو تاثر سے معمور ہوئے ہیں ـ گرد و پیش کے مشاہدات کو بھی وہ جذبہ کی لطیف زبان میں ادا کرتے ہیں "

کی ندرت کے اعتبار سے ممتاز و منفرد شاعر ہیں ـ انہوں نے اپنے دکھ و جذبوں، یاسیت، غم، زمانہ کی بے مہری اور حالات کی سختی کو پر اثر اور خوبصورت انداز میں اشعار کا جامہ پہنایا ہے اور زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کرتے ہوئے خلوص و محبت کے پیامبر نظر آتے ہیں ـ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

تمام عمر مجھے دوستوں نے لوٹا ہے
خلوص کا یہ صلہ ہے تو کوئی بات نہیں

دنیا فریب دیتی رہی ہم کو اور ہم
کچھ سوچ کر خلوص کے سانچے میں ڈھل گئے

بانی: مرحوم عبدالرحمٰن بسمل سہسرامی ✱ یادگار:- زین العابدین احمد زاہدی سہسرامی

ماہنامہ سہیل

گیا

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیر
- قیصر عثمانی
- شاہ احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مفتی
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر:- مسعود منظر

▲ ایڈیٹر:- جمیل منظر

▲ اعزازی ایڈیٹر:- خورشید ہاشمی

معاونین:- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

▲ کتابت:- سید عبدالاحد گیاوی ▲

شمارہ ۵ جلد ۵۳

بدلِ اشتراک —

- فی شمارہ ———— ۵ روپے
- سالانہ ———— ۵۰ روپے
- لائف ممبری ———— ۱۰۰۰ روپے

▲ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر:- ۲۰۵۷۳

▲ فہرست ▲

★

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام ——
—— ترقی کے نئے باب

۲۰ - نکاتی پروگرام کا خاص مقصد ہے غربت کے خلاف جدوجہد - صوبہ میں اس پروگرام کے سوتر / اُپ سوتر کے لئے خاص نشانہ مقرر کئے گئے ہیں اور پوری لگن کے ساتھ ہر سطح پر اس کی حصولیابی کے لئے کوشش کئے جا رہے ہیں - اس کے تحت سال ۹۳-۱۹۹۲ء میں حاصل کامیابیاں قابل ذکر ہیں -

○ سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت 2,47,898 خاندانوں کو فائدہ دلایا گیا ○ جواہر روزگار یوجنا کے تحت ۴۳۵.۹۹ لاکھ مانو دوس کا سرجن کیا گیا ○ 20/ چھوٹے دیہی اور سلبی کرت اکائیاں قائم کی گئیں ○ بھومی سدھار یوجنا کے تحت 8,369 ایکڑ خالی زمین تقسیم کی گئی ○ صوبہ کے 5782 گاؤں میں صاف پینے کا پانی کا انتظام کیا گیا ○ خوشحالی کرن کے تحت 2,76,842 لوگوں کی نس بندی کرائی گئی ○ خاندانی منصوبہ بندی کی ان یانیہ ودھی کے ذریعہ 2,76,809 لوگ مستفید ہوئے ○ بچوں کا ٹیکہ کرن پروگرام کے تحت ڈی-پی-ڈی کے 19,94,106 پولیو کے 19,55,877 بی سی جی کے 21,93,394 اور میزلس کے 18,14,393 ٹیکے لگائے گئے ○ 20,930 آنگن باڑی مراکز قائم کئے گئے -

○ مختلف منصوبوں اور پروگراموں کے تحت 1,89,63 انوسوچت جاتی اور 1,33,267 انوسوچت جن جاتی کے خاندانوں کو مستفیذ کرایا گیا ○ بے گھر لوگوں کے درمیان 21,628 جگہ دی گئی ○ اندرا آواس یوجنا کے تحت انوسوچت جاتی اور جن جاتی کے لوگوں کے لئے 25,953 گھروں کی تعمیر کی گئی ○ مالی طور پر کمزور اور کم آمدنی والے لوگوں کے لئے 496 اور 268 مکانوں کی تعمیر اور الاٹ کیا گیا ○ تنگ بستیوں میں سدھار پروگرام کے تحت گندی بستیوں میں رہنے والے 7,464 لوگوں کے لئے پینے کا پانی، جل [illegible] انتظام، نالی سدھار، غسل خانہ، پیخانہ، گلی تعمیر، بجلی وغیرہ کی سہولیات مہیا کرائی گئی ○ 20,337 ہیکٹر میں 979.20 لاکھ پودے لگائے گئے ○ جن وترن پرنالی کی 686 دوکانیں کھولی گئیں ○ 258 گاؤں میں بجلی 2,592 لیمپ سیٹوں کو بجلی سے تعلق 175,064 اچھے قسم کے چولہوں کی تعمیر اور 3,152 بائیو گیس سینٹر قائم کیا گیا -

جاری کردہ :- **محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار**

(1) 65 سو (ٹ–28) 93-94

نمود

بے سمتی

ہمیں اپنے ادبی سفر میں اس امر کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ہماری اجتماعی رفتار کیسی ہے؟ ہم آنکھ بند کر کے سفر تو نہیں کر رہے ہیں، اور اگر آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ بیچ بیچ میں یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ ہم شعر و نثر کی مختلف اصناف میں اپنے ماقبل کے فن کاروں سے کس حد تک مختلف ہیں۔ کن جہتوں میں ان سے آگے نکلے ہیں، کہاں کہاں ہمیں تھکن کا احساس ہو رہا ہے۔ گویا مجموعی طور پر اپنی پیش رفت کا تخمینہ لگانا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ماضی کے لسانی ارتقا کے مقابلے میں اگر ہم آج زیادہ بہتر ہیں تو اس کا اظہار کیوں کر ہو رہا ہے۔ ان خصوصیات پر اجتماعی حیثیت سے بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اور انفرادی تنقیدی تجزیئے بھی درکار ہیں۔

ان مسائل کا تجزیہ تفصیل طلب ہے، یہ کام ہمارے ناقدین کو کرنا ہے۔ ہم یہاں صرف اس عمومی تاثر کا اظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ آج کا اردو ادب نثری اور شعری دونوں حیثیتوں سے اپنے ہونے کا ثبوت تو دے رہا ہے مگر اس بروا کے چکنے چکنے پات دکھائی نہیں دیتے۔ جس کی وجہ سے اسے ہونہار کہا جا سکتا ہو۔ تھکن بے دلی، روایت پسندی، ہیئت پرستی اور بے نام و بے مقصد تجربات کی ایک دلدل ہے جس میں ہمارے سارے معیارات دھنستے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ ایک خوفناک منظر نامہ نہیں ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ آج ہمارے اہل قلم حضرات فکشن کے میدان میں محنت کر رہے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ فکشن کا معیار بلند تر ہو رہا ہے۔ انعام و اعزاز اور [illegible] کا شعور و شغف زیادہ ہے اور اصیل تخلیقی اور اعلیٰ ادبی معیار کا خیال کم ہے۔ انعامات کی لپک نے فکشن کے میدان میں سرعت رفتار تو پیدا کر دی ہے مگر عالم یہ ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔

شعری حصے میں لگتا ہے کہ غزل آگے جا رہی ہے مگر کیا یہ خصوصیت عمومی معیار کی حیثیت حاصل کر رہی ہے یا انگلیوں پر گنے جانے والے چند فنکاروں تک محدود ہے۔ ہم ناقدین کو ان سوالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ــــ اور یہ بات ہمارے فنکاروں تک بھی پہنچنی چاہئے کہ یہ سارے امور انہیں سے تعلق رکھتے ہیں ــــ

ــــ مسعود منظر ــــ

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
گوہاٹی

اُردو، ہندی ۔ اور امرت رائے

۱۹۹۱ء کے دوران امرت رائے کی شاہکار تصنیف A HAUSE DIVIDED (ایک گھر جوبٹ گیا) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی، کتاب ہذا کی اشاعت اور بازار میں اس کی آمد کے دو تین ماہ بعد ہی انجمن ترقی اردو ہند کے ہفتہ وار ہماری زبان میں بہکے بکھرے مشتعل جذبات میں شرابور مضامین شائع ہونے شروع ہوئے۔ ایسے مضامین جن میں استدلال کو تو بالکل برطرف کر دیا گیا تھا۔ امرت رائے کے نام کے بعد منشی پریم چند کے سپوت، ہر مضمون میں نظر آیا۔ ملحوظ رہے۔ اردو میں لفظ سپوت کا استعمال استہزاد اہانت کے مفہوم میں کیا جاتا ہے۔ بات سپوت پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اسی نوعیت کی نہ جانے کیا کیا اینڈی بینڈی باتیں سنانے کو ہر مضمون نگار اپنا فریضہ سمجھتا۔ جناب مسعود حسن خاں صاحب نے تو کمال ہی کر دیا، موصوف نے ساہتیہ اکادمی کے انگریزی ماہ نامہ انڈین لٹریچر (INDIAN LITERATURE) میں امرت رائے کی کتاب کو بہت فاضلانہ کاوش بتایا مگر ایک وزن سے خارج مصرع کی نوعیت کی بات بھی شامل کر دی کہ اردو کو دوسری زبان کا درجہ دئے جانے کے سوال پر امرت رائے سیاست پر اترے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اردو مضامین میں خاں صاحب موصوف جو بہ غایت مستقیم و استوار شخصیت کے حامل ہیں نے جذباتی انداز پر نگاڑا بجانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کیوں پیچھے رہتے اور کامریڈ نے زر افشت میں ٹاٹ کا پیوند لگاتے ہوئے لکھا کہ "ہم تو امرت رائے کو سیکولر آدمی سمجھتے تھے۔ کاش کامریڈ کو سیکولر اصطلاح کا مفہوم معلوم ہوتا۔ کے۔ این پانیکر نے اپنی تصنیف (CUL-TURE & CONSCIOUSNESS IN MOD-ERN INDIA (PPH) میں سیکولرازم کو انیسویں صدی کے بورژوا آئی کلچر سے عبارت رومانیت نیز نصب العینیت IDEALISATION AND-ROMANTICISM) قرار دیا ہے۔

یعنی کا مرید موصوف نے اردو کے ادیبوں میں شامل ہونے کے لئے اپنی واقفیت یا عدم واقفیت کا ثبوت فراہم کیا۔ یہاں یہ سب کچھ کہنا باوجوہ ضروری ہوگیا ہے اور جس کو آپ چاہیں تو جملہ معترضہ کی حیثیت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اردو تنقید بہت بڑی حد تک مضمرات ذہنی نیز ان سے رائیدہ جذبات و تعاملات میں اسیر رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں، امرت رائے کے PLUS POINTS یعنی لغایت مثبت نکات۔

۱۔ امرت رائے ان ہندی کے ادیبوں سے اتفاق نہیں کرتے جو اردو کو ہندی کی شیلی (اسلوب) بتاتے آئے ہیں۔ وہ اردو کو علیحدہ زبان و ادب سمجھتے ہیں۔

۲۔ امرت رائے دراں حالانکہ وہ ہندی افسانوی ادب کے ایک بہت تابندہ ستارے ہیں اردو میں بھی موصوف کو قابل رشک مہارت حاصل ہے۔ ان کے معترضین کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ وہ اردو میں خوش خط بھی ہیں اور خوش نویس بھی۔ مجھے بھی اس حقیقت کا انکشاف بعد کو ہوا۔ میں نے ان کی متذکرہ تصنیف پر بے وجہ حشر برپا دیکھ کر ایک مضمون معلم اردو لکھنؤ کو دیا بہ عنوان " گھر جو تقسیم ہوگیا، تلخیص و تجزیہ۔ اس مضمون میں کتاب کے سارے ابواب کی تلخیص ہے۔ اور آخر میں منتجات پر استدلالانہ روشنی ڈالی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مضمون میرے گھر سے کوئی لے گیا۔ بعد میں معلم اردو سے طلب کرنے کے باوجود مجھے وہ دو شمارے جن میں میرا مضمون بالاقساط شائع ہوا تھا نہ مل سکے۔ اسی مضمون کی بحث کو اور آگے بڑھاتے ہوئے میں نے دو تین مضامین سہیل گیا اور شان ہند دہلی کو دیئے۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ امرت رائے سے سعادت مراسلت حاصل کی جائے۔ نصف ملاقات کے اشتیاق نے موصوف کا پتہ حاصل کرنے کی جانب مائل کیا۔ پتہ کتاب کے ناشر اور پروفیسر گیان چند صاحب دونوں سے مل گیا۔ امرت رائے انگریزی میں ایم اے ہیں مگر میں نے ان کو ہندی میں خط لکھا۔ تعجب ہوا کہ جواب بہت خوش خط نیز اسلوبیاتی اردو میں تھا۔ مراسلت کا سلسلہ قائم رہا اور میں نے ان سے جب یہ دریافت کیا کہ آپ اردو میں جواب کیوں دیتے ہیں تو انہوں نے مطلع کیا کہ سہیل عظیم آبادی مجھے ہندی میں لکھتے اور میں اردو میں جواب دیتا اور اب اس کی تجدید آپ سے مراسلت میں کی گئی ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف باوجود ضروری ہوگیا ہے کیوں کہ اردو کے بعضے سرپھرے ادیب یہ سمجھنے لگے تھے کہ تصنیف ہذا میں پروفیسر گیان چند جو کچھ عرصہ تک الہ آباد یونیورسٹی میں بھی شعبۂ اردو سے وابستہ رہنے کا بہت ہاتھ رہا ہوگا اور یوں بھی کئی ایک کو پروفیسر موصوف سے کشش رہی ہے۔

میرے مضمون کے کچھ بعد ہی حیدرآباد کے جریدے 'سب رس' میں پروفیسر گیان چند کا بھی مضمون شائع ہوا جس میں منجملہ دیگر امور یہ بھی کہا گیا کہ امرت رائے کے شاہکار کے برابر کا کام غالباً اردو والے مل کر بھی نہ کر سکیں "دررد مسعود" میں گیان چند سے متعلق ان صاحب کے ارشادات کو اسی زمرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نمبر۳ ۔ امرت رائے نے موجودہ ہندی زبان وادب اور اردو زبان وادب کا بنظایت عمیق مطالعہ پیش کیا ہے ۔ وہ اردو اور ہندی دونوں کو ان ستمکار بانہ حامیان سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اردو میں عربی فارسی لغات وتراکیب کو درآمد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہندی میں بھی سنسکرت کی بے جا دراندازی ان کے نزدیک منفی فعل ہے۔

نمبر۴ ۔ پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی نے امرت رائے کے مدلل موقف پر بار ہا اپنی مسرت سے ان کو مطلع کیا بالخصوص ان نکات پر جو چیٹرجی کے منتجات سے باوجوہ ہم آہنگ نہیں ہوتے ۔ سورگیہ چیٹرجی صاحب نے کئی مقامات پر اپنی رائے پر امرت رائے کی فوقیت کو تسلیم کیا ۔ دراں حالیکہ چیٹرجی کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ امرت رائے کی کاوش کی تکمیل نہ دیکھ سکے مگر انہوں نے ہمیشہ اپنے مشورے دینے میں بخل نہیں کیا ۔ پروفیسر گیان چند ، پروفیسر گوپی چند نارنگ ، رام ولاس شرما ، چندر ولی پانڈے ، لکشمی ساگر وارشنیے ، [illegible] اور دیگر مشاہیر سے بھی رجوع کرتے ہوئے امرت رائے نے موضوع پر تبادلۂ خیالات کیا ۔ مزید براں موضوع کے جادہ و منزل کی تلاش میں اس کے متعلقات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مستشرقین اور ہندی ، بنگالی ، آسامیہ ، اڑیہ گجراتی ، ہریانوی ، پنجابی ، راجستھانی ادیبوں اور ماہرین لسانیات کی معروف کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ۔ اردو اور ہندی دونوں کے معاصر مشاہیر ادبیات کا اتنا خصوصی و عمیق مطالعہ اردو کے مسعود حسین خاں ، گیان چند ، ہندی کے رامبلاس [illegible]

شرما ، راج ولی پانڈے وغیرہ کے شاہکاروں میں بھی نظر نہیں آتا ۔ پاکستان کے محقق [illegible] صاحب کے ارشادات کو دیکھا ضرور ہوگا مگر موصوف کی کسی بات کو قابل التفات نہ گردانا ہوگا ۔ اردو اور ہندی ادبیات کا مطالعہ اتنا عمیق اور اطرافی و تجزیاتی ہے کہ موصوف سے رشک ہونے لگتا ہے ۔

اردو کے ماہرین لسانیات کھڑی بولی کو ہندوی یا قدیم اردو سمجھ بیٹھے ہیں ۔ ہندی یا ہندوی نے اگر تراکیب افعال کو زیادہ تر کھڑی بولی سے لیا ہے تو اس نقطۂ نظر سے کھڑی بولی کی قدر وقیمت میں اضافہ نہیں ہو جاتا ۔ ہندی یا ہندوی کا خمیر دراصل برج بھاشا اودھی جیسی علاقائی بولیوں [illegible] (DIAL [illegible]) سے بھی اٹھا ہے ۔ ہندی اور اردو میں تقسیم سے بیشتر جو زبان ہندی یا ہندوی ابھر کر آئی تھی اس کا عہد بہ عہد ، علاقہ بہ علاقہ ، منزل در منزل مطالعہ کرنے کا سہرا امرت رائے کے سر ہی بندھتا ہے ۔ ۱۱ویں صدی کے گورکھ ناتھ اور دوسرے ناتھ پنتھی ، سادھو سنت سے ۱۳ویں / ۱۴ویں صدی کے امیر خسرو ، مہاراشٹر کے سنت شعراء ، کبیر ، نرگن شعرا ، پنجاب کے نانک ، گجرات کے دادو (احمد آباد) اور دوسرے شعرا کا کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ گجراتی ، مہاراشٹری ، مارواڑی ، سندھی وغیرہ میں بنظایت مماثلت پائی جاتی ہے ۔ یہ حقیقت ہے ۱۸ویں صدی کے اواخر تک یہ تمام تر بولیاں سب یا ہندوی کہلانے لگی تھیں ۔ دکنی کا شمار بھی ہندی یا ہندوی میں ہوتا تھا ۔ تمام دلیو اور گیا لیشر [illegible] (ایک صنف سخن) علاء الدین کی دکن میں لشکر کشی سے

[illegible]

جب سے ہندی/ہندوی سے سنسکرت کے الفاظ کو زبان بدر کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور جو انشاء اللہ خاں کی فارسی تصنیف "دریائے لطافت" جو ۱۸۰۸ء میں طبع ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں آکر فارسی، عربی لغات سے لدی ہوئی زبان کو اردو معلیٰ کہا جانے لگا۔ ملحوظ رہے، غالب کے زمانے تک" اردو معلیٰ یا "ریختہ" ہی زبان کے تعلق سے استعمال ہوتے تھے اور اس زبان میں شعر کہنا باعث تفاخر و تفوق نہیں سمجھا جاتا تھا ؎

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

غالب کے زمانے میں" اردو" زبان کے لئے مستعمل تو ہونے لگا تھا مگر پوری طرح مروج نہیں ہوا تھا۔ اورنگ کی وفات کے بعد برہان الملک اودھ چلے گئے اور نظام الملک حیدر آباد دکن۔ اودھ کے نوابین اور حیدر آباد کے نظام کا تعلق دہلی کے شہنشاہ سے برائے نام ہی باقی رہا۔ اودھ والے اپنی زبان کو اردوئے معلیٰ نہ کہہ کر اردوئے مجلیٰ کہنے لگے۔ ایک بات جو امرت رائے بھی نظر انداز کر گئے ہیں بلکہ ابھی تک اردو لسانیات نے بھی صرف نظر کی ہے۔ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بے شمار مسلم صوفیا کرام نے ہندوی/ہندی کو گلے لگایا۔ اور عوام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ امیر خسرو کے سہرا باندھنا صرف غلطی کا مرتکب ہونا ہے۔ ۱۱ ویں صدی کے آغاز سے یا اواسط سے اپ بھرنش (APABHRANSA) نے کروٹیں بدلنا شروع کر دیا تھا۔ اپ بھرنش بنیادی کسی کو کہتے ہیں اس پر اردو والوں نے بالعموم قطعاً توجہ مبذول نہیں فرمائی ہے۔ وکرم تقویم کے لحاظ سے دور حاضرہ ۲۱ ویں صدی کا اواسط قرار پاتا ہے۔ وکرم تقویم کی گیارہویں صدی پر سنسکرت پر مقامی اثرات مرتب ہونے لگے اور ان مرتبہ اثرات میں وہ اثرات بھی شامل ہونے لگے جو پالی زبان کے وجود میں آنے سے عوام تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ دوسرے الفاظ میں سنسکرت اور پالی دونوں کے ملے جلے روپ کو اپ بھرنش کہا جا سکتا ہے۔ ملحوظ رہے، متعدد سنسکرت شاہکار اسی دوران معرض وجود میں آئے۔ کوئی ادب معدوم نہیں ہوتا۔ بعض سنسکرت زبان کو مردہ زبان سمجھ بیٹھے ہیں جو یکسر غلط ہے۔ جو یکسر غلط ہے جرمنی سے ہر پیر کو سنسکرت میں خاص دلچسپ پروگرام نشر ہوتا ہے مزید براں، سنسکرت کی روح پالی، اپ بھرنش اور ان کے دامن میں پلی بڑھی موجودہ زبانوں میں تابناکی و توانائی کا مظہر بنی ہوتی ہے۔ بنگالی، گجراتی، اڑیہ، ہندی، راجستھانی، مہاراشٹری، ملکہ تامل، تیلگو، ملیالم وغیرہ موجودہ زبانوں کی لفظیات سنسکرت کی مرہون منت نظر آتی ہیں۔ مولانا کی جانب رجوع کیا جائے۔ اگر ہندی والوں نے صوفیائے کرام کا ہندی کلام کلیجے سے نہ لگایا ہوتا تو درج ذیل بڑے شاعر حرف غلط کی طرح مٹ جاتے۔ امرت رائے نے چند کا ذکر کیا ہے اور ان کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

فرید گنج شکر (۱۱۷۳ - ۱۲۶۶ء)
شیخ شرف الدین بو علی قلندر (وصال ۱۳۲۳ء)
حمید الدین ناگوری (۱۱۸۳ - ۱۲۷۴ء)
امیر خسرو (۱۲۳۶ - ۱۳۲۴ء)

یہ کہنا غلط ہے کہ امیر خسرو پہلے شخص تھے جو
ہندوی کی جانب رجوع ہوئے۔ خسرو نے جو زبان
استعمال کی وہ قریب ۲۰۰ سال سے پروان چڑھ رہی
تھی اور اس میں زمانے کے مروجہ عربی و فارسی لغات
بھی شامل ہو رہے تھے۔ خسرو کی زبان ہندی/ہندوی
کی ایک مخصوص منزل کا پتہ دیتی ہے۔

مولانا داؤد نے اپنی معروف تصنیف "چنداین"
۱۳۷۳-۱۳۷۵ء کے مابین سپرد قلم کی۔ یہ کتاب پرمیشوری
لال گپتا کی مساعی جمیلہ سے تدوین ہوئی اور دستیاب ہے۔
عبدالقادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں "چنداین"
کا ذکر کیا ہے نیز اس کے اوصاف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ
ہندوی میں پہلی مثنوی تھی۔ جس کے تتبع میں دوسری
ہندوی مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ مثلاً قطبن کی "مرگاوتی"
(۱۵۰۱ء)

جائسی کی "پدماوت" (۱۵۴۰ء)
منجھن کی مدھومالتی (۱۵۴۵ء)
عالم کی "مادھوانل کام کندلا" (۱۵۸۳ء)
عثمان کی چتراولی (۱۶۱۳ء)
شیخ نبی کی "گیان دیپ" (۱۶۱۹ء)

دکنی زبان کو ۱۸ویں صدی کے اواخر تک دکنی یا ہندی
ہی کہا جاتا تھا، جس پر امرت رائے نے وضاحت و تشریح
سے روشنی ڈالی ہے اور ان کا دکنی زبان کا مطالعہ
کتاب کے ۱۷۲ سے لے کر ۲۲۵ یعنی کل ۵۳ صفحات کو
محیط ہے۔ امرت رائے پہلے ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے
تاریخی شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ
دکنی علاقوں میں ہندی کی ترویج شمال کے تاجر پیشہ
لوگوں نے وہاں جاکر کی۔ بعد ازاں علاء الدین خلجی
کے دوران حکومت اس کے معروف سپہ سالار ملک
کافور نے ۱۲۹۷ء میں گجرات، ۱۳۰۴ء میں مہاراشٹر،
۱۳۰۷ء میں آندھرا اور ۱۳۰۸ء میں کرناٹک کو فتح
کیا۔ ۱۳۰۷ء میں محمد تغلق نے دیوگری جس کا نام بدل
کر دولت آباد کر دیا کو دارالسلطنت بنایا۔ یہی نہیں
اس نے دلی کی آبادی کو بھی ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔
لہٰذا ہندی تین مرحلوں سے گذرتی ہوئی دکنی علاقوں
میں پہنچی اور وہاں ۱۷ویں صدی کے اواخر تک زبان کو
دکنی، ہندی، ہندوی، دہلوی یا گوجری ہی کہا جاتا رہا۔
لفظ "اردو" ۱۸ویں صدی کے اواخر یا ۱۹ویں کے
اوائل میں مصحفی کے ایک شعر میں پہلے پہل استعمال ہوا۔
امرت رائے نے بے شمار حوالے پیش کئے ہیں۔ دکن کے
صوفیائے کرام میں معراجی شمس العشاق (۱۴۹۶-۱۵۲۶ء)
برہان الدین جانم (۱۵۴۳-۹۸ء) شاہ امین
(۱۵۹۸-۱۶۷۵ء) بطور خاص مطالعہ شامل ہے۔
اور ان کے کلام کے حوالے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ
ان کی لفظیات میں مہاراشٹری، سنسکرت، ہندی
لغات نیز ویدانت اور یوگ کی اصطلاحات شیر و شکر
ہوتی نظر آتی ہیں۔ شیخ بہاء الدین باجن (۱۵۰۶-
۱۳۸۸ء) شاہ علی محمد جیو گام دھنی (وصال۔ ۱۵۶۵ء)
قاضی محمود دریائی (۱۴۶۵-۱۵۳۶ء) شیخ بہاء الدین،
سید شاہ حاتم وغیرہ کے کلام سے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔
اور ان سب کی زبان دوسرے صوفیائے کرام کی زبان
سے واضح مماثلت رکھتی ہے۔ تکارام (۱۶۰۸-
۱۶۴۹ء) شیواجی کے گرو اور بادی گرو رام داس
(پیدائش ۱۶۰۸ء) کی زبان بھی ہندوی تھی۔ [illegible]
عربی، سنسکرت، مروجہ الفاظ و اصطلاحات زبان

ہندوی میں پے در پے استعمال ہوتے رہے۔ شاہ
تراب (۱۶۰۷ء) نے اپنی تخلیق "من سمجھاون" میں
ایک جگہ لکھا ہے

صفت کر ا دل اس کی جو رام ہے گا
اسی رام سوں ہم کو آرام ہے گا
سدا رام کے نام سوں کام ہے گا
ہمن دھیان اس کا صبح شام ہے گا

محمود حسن خاں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مذہبی فکر میں رام
اور رحیم کو ایک سطح پر رکھنا بہت بڑی جسارت تھی۔ شاہ
تراب کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور مثالیں
ملاحظہ ہوں۔

وہی اللہ وہی سوز ہری نام
ہے اک محبوب ہیں جس کے اتے نام
(گلزار وحدت، من سمجھاون)

اے پیو چیت کا لب تارا ہے
آب آتش خاک ہور بارا ہے
چیت، من، بدھ اہنکارا ہے
سب روپ کو سدھارا ہے
پیو سب میں سب سوں نیارا ہے
جیوں روشن جگ مگ تارا ہے
(گیان سروپ۔ من سمجھاون)

مسلم صوفیائے کرام اور ہندو سنتوں کے کلام
میں سنسکرت کے الفاظ بھی ہیں اور ساتھ ہی فارسی
یا بہ توسط فارسی آمدہ عربی لغات بھی ملتے ہیں —
نانک پنتھی، کبیر پنتھی اور صوفیوں کی زبان کو بخوبی
ہندی یا ہندوی کہی جا سکتی ہے۔
سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات
(۱۶۱۲-۱۵۸۰ء) وجہی کا شاہکار "سب رس"
(۱۶۳۵ء)، جگت گرو سلطان ابراہیم عادل شاہ
دوم کی تخلیق "نورس"، نصرتی (وفات ۱۶۷۴ء)
کی شاعری "گلشن عشق" (۱۶۵۸ء) اور ولی دکنی
(وفات ۱۷۰۷ء) ضیاء الدین خسرو کی تصنیف "خالق
باری" (جس کو غلط فہمی سے امیر خسرو کی تصنیف بتایا
جاتا تھا) وغیرہ میں ہندی، یا ہندوی زبان کارفرما
رہی ہے۔

امرت رائے نے لاتعداد عربی، فارسی، سنسکرت
لغات کی نشاندہی کی ہے۔ یہ تھی ہندی یا ہندوی جو
ہندو مسلم اشتراک و تعاون سے پیدا ہوئی، یہ وہ
زمانہ تھا جب "داخل خارج" کا عمل شروع نہیں
ہوا تھا۔ ملحوظ رہے، "داخل خارج" کا عمل ہی ثقافتی
تقسیم کی جانب ملک و قوم کو دھکیلنے میں کامیاب ہوا۔
آگے بڑھنے کے پیشتر غالباً یہ بتانا بے محل نہ ہوگا
کہ اگر موجودہ ہندی ادبیات میں متذکرہ شاہکاروں
کو جگہ نہ دی گئی ہوتی تو مرور ایام نے ان گنج ہائے گراں
مایہ کو گمنامی کے ظلمات میں ڈبو دیا ہوتا۔ ملحوظ رہے
ایم اے ہندی کے نصابات میں بالعموم صوفی کاویہ
(شعر و سخن) کا علاحدہ پرچہ شامل رہتا ہے۔ راقم
الحروف کی استدعا ہے کہ مجال چند تیواری کی تصنیف
"صوفی کاویہ دھارا کا دارشنک وایوچن"
(सूफी काव्य धारा का दार्शनिक विवेचन) سے قارئین کرام رجوع کریں۔ اس کتاب
میں فلسفہ تصوف نیز صوفی سلسلوں کا بہترین جائزہ
لیا گیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ اردو میں نہیں کیا جانا چاہیے
مگر حضرات ذہنی کے آسیب نے اردو کو اپنے سرمایہ و

الشاؤ، سرسید، حالی وغیرہ جن کے خیالات
سیاق وسباق سے پیش کئے گئے ہیں وہ خاصے اہم
تو ہیں مگر ان میں سے کسی ایک کو نقیب سمجھ لینا یا سب
کو بالکل ایک قیادت کے تحت دیکھنا غلط اقدامی کی
دلیل ہوگی۔ کوئی شخص اپنے موروثی خیالات وجذبات
سے زیادہ اوپر نہیں اٹھ سکتا، کچھ حد تک انحراف
تو ناگزیر ہے مگر ان کے خلاف جہاد شروع کر دینا
غالباً ناممکنات میں شامل سمجھا جائے گا۔ ابھی تک
تاریخی پس منظر، ثقافتی ومعاشرتی طرز زندگی، اسلوب
بود وباش وغیرہ کو نظر انداز ہی کیا گیا ہے، مغلیہ
عہد کے دوران جاگیردارانہ، منصب دارانہ نظام
ہمارے خیالات وتصورات کے عرش وفرش ہو گئے تھے۔
۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد بہادر
شاہ (۱۷۰۷-۱۷۱۲ء)، جہاندار شاہ (۱۷۱۲-۱۷۱۳ء)
فرخ سیر (۱۷۱۳-۱۷۱۹ء) محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء)
احمد شاہ (۱۷۴۸-۱۷۵۴ء) عالمگیر دوئم کو ۱۷۵۹ء
میں اس کے وزیر ہی نے قتل کر دیا، اور اورنگ زیب
کے چھوٹے لڑکے کے بیٹے کام بخش کو شاہجہاں سوئم کو
تخت نشین کرایا ۱۷۵۹ء میں سداشیو بھاؤ مراٹھا
سردار نے اپنی عسکری قوت سے علی گوہر کو ۱۷۵۹ء
میں مسند شہنشاہیت پر بٹھایا۔ علی گوہر کی تخت
نشینی شاہ عالم دوئم کے نام سے ہوئی۔ یعنی یکے بعد
دیگرے ۵۲ سال کے دوران ہی مغلیہ شہنشاہیت کا شیرازہ
بکھر کر رہ گیا۔ علی گوہر شاہ عالم کے بعد [illegible] شاہ دوئم
(۱۸۰۶-۱۸۳۷ء) نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ
[illegible] ۱۸۳۷ء میں آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ [illegible]
[illegible] ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت میں ملوث

پائے جانے پر ملک بدر کر دیئے گئے ان کا انتقال دوران
اسیری رنگون میں ہوا جہاں ان کا مزار نگاہ دروں
بیں کو مغلیہ سلطنت کی تاریخ جو سیاسی زبان میں
۱۵۲۶ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک یعنی ۳۳۲ سال
کو محیط مغلیہ تاریخ کا ترجمان ہنوز موجود ہے جو گوش
شنو کے لئے داستان ہائے عبرت کی صدا بازگشت سے
بھی معمور ہے۔ نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۸-۳۹ء)،
احمد شاہ ابدالی کی یلغاریں (۱۷۴۷-۵۷ء)، پانی پت
کے میدان پر مرہٹوں نے اپنی شکست فاش کے باوجود
اپنی سیاست وعسکریت سے دوبارہ عظمتیں حاصل
کرنا وغیرہ داستانیں بھی نغمہ زیریں بنی ہوئی ایسی
صدائے بازگشت میں سنی جا سکتی ہیں۔ چونکہ پیش
نظر مضمون اردو زبان وادب سے متعلق ہے لہٰذا
تاریخ کے گھوکروں کو ہٹاتے ہوئے موضوع کی جانب
پیش قدمی ہی درکار ہے۔

زبان کے اعتبار سے مغلیہ عہد حکومت بالخصوص
مرتکز توجہ رہے گا کیونکہ اسی دور میں فارسی زبان
ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری زبان کی حیثیت سے
سکہ رائج ہو گئی۔ مرہٹہ ریاستیں، راجپوتانہ کے
راجا مہاراجا، پنجاب کے سکھ سردار، بندیل کھنڈ
کے حکمراں، بھرت پور وغیرہ کے جاٹ بھی زبان
فارسی کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کیا
کرتے تھے۔ یہ صورت حال ایسٹ انڈیا کمپنی سے
روابط میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر ۱۸ ویں صدی
کے شروع ہونے کے کچھ پہلے ہی فارسی زبان کے
استعمال کو ناگزیریت حاصل نہیں رہی مگر شرفا
اس زبان سے واقفیت کو حرز جاں بنائے رہے۔

جیسا پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مغلیہ دور نے جاگیرداری (مرہٹے وطن داری کہا کرتے تھے)، زمینداری نظام قائم کیا تھا۔ جب سلطنت کا انہدام شروع ہوا تو دکن کے نظام الملک، اودھ کے نواب وزیر، بنگال (بشمول موجودہ بہار و اڑیسہ) کے نواب سبھی آزاد ہو گئے تھے اور آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں ہوتے چلے گئے۔

سیاسی سطح پر مغلیہ سلطنت بہار، کرناٹک، اودھ، روہیلکھنڈ وغیرہ کے ناظم الامور جو آزاد ریاستیں ریاستوں کے والیان ہو چکے تھے۔ سب کے سب اپنی آزادی کو سلب کئے جانے کے تماشائی بنے رہے اور بس مگر معاشرتی سطح پر احساس برتری جو دراصل احساس سے کمتری سے زائیدہ تھا پوری آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہونے لگا۔ چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں، چھوٹے بڑے زمینداروں وغیرہ مغلیہ دور کی یادوں کو کلیجے سے لگائے رہے اور علماء، شعراء، گلوکار، نیز دوسرے فنکاروں کی حتی المقدور سرپرستی میں مشغول رہے ہر جگہ صاحب خانہ ایک مغل شہنشاہ کا کردار ادا کرتا معلوم ہوتا تھا، ہر زمیندار واجد علی شاہ اور جاگیردار وغیرہ روہیلہ نواب کے روپ میں پیش ہونا پسند کرتا تھا۔ ۱۳ ویں صدی سے لے کر ۱۸ ویں صدی کے اواسط تک روسا، امرا، سلاطین وغیرہ کا فارسی و عربی وغیرہ سے روابط مفقود ہو گئے تھے، صرف فارسی عربی کے لفظیات بطور (TRAUMA-TIZED MEMORY) کرب آگیں نفسیاتی حافظہ میں محفوظ رہ گئے اور ان ہی سے الفاظ لے کر ہندی / ہندوی کے ساتھ استعمال کرنا موجب تفاخر و تفوق ہو گیا۔ اور اس طرح ہندی / ہندوی کے ساتھ ان کے رشتے کمزور پڑتے گئے۔ ایک نئی زبان کی داغ بیل اسی طرح با وجود پڑنے لگی۔ یہ نئی زبان بعد کو غالب کے زمانے میں اردو معلی / اردو کے نام سے پکاری جانے لگی۔ آج کل یہی ہے زبان و ادبیات اردو ——

جناب امرت رائے نے انشا، حالی، سر سید، مولوی عبدالحق وغیرہ ہی کو لسانیاتی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا ہے جب کہ حقیقت، نفسیاتی و سماجیاتی سطح پر یہی ثابت کرتی ہے کہ تمام تر سربراہان سماجیاتی و نفسیاتی حقائق کے ترجمان محض ہی تھے۔ کاش، امرت رائے صاحب ان پیش کردہ مرتکزات پر بھی غور فرمائیں اور اپنی رائے مستقیم سے مستفید و مستفیض فرمانے کی زحمت گوارا کریں۔

یہی نہیں ایک قابل لحاظ نکتہ اور ہے جو نظرانداز ہوتا رہا ہے۔ حقیقت شاہد ہے کہ اردو میں بھی جاگیردارانہ نفسیات نے افتراق پسندی اختیار کی تھی جو آج کل کے ذرائع ابلاغ نے ختم کر دی ہے۔ اگر دہلی میں اردو کو اردوئے معلیٰ کہا گیا، اودھ میں اردوئے مجلی، روہیلکھنڈ میں اردوئے معلیٰ اور عظیم آباد میں اردوئے معظمہ وغیرہ نام رکھے گئے۔ جب حالی، آزاد اور دیگر علما کرنل ہالر ائیڈ کی سرپرستی میں لاہور پہنچ گئے تو وہاں پر موجودہ اردو کی داغ بیل پڑنا شروع ہوئی۔ جاگیردارانہ ماحول سے وابستہ غیر مسلم بالخصوص ہندو بھی ان سے شریک و سیر رہے اور خاص خدمت انجام دی۔

امید ہے کہ امرت رائے کے شاہکار - A HOUSE-DIVIDED - پر اس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر اہل نظر و فکر غور فرمائیں گے راقم الحروف اس موضوع پر

اعجاز حسن ندیم
بریاتو، ضلع رانچی

اردو کے ادبی لطائف —
منظر اور پس منظر

محبت

جہانگیر اور نورجہاں محل سرا کے پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے فرصت کے لمحات کو سیر و تفریح میں گذار رہے تھے۔ رنگین شام، پرفضا باغ اور حیات پرور ماحول کی مناسبت سے اس وقت موضوع سخن بھی محبت ہی تھا۔ دوران گفتگو میں کسی بات پر جہانگیر نے فی البدیہہ شعر کہا ؎

بلبل نیم کہ نعرہ کنم دردِ سر دہم
پرواز ام کہ سوزم و دم بر نیا ورم

(بلبل نہیں کہ نالاں کروں دردِ سر بنوں —— پروانہ ہوں کہ جل مروں لیکن نہ اُف کروں)

محبت اور وفاداری کے اس مقابلے میں نورجہاں کب شکست ماننے والی تھی: وہ برجستہ کہہ اٹھی۔

پروانہ من نیم کہ بیک شعلہ جاں دہم
شمع تمام سوزم و دم بر نیا ورم

(پروانہ میں نہیں ہوں کہ شعلے پہ جان دوں —— سرتاپا شمع ہوں کہ جلوں پہ بھی چپ رہوں)

اور اس طرح عشق کے مقابلے میں حسن کی وفا کوشی اور سرفروشی کا اس نے اظہار کر دیا۔

گلاب اور کانٹے

انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن (جو اندھا تھا) کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی جو بہت خوبصورت تھی مگر وہ جھگڑالو طبیعت کی بھی تھی۔ ایک دن ملٹن کے ایک دوست نے اس کی بیوی کی تعریف میں اس سے کہا

"ملٹن! تم جانتے ہو، تمہاری بیوی کتنی خوبصورت ہے؟"

"نہیں" ملٹن نے جواب دیا

"بالکل گلاب کی طرح" اس کے دوست

"سچ کہتے ہوئے" ملٹن نے کہا۔ "گلاب کی خوبصورتی تو میں دیکھ نہیں سکتا مگر ذات دن چبھنے والے کانٹوں کو ضرور محسوس کرتا ہوں۔

شوخیٔ طفلانہ

حضرت داغ دہلوی اپنے ایک عزیز شاگرد کے یہاں تھے۔ شام کو شاگرد اور استاد دونوں کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور سامنے چھ سات برس کا شاگرد زادہ کھیل رہا تھا۔ کھیل کے دوران اسے شرارت سوجھی تو بلبل کا پنجرہ کھول کر پیر میں زنجیر پہنادی۔ باپ نے بیٹے کی اس شوخ حرکت پر استاد محترم کو متوجہ کر کے کہا۔

پیر کے بدلے پاؤں باندھا بلبل ناشاد کا

تو حضرت داغ نے برجستہ شاگرد کے مصرع پر گرہ لگائی

کھیل کے دن میں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

ملامت

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا غالبؔ کے نہایت گہرے دوست تھے انہیں آم بالکل نہیں بھاتے۔ ایک گدھا والا اپنے گدھے لئے مرزا کی گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے تو حکیم صاحب نے مرزا سے کہا۔

"مرزا! آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا"

"بیشک گدھا آم نہیں کھاتا" مرزا نے برجستہ جواب دیا۔

قحط

انگریزی کے مشہور مزاح نگار جی۔ کے چسٹرٹن کی ملاقات برنارڈ شا سے ہوئی۔ برنارڈ شا جو ضرورت سے زیادہ دبلا پتلا تھا اور چسٹرٹن اس سے کہیں زیادہ موٹا اور اس کا پیٹ بھی ابھرا تھا۔ شا کو دیکھتے ہی کہا۔

اگر کوئی غیر ملکی تمہیں دیکھ لے تو سمجھے گا کہ انگلینڈ میں قحط پڑ گیا ہے؟

"اور تمہیں دیکھ کر قحط کی وجہ بھی سمجھ جائے گا۔" شا نے برجستہ جواب دیا۔

فکر و جستجو

ایک دن جرأت (جو بینائی سے محروم تھے) سر جھکائے کسی فکر میں محو تھے کہ انشا ان سے ملاقات کو پہنچے تو کہا۔

"کس فکر میں ڈوبے ہو؟"

"ایک مصرع خیال میں آیا ہے، دوسرا ڈھونڈ رہا ہوں۔

انشا نے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

جرأت نے کہا "خوب مصرع ہے مگر جب تک پورا نہ کرلوں، نہ سناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرع لگا کر چھین لوگے۔"

انشا کے بے حد اصرار پر جرأت نے آخر پڑھ دیا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

انشا نے فوراً دوسرا مصرع جوڑ کر کہا۔

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

حق آزادی

سردی کی ایک خوشگوار شام کو ایک انگریز

ہیٹ اور کوٹ میں ملبوس بائیں ہاتھ جیب میں ڈالے اور
داہنے ہاتھ میں چھڑی تھامے کبھی آگے اور کبھی پیچھے نچاتا
جارہا تھا اس کے پیچھے ایک دوسرا انگریز تھا۔ چھڑی
کی نوک اچانک اس شخص کی ناک پر آ لگی تو غصہ بھری
نظروں سے دیکھا تو پہلے والے انگریز نے "سوری"
کے بجائے یہ کہا۔

"تمہارے خفا ہونے کی وجہ ؟"

"تمہیں معلوم ہونی چاہیئے کہ انگلینڈ کی حکومت
نے ہر آدمی کو حق آزادی دے رکھی ہے ؟"

دوسرے نے جواب میں کہا۔ "تمہاری چھڑی کی
نوک تمہاری حق آزادی کی آخری حد ہے۔ میری ناک
سے میری حق آزادی کا حد شروع ہوتی ہے — میری
حق آزادی میں دخل اندازی کا حق تمہیں کیوں کر حاصل
ہوگیا —"

قوم کا غم

جس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس نے نمک
بنانے کی تحریک شروع کی تو گاندھی جی نے مولانا محمد علی
جوہر (جو ذیابیطس کے عارضہ میں مبتلا تھے) کو بھی اس
تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو مولانا نے گاندھی
جی سے فرمایا:

"میں کیا نمک بناؤں گا، قوم کے غم میں دس سال
سے شکر بنا رہا ہوں"

لاحول

ایک شام داغ دہلوی مغرب کی نماز میں مشغول
تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے مگر نماز پڑھتے
دیکھ کر واپس لوٹنے لگے اسی اثنا میں داغ بھی نماز
سے فارغ ہو چکے اور انہیں جاتا دیکھ کر آواز دیا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

"ان صاحب نے کہا۔ "آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر
واپس جارہا تھا"

"میں نماز ہی تو پڑھ رہا تھا، لاحول نہیں" داغ
نے مسکرا کر کہا۔

صحیح داد

مولانا حالی ایک مرتبہ سہارنپور گئے اور ایک
زمیندار کے یہاں مہمان ہوئے۔ گرمی کے دن تھے اس
لئے رئیس زمیندار نے ایک ملازم کو بلا کر کہا

"دیکھو! جو حضرت لیٹے ہوئے ہیں انہیں پنکھا
جھل دو"

ملازم نے پوچھا۔ "کیا یہ نئے نئے آئے ہیں؟"

"ہاں! یہ بہت بڑے شاعر مولانا حالی ہیں" مالک
زمیندار نے جواب میں کہا۔

اس پر ملازم حیرت زدہ ہو کر بولا "کیا ہل چلانے
والے (ہالی) بھی مولوی ہوتے ہیں۔"

ملازم کی بات سن کر مولانا اٹھ بیٹھے اور کہا "مجھے
اپنے تخلص کی صحیح داد آج ملی —"

قید خانہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا غالب اکثر
میں بیٹھا کرتے وہ کمرہ مکان کے دروازے کی چھت

بہ نہایت تنگ وتاریک تھا اور اس کا در بھی اس قدر
چھوٹا کہ جھک کر داخل ہونا پڑتا۔ ایک دن رمضان
کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر
و مرزا سے ملنے آئے تو دیکھا کہ مرزا اس کوٹھری میں بیٹھے
کسی دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے ہیں۔ رمضان کے
مہینے میں مرزا کو چوسر کھیلتے دیکھ کر مولانا نے کہا:

"ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے
میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت
میں تردد پیدا ہو گیا؟"

اس پر مرزا نے برجستہ جواب دیا۔

"قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم
ہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، یہی کوٹھری
تو ہے۔"

اردو کے ادبی ذخیروں میں ادیب و شعراء اور
قومی وسیاسی مصلحین کی زندگی کے حالات، واقعات
اور معمولات کے ایسے بے شمار تذکرے درج ہیں جن میں
سے محض چند بطور نمونہ اوپر پیش کئے گئے ہیں جو نہ تو کوئی
بندھے ٹکے اصول پر مبنی ہیں اور نہ بہ اعتبار مزاج و
موضوع ان میں یکسانیت ہی پائی جاتی ہے۔ البتہ الفاظ
کے برمحل استعمال اختصار کلمات اور برجستگی و حاضر
جوابی جو موقع ومحل کی مناسبت سے ان میں استعمال
ہوئے ہیں، لطف اندوزی کا سماں پیدا کرتے ہیں
اور انہیں پڑھ کر ہمارے افسردہ اور پژمردہ دلوں
میں سرشاری کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے
ہونٹوں پر یا تو مسکراہٹ پھیل جاتی ہے یا زور کی
ہنسی آجاتی ہے اور چہرہ کھل اٹھتا ہے یا پھر آدمی
بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ ان لطیفوں کے مطالعہ سے ہمارے
اندر کے تناؤ میں جو کمی آتی ہے اس کے عوض ہمیں
آسودگی، فرحت، شادابی اور شادمانی کے ایسے انبساط
افروز لمحے فراہم ہوتے ہیں جس کا اظہار مسکراہٹ، ہنسی
یا قہقہے کی صورت میں ہوتا ہے اور خوشی کے ان لمحوں میں
ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے رنج والم کو بھول جاتے ہیں۔
لطیفے کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ عبدالغفور
رقم طراز ہیں:۔

"لطیفے کی مثال ایسی ہے جیسے ستار کے تاروں
میں سُر بھرے ہوتے ہیں۔ سلیقہ سے تار کو چھیڑا کہ اس
سے مدھ بھرے سُر نکلنے شروع ہوتے ہیں۔ لطیفے میں بھی
مزاح، لطافت اور شگفتگی بھری ہوتی ہے۔ اس کو
صحیح انداز سے کوئی چھیڑ دے اور پیش کش مناسب موزوں
ہو تو بس بجلیاں کوندتی ہوئی نکلیں گی۔ اور ہنسی کے
شرارے پھوٹ پڑیں گے۔"

(پیش لفظ۔ قہقہہ زار، از خواجہ عبدالغفور)

چنانچہ انہی خصوصیات کے پیش نظر لطف ولطافت کی
وہ باتیں جن کا تعلق ادیب وشاعر کی حیات ومعمولات
سے ہو۔ ادبی لطیفے کہے جا سکتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ روزمرہ زندگی کے معمولات
میں وہ انسانی خواہشات جو سماج اور ماحول میں ہم
آہنگی کے فقدان کے سبب دبی ہوئی ہوتی ہے۔ لطیفہ
اس کا ایک مختصر خاکہ ہے۔ جس کے ذریعہ نہ صرف
اس کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ وہ مسرت وانبساط
کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ جس کے عوض آدمی خود کو مسکرانے
یا ہنسنے پر مجبور پاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہنسنا اور ہنسانا
ایک فن ہے۔ چنانچہ ان دنوں اردو کے اخباروں،

رسالوں، جریدوں اور ڈائجسٹوں میں فن لطیفہ کی
اشاعت کا اہم مقصد انہیں رونق و رنگین اور تبسم
آمیزی سے قارئین کے لئے دلچسپی پیدا کرنا ہے لیکن
ان میں ادبی لطیفوں کی بہ نسبت غیر ادبی لطیفے کی
تعداد زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور
ٹی۔وی کے مختلف قسم کے پروگراموں میں بھی دلچسپی اور
لطف اندوزی کے پیش نظر فن لطیفہ کو خاصی اہمیت
دی جا رہی ہے تاکہ ہر عمر اور ہر ذہن کے لوگ یکساں
طور پر فرحت و انبساط سے محظوظ ہو سکیں۔

کائنات کے تمام مخلوقات میں انسان ہی وہ
واحد مخلوق ہے جسے ہنسنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ موقعوں
موقعوں پر ہنستا ہے۔ کبھی اپنے آپ پر ہنستا ہے اور کبھی
دوسروں پر۔ چنانچہ ہنسنے ہنسانے کا طریقہ وہ ادب میں
بھی ڈھونڈ نکالا اور بیسویں کے آغاز میں سر سید کے
طفیل اور غالب کے فیض سے اردو ادب میں طنز و
مزاح ایک صنف کی حیثیت سے شامل ہو گئی جس
کے ذریعہ زندگی، سماج اور سیاست کے حالات و
واقعات کی وہ صورتیں جو مضحکہ خیز ہوں بیان کی جانے
لگیں۔ مثال کے طور پر ملک کے ناقص نظام تعلیم کا
نوجوانوں پر پڑنے والے اثرات پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میٹرک میں جو لڑکے فیل ہوتے ہیں ان کی دو اقسام
ہیں۔ ایک سرکاری فیلئے اور دوسرے غیر سرکاری فیلئے یعنی
لڑکا جاہے جہاں تعلیم پائے اسے فیل ہونے کی گارنٹی
دی جاتی ہے۔ سرکاری اس لئے کہ سرکار بلڈنگیں زیادہ
بناتی ہے، تعلیم کم دیتی ہے اور غیر سرکاری اس لئے کہ وہ
بلڈنگوں کے کرایے زیادہ دیتے ہیں اور تعلیم کم دیتے ہیں۔
یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سے سیکٹر میں۔ میرا خیال ہے
کہ دونوں میں فیل کرانے کی ریس جاری ہے۔ کبھی پبلک
گھوڑا فیل کرانے میں جیت جاتا ہے اور کبھی پرائیویٹ
گھوڑا ___ اور استاد گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔
(پیاز کے چھلکے۔ فکر تونسوی)

یا پھر ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی پر ہنگامہ خیزی اور بڑھتی
ہوئی مہنگائی کی شورا شوری پر فکر تونسوی کا یہ اقتباس۔
کچھ عقلمند لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ کرنسی کا پھیلاؤ
بڑھ رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ بچوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا
ہے یا شاید یوں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھا
دیکھی بڑھ رہے ہیں یا بچے اور کرنسی دونوں ایک دوسرے
کو نیچا دکھانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ادھر گورنمنٹ
اپنی ٹکسال میں سے ایک نوٹ چھاپ کر بھیجتی ہے
اُدھر والدین ایک بچہ مارکیٹ میں ارسال کر دیتے ہیں۔
گورنمنٹ کو اس بات پر بڑا غصہ ہے کہ یہ بچہ سالا کھائے
گا کہاں سے ؟ ___ چنانچہ وہ غصہ میں آکر ایک
نوٹ اور چھاپ دیتی ہے۔ جب یہ دوسرا نوٹ چھپنے کی
خبر پہنچتی ہے تو ایک اور بچہ جھانک کر کہتا ہے۔
"آداب عرض ___ آداب عرض"

چنانچہ اس طرح کے مضحکہ خیز اقتباسات کے مطالعہ کے
دوران قاری یا تو مسکرا مسکرا کر کچھ سوچتا ہے یا پھر
سوچ سوچ کر مسکرانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سوچ، یہ
مسکراہٹ۔ معاشرے کے معائب و مکروہات یا سماج
اور زندگی کے غیر متوازن اور ناہموار صورت حال
پر ہوگی۔ مگر اس کے پس پردہ تعمیر و اصلاح کے جذبے کی
کارفرمائی بھی ہوا کرتی ہے۔

فطری طور پر انسان کچھ عجلت پسند بھی واقع ہوا
ہے۔ وہ جلد بازی میں عمل اور انجام دونوں کو بیک وقت

دیکھنے کا متمنی رہا ہے لہٰذا کارٹون گرافی کی اختراع اس کی اسی خواہش اور کاوش کا نتیجہ ہے جسے دیکھتے ہی آدمی مسکرانے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سوچ و مسکراہٹ کے در پردہ بھی سماج و سیاست کے کڈھب اور ناہموار پہلوؤں کی گرہ کشائی ہوئی ہے۔ جس کا مظاہر آئے دن اخبار و رسائل میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔

فن لطیفہ کی ابتدا کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی؟

اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ غالب گمان یہ ہے کہ انسان جب اپنی باتوں کو دوسروں تک پہنچانے کا ہنر سیکھ لیا ہوگا تو اس نے اپنا اور دوسروں کا غم غلط کرنے کا مداوا بھی ڈھونڈ لیا ہوگا، وہ مزاح کی صورت ہوگی۔ اور مزاح انسانی زندگی کی رفتہ رفتہ ایک ضرورت بنتا گیا ہوگا۔ انسان نے مزاح کو اس لئے اپنایا ہوگا کہ وہ اپنی زندگی کے رنج و غم سے چھٹکارا پا سکے یا موت سے پہلے غم سے نجات حاصل کرنا اس کے بس میں نہ ہو، تو نہ سہی کم از کم زندگی کو موت بننے سے ضرور بچا سکے۔ ایسے وقت میں اس کے منہ سے جو کلمات نکلے ہوں گے وہ فن لطیفہ کی بنیاد رہی ہوگی اور اس فن کو موثر بنانے کے لئے لطیفہ، لطیفہ گو اور سامع کی تثلیث کا سہارا لیا گیا ہوگا۔ اس لحاظ سے فن لطیفہ کی روایت بڑی قدیم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ماضی قریب کی سماجی تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ظرافت، مذاق اور دل لگی کی بنیاد دراصل پھبتی بازی ہے جو لکھنوی معاشرہ کی دین ہے جس کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی علاقہ یا خطہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سماجی تعلق میں پھبتی بازی دراصل ذہنی طباعی کا ایک منفی رویہ ہے جو تشبیہ و استعارے کے پیکر میں ایسی کوئی ہنسنے ہنسانے والی بات انوکھی انداز سے کہی جاتی ہے جس سے کسی آدمی یا چیز کے عیب یا نقص نمایاں ہو اور سننے والا ہنسنے بھی لگے۔ لہٰذا سماجی تعلق کے اس رویئے نے تہذیب و معاشرت پر بھی بڑا گہرا اثر ڈالا جس کے نتیجے میں لکھنوی تہذیب میں مجلس رکھ رکھاؤ، نفاست پسندی اور سلیقہ شعاری کے لئے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے محفل کی فضا کو خوشگوار بنانے کا جو عام جذبہ پیدا ہوا اس سے لکھنوی بول چال کی زبان میں ایک عجیب بے تکلفی پیدا ہو گئی اور اس کا مظاہرہ ایوان ملاقات اور بالاخانے سے لے کر کوچہ و بازار تک ہونے لگا لیکن لکھنو کے معمولات میں مشتمل لطیفوں کو قلم بند کرنے کا رواج ناپید رہا۔

حافظ عربی زبان کا سب سے پہلا عالم ہے جس نے عربی میں لطیفوں کو قلم بند کرنے کا رواج دیا اور اس نے ایک کتاب بھی مرتب کی۔ اس کے بعد سات سو لطیفوں پر مشتمل ایک دوسری کتاب "کتاب الاذ[کیا]" علامہ ابن جوزی نے ترتیب دی۔ پھر عربی کے ذریعہ یہ مذاق فارسی زبان تک پہنچا تو نظامی، سمرقندی، مولانا روم اور شیخ سعدی وغیرہ نے فارسی میں لطیفے کے مذاق کو عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور ایک مدت میں لطیفوں کے چند مجموعے مجمع الانوار، مجمع الحکایات، مجمع المضحکات اور مجمع العجائبات نام سے مرتب پائے۔

اردو میں لطیفوں کے قلم بند کرنے کا رواج طور پر معدوم نظر آتا ہے۔ ایسے وقت میں انشاء خاں انشاء کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ ایک بار نواب سعادت علی خاں ان سے ناراض

صلح صفائی کے لئے ہر روز ایک نیا لطیفہ سنانے کی
فرمائش انہیں بطور سزا دی۔ لیکن لطیفوں کے اس
سرمائے کو اکٹھا کرنے کا خیال انشا میں بھی ناپید رہا۔
البتہ حضرت امیر خسروؒ کی تخلیقات میں خسرو کے گیت،
ڈھکوسلے، دوہے، دوسخنے، انمل، کہہ مکرنیاں اور
پہیلیاں وغیرہ جو مختلف موضوعات کے
تحت کہی گئیں گرچہ وہ لطیفے کے زمرے میں نہیں آتے
مگر ان کے مطالعہ سے لطف اندوزی کا جو سماں بندھتا
ہے اور زبان وبیان سے سرور اور فرحت وانبساط کی
جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، بغیر مسکرائے ہم نہیں رہ سکتے
اس بنا پر وہ قطعی طور پر لطیفے کی ابتدائی نقوش کا درجہ
رکھتے ہیں۔ موضوع "چھتری" پر کہی گئی پہیلی کی یہ مثال
ملاحظہ ہو۔

گھوم گھمیلا لہنگا پہنے ایک پاؤں سے رہے کھڑی
آٹھ ہاتھ ہیں اس ناری کے صورت اس کی لگے پری
سب کوئی اس کی چاہ کریں ہیں گرو مسلمان ہندو چھتری
خسرو نے یہ کہی پہیلی دل اپنے میں سوچ ذری

کہہ مکرنیوں سے لطف اندوزی کی ایک اور مثال۔
ایک کنوئیں پر چار پنہارنیاں پانی بھر رہی تھیں۔
امیر خسروؒ پیاسے ادھر سے گذرے۔ انہوں نے پانی طلب
کیا۔ ان میں سے ایک ان کو پہچانتی تھی کہا ــ تو ہی امیر
خسرو ہے تیرے پہیلیاں، مکرنیاں اور انمل سب سناتے
ہیں۔ ہمیں بھی کھیر، چرخا، ڈھول اور کتے پر جب تک
انمل نہیں سنائے گا، ہم پانی نہیں پلائیں گے۔ آخرش
خسرو نے ہار کر کہا۔

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا ــ لا پانی لا

(امیر خسرو کی ہندی شاعری: صفحہ ۵۷)

امیر خسروؒ کی تحریر و تصنیف کی خصوصیات پر مولانا
شمس اللہ قادری کا خیال ہے کہ اردو زبان میں جس
شخص کو سب سے پہلے کسی مستقل تصنیف اور فکر کا
موقع ملا۔ وہ حضرت امیر خسروؒ ہیں۔ انھوں نے آئندہ
اردو کے عنصر انتخاب کئے۔ مسالہ جمع کیا،
ارکان مہیا کئے اور ایک ڈھانچہ بنا کے دکھلایا
ان کے اکثر پہیلیوں اور بیتوں (دوہوں) کی زبان ایسی
صاف اردو ہے کہ متقدمین ریختہ کی زبان سے صاف
ملتی ہے۔

بلاشبہ اردو میں لطیفوں کو یکجا کرنے کی اولین
کوشش مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف
حسین حالی کی مرہون منت ہے۔ آب حیات میں، آزاد
نے شعراء کے لطیفے اور یادگار غالب، میں حالی نے
مرزا غالب کے خوش طبعی کے تذکرے قلم بند کئے
ہیں۔ لیکن لطیفے کے موضوع پر سب سے قابل ذکر
تصنیف مولانا عبدالباری آسی مرحوم کی کتاب خندۂ
گل ہے جس کی تخلیق سے اہل قلم کا توجہ اس مذاق
کی طرف ہوا۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کی چٹکیاں
اور محمد حسن عسکری کی، لطائف وظرافت، یہ دو لطیفوں
کے مجموعے، خندۂ گل، کے بعد شائع ہوئے۔ احمد جمال
پاشا کے مرتب کردہ انتخابات میں، غیر ملکی لطیفے، مجاز
کے لطیفے، ملا نصیرالدین کے لطیفے، اور، فن لطیفہ گوئی
وغیرہ گرچہ لطیفوں کے عمدہ مجموعے ہیں لیکن لطیفہ کو
زبان وبیان کی شائستگی اور برجستگی کے ساتھ
اور کم سے کم الفاظ میں پیش کرنے کا جو سلیقہ شاد
کے یہاں نظر آتا ہے وہ اردو کے دیگر ادیبوں کے

یہاں نہیں ملتا۔ لطیفہ کے اسی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے احمد جمال پاشا رقم طراز ہیں۔

"لطیفے کا حسن اس کے اختصار میں ہے۔ ادھر مقرر کے منھ سے پھول جھڑنا شروع ہوں ادھر محفل میں قہقہوں کے جگنو چمکنے لگیں۔ اسی لئے اس کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔ لطیفہ ایک نہایت ہی لطیف شئے ہے جس کے بیان کے لئے ایک خاص قسم کی ذہانت، حاضر جوابی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہے۔ اگر لطیفہ بحر طویل میں چلا گیا تو وہ حکایت، داستان، قصہ، افسانہ غرض کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر لطیفے کے ذیل میں ہرگز اس کا شمار نہ ہوگا۔"

(مضمون، فن لطیفہ گوئی۔ ماخوذ از ظرافت و تنقید۔ مصنفہ احمد جمال پاشا)

اس ذیل میں منٹو کے "سیاہ حاشیے" اور شوکت تھانوی کی "شیش محل" کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ جسے اردو کے کچھ نقاد لطیفوں کے مجموعے قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "سیاہ حاشیے" منٹو کے افسانچوں کا مجموعہ ہے جبکہ "شیش محل" مختصر مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ۔ البتہ نریش کمار شاد کی "سرخ حاشیے" اس سلسلے کی خاص طور پر قابل ذکر کتاب ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ عبد الغفور کا "قہقہہ زار" اور "شگوفہ زار" یہ دونوں کتابیں محض لطیفوں کے مجموعے ہی نہیں بلکہ ان میں مزاح کے چند عناصر کا جائزہ بھی پیش ہوا ہے۔

بہر حال زندہ دلی، زندگی کا دوسرا نام ہے تو لطیفے زندگی کی کثافت کو ہنسی یا مسکراہٹ ہی تحلیل کرکے اسے تقویت پہنچاتے ہیں۔ لیکن ادبی لطیفوں کا جو سرمایہ اردو میں موجود ہے ان کی تعداد غیر ادبی لطیفوں سے کہیں کم ہے۔ جن کے مطالعہ سے اردو کے ادیب و شعرا کی زندگی کے حالات و واقعات کے وہ اوجھل پہلو جہاں تک ہماری رسائی باآسانی ممکن نہ تھی اس کی نشاندہی کرتے ہیں، انہیں سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہمارے معلومات میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اور ان کی بے ساختہ گوئی ہمیں مسرت و شادمانی عطا کرتے ہیں۔

٭٭٭

۵؎ پیر جادید از مولانا شمس اللہ قادری۔ صفحہ ۲۳

(بقیہ:- تارا چرن رستوگی)

مکالمہ یا مذاکرہ چاہتا ہے اور بس ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

ان کی تصنیف فی الواقع سنگ منزل ہے جو ہمارا ایپروچ کھلے دل و دماغ سے ہونا چاہئے۔ معترضین ذہنی نے اردو کاز کو بہت نقصان پہنچایا ہے

غزلیں

راز اعظمی

ہر اک مکان و ہر اک در اداس کیوں ہے میاں
یہ سارے شہر کا منظر اداس کیوں ہے میاں

یہ کیسا غم ہے کہ افسردہ ہیں گل رخسار
جسے بھی دیکھو وہ پیکر اداس کیوں ہے میاں

ہے ساز باز نہ کچھ باغبان و گلچیں میں
چمن میں رہ کے گل تر اداس کیوں ہے میاں

کہیں نہ رزم میں کام آگیا ہو میر سپاہ
یہ کس کا سوگ ہے لشکر اداس کیوں ہے میاں

کسی کے قتل پہ قاتل ہے شادماں لیکن
یہ قتل گاہ کا منظر اداس کیوں ہے میاں

ہوا ہے کیا اسے احساس خون ناحق کا
لہو میں ڈوب کے خنجر اداس کیوں ہے میاں

نگاہ اٹھتی ہے جس پر ہر ایک رہرو کی
وہ شاہراہ کا پتھر اداس کیوں ہے میاں

یہ کس نے روک دیا راز کو دم تحریر
قلم اٹھا کے سخنور اداس کیوں ہے میاں

شاہد فروغی (ہوڑہ)

یادوں کا سلسلہ مرے اب تک جوان ہے
بیتے دلوں کی اس میں بھری داستان ہے

قدموں تلے زمیں نہیں آسمان ہے
احساس کے سفر کی یہی داستان ہے

کتنا بدل گیا مرا اخلاق دیکھ کر
دشمن کبھی تھا وہ مرا اب مہربان ہے

ہر شب گھٹن کے ساتھ گزرتی ہے اس جگہ
تم دیکھ لو یہی مرا اپنا مکان ہے

ہے سادگی بھی، لوچ بھی، اس میں مٹھاس بھی
"اردو" غزل کے واسطے میٹھی زبان ہے

دستک سی ہو رہی ہے در دل پہ بار بار
آئی ہے اس کی یاد یا مہمان ہے

شاہد یہاں قرار سے اب فائدہ نہیں
یہ سمت زندگی کا کوئی امتحان ہے

فرحت تلہری
شاہ جہاں پور

انا کی بات وہ ہر دم زباں پہ رکھتا ہے
زمیں پہ رہ کے دماغ آسماں پہ رکھتا ہے
وہ تیز خنجر کذب زباں پہ رکھتا ہے
ہر اہل علم و ہنر کو نشاں پہ رکھتا ہے
حسین پھولوں کا وہ اس قدر ہے شیدائی
گلوں کے بوٹے فراز مکاں پہ رکھتا ہے
عجیب دلکش و رنگیں ہے اس کا طرز بیاں
بہت عبور وہ اپنی زباں پہ رکھتا ہے
تسلیاں سی کوئی دے رہا ہے آخر شب
یہ کون دست حسیں نبض جاں پہ رکھتا ہے
سناں و تیغ کا کرتا ہے کام نام اس کا
عجیب وہ رعب دل دشمناں پہ رکھتا ہے
سفینہ [illegible] کا ہی لگتا ہے آئے سر ساحل پر
جو طائرانہ نظر بادباں پہ رکھتا ہے
وہ ہے تو کچھ بھی نہیں دیکھنے میں اے فرحت
نگاہ فکر مگر کہکشاں پہ رکھتا ہے

عطا عابدی

مظلوم کی آواز ہی مظلوم کے حق میں
اس دور میں شاید ہی سنی جاتی ہے ٹھہرو
اے جگنوؤ! قربت کا یہ احساس ہی کیا کم
کچھ تم سے مری تیرہ شبی جاتی ہے ٹھہرو
اب توڑ کر کے [illegible] عتم جاں سے امیدیں
کیا جانے کدھر دن کی ندی جاتی ہے ٹھہرو
آرام و سکوں، امن و اماں نام ہے جس کا
دولت وہ [illegible] سے چھینی جاتی ہے ٹھہرو

کسی کے شوق کا مارا ہوا ہے
پرندہ آسماں سے جو گرا ہے
مری آنکھوں کے سارے خواب لے لو
زمانے میں بھلا اب کیا رہا ہے
اکیلا وہ نہیں الجھا ہے مجھ سے
مرا دامن بھی بہت الجھا ہوا ہے
عجب سناٹے کا سا ہے اور میں ہوں
یہ مجھ کو دن ڈھلے کیا ہو گیا ہے
تو ملے کیسے حیرتی کیسے بتاؤں
مری آنکھوں میں منظر خوف کا ہے
چلو اب نیند آ جائے گی سکوں کی
اثاثہ زندگی کا لٹ چکا ہے

میسم عارفی (بستی پور)

بیتاب کیفی (بھوجپور)

مجھ سے تم اس کا سبب مت پوچھو
وقت کے غیظ و غضب مت پوچھو
حسن و اخلاق و وفا کافی ہے
نام مت دیکھو نسب مت پوچھو
بھول کر آج نئی نسلوں سے
عجز و تہذیب و ادب مت پوچھو
بے کراں کرب ہی قسمت میں ہے
مستی و عیش و طرب مت پوچھو
خوبیاں جو تھیں یہاں اگلوں میں
وہ فقط خواب ہیں اب مت پوچھو
اپنی کرتوت پہ ڈالو نظریں
مہرباں کتنا ہے رب مت پوچھو
ماہر فن ہے یہاں ہر کوئی
حسن و انداز طلب مت پوچھو
دن تو بیتاب گزر جاتا ہے
آہ مظلوم کی شب مت پوچھو

اسلم طارق (شاہجہاں پور)

تیرے خلوص تیری رفاقت کے نام پر
اک عمر ہم نے کاٹ دی چاہت کے نام پر
آنکھوں میں خواب دل میں تمناؤں کے ہجوم
ہر آدمی فدا ہے مسرت کے نام پر
صدیوں سے یارو آج بھی قائم ہے سلسلہ
نیلام پیار ہوتا ہے دولت کے نام پر
گھر مفلسوں کے بنتے ہیں مشکل سے دوستو
کیوں بستیاں جلاتے ہو نفرت کے نام پر
مکر و فریب، جھوٹ، دغا کے سبب سے آج
انسان ہے اک کلنک شرافت کے نام پر
وہ کیا سمجھ سکے گا محبت کی سرگزشت
کھائے نہ جس نے زخم محبت کے نام پر
طارق وہ میرے قتل کی سازش میں تھا شریک
مجھ کو تھا فخر جس کی رفاقت کے نام پر

مشرف عالم ذوقی
دہلی

مسلمان

ترجمہ: تبسم فاطمہ

قسط: ۱۲

(غلامی کے آخری دنوں سے ۱۹۸۶ء تک)

اور ایک تھے نظیر میاں۔ میاں مولوی عنایت اللہ کے پڑوسی۔ اگر اتفاق سے وہ بھی آجاتے تو ان کی الگ ڈفلی، الگ راگ ہوجاتا۔ نظیر میاں کو پاکستان سے نفرت تھی۔ [illegible] کے بعد ان کے اکلوتے بہن بھائی پاکستان جاکر ہی بس گئے۔ [illegible] تب سے وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ کہتے ہوں، وہاں ان [illegible] مصروفیت ہی ایسی ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ وہ تو برا ہو [illegible] کر ایک بار پاکستان کا ویزا بنوا [illegible] اور [illegible] پاکستان سے ہو آئے۔ گئے تھے [illegible] ماہ کے [illegible] ایک ہی ماہ میں۔ اب وہ میں اور نظیر میاں [illegible] محلے میں اکیلے مولوی [illegible] عنایت اللہ [illegible] سے کسی تیسرے آدمی سے [illegible] پاکستان کا ذکر [illegible] جیسے قیامت آجاتی۔ پھر تو [illegible] نظیر کا [illegible] ہوتا۔ طریقے طریقے سے [illegible] کے باندھ ٹوٹ جاتے۔ [illegible] لے کے رہیں گے

پاکستان — میاں لے لیانا — چین مل گیا نا؟ قرار آگیا نا دل کو — نہیں نہیں — وہاں اپنے لوگ ہوں گے — مجھے تو اس قائداعظم پر غصہ آتا ہے۔ بڑا آیا قائداعظم کہیں کا — ملک کا بٹوارہ کرادیا — فاسشیا — دلوں کی تقسیم کرادی — آدھے رشتے دار ادھر رہ گئے۔ آدھے اُدھر چلے گئے۔ پھر کم بخت نصیبہ بھی ایسی کہ دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوا — لے کے رہیں گے پاکستان — لے لیانا، جی ٹھنڈا ہوگیا نا — اب چین کی بنسی بجا رہے ہیں نا — وہ بلوچی ہے — وہ پٹھان ہے — وہ سندھی ہے — وہ اردو بولتا ہے وہ بہاری ہے۔ وہ مہاجر ہے — مارکاٹ مچی ہے۔ پٹھان کوٹ میں زمین میں نشیلی چیزیں چھپائی جارہی ہیں۔ ارے واہ — گھر میں کھانے کو دو وقت کی روٹی نہیں لیکن زمین پر شاندار کارپیٹ بچھائیں گے۔ پڑوسی کا حکا، کریں گے۔ وی۔ سی۔ آر لیں گے۔ وی۔ سی۔ آر

لیں گے۔ اور چہرے پر پاؤ پاؤ بھر پاوڈر کریم ملیں گے
— لڑکیاں — ارے ہائے توبہ — جہنم میں جائیں۔
بڑا آیا اسلامی ملک — پردہ تو بس نام کا ہے — کیوں
عنایت اللہ — میں نے غلط کہا کیا —؟ غلط کہا تو
سو جوتی میرے منہ پر بھگا کر مارنا — کیوں ؟

نہیں — ہیں — ہیں — مولوی عنایت اللہ اپنا
راگ لے کر بیٹھ جاتے تھے رومالیں رنگوائیں —
سادی چھپا تیں آگئیں — ہیں — ہیں ... لیکن
نازک زمانہ ہیں — پتہ نہیں مسلمانوں کو عقل کب
آئیں گی —

مولوی نظیر کو اس بات کا بھی ملال تھا کہ اب وہاں
یعنی پاکستان میں لوگوں کے پاس محض دکھاوا رہ گیا
ہے — نمائش رہ گئی ہے — خود ان کے اپنے بھائی ہیں۔
برسوں بعد جن سے ملے۔ وہ پاکستان گئے تھے — وہاں
برسوں کی جدائی کا درد کیا ہوتا۔ بلکہ سوال پوچھتی ہول
تول کرتی آنکھیں تھیں — کہ بھیا یہ کیا حال بنا رکھا
ہے آپ نے؟ کیا بھارت میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت
ٹھیک نہیں۔ اس کا مطلب یہاں کے اخبارات
ٹھیک ہی لکھتے ہیں — آپ کرتے کیا ہیں۔ بچے کیا
کرتے ہیں — ہمارا ؟ ہمارا تو بڑا لڑکا لندن میں ہے۔
دوسرا کویت میں — لڑکی پیرس میں —
اور آنکھوں میں حقارت ہی حقارت تھی۔
نفرت ہی نفرت تھی —
صرف اعتراضات ہے — کہ بھارت کتنا
پیدا کیا — وہاں رہنے والے مسلمانوں کو بھی سلیقہ
نہیں — ہنر نہیں — گھر کی سجاوٹ انہیں نہیں آتی —
لباس اور مینرز سے انہیں دور کا واسطہ نہیں —

یہ مولوی نظیر کے بھائی بہن تھے۔ کوئی غیر نہیں تھے۔
سوال پوچھنے والی آنکھوں میں مانوس چمک نہیں تھی۔
نظیر میاں ایکدم سے چونک گئے۔ وہ صرف ان الزامات
کو سنتے رہے۔ کیا کہتے — کہ بھائی — تم سب جگہ ہو۔
پیرس میں — لندن میں — کویت میں — لیکن پاکستان میں
کب ہو —؟ اپنے وطن میں کب ہو — ہم تو اپنے وطن میں
ہیں بھائی — ہاں ہمیں سجاوٹ نہیں آتی — رہنے کا طریقہ
نہیں معلوم، لیکن اس خود نمائی کے رسم میں، ہم گھر کا سکون
نہیں بیچتے — تمہاری طرح تو جون کھا کر بھوکوں نہیں
رہتے — ہمیں سجاوٹ نہیں آتی، اس لئے کہ ہم اپنے
ڈرائنگ روم کو لندن اور پیرس کے سامانوں سے نہیں
بھرتے — ہم ہندوستانی ہیں۔ دل ہندوستانی ہے۔
اور ....

انہوں نے نظریں جھکا لیں — ارادہ باندھ لیا۔
یہاں نہیں رہیں گے اور اب کبھی نہیں آئیں گے۔
کہتے ہیں مولوی نظیر جب پاکستان سے لوٹے تو
کچھ دنوں تک لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے رہے۔ انہیں
شرم آتی — کہ وہ لوگوں سے پاکستان کے بارے میں کیا
کہیں گے۔ جھوٹ وہ بول نہیں سکتے — اور وہ اس
پاکستان کے بارے میں کیا کہیں گے جہاں آزادی کے برسوں
سالوں بعد بھی ان کے بھائی مہاجر جیسی گالیاں سن رہے
ہیں اور لندن پیرس کی تعریف میں ڈوبے ہوں۔ لعنت ہے
ایسی عزت پر کہ رہنے کے اتنے دنوں بعد بھی مہاجر کہلا
رہے ہیں —
میاں نظیر اور مولوی عنایت اللہ جیسے لوگ
اس محلے میں کم نہیں تھے جنہیں اس بات کا شدت سے
احساس تھا کہ وقت بدل گیا اور اب اس دور کی رنگینی

واپس نہیں آسکتی۔

دور سچ مچ نازک آگیا۔ اس معاملے میں پرانی دلی کا یہ علاقہ بہت نازک مانا جاتا تھا۔ ذرا سی بات پہ دو فرقوں میں ٹھن جاتی۔ دکانیں بند ہوجاتیں۔ کبھی کبھی مسجد سے بھی خطبہ کی جگہ سیاسی فرمان جاری ہو جاتے۔

کہ اے مسلمانو! تم یہ کرو۔ تم وہ کرو۔

آن میں پولس فورس والی سیٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتی۔ کرفیو لگ جاتا۔

یہ ہر معاملے میں سینسیٹو (SENSITIVE) ایریا تھا۔ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی، مولوی عنایت اللہ کا گھر سیاست کا اکھاڑہ بن جاتا۔ محلے کے مسلمانوں کی وہیں میٹنگ ہوتی۔ مشورے ہوتے۔ بچاؤ کی راہیں نکالی جاتیں۔

دوپہر کی تپش سے زمین سلگ رہی تھی۔

مولوی عنایت کے یہاں داڑھی والے جمع ہوچکے تھے۔ سب شہر کی خراب ہوتی فضا کو لے کر فکر مند تھے۔

ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"بی۔ جے۔ پی سے ہی ہمیں سب سے بڑا خطرہ ہے۔"

"وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا چاہتی ہے۔"

ایک شخص نے اپنی دلیل پیش کی۔

"بی۔ جے۔ پی کا ہتھیار نشان زرد ہونا چاہئے۔

"ہو سکتا ہے کہ اس پر مذہب کا [illegible] [illegible] کے حامی دنگوں [illegible] یہ بات [illegible] ہو چکی ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو طے ہو کہ ہم کس کے ساتھ ہوں۔ شہاب الدین کے۔ امام صاحب کے یا۔۔۔"

ایک بوڑھے بزرگ نے اپنی دلیل پیش کی۔

"ہم نہ شہاب الدین کے ساتھ ہیں۔ نہ امام صاحب کے جو اسلام کی بات کہے گا۔ ہم اس کے ساتھ ہیں۔"

"کیا سچی بات کہی مولانا۔"

لوگوں نے تالیاں بجا کر مولانا کی بات کا استقبال کیا۔

"لیکن جس طرح بی۔ جے۔ پی نے اپنے پر پھیلانے شروع کئے ہیں اس سے لگتا ہے کہیں ایک دن اس کی حکومت نہ ہوجائے۔"

"نہ ابھی اس کے اتنے پر نکلے ہیں نہ یہ دن آئے گا۔ جن سنگھ کا کیا حشر ہوا تھا۔ وہ کیسے لوٹ لے۔۔۔

"مذہب کے نام پر کوئی پارٹی اس دیش میں راج نہیں کرسکتی۔"

"لیکن بی۔ جے۔ پی آگئی تو۔۔۔"

"آگئی تو پھر دیکھیں گے۔ کہنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مسلمان بھی یہاں مٹھی بھر نہیں ہیں کہ داؤں کو آزما کر چلے گئے اور وہ چپ چاپ دیکھتے رہے۔"

"مسلمانوں میں اتحاد کہاں ہے۔"

"اتحاد ہوتا تو کیا کوئی ہم پر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی کوشش کرتا۔ ساری دنیا میں ہم ذلیل و خوار نہ رہے ہوتے۔

"ہمارا کوئی نیتا بھی نہیں۔"

"لیکن بی۔ جے۔ پی آگئی تو۔۔۔"

"آنے کے بعد وہ [illegible] کچھ نہیں کرے گی۔ مسلمانوں کو خوف محسوس ہے۔ مذہب کو اس نے صرف ووٹ کا ہتھیار بنایا ہے۔ حکومت میں آنے کے بعد اس سے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔"

" پھر خطرہ کس سے ہے ؟"
کانگریس سے ۔۔ اس کی ہر چال دوغلی ہے۔"
" پھر دنگے بھڑکاؤ ۔۔ پھر کرم لگاؤ ۔"
" یہاں کے ہندو اپنی دکانوں پر بھگوا جھنڈا
پھہرا رہے ہیں ۔ ہم کیوں نہ اسلامی جھنڈا ۔ ۔ ۔"
" رومالیں روٹیں گئیں سادی چپاتیں آگئیں ۔"
" میاں ۔۔ انتقامی جذبے سے دکھ نہیں ہونے والا۔
ایک جگہ زیادہ ہو۔ مار لوگے تو کون سا دوسری جگہ پر بچ
جاؤ گے ۔ یہ بات نہ بھولو کہ پولس بھی ان کی ہے۔"
" جو کچھ کرنا ہے ہوش و حواس میں کرنا ہے ۔"
" اس سے اچھا تھا کہ پاکستان چلے گئے ہوتے ۔"
اور وہاں اپنوں کے ہاتھوں مار کھا رہے ہوتے ۔
مہاجر کہلا رہے ہوتے ۔ امام صاحب نے کہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"
" دکانیں بند رکھنے میں سارا گھاٹا ہے ۔"
باتیں دیر تک چلتی رہیں ۔ اس درمیان دروازہ
پر دستک پڑی ۔ ایک آدمی باہر دیکھنے گیا ۔ پھر اس
نے پلٹ کر مولوی عنایت اللہ سے کہا ۔
" ایک نوجوان لڑکی آپ کے بارے میں معلوم کر
رہی ہے ۔"
" میرے بارے میں ؟"
مولوی عنایت بھاگ کر باہر آئے ۔ دروازہ پر
ایک سہمی سہمی لڑکی کھڑی تھی ۔
" کون ہو تم ۔۔ ؟"
مولوی عنایت نے رعب سے پوچھا ۔
میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔۔۔۔ یہ لڑکی افروز تھی ۔

(بقیہ : مشاعرہ برائے فٹ پاتھ)

ہاتھی تو مر کر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے ۔"
" حضور اونٹ جنگلی نہیں ہوتا ۔"
" ریگستانوں میں جنگل ہوتے ہی نہیں تو جنگلی کہاں
سے ہوگا ۔ ویسے جنگل کا انسانی تہذیب و ارتقا سے
گہرا رشتہ ہے ۔
" یہ کج بحثی ہے ۔"
" اونٹ کے کارن ۔"
اونٹ اور ہاتھی کے جھگڑے میں فٹ پاتھ
دبے جا رہے تھے ۔ اکثر بحث کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اصل
موضوع غائب ہو جاتا ہے ۔ جھگڑا رہ جاتا ہے ۔
کافی دھوپ دوڑ کے بعد یہ راز کھلا کہ دن میں
دکانداری اور رات میں انسانی مخلوق میں اضافے کے لئے
فٹ پاتھ بے دریغی سے استعمال ہوتے ہیں ۔ ان پر
جو مخلوق اُگتی ہے یا اُگائی جاتی ہے وہ روایت کی پابندی
کرتے ہوئے زندگی بھر کسی کی شوخیٔ تحریر کا نقش فریادی
بنی رہتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں ہر وہ چیز
اور کام جو غلط اور ناجائز ڈھنگ سے کیا جائے ، آخر کو
سودمند ثابت ہوتا ہے ۔
فٹ پاتھ کا چونکہ اس ملک کے عوام سے کوئی
تعلق نہیں ، اس لئے ان کو قبول جانا بہتر ہے ۔ مقامات
آہ و فغاں اور بھی ہیں ۔

پرنٹر پبلشر این منظر نے لیبل آرٹ
پریس شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر
سہیل ، ریور سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا

ش۔ انصاف
بمبئی

کہاں گئی چڑیا!

(ناٹک دیکھنے والوں کے بیچ سے کچھ لوگ بلند آواز میں گاتے ہوئے باہر آتے ہیں۔ اور فوجیوں کی طرح مارچ کرنے کے ڈھنگ سے چلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ لوگ فلم سکندر کا گانا اسی دھن میں گا رہے ہیں۔)

ایک — (مٹھی تانتے ہوئے) وندے ماترم!!!

سب — وندے ماترم — وندے ماترم

ایک — یہاں ڈال ڈال پر سونے کی چڑیا کرتی ہے بسیرا
یہ بھارت دیس ہے میرا

سب — یہ بھارت دیس ہے میرا — جے بھارتی — جے بھارتی — جے بھارتی — جے بھارتی

سامنے کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ جیسے ہی یہ ان کے قریب پہنچتے ہیں سر دھیما ہو جاتا ہے۔ سامنے کھڑے ہوئے لوگ انہیں دیکھ کر ایک ساتھ قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں۔ پھر ایک آدمی قہقہہ لگانے والے گروپ سے باہر نکلتا ہے اور انگریزوں کے لہجے میں بولتا ہے۔

— اے بھارتی — ادھر آ — یہ تیسرا پیٹ تیری پیٹھ سے کیوں چپکا ہوا ہے۔ کھانے کو نہیں ملتا کیا؟

— جی نہیں صاحب جی

— اے تو ادھر آ — کیا پھٹے ہوئے گندے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہیں کیا؟

— جی نہیں صاحب جی

— اور آپ میڈم — آپ نے کچھ پڑھا لکھا ہے کہ نہیں۔۔؟

— جی نہیں صاحب جی

— اور تم فٹ پاتھ پر کیوں سوتا ہے۔ رہنے کو گھر نہیں کیا؟

— جی نہیں صاحب جی

— (یکایک ایک آدمی ہاتھ کو ہوا میں نیچے سے اوپر لے جاتے ہوئے) پھُرررر

— جب وہ ہاتھ نیچے سے اوپر لے جاتا ہے سب ان کے ہاتھ کے ساتھ ساتھ نیچے سے اوپر دیکھتے ہوئے۔

"یہ کیا ہوا ؟"
—— اُڑ گئی
—— اُڑ گئی رے اُڑ گئی
—— سونے کی چڑیا اُڑ گئی رے
سب —— (ایک ساتھ) سونے کی چڑیا اُڑ گئی رے۔
اُڑ گئی رے۔ سونے کی چڑیا اُڑ گئی رے۔
—— سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
—— جی ہاں سارے جہاں سے اچھا ہمارا دیش جس
کی ڈال ڈال پر سونے کی چڑیاں بسیرا کرتی تھیں
—— یہ دیس آج سے ۴۵ سال پہلے انگریزوں کی
غلامی سے آزاد ہوا۔
—— جو پارٹی آزادی دلانے والی پارٹی ہونے پر
ناز کرتی ہے وہی تو چالیس سالوں سے دیس
پر حکومت کر رہی ہے۔
—— آج بھی اسی کی حکومت ہے
—— اور آج بھی کہہ رہی دیس کی مالی حالت گمبھیر
ہے۔
—— خزانے خالی ہو چکے ہیں۔
—— دیس کنگال ہو گیا ہے۔
—— پھر ررر
سب —— یہ کیا ہوا ؟
—— پھر ررر —— ہماری ریزرو بینک پر بیٹھی سونے
کی چڑیا اڑ کر سات سمندر پار لندن کے بینک
پر جا بیٹھی ہے۔
—— ہم نے انگریزوں کو بھگا دیا —— وہ سالے
ہمارے دیس کے غدار تھے
—— ہمارے دیس کو ہیو پار کی منڈی بنا کر بیچ کھایا
—— ہمارے دیس کی دولت اور ہمارا سونا لے
جا کر اپنے لندن کے بینکوں میں جمع کر لیا۔
—— پھر ہم نے گاندھی کی لکڑی اٹھائی۔ انگریزوں
کی پیٹھ پر جمائی۔
سب مل کو —— اور بھگا دیا غداروں کو

—— ٹماٹر کیا بھاؤ ہیں۔
—— ۳۰ روپے کلو
—— ۳۰ روپے کلو!! کچھ کم کرو بھائی
—— کم کر دوں —— اچھا تو آدھا کلو کر دیتا ہوں۔
—— وزن نہیں بھائی —— بھاؤ کم کرو۔ وہ نکڑ والی
دکان پر ۲۰ روپے کلو کا بھاؤ ہے
—— تو وہاں سے لے لو۔ ہم نے کب روکا ہے۔
—— مگر بات یہ ہے کہ اس کے پاس ٹماٹر ختم ہو گئے
ہیں۔
—— یہی تو بات ہے صاحب۔ جب ہمارے پاس ختم
ہو جاتے ہیں تو ہم تو پانچ ہی روپے کلو بیچتے ہیں۔
—— کیا قیامت مچی ہے، ٹماٹر تیس روپے کلو ہو گئے
ہیں۔
—— تو ٹماٹر کھانا ضروری ہے کیا ؟
سب —— بالکل نہیں بالکل نہیں۔
—— شکر ۱۰ روپے کلو چل رہی ہے
—— تو شکر کھانا ضروری ہے کیا
سب —— بالکل نہیں۔ بالکل نہیں
—— اور اناج —— اناج کا بھاؤ تو آسمان چھو رہا
ہے۔
—— تو اناج کھانا ضروری ہے کیا ؟

—— ارے واہ اناج ہی نہیں کھائیں گے تو زندہ کیسے رہیں گے۔
—— تو زندہ رہنا ضروری ہے کیا ؟
—— ٹھیک کہتے ہو بھیا — اس دیس میں زندہ رہنا کوئی ضروری نہیں۔ زندہ رہ گئے تو دھرم اور جات پات کے دنگوں میں مارے جائیں گے۔
—— اس سے بچ گئے تو آتنک وادی مار ڈالیں گے۔
—— ان سے بچ گئے تو مہنگائی اور غریبی ضرور مار ڈالے گی۔
—— ریل کا کرایہ بھی تو پھر بڑھا دیا گیا ہے
—— تو ریل گاڑیوں سے سفر مت کرو۔ پیدل چلو۔
—— چلتے چلتے جوتے گھس جائیں تو ننگے پیر چلو۔
—— جیسے آج سے ۳۵ سال پہلے آرم اسٹرانگ چاند کی زمین پر چلا تھا۔
—— اور اسے چاند کی دھرتی پر چلتے دیکھ کر ساری دنیا نے تالیاں بجائی تھیں۔
—— آزادی کے ۵۴ سال بعد ہم بھی بھارت کی دھرتی پر ننگے پیر چلیں گے۔
—— اور ہمیں بھی دیکھ کر دنیا تالی بجائے گی۔ (سب تالی بجاتے ہیں)
—— جہاں گلی گلی میں ننگی بھوکی جنتا کرتی ہے بسیرا
—— وہ بھارت دیس ہے میرا۔ وہ بھارت دیس ہے میرا۔
—— جے بھارتی — جے بھارتی
—— جے رام کی — جے رام کی
سب — جیئے شری رام — جیئے شری رام
—— اللہ اکبر
—— جیئے شری رام (اللہ اکبر۔ جیئے شری رام کی

کچھ دیر تک گونج ہوتی رہتی ہے)
—— کھانا نہیں، غم کھائیں گے۔ ماریں گے مر جائیں گے
سپنے جہاں سجائے تھے۔ قبریں وہیں بنائیں گے
سب —— ہم بھارتی۔ ہم بھارتی
—— کیا ہماری سونے کی چڑیا اب کبھی واپس نہیں آئے گی؟
—— کیا ہمارے خزانے یوں ہی خالی ہوتے رہیں گے؟
—— کیا ہمارا دیش، دیش بھگت لیڈروں کے ہاتھوں کنگال ہوتا رہے گا؟
—— ہر بجٹ میں قیمتیں بڑھتی رہیں گی ؟
—— کیا روٹی، کپڑا، مکان اور تعلیم جیسی بنیادی ضرورتیں بھی کبھی پوری نہیں ہوں گی ؟
سب —— کبھی نہیں۔ کبھی نہیں
—— ہمارے سپنے کبھی ساکار نہیں ہوں اگر ہم سادھارن لوگ ہی ایک دوسرے کو نہیں سمجھیں گے۔ ہم سب جن کے سپنے ایک ہیں۔ سب کا جیون ایک ہے، سب کی ضرورتیں ہیں وہی اگر ایک دوسرے کا دکھ درد نہیں سمجھیں گے۔ وہی اگر ووٹوں اور کرسیوں کے لئے لڑتے والی گندی راج نیتی کا شکار بنتے رہیں گے۔ پرانت، دھرم، بھاشا اور جات پات کی دیواریں کھڑی کرتی رہیں گے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہیں گے۔ تو دیس کی حالت کبھی نہیں سدھرے گی
—— دیس کو موجودہ پرستیتھی سے نکالنے کے لئے؟ مندر بنانے ہوں گے
—— جی مندر — مگر رام اور کرشن کے مندر نہیں پیار کے مندر، ودیا کے مندر بنانے ہوں —

— شیلانیاس کے جلوس نکالتے ہوں گے

— اینٹ اور پتھر جمع کرنے کے لئے نہیں بلکہ دیش کی ننگی بھوکی جنتا کے لئے کپڑے اور روٹیاں جمع کرنے کے لئے۔

— جب دیش میں کوئی ننگا نہیں رہے گا، بھوکا نہیں رہے گا، بے گھر نہیں رہے گا۔ نرکشر نہیں رہے گا

تب —

رام راجیہ آجائے گا۔

— قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے) رام راجیہ! رام راجیہ میں تو شاید بیر بیچنے والی ایک ہی اچھوت بڑی تھی۔ لیکن آج تو لاکھوں سبریاں ہیں، لاکھوں اچھوت ہیں۔ جنہیں اچھوت اور ذریدر بنا کر دنیا کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔

— سبری کی پرتھا کوئی مٹانا نہیں چاہتا، ہاں کبھی کبھی اس کے دو چار بیر کھا کر اپنی مہانتا سبھی بڑھانا چاہتے ہیں۔

— کرسی اور ستہ کے لئے پچھڑے ورگوں کو اُوپر اُٹھانے کی باتیں سبھی کرتے ہیں مگر ورگ وہیں رہ جاتے ہیں اور بات کرنے والے اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔

— فضا میں نغمے نہیں نعرے گونج رہے ہیں۔

— باغوں میں پھول نہیں کانٹے اگائے جا رہے ہیں

— مندر اور مسجد میں عبادت نہیں سیاست ہو رہی ہے

— ہوا میں چاروں طرف نفرت کا دھواں بھرا ہوا ہے۔

— ایسے میں چڑیا کیسے واپس آئے گی۔

— رہی سہی چڑیاں بھی اڑ جائیں گی۔

دستخط

(بقیہ خطوط) —— × ——

جذبات کی چغلی کھاتی ہے۔ ایسی چیزوں کی اشاعت سے آپ کو پرہیز کرنا چاہیئے۔ آپ کا رسالہ تو خالص ادبی رسالہ ہے؟ گویا ڈاکٹر صاحب کا مضمون غیر ادبی کوشش ہے۔

بھوپال میں مقیم ادب کے اس ایک طالب علم کی جذباتی بکر کو دیکھی خاصی توجہ چاہتی ہے۔ موصوف نے رستوگی صاحب جیسے خورشید علم و ادب کو اپنی "LITTLE KNOWLEGE" کے چراغ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مخمور کی شاعری کو ہم بھی اچھا سمجھتے ہیں اور عبدالمتین نیاز بھی لیکن اس رائے کو ہم رستوگی صاحب پر ٹھونسنے کا استحقاق نہیں رکھتے۔ نیاز کا بڑے تپاک کے ساتھ یہ کہنا بھی مضحکہ خیز ہے کہ آپ نے کسی ذاتی معاملے کے سبب جذباتی ہو کر مذکورہ تحریر لکھی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ایسی تحریروں سے اپنی شخصیت کو مجروح نہ کریں؟ یہ رہی چھوٹے منہ کی بڑی بات۔ نہ جانے الیوان اردو کے ایڈیٹر نے موصوف پر کیسا جادو کر دیا ہے۔

آخر میں، یہ کہنا دور از کار نہ ہوگا کہ ڈاکٹر رستوگی پر لاعلمی، کم فہمی اور مخاصمت جیسی تہمتیں لگانے والے آسمان پر تھوکنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ میں ان کے لئے دعا کروں گا کہ حق رحمت کرے۔

● رام پرکاش راہی، دہلی

دستخط

فیاض حالی
ایڈوکیٹ ۔ گیا

نواب سید علی مظفر
کچھ یادیں کچھ باتیں

"ماہنامہ سہیل" کا تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے ورق الٹتے ہی "نمود" پر نظر پڑی ۔ تعزیتی اداریہ "آہ سید علی مظفر" کا مطالعہ کیا ۔ نواب سید علی مظفر جن کو پیار سے "میاں" بھی کہا جاتا تھا اس دار فانی سے رخصت ہوگئے ۔ انکی شرافت عظمت، ذہانت گوناگوں خصوصیت اور ادبی صلاحیت کو اس اداریہ میں پیش کیا گیا ہے ۔ لیکن مدیر سے ان کی زندگی کا ایک اہم گوشہ چھوٹ گیا جس کا ذکر ضروری تھا ۔ مرحوم ترقی پسند ذہن رکھتے تھے ۔ اور دو : بلکہ ہمیوں سے آخری لمحہ تک ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ ممبر رہے ۔ انکی رکنیت بطور فیشن نہیں تھی بلکہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی پارٹی کے اصول وضوابط کو برتتے تھے ۔ نواب صاحب کی ترقی پسندی کا ذکر آتے ہی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی یاد آگئی ۔ ۱۹۷۰ء کی بات ہے کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے لئے گیا شہر کا انتخاب کیا گیا تھا ۔ تیاری کمیٹی کی بیشتر میٹنگیں نواب صاحب کے مکان "ظفر منزل" میں ہی ہوا کرتی اور "میاں" اس میں کافی دلچسپی لیتے اور ہر طرح تعاون دیتے تھے کانفرنس میں ہندوستان کے تقریباً سبھی ترقی پسند شعراء و ادباء نے شرکت کی تھی ۔ اس کانفرنس کی کامیابی میں نواب صاحب کا بھی اہم کردار رہا تھا ۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی ان کی فعالیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ یہ واقعہ ۱۹۷۷ء کا ہے ۔ گیا میں میونسپلٹی کا انتخاب ہونے والا تھا ۔ کمیونسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی نامزدگی کا پرچہ داخل کیا تھا ۔ جناب نند کیشور سنگھ ایڈوکیٹ بھی ان میں سے ایک تھے ۔ نواب صاحب نے گیا شہر کے مختلف محلوں کی تنگ وتاریک گندی گلیوں میں ووٹروں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے دیگر کامریڈوں کے ہمراہ

گھومنے میں کبھی بھی ذرا جھجک محسوس نہیں کی۔ شہر کے لوگوں نے شاید تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ نواب صاحب ان گلیوں میں کبھی قدم رکھیں گے۔ اسمبلی انتخابات میں بھی وہ اسی طرح فعال رہے۔

طویل عرصہ سے نواب صاحب کی قربت حاصل رہی جس کی بنیادی وجہ ہم دونوں کی ایک جماعت سے وابستگی تھی۔ گذشتہ چند برسوں سے انکی روزانہ شام کی نشست پابندی کے ساتھ پروفیسر افصح ظفر کی رہائش گاہ پر ہوا کرتی تھی۔ مذہبی، ادبی، سیاسی، فلمی اور اسپورٹس کے موضوع پر گفتگو ہوتی لیکن ان جلسوں میں کبھی بھی نواب صاحب کی زبان سے شکوہ شکایت، غیبت اور منافقت کی بات نہیں سنی گئی۔ ہادی ہاشمی ہائی اسکول گیا کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے بھی نواب صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی کبھار کسی معاملے میں شدید اختلاف رائے بھی ہوتا لیکن میٹنگ کے خاتمے پر اس کے اثرات کافور ہو جاتے تھے۔ ہمارے درمیان عمر کا تفاوت مجلسی زندگی کی بے تکلفی میں رکاوٹ نہیں بنا۔

عمر کے آخری دنوں میں سرطان جیسے موذی مرض نے نواب صاحب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس خطرناک مرض کی تکلیف انہوں نے جس صبر و ضبط اور ہمت کے ساتھ برداشت کیا یہ شاید انہیں کا حصہ تھا۔ انتقال سے ایک ہفتہ قبل تک مرض کے شدید اثرات کے باوجود نشست میں شامل ہوتے رہے لیکن کبھی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔

۱۹ر جولائی سنیچر کی شب کو حسب معمول ہم لوگ افصح صاحب کے ڈرائنگ روم میں محو گفتگو تھے۔ سوا آٹھ بجے ایک شخص نے آکر خبر دی کہ نواب صاحب کی حالت نازک ہے۔ سنتے ہی کا ذہن ان کی [illegible] لگا۔ تا ہم سب بہ عجلت تمام ان کے مکان پر پہنچے۔ نواب صاحب اس وقت عالم سکرات میں تھے اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے اس دار فانی کو چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ ان کے عزیز و اقارب، ملازمین اور ہم لوگوں کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شہر کا ایک [illegible] رہنما، بے مثال، ہندو مسلم رابطے کی کڑی [illegible] کو سوگوار چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا۔

نواب صاحب کے زندگی کے اوراق بڑے طویل ہیں وہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات اگر قلمبند کئے جائیں تو ضخیم کتاب کی شکل میں سامنے آسکتے ہیں۔ "زبان و ادب" میں نواب صاحب کا سوانحی مضمون "مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا" دو قسطوں میں چھپ چکا ہے اور تیسری قسط بھی عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس مضمون کی باقی یادیں وہ اپنے ساتھ لے کر چلے گئے ؎

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ماہنامہ سہیل میں چھپے قسط وار مضمون "پراگندہ طبع لوگ" کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا اعلان کرکے "ادارہ سہیل" نے اردو ادب میں اپنی انفرادیت اور بلند پروازی کا ایک اور ثبوت پیش کیا ہے۔ ارکین ادارہ پیشگی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شہر خیال

آپ کا خط [illegible] اور اس کے فوراً بعد "سہیل" کا تازہ شمارہ بھی۔ شکریہ! اس شمارے میں "نئی کتابوں کے تعارف میں" ششماہی "علم و ادب" پر اقبال حسن آزاد صاحب کے تبصرے کی شمولیت سے ایک مضحکہ خیز سی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے مجھے سخت سست کہتے ہوئے لکھا ہے کہ میری "کہانی" "انتقال" ششماہی علم و ادب میں شائع ہونے سے قبل "شب خون" میں بھی آچکی ہے۔ ان کی شکایت کا مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ ان کا یہ تبصرہ بھی آپ کے یہاں چھپنے سے پہلے کہیں اور چھپ چکا ہے، غالباً "تعمیر ہریانہ" میں۔ جب کوئی ایک ہی تبصرہ دو یا دس جگہ چھپنا ان کے نزدیک معیوب نہیں تو ایک کہانی بیچاری کو ہی وہ پابہ زنجیر کرنے کے درپے کیوں ہیں؟

ہماری بدقسمتی ہے کہ اتنی بڑی اردو دنیا میں ہمارے رسائل کی اشاعت کی تعداد عموماً پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوتی اور ان میں سے بھی بیشتر ایسے ہیں جو نہایت طویل اور بے قاعدہ وقفوں سے چھپتے ہیں۔ دریں حالات لکھنے والے اگر بعض اوقات کسی مجبوری میں اپنی کوئی مطبوعہ تخلیق کسی ایسے رسالے کو ایک گرمیسی سنبھالنے کی خاطر بے معاوضہ دے دیں جس کے قارئین کا حلقہ جدا ہو، تو اس میں کیا قباحت ہے؟

جناب آزاد نے اپنے تبصرے میں جو [illegible] establishment [illegible] کا لفظ [illegible] تخلیق کاروں کے رولوں کا ذکر روا رکھا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ establishment سے صرف "معززین" مراد کرتے ہیں جنہیں پرائم منسٹری یا [illegible] آفس کی ہیڈ کلرکی کے مقام پر تک جانا ہوتا ہے۔ ان "معززین" کا کوئے ملامت میں کیا کام؟ یہاں کی خاک چھاننے اور جسم و جاں بانٹتے چلے جانے کا حوصلہ تو ان دیوانوں میں ہوتا ہے جو اس وقت تک سرگرداں رہتے ہیں جب تک بے دم ہو کر نہ گر پڑیں۔ میں اب سٹھ کے قریب پہنچ کر بھی اس لئے لکھتا ہوں کہ مجھے ابھی مزید غم و ذلت حاصل کر اپنی ہجرت اور آوارگی کے چھالے بنائے رکھنا ہے اور اسی مانند نو بہ نو رہنا ہے، تاکہ اقبال حسن آزاد اور ان کی نسل کے دوسرے نئے لوگ میری [illegible] سے اپنی [illegible] کا سراغ پا سکیں اور لیں، بالآخر اپنی برتری [illegible] سرشار ہونے کے لئے پابہ رکاب رہیں۔ سنا ہے کبھو کے کانٹے پر تو بھی بھگوان کی مستی اتنی [illegible] تھی کہ [illegible] ہاتھ پیر پھولنے لگتے تھے۔

[illegible] بھائی مورسند، اپنے [illegible]

لمحوں میں، تو ہم اپنی شکلیں گنوا چکے ہوتے ہیں اور صرف اپنے کرداروں کی شناخت کا سامان کر رہے ہوتے ہیں جو بھی ہیں ہمارے کے سارے وہی ہیں، ہم کیا، اور کون؟ ہمارے بعض مکتبی نقادوں نے خواہ مخواہ ایسے اشتہار کا سماں باندھ رکھا ہے جس سے تخلیق کاروں کو بھی اعزاز اور رتبے کی ترغیب رہے۔

بات کیا تھی اور کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ کسی فنکار سے بات کرتے ہوئے مجھے بھی یہی دقت درپیش رہتی ہے۔ بہرحال میں اپنے نوجوان دوست کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے ۔۔۔ ذرا سا ہی سہی ۔۔ اداس ہو پانے کا موقع عطا کیا۔ گذشتہ کئی دن سے مجھے اپنا آپ بڑا مطمئن اور مسرور معلوم ہونے لگا تھا اور سمجھ میں نہیں آ یا رہا تھا کہ اس عذاب سے باہر کیوں کر آ پاؤں۔

چٹھی کافی لمبی ہو گئی ہے۔ مگر آپ بھی تو ایک مدت سے شکایت کر رہے تھے کہ میں نے کوئی کہانی کیوں نہیں بھیجی۔ لیجئے۔ فی الوقت تو یہی کہانی ہوئی ہے۔ غیر مطبوعہ ہے، بڑے اطمینان سے چھاپ لیجئے۔

میرا یار کلام حیدری آج کل آپ کے یہاں ہی جمعی منا رہا ہے۔ ملاقات ہو تو میرا اسے میری رام رام کہئے (رام رام کہتے ہوئے آنجہانی رام بھگتوں سے ڈر لگتا ہے۔ رام ہی بچائے)

● جوگندر پال، دہلی

ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب نے اپنے مضمون میں کسی حد تک غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں حالات اور واقعات سے مکمل طور پر آگاہی نہ ہو۔ موصوف نے آپریشن بلو سٹار کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اندرا گاندھی کے حکم سے گولڈن ٹمپل کو مسمار کر دیا گیا تھا۔ یہ غلط ہے۔

گولڈن ٹمپل کامپلکس میں کئی عمارتیں ہیں۔ ان میں سورن مندر یا ہری مندر وہ عبادت گاہ ہے جسے گولڈن ٹمپل ہی کہا جاتا ہے جب جنرل سنگھ بھنڈراں والے نے اس کامپلکس پر قبضہ کر کے اسے فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تو ملک کی سالمیت کی لئے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اندر اسلحہ اور مہلک ہتھیار اتنی تعداد میں تھے کہ پولس اور سی۔آر۔پی۔ الیف برسوں لڑائی جا سکتی تھی، کیونکہ باہر سے سپلائی جاری تھی۔ بھنڈراں والے نے ایک سوال حل کیا تھا کہ فی سکھ پینتیس (۳۵) ہندو حصہ میں آتے ہیں مار ڈالو سب کو۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا کرتا تھا کہ اس کی ایک آواز پر پاکستان مدد کو آجائے گا۔ اگر اس کا پلان کامیاب ہو جاتا تو پنجاب اور جموں کشمیر کا علاقہ ہندوستان سے کٹ کر پاکستان میں شامل ہو چکا ہوتا۔ اس صورت حال سے مجبور ہو کر فوجی کارروائی کرانی پڑی جیسا کہ سعودی عرب میں ایک بار کرنے کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ کیا یہ اندرا گاندھی کی حماقت تھی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اندرا گاندھی

منٹ میں ہزاروں گولیاں، راکٹ اور گولے آرہے تھے۔ حملہ اکال تخت پر کیا گیا تھا، جس پر بھنڈراں والا قابض تھا اور جسے سکھ مذہب کے خلاف ورزی کرتے ہوئے ہتھیاروں کا بھنڈار اور چھاؤنی بنا دیا گیا تھا۔

راجیو سنجے گاندھی کی ہوائی حادثے میں موت کی بات، اگر یہ خدا کی طرف سے سزا تھی تو صدر مملکت جناب ضیاء الحق صاحب کی موت کیا تھی۔ لنکن، کینیڈی، گاندھی اور بیسیوں دوسرے نیتاؤں کی شہادت کس زمرے میں آتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک تعلیم یافتہ، بزرگ ہیں۔ کم از کم مشرقی تہذیب کا لحاظ رکھتے ہوئے اندرا گاندھی کے ساتھ شریمتی تو لکھ دیتے۔

دوسرا مضمون جناب ڈاکٹر سید ابوالفیض صاحب کا پڑھا جن اردو کے افسانہ نگاروں اور شاعروں نے اردو ادب و زبان کو نئے رنگ و آہنگ، نئی تکنیک، نئے موضوعات اور نئی طرز اظہار سے روشناس کرایا ہے ان میں جوگندر پال، سریندر پرکاش، بلراج مینرا، بانی، کمار پاشی، اور بلراج کومل بھی شامل ہیں۔ کیا مضمون نگار بھول گئے یا دانستہ ان ناموں کو نظر انداز کر دیا۔ ہو سکتا ہے اس طرح انہوں نے اپنے کسی خاص جذبے کی تسکین کر لی ہو لیکن یہ ادبی ایمانداری نہیں ہے۔

یہ شمارہ مجموعی طور پر اچھا ہے۔ کچھ مضامین تشنگی کا احساس چھوڑ جاتے ہیں۔

٭٭ نشتر ولی کمان دروازہ امرتسر

سہیل کا تازہ شمارہ "فن اور فن کار" قابل ستائش اور لائق آفریں ہے۔ نئے فن کاروں پر بھی کچھ مضامین شامل کر کے آپ نے گویا یہ ثابت کر دیا ہے کہ "ادب میں اجارہ داری" کے آپ قائل نہیں ہیں۔

محترم تارا چرن رستوگی کا مضمون (سید مظفر حسین برنی اور تنظیم اقبالیات) معلوماتی ہے اور اس سے روشنی بھی ملتی ہے۔ ادب میں جب لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اپنی یادوں کو سمیٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ مضمون کسی بھی شخصیت سے متعلق کیوں نہ ہو اپنی یادوں کے حوالے کے بغیر بات ممکن نہیں ہو پاتی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کا ناجائز استعمال بہت ملتا ہے اور تحریر میں بے ربطگی بھی جھلکتی ہے شاید ان کی پیرانہ سالی اور ضعیف العمری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہو لیکن یہ بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ ان کے پاس الفاظ اور معلومات کا بے پناہ ذخیرہ ہے جسے سمیٹنے کی کوشش میں بہک بھی جاتے ہیں مگر یہ کیا کم ہے کہ اس عمر میں بھی وہ ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ موت ان کے تعاقب میں ہے مگر وہ اپنا اشہب قلم دوڑا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مضامین پر تنقیدی نہیں تعاطفی نگاہ ڈالنی چاہیے۔

عالمی شہرت یافتہ ادیب خوشونت سنگھ سے ظفر حمیدی کی ملاقات انتہائی مختصر اور تشنہ رہی۔ قارئین کی معلومات میں اضافہ کی خاطر نفس ملاقات تک مضمون کو محدود نہ رکھتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ خوشونت سنگھ کی جس وسعت نظری، روشن خیالی سے وہ متاثر ہیں وہ ہر بڑی شخصیت میں پائی جاتی

ہے خوشونت سنگھ تو لبرل ہیومنزم پر ایمان رکھتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی دونوں روایات سے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے خود کو بھی ORIO-OCCIDENTAL- (مشرقی فرنگی) کہا ہے تو ظاہر ہے کہ ان میں نظریاتی تفتیح، وسعت، رواداری تو ملے گی ہی۔ ان کا ناول TRAIN TO PAKISTAN بھی انسانی ہمدردی اور حقیقت پسندی کی روشن مثال ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے ہولناک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ کس طرح مذہبی جذباتی لخروں میں الجھا کر سادہ اور معصوم لوگوں کو کچھ جنونی سکھ نوجوانوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے اکسایا تھا۔ بڑا تخلیق کار مذہب ذات پات سے بہت بلند ہوتا ہے۔ باغیانہ اور انحرافی ذہن کے باوجود بھی انسان درست نظریات کو خاص اہمیت دیتا ہے پھر تو پیغمبر ختمؐ کی پوری زندگی انسانیت کی فلاح و بہبودی میں گذری۔ ان سے عقیدت اور محبت تو ان کے دشمن کو بھی تھی۔ ہر کوئی انہیں صادق اور امین کہتا تھا۔

"سورج کی صلیب" کے شاعر صبا اکرام جنہوں نے ہجرتوں کا کرب سہا ہے اور ثبوت میں یہ شعر کہا ہے

صدیوں سے سہ رہا ہوں صبا بے گھری کا غم
نکلا تھا ایک بار میں اپنے مکان سے

اچھے تخلیق کار بھی ہیں۔ اچھی تنقیدی بصیرت بھی۔ انہوں نے جمیل الدین عالی کی غزلوں پر اعلیٰ مضمون لکھا ہے عصمت چغتائی بیسویں صدی کی شہزادی تھیں۔ ایک ہزار ایک راتوں کے بعد کی کہانی سنانے والی عصمت چغتائی نے نئے اسلوب کی طرح ڈالی اور کہانی کو اپنے جیسا روپ دیا۔ جو زبان وہ استعمال کرتی تھیں اس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ ان کے فکر و فن پر مسحور قیصر کا مضمون ٹھیک ہے۔

حسین الحق ادب پر چھائے ہوئے ہیں ان کے ناول (فرات) کے تخلیقی اسلوب نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ادبی حلقوں میں اس کے بارے میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر اتنا تو یقینی ہے کہ ناول عمدہ ہے اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر، شفق نے اپنے مخصوص اسلوب میں ان پر جامع تحریر لکھ کر ناول کی تفہیم کی راہیں آسان کردی ہیں۔

نئی نسل کے عمدہ شاعر محسن رضا رضوی پر رؤف خیر کا مضمون اچھا لگا۔ رضوی کے بعض اشعار بھی دل کو چھونے والے ہیں۔

جمال اویسی پر وصال احمد کا مضمون پڑھا تو ساتھ گزرے ہوئے چند لمحے یاد آگئے۔ کبھی وہ بھی اسی علی گڑھ میں تھے۔ مگر علی گڑھ کے نہ ہوسکے علی گڑھ ہر کسی کو راس نہیں آتا۔ یہ علی گڑھ تو ستم سہنے کے آداب سکھاتا ہے۔ ستم سہہ کر جنون کا ساز چھیڑنے والے، وفا کے گیت گانے والے بھی یہاں موجود ہیں کہ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہے کہ یہ ستمگروں کا شہر ہے۔ بے وفاؤں کی بستی ہے یہ دمشق مصلحت و کوفہ نفاق ہے۔ یہاں تعلق و چاپلوسی کی کلید سے در گنجینہ قارون کھل جاتا ہے اس ہنر سے ناواقف خدا کے سادہ لوح بندوں پر

رحمت کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ انتظار حسین نے سچ لکھا ہے کہ "جسے علی گڑھ نہیں بگاڑ سکتا اسے دنیا کی کوئی برائی نہیں بگاڑ سکتی" علی گڑھ نے اویس کے ساتھ بھی کچھ اچھا سلوک نہ کیا ــــ یہاں بھی انہوں نے مشقتیں جھیلیں اور انہیں تلخ تجربے ملے جس کی چھاپ ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے

● حقانی القاسمی (علی گڑھ)

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ
مضامین نظم و نثر کافی متنوع نہیں ــــ
نثری حصہ اچھا ہے۔ میری نظم غالب میں کتابت کی بہت سی اغلاط در آئی ہیں۔ دوسرے شعر میں 'مفکر' کی جگہ متفکر چھپا ہے جس کے باعث مصرع بے وزن ہو گیا ہے۔ دیگر اشعار میں بھی سہو کاتب کے جلوے نظر آتے ہیں ــ پانچویں شعر میں ہمہ گیر کی جگہ ہم گیر، شعر کے انکار کی جگہ شعر کے اعجاز شائع ہوا ہے ــــ پندرویں شعر میں میرزا کی جگہ میرا، سولھویں شعر میں 'اٹھتے' کی جگہ اٹھیں، اکیسویں شعر میں جبکہ' کی جگہ "جس کے" چھپا ہے۔
یہ خط ضرور شائع کر دیجئے گا تاکہ ان اغلاط کو قارئین مجھ سے منسوب نہ کریں۔

● کرشن موہن (دہلی)

سہیل کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔
عرض کروں گا کہ "دہلی کے چار شعراء" کے بارے میں ڈاکٹر رستوگی سے اختلاف رائے کا حق تو کسی کو بھی پہنچتا ہے جبھی تو موصوف نے اپنے مضمون کے اختتام پر بڑی شائستگی کے ساتھ کسر نفسی کا اظہار کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے: "ملحوظ رہے کوئی تنقید حرف آخر نہیں کہی جا سکتی۔ اگر کوئی نکتہ داں میری تردید کرتا ہے تو باور فرمائیں مجھے مسرت ہوتی ہے"۔
لیکن ہنسی آتی ہے جب ملک زادہ جاوید جیسا شاعر یہ کہے کہ "ڈاکٹر صاحب پہلے شعر کہنا شروع کر دیں۔ پھر شعراء کے کلام کے اچھا یا برا ہونے کے فن سے وہ آشنا ہو سکیں گے اور صحیح تنقید کر سکیں گے" (یہ شعرا کے کلام کے اچھا یا برا ہونے کا فن' کیا چیز ہے۔ ملک زادہ کی طرف سے یہ اختراع بھی خوب ہے) اس فصلی نوعیت کے شاعر کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ رستوگی صاحب اوائل عمر میں جعفر علی خاں اثر کے تلامذہ میں شعر بھی کہتے تھے۔ یاد رہے کہ اگر وہ شاعر ہی رہتے تو شاید وہ Comparative Literature کے نقاد کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت تک نہ پہنچ پاتے۔ ڈاکٹر صاحب کی شعر فہمی اور تنقیدی صلاحیت پر حرف زنی کے لئے یہ کافی نہیں کہ آپ رسالوں میں چھپیں یا اسعد بدایونی کی زمینوں میں اسی کے مصرعوں کو سرقاً اپنا کر مشاعروں وغیرہ میں داد تحسین کے کاغذی پھول بٹوریں۔
اس طرح شہپر رسول کی بات بھی بدمزہ سی لگتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ان کی تحریر مخاصمانہ

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

بانی:۔ حافظ عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی ★ یادگار:۔ زین العابدین احمر و ادریس سنہاروی

سُہیل گیا

ماہنامہ

شمارہ ۹۰ جلد ۵۳

بدلِ اشتراک

▲ فی شمارہ ——— ۵ر روپے
▲ زرِ سالانہ ——— ۵۰ر روپے
▲ لائف ممبری ——— ۱۰۰۰ر روپے

فہرست

★

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سُہیل
ریلوے سائڈ روڈ گیا (بہار)
فون:۔ ۲۱۵۷۳

آپسی میل ۔ ایکتا اور ہم آہنگی
قوم کی اصل طاقت ہے

زبان ، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا، یہ سبھی فرقوں، زبانوں، مذہبوں اور تہذیب وتمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ گووندر، ربندر اور قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت ملک کے گاؤں گھر میں گائے جاتے ہیں۔
کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے

آیئے ــــ ہم سب مل کو قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ :۔ محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ، بہار

80 PR (R-37) 93-94

" لو خود ہی اپنے دام میں صیّاد آگیا "

پاکستان میں انتخابات کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو دوبارہ وزیر اعظم منتخب کر لی گئی ہیں۔ ان کے کیبنٹ کی پہلی میٹنگ کشمیر کے معاملے پر ہوئی جس میں انہوں نے اپنی فوج کو تیار رہنے کا حکم صادر کیا ہے۔

پاکستان سرکار کے اس فیصلے سے ہمیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہے بلکہ ہمیں تو خوشی اس بات کی ہے کہ آخر ہمارے وزیر اعظم جناب نرسمہا راؤ اور وزیر مالیات جناب منموہن سنگھ کو تو اس بات کا پتہ چل گیا کہ سامراجیوں کی لاکھ چاکری کے بعد بھی وہ ان کا دل نہیں جیت سکتے۔ شائیلوک کو تو جگر کا گوشت چاہیئے وہ بھی پورے ایک پاؤنڈ۔ کیا دے سکیں گے ہندوستان کے وزیر اعظم جناب نرسمہا راؤ ہندوستان کے جگر کا ایک پونڈ گوشت؟ تب ہندوستان میں بچے گا ہی کیا ——

پاکستان میں مقیم امریکی امبیسڈر جان۔ سی۔ منرو نے کہا ہے کہ جموں کشمیر کا معاملہ متنازعہ ہے اور اگر ہندوستان اور پاکستان دونوں راضی ہوں تب واشنگٹن بیچ بچاؤ کر سکتا ہے۔ منرو کے اس بیان سے امریکی حکمرانوں کا منصوبہ ظاہر ہو چکا ہے۔ امریکی حکمراں کا یہ کہنا کہ کشمیر ہندوستان کا ایک ریاست نہیں بلکہ ایک متنازعہ مقام ہے ان لوگوں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے جنہوں نے بڑے زور و شور سے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ امریکہ اب پاکستان کو چھوڑ کر ہندوستان کی طرف آگیا ہے۔

پاکستان میں ہوئے عام انتخابات کے فوراً بعد اور ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں ہو رہے انتخابات کے ٹھیک پہلے کشمیر کے پاک حضرت بل درگاہ پر انتہاپسندوں کا قبضہ اور ٹھیک اسی وقت امریکی حکمرانوں کا کشمیر کو متنازعہ مقام قرار دینا ایک سوچی سمجھی سازش کا ہی نتیجہ ہے۔

((آیئے ! اس نازک گھڑی میں اپنی آزادی، عزت اور جمہوریت کی حفاظت کے لئے سامراجیوں، فرقہ پرستوں اور ان تمام طاقتوں کے خلاف جو ہمارے ملک کی آزادی، یکجہتی اور جمہوریت پر خطرہ پیدا کر رہے ہیں متحد ہو کر مقابلہ کریں اور ہماری مرکزی سرکار کو بھی اب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سامراجی ان کے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔

مسعود منظر،

رؤف خیر
حیدرآباد دکن

لفظیاتِ فیض

اس میں شک نہیں ہر دور کا اپنا محاورہ ہوتا ہے۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، بادہ و ساغر کی اصطلاحیں اور علامتیں مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے چھوٹی پڑ جاتی ہیں۔ دار و رسن، طوق و گلو اور زنجیر کی جھنکار سبک ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح صحرا، سایہ، دھوپ، سمندر اور ریت بھی بے مزہ لگتی ہے یعنی لفظ پر بھی معاشیات کا قانون تقلیل افادہ (LAW OF DIMINISHIN-G UTILITY) لاگو ہوتا ہے۔ کثرت استعمال سے لفظ اپنا آب و روغن کھو دیتا ہے۔ بعض علامتیں کلیشے CLICHE بن کر بار گزرنے لگتی ہے۔ یہ سب سہی مگر لفظ مر تو نہیں جاتا۔ زندگی نواز ہاتھوں میں آ کر مردہ لفظ بھی جی اٹھتا ہے۔ ظاہر ہے شعر و ادب کا سارا دار و مدار لفظ ہی پر تو ہے بس شرط یہ ہے کہ لفظ کو برتنے کا سلیقہ چاہیئے۔ شاعر کیا سوچتا ہے (موضوع) کس طرح سوچتا ہے (تخیل) اور اس سوچ کو کن لفظیات کے حوالے کرتا ہے اور انہیں کس طرح برتتا ہے۔ یہی سب کچھ اس کے تعین میں مددگار ہوتے ہیں۔ اس کی پہچان بناتے ہیں یہ اسلوب ایک رازِ غیر سربستہ (OPEN SECRET) ہے۔

معاشیات ہی کے اصول (LAW OF UTIL-ITY RETURN) کے تحت فیض نے لفظ کی زندگی بڑھا دی ہے۔ وہ لفظ جنہیں چھونے سے دیگر شعراء کتراتے رہے۔ فیض نے اپنا جادو جگا کر ان کا حسن بڑھا دیا۔ گل، گلچیں، صیاد، قفس جیسے بے روح الفاظ فیض کی مسیحا نفسی سے یہ روپ اختیار کر جاتے ہیں۔

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

بقول احمد ندیم قاسمی:-

" فیض نے اردو غزل کی مروجہ لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیوروں سے برتا کہ ان لفظوں کے آفاق پھیل گئے۔ وہ فیض کے لہجے سے تازگی حاصل کر کے نئے مفاہیم سے لد گئے ہوا فیض نے CLICHE کلیشے پر قلم باذن اللہ

سلہ فیض نمبر "شبستان" دہلی ۱۹۸۵ء

کہتے ہوئے اسے حرفِ رازدار PASS WORD
یعنی سم سم بنا لیا۔ جیسے

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

یہاں "بے وجہ" سم سم کی طرح اک جادوئی لفظ ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یہاں سارا حسن "کاروبار" سے پیدا ہو رہا ہے

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

بام پر آنا یہاں جو مزہ دے رہا ہے وہی فیض کا حصہ ہے۔

ضلع جگت سے فیض کو کوئی علاقہ نہیں مگر بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر دیکھئے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

مصحفی و مومن نے جس مضمون کو پامال کر کے رکھ دیا تھا اس کو پھر بام تک پہنچا دیا ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

[illegible] سارے لفظوں میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ موضوع، تخیل اور لفظ پرانے [illegible] ہونے کے باوجود محض سلیقۂ اظہار کی وجہ سے اک نئی معنویت لے کے ابھرتے ہیں۔ [illegible] اک غیر ادبی مثال دینا چاہتا ہوں کہ فیض [illegible] OLD GOLD کے قائل ہیں۔ فیض کے پاس جو OLD SCRAP ہے وہ اسے ردی کے بھاؤ نہیں بیچتے بلکہ اس پرانے ذخیرے کی پالش کر کے، اسے چمکا کر، وقت سے ہم آہنگ کر کے، نئے مال سے زیادہ قیمت پر بیچتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ MADE IN JAPAN اور MADE IN ENGLAND مال کا جنون [illegible] کریز عام ہے

غالب نے جس خلش کو جگر کے پار ہونے والے تیرِ نیم کش کی صورت میں دیکھا تھا فیض نے اس کی تصویر یوں کھینچی۔

وہیں ہیں دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

غالب نے اپنی قیمت یوں لگائی تھی ؎

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

اور چشمۂ فیض ملاحظہ فرمائیے۔

ہنر کے مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

اظہار کے فرق سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے ؎

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

فیض نے اپنے دور کی عکاسی اپنے لہجے اور موجودہ محاورے میں کچھ اس طرح کی ہے ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

دیر و کعبہ اگر وا نہ ہو تو غالب اپنی خود بینی و خود آرائی

ماہنامہ سہیل گیا

کی دہائی دے کر لوٹ جاتا ہے ۔ اور فیض لوٹتے ہوئے کہتے ہیں ؎

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

اور اس غزل کا اک شعر ملاحظہ فرمائیے ۔ دل اور دستِ عدو کا فرق سمجھانے میں فیض کس نازک مقام سے گزر گئے ؎

وہیں لگے ہیں جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

غالب :-

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

فیض :-

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

امیدوار کی وجہ سے شعر کا لطف کہاں سے کہاں پہنچ گیا نہ صرف یہ کہ فیض نے پرانے موضوعات اور پرانی لفظیات کو نئی زندگی دی بلکہ وہ نیا لہجہ بھی دیا جو سکۂ رواں کی طرح ہاتھوں ہاتھ چلا ۔ اردو شاعری میں "آشیاں سازی" — آشیانہ بنانا ۔ آشیانہ تعمیر کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے حتیٰ کہ مجدد شعر علامہ اقبال نے بھی حرف نہی کے ساتھ شاہیں کی اک خصوصیت بتائی تھی ؎

پرندوں کی دنیا کا درویش ہے یہ
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

مگر فیض کا لہجہ دیکھیے کہ پیرایۂ اظہار کو کتنی وسعت دے دی ؎

کسی خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کسی نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

"آشیاں کردن" سے استفادہ سہی مگر اردو ٹکسال میں ڈھل کر تو یہ سکہ نکلا ۔ اسی انداز کا اک اور اجتہادِ لفظی ملاحظہ فرمائیے ؎

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

اور اسی غزل کا اک اور غضب کا شعر سنئے اور آج کی زندگی اس میں ڈھونڈیئے ؎

جو کچھ بھی بن نہ پڑا فیض لٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

مختصر یہ کہ اردو غزل کی مروجہ لفظیات کو حیاتِ نو ملی بلکہ فیض نے اردو غزل کو نیا لہجہ، نئی لفظیات بھی دیں اور ایسے دور میں جب غزل ہی کو فرسودہ صنف سمجھ کر مسلسل نظر انداز کیا جا رہا تھا ۔ فیض نے غزل کو وقار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی سینے سے لگایا تو نئی نظم کا دم بھرنے والوں کے چہرے اتر گئے ۔ نظم کے میدان میں بھی فیض نے اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑ دیئے ۔ اقبال کے یہ فرمانے کے باوجود کہ ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

وہ مداری ہر دور میں رہا ۔ اقبال سے پہلے بھی تھا اور بعد بھی رہا ۔ چنانچہ سرمایہ داری پر ہر دور میں طنز ہوتا رہا ۔ غالب نے کوہکن کے حوالے سے طنز کیا تو جوش ملیح آبادی نے تاجدارانِ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام، ہم غلامانِ ازلی کا پیام کے ذریعہ اسے ہدفِ ملامت بنایا ۔ فیض کی انفرادیت یہاں بھی ابھرتی ہے ۔ "کتے" ان کے یہاں مظلومیت کی علامت ہیں مگر اپنے آقاؤں کی ہڈیاں چبا سکتے ہیں

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے

تو انسان سب سرکشی بھول جائے
بس شرط اتنی ہے کہ ؎
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

فیض جس دور میں سانس لے رہے تھے وہ تمام تر نفرتوں کا دور تھا۔ سامراجیت سے نفرت، غلامی سے نفرت، پھر آزادی کی شب گزیدہ سحر سے نفرت، جا بجا کوچہ و بازار میں بکتے ہوئے جسموں کی مجبوری سے نفرت۔ اتنی ساری نفرتوں کے بیچ رہ کر بھی فیض کا لہجہ کھردرا ہونے نہیں پاتا بلکہ اسی متانت سے جو فیض کی پہچان ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

وہ جاتے جاتے اپنی محبوب سے اپنے جانے کا جواز بھی بتاتے جاتے ہیں۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ...
اب بھی دلکش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجئے...
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں جسم کی راحت کے سوا

رقیب سے نفرت اک لازمی امر ہے جیسا کہ اردو شاعری بھی اس سے بھری پڑی ہے ؎

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مگر فیض نے اردو ادب میں پہلی دفعہ رقیب کے لئے بھی نفرت کے بجائے نرم لہجہ اختیار کیا محض اس لئے کہ ؎

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

اس سلسلے میں فیض حق گوئی و بیباکی پر اکساتے بھی ہیں تو محض نفرت کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سُرخ ہیں آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

فلسطینی بچے کے لئے لوری بھی گاتے ہیں تو نفرت کی فضا میں بھی اسے زندگی سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے فیض ہی کے لہجے میں یہ کہنا چاہوں گا۔

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے جرأت تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

(اعمو...)

شروَن کمار ورما
امرتسر

(مزاحیہ)

مشاعرہ برائے فٹ پاتھ

فٹ پاتھ کی اہمیت کا احساس ہمیں اس کل بلدیاتی امدادی مشاعرہ میں ہوا، جس کا انعقاد کارکنانِ بلدیہ نے ٹھیکیداروں کے مالی تعاون سے کیا تھا۔ اس مشاعرہ کی کامیابی کا سہرا ان خواتین کے سر تھا جو سردی کے باوجود کم لباس اور زیادہ میک اپ میں آئی تھیں۔ مرزا غالب کے مصرع ــــ دھوکا دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا ــــ کا مطلب ہم پر اس مشاعرہ میں واضح ہوا۔ ایسی خوبصورت اور جامع تشریح اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

سامعین کی اگلی قطاروں میں جوان اور خوبصورت نظر آنے والی خواتین کی بھرپور نمائندگی سے بہت سے شاعروں کے منہ پر رونق آگئی تھی۔ ہر شاعر غزل سنانے سے پہلے منتظمینِ مشاعرہ کی بے پناہ [illegible] مصروفیتوں اور ذوقِ سلیم کی تعریف کرتا اور امید ظاہر کرتا کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح خدمت [illegible] کرتے رہیں گے۔

مشاعرہ کا تعلق دریا [illegible] سے تو ہو سکتا ہے فٹ پاتھ سے نہیں۔ خیر یہ ڈیموکریسی کا زمانہ ہے ــــ جو ہو جائے کم ہے۔ مرزا سے کر کسی موہوم سی کمر والے غنچہ دہن، سیم تن، نازک بدن، آہوئے فتن، خنجر بکف، محوِ آرائش، خمِ کاکل، ہرجائی قسم کے ایسے جابر و ظالم محبوب کا خیال تو آ سکتا ہے جس کے رخساروں پر خطِ سبزہ افعی بن گیا ہو۔ اور جو عدو کو ساتھ لئے عاشق کے مزار پر بعد از قتل، جفا سے توبہ کرنے کے ارادے سے آئے اور شاعر بے چارہ پکار پکار کر خدمیں سے کہے ــــ "ہم رے کو مسلمان جلایا نہیں کرتے" لیکن فٹ پاتھ یاد نہیں آتا۔

خیر وہ مشاعرہ فٹ پاتھوں کی خستہ حالی اور گم شدگی کو مدنظر رکھ کر ہی کرایا گیا تھا۔ طرحی غزل کے ساتھ غیر طرحی غزل سنانے کی بھی اجازت تھی۔ شاعر حضرات دیدۂ تر، آہِ نارسا، نالۂ نیم شب، دامنِ تار تار، غبارِ راہ اور رہ کی منزل گمشدہ کا ذکر کرتے تو سامعین خوب داد دیتے۔ جب ایک شاعر نے یہ شعر پڑھا

رہ گزر [illegible]

جس کو ہو ناز و سر [illegible]

تو سامعین یکدم سنجیدہ اور رنجیدہ ہو گئے۔ ٹھیکیدا

کارکنانِ بلدیہ شیم، شیم، کے نعرے بلند کرنے لگے۔ جناب صدر جو کارپوریشن کے میئر بھی تھے اور اتفاق سے سرکاری ٹھیکیدار بھی، نے تو باقاعدہ واک آؤٹ کر جانے کی دھمکی، بیٹھے بیٹھے دے دی۔ ناظم مشاعرہ نے انہیں سمجھایا کہ وہ حزبِ مخالف کے لیڈر نہیں ہیں۔ موقع اور خواتین کی نزاکت کے مدنظر بیٹھے رہیں۔ یہ بھی گوش گزار کیا کہ ابھی ویڈیو فلم بھی بننی ہے۔ اس شاعر کو زبردستی بٹھا کر ایک خوش شکل و خوش گلو و خوش لباس شاعرہ کو زحمتِ کلام دی گئی۔ خاتون نے آتے ہی مائک کچھ اس انداز اور مضبوطی سے تھاما جیسے پختہ عمر میں شادی کرنے والی، میاں کی کلائی پکڑتی ہے۔ —— چلے جانا نہیں —— والے انداز میں۔ پھر لہک کر شعر پڑھا ——

لبسوں، موٹروں سے بچ کر اگر آسکو، تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں فٹ پاتھ اب نہیں ہیں

پنڈال، بہت خوب، مکرر، مکرر کے کلمات سے گونج اٹھا۔ مشاعرہ کے بے مثال کامیابی کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب پچھلی نشستوں سے لئی آوازیں بلکہ آواز ایک ساتھ سنائی دیے۔ کوئی مضائقہ نہیں، آجائیں گے —— اگر مشاعرہ پولیس کی نگرانی میں نہ ہو رہا ہوتا تو شاعرہ کے ساتھ ساتھ زیورات اور عزت و آبرو بھی لٹ جاتی۔ ہم مشاعرہ کی کامیابی کا یہ انداز دیکھ کر وہاں سے کھسک لئے۔ گیٹ پر سنتری نے ٹوکا۔

"کدھر ——؟"

ہم نے قسمیں کھا کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی، ان سفید بالوں اور پچکے گالوں کے ساتھ گھر کے سوا کہاں جا سکتے ہیں۔ وہ نہیں مانا۔ دس کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھونسا تو اسے ہماری شرافت اور نیکی پر یقین آیا۔

آخری شعر جو ہم نے سنا وہ کچھ اس طرح تھا۔

جن پر جواں ہوئے تھے وہ سڑکیں کہاں گئیں
میرے عظیم شہر کے فٹ پاتھ کیا ہوئے

اس شعر کے ساتھ ہی جیسے فٹ پاتھ ہمارے ذہن پر سوار ہو گئے۔ آخر یہ کمبخت گئے کہاں۔ چھپے تو گئے نہیں جو ادھر اُدھر ہو گئے۔ ہم راہ چلتے لوگوں کو روک روک کر پوچھنے لگے —— بھائی، فٹ پاتھ کہاں چلے گئے۔ ایک نوجوان تو لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ "میں یہاں نوکری ڈھونڈنے آیا ہوں —— فٹ پاتھ نہیں"۔ ہم نے بلدیہ کے دفتر میں جا کر دریافت کیا۔ چپراسی نے بیس روپیہ لے کر ہمیں وہ رجسٹر، نقشے وغیرہ دکھائے جن میں فٹ پاتھ موجود تھے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

اس سوال پر پہلے تو لوگوں نے ہمیں حیرت سے دیکھا، پھر حسرت سے دیکھنے لگے۔ پھر ہنسنے اور آخر کترانے لگے۔ ایک بھکاری نے کمال مہربانی سے بتایا کہ وہ فٹ پاتھ پر پیدا ہوا تھا۔ وہیں اس کا بچپن گزرا۔ وہیں اس نے اپنا یہ آبائی پیشہ شروع کیا۔ اب وہ بھی اس کی تلاش میں ہے —— کارکنانِ بلدیہ نے پولس والوں سے مل کر انہیں رفاہِ عام کے خیال سے نیلام کر دیا ہے۔

ہماری دن بہ دن بگڑتی ذہنی حالت کو دیکھ کر بیوی کو بھی تشویش ہوئی۔ بولی —— "میں نگوڑی، کرم جلی، پہلے ہی شرمندہ ہوں تم سے شادی کر کے، اب تم اور میرا امتحان مت لو —— میں پر جماعت ہو فین ہوتی رہی ہوں۔ فٹ پاتھ کی تلاش چھوڑو —— زندگی کو

بہتر بناؤ۔"

"وہ کیسے۔"

"رشوت لے کر۔" بیوی کے بھائی نے جواب دیا

"عقل کی بات کبھی ان کے بھیجے میں نہیں آئی۔ ابھی بات بری لگتی ہے۔ رشوت لیتے تو آج گھر کی اور ان کی، یہ دُر دِشا نہ ہوتی۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہی۔"

"دھوکہ بھی نہیں۔" ہم نے پوچھا

بیوی کے تیور بگڑتے دیکھ کر ہم اپنے اندر اتر گئے کہ کہیں اور تو جا نہیں سکتے تھے۔

"تم یہ بیٹھے بٹھائے کہاں غائب ہو جاتے ہو۔" بیوی نے ناراضگی سے کہا۔

"غائب نہیں۔ بھاگیہ وان، اپنے اندر اتر جاتا ہوں۔ آج کل تمام مفکرین یہی کرتے ہیں۔ جدیدیت کا بھی یہی تقاضہ ہے۔"

"بھاڑ میں جائے تمہاری جدیدیت۔ میری اور ان آٹھ بچوں کی زندگی تباہ کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ تم باہر ہی رہا کرو۔ آئندہ تم اس طرح کبھی اندر اترے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔

"وہ تو پہلے بھی نہیں ہے۔"

"کیا کہا۔ مائکے چلی جاؤں گی۔ بھائی کے ساتھ۔ نہیں مائکے نہیں جاؤں گی۔ بھوک ہڑتال پر بیٹھ جاؤں گی۔ اور جوس لیا کروں گی۔" گھر کی جھڑکیوں سے جب ہم خوفزدہ نہیں ہوئے اور ذہنی حالت میں جب کوئی سدھار نہیں ہوا تو وہ ہمیں فیملی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر کی نئی اسسٹنٹ نے جب ہماری کلائی تھامی تو بیوی نے جب سے ہاتھ کھینچ لیا

"تم رہنے دو جی، انہیں کوئی زنانہ بیماری نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر نے تفصیلات سن کر کہا۔

"پریشان مت ہوں۔ ان کے اندر کچھ نہیں ہے۔"

"اے لو، بالکل خالی ہی کیا۔ وہ موئے دل، جگر، گردے کچھ بھی نہیں۔ ہائے، یہ تو سچ مچ شاعر ہو گئے۔"

"ہمارے اندر خلا ہے، اندھیرا ہے، تنہائی کا آسیب ہے۔"

"پھر وہی سیب۔ اس سیب نے جنت میں مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ اب میرے گھر میں۔ تم سیب نہیں کھاؤ گے۔"

"میڈم، انہیں خطرہ سیب سے نہیں شاعروں سے ہے۔ انہیں شاعروں میں مت جانے دیں یا خود ساتھ جایا کریں۔

"لو اور سنو، میں تو کہیں نہ جاؤں۔ وہاں تو بڈھے بڈھے شاعر بھی اپنی خستہ حالی، لمبے الجھے بالوں، میلے کپڑوں اور ہونق چہروں اور پریشانیوں کا ڈھیر دار ہم عورتوں کو ٹھہراتے ہیں۔ موئے شادی کے بعد بھی پرائی عورتوں سے عشق کرتے ہیں۔ میں تو یہ مسئلہ وومن ویلفیئر ایسوسی ایشن میں اٹھاؤں گی۔

"انہیں شاعری سے پرہیز لازم ہے۔"

"مجھ پر تو ایک آدھ شعر کہہ سکتے ہیں نا۔"

"ان کے لیے خطرہ ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب کچھ کیجئے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ یہ تو راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر بستر میں قلم ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ پورے ... کا نقشہ لاکھو بیڈروم

میں لٹکا دیا ہے۔ کہتے ہیں جب نقشے میں فٹ پاتھ
ہیں تو شہر میں کیوں نہیں ملتے۔ اب دیکھئے، دنیا
کے نقشے پر تو خط استوا وغیرہ ہیں، دھرتی پر تو
نظر نہیں آتے۔"

"دوسرا راستہ ہے الیکٹرک شاک ـــ"

"یہ برزک میں نہیں لے سکتی۔ بار بار تو بجلی
چلی جاتی ہے۔"

فیملی ڈاکٹر نے ہماری فیملی کی حالت اور
سائز کے مدنظر کہا۔

"گھر سے جب نکلو، تو یہ سوچ کر چلو کہ فٹ
پاتھ پر چل رہا ہوں۔"

"یہ خود فریبی ہے۔"

"اگر کوئی جان بوجھ کر تم سے ٹکرا جائے تو
فوراً معافی مانگ لو۔ اگر وہ جیب کترا ہے تو دوسری
جیب اس کی طرف بڑھا دو۔ پولس والوں سے
اس طرح پیش آؤ جیسے تم "کرنسی دیک" منا رہے ہو۔"

فیملی ڈاکٹر کے دس اصول سن کر ہم گھبرا گئے ـــ
لیکن فٹ پاتھ کی تلاش جاری رکھی۔ اس سلسلے میں
انگریزی کے ایک استاد نے بتایا کہ فٹ پاتھ خالصاً
انگریزی زبان کا لفظ ہے اس کا ہندوستانی تہذیب
تمدن سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ملک کی اسی فی صد
آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ فٹ پاتھوں کے بغیر
ہی آرام سے جی رہی ہے۔ فٹ پاتھ ہی کیا اور بھی
بہت سی ایسی نعمتوں کے بغیر زندہ ہے۔ بیس فیصد
کے لئے کچھ کرنا ڈیموکریسی اور سیکولرازم کے خلاف
ہوتا۔ منشی پریم چند جو دیہی زندگی کے عکاس
مانے جاتے ہیں، کہیں فٹ پاتھ کا ذکر نہیں کرتے ـــ
بازار حسن میں بھی نہیں۔

پروفیسر: فٹ پاتھ تو تہذیبی ارتقا کی دلیل
ہیں۔"

"ان پر خاصی بدتہذیبی کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔"

فٹ پاتھ کے بغیر سڑک کا تصور ایسا ہی ہے
جیسے بنا کانوں کے چہرے۔ جانوروں میں بھی صرف
سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ توبہ کرنے کے لئے کانوں
کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح فٹ پاتھ بھی۔"

"اب لوگوں کا دھیان توبہ کی طرف نہیں جاتا۔"

"بڑے کانوں کے پیچھے بڑی شخصیتیں ہوتی ہیں۔"

"ہاتھی کے بارے میں کیا کہیں گے آپ۔"

"نیک، شریف، انسان دوست اور قابل
اعتماد جانور ہے۔ بادشاہ اسے جنگ اور جلوس
کے لئے استعمال کرتے تھے۔"

سزا کے طور پر بھی ـــ غریب کی ڈیوڑھی پر
ہاتھی بندھوا دیتے تھے۔

"یہ اونٹ کی طرح کینہ سوز نہیں ہوتا۔ شعر میں
بھی "شتر گربہ" کا عیب ہوتا ہے۔ فیل گربہ کا نہیں۔"

"اونٹ کو برا کہہ کر آپ عربوں کی دل آزادی
کر رہے ہیں۔ اس کے لاکھ ٹیڑھے میڑھے ہونے کے باوجود
دنیا کی کچھ بہترین عشقیہ داستانیں اس کے بغیر مکمل نہیں
ہوتیں۔ ناقۂ لیلیٰ ہی کو لے لیں۔ اونٹ کے بغیر اردو غزل
ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔

ناقۂ لیلیٰ۔ بے مجنوں بے چارے کے ساتھ کیا کیا کم
ستم، مجنوں پر اس کے طفیل کیا بیتی۔ اچھا ہوا کہ
برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں نہیں ہوتا۔ ورنہ
رومیو اور جولیٹ کی کمر دھچکوں سے ٹوٹ جاتی۔

فضا ابن فیضی

مئو ناتھ بھنجن

نہ سمندر، نہ صدف اور گہر میں دیکھو
جھانک کر میرے گریبانِ نظر میں دیکھو

اور کیا ہے، مری آتش نفَسی کا حاصل
اشک کی فصل اُگی دیدۂ تر میں، دیکھو

یوں ہی طے کرنا ہے اب تو شبِ ہجرت کا سفر
شمع روشن نہ کرو راہ گزر میں، دیکھو

آگ کی لپٹیں سی اٹھتی ہیں، کبھی چھاؤں کبھی
دھوپ بیٹھی ہے کہاں حبس کے شجر میں دیکھو

زندگی، فلسفہ، دانشِ آب و گل ہے
اس حقیقت کو نہ تم بیٹھ کے گھر میں، دیکھو

وہی سودا کہ ہے بدنام زمانے بھر کا
تم بھی، دو آنکھیں اگر رکھتے ہو سر میں دیکھو

زاویہ بدلو، کہ منظر بھی بدلتے جائیں
کبھی دیوار، کبھی روزن و در میں دیکھو

منزلیں سب کی، نہ لگ جائیں تمہارے پیچھے
نقش ابھرے نہ کوئی راہگزر میں دیکھو

وقت نے گھر کا خزانہ نہ چھپایا ہو کہیں
نقب تو کھول کے، دنیا سفر میں دیکھو

خبریں آسیب ہیں، جسموں سے چمٹ جاتی ہیں
اس کا کہنا ہے کہ اخبار نہ گھر میں دیکھو

بھیک میں، کون بھلا تم کو اُجالا دے گا
ڈال کر ہاتھ، ذرا جیبِ سحر میں دیکھو

بے در و بست معانی ہیں، یہ سارے الفاظ
تم، مجھے سلسلۂ حرفِ ذکر میں دیکھو

اے فضاؔ میں سہی، از دستِ شدہ کوئی چیز
دیکھ کر اس عیب کو، مرے ان ہنر میں دیکھو

فرحت شہزاد
کیلیفورنیا

وہی پرانی بات ہے لیکن نئی نویلی لگتی ہے
تم کیا میرے ساتھ ہوئے ہو، دنیا میری لگتی ہے

گل رت نے مہکا کر کلیاں خوشبو خوشبو کر ڈالی
وجد میں آج چمن کی مجھ کو ڈالی ڈالی لگتی ہے

ناچ رہی ہیں خوشیاں ہر سو گھنگھرو باندھے پیروں میں
آج دلہن امیدوں کی دل گھر میں اتری لگتی ہے

رنگوں کی برسات ہوئی ہے گویا میرے آنگن میں
چاندی جیسی چاند کرن بھی دھنک نہائی لگتی ہے

مستقبل کے اندیشے ویران نہیں اب کرتے حال
دھول گئے کل کے قدموں کی دل سے دھوئی لگتی ہے

خواب سجائے آنکھوں میں ہم تعبیروں سے ڈرتے تھے
آج مگر تعبیر کی دیوی رام ہوئی سی لگتی ہے

دنیا میں شہزاد کی جاناں تم ہو چاند محبت کا
اب ہر شب اس نگری میں پورنماشی لگتی ہے

غزلیں

کلیوں کو کمہلائے کون
ذکر خزاں کا لائے کون
تو مجھ سے ہے، میں تجھ سے
تجھ کو یہ سمجھائے کون
جیون الجھن ہے لیکن
یہ الجھن سلجھائے کون

مانا میں دیوانہ ہوں
اب تجھ کو جھٹلائے کون
سن کر میری غزلوں کو
جز تیرے شرمائے کون
جو خود میں ہی کھویا ہو۔۔
اس کو ڈھونڈ کے لائے کون
گلی گلی ہے ویرانی
صحرا میں اب جائے کون

میرا ہے تو بس میرا ÷ خوابوں پر اترائے کون
صحرا میں تنہائی کو ÷ تنہا چھوڑ کے جائے کون
شہر بنا ہو جب مقتل ÷ گیت خوشی کے گائے کون
تو نے جو شہزاد چنا ÷ وہ رستہ اپنائے کون

شباب للت

تمناؤں کے تپتے ریگ زاروں سے نکل آئے
بڑی مدت ہوئی ہم ان حصاروں سے نکل آئے

کناروں سے تماشا ڈوبنے کا دیکھنے والو !
اگر طوفان کوئی ان کناروں سے نکل آئے؟

بہاروں سے امیدیں ہم نے کیا کیا باندھ رکھی تھیں
مگر پہلو خزاں کے ان بہاروں سے نکل آئے

چمن میں زہر جو بوتے رہے برسوں تلک حالی
شگوفے آج اسی کے شاخساروں سے نکل آئے

جنہیں کچھ پاس غیرت تھا جنہیں تھی آبرو پیاری
وہ تیرے کاسہ لیسوں کی قطاروں سے نکل آئے

میں اپنی سیر گاہیں آسمانوں پر بناؤں گا
میرے راکٹ بہت آگے ستاروں سے نکل آئے

ذرا دم ہی لیا تھا ہم نے بس دشتِ تمنا میں
گناہوں کے درندے اپنے غاروں سے نکل آئے

اپیلیں امن کی بستی کی دیواروں پہ چسپاں تھیں
مگر دنگے نئے ان اشتہاروں سے نکل آئے

ملے رہبر کوئی مخلص تو شاید کارواں اپنا
تشدد کے بھیانک خارزاروں سے نکل آئے

نہ مل پائے سمندر سے جو اپنے، ہم وہ دریا ہیں
لٹے ہم راہ میں جب کوہساروں سے نکل آئے

شباب اس دور کی جدت پذیری واہ کیا کہنا

نشتر اکبرآبادی

" پونہ "

دنیا کو کسی پل بھی یہ ویران کرے گا
یہ کام کبھی بس دور کا انسان کرے گا

اس کو بھی رقیبوں نے خدا مان لیا ہے
اب کون مجھے آکے پریشان کرے گا

کھٹکے گا وہ کانٹا سا عزیزوں کی نظر میں
جو شخص مرتب مرا دیوان کرے گا

میں تیرے سوا کس سے کروں بات غزل کی
تو ہی تو غزل کی مری پہچان کرے گا

جس دل کو تعلق ہے حسین ابن علی سے
سچ بات کا ہر حال میں اعلان کرے گا

اے عشق ترا سلسلہ معلوم ہے مجھ کو
اک روز مجھے بے سر و سامان کرے گا

پھر لکھنے لگا ہے وہ امیروں پہ قصیدے
پھر کوئی کھڑا شہر میں طوفان کرے گا

دیگر

سہیل اختر

بھونیشور۔ اڑیسہ

مقتل تشنہ، منظر پیاسا
جیسے ایک سمندر پیاسا

بستی اپنی لوگ بھی اپنے
میں بھٹکا ہوں در در پیاسا

سو بھی جاؤ، خواب کا پنچھی
لوٹ نہ جائے آکر پیاسا

ہم نے اسے ممنون کیا ہے
جب لہرایا خنجر پیاسا

شعر لکھوں میں سیلابوں پر
بیٹھا اپنے گھر پر پیاسا

ہر ذرہ سیراب جنوں کا
شہر خرد میں اختر پیاسا

ملک زادہ جاوید

نوائڈا

دھڑ کسی کا اور سر ہے مختلف
قتل کرنے کا ہنر ہے مختلف

ایک بھی تصویر البم میں نہیں
میری یادوں کا سفر ہے مختلف

خشک شاخوں پر ہری ہیں پتیاں
میرے آنگن کا شجر ہے مختلف

آج چہروں پر مسرت تو ملی !
آج ٹی وی کی خبر ہے مختلف

سوکھ جاتا ہے پسینہ دھوپ سے
ان دنوں کچھ دوپہر ہے مختلف

ایک جیسے لوگ عنقا ہو گئے
عہد نو کا ہر بشر ہے مختلف

شاعری جاوید کی ہے منفرد
اس کے لہجے کا اثر ہے مختلف

احمد سعدی
سید پور، بنگلہ دیش

بے غرض مے سے سبو سے جام سے
بے تعلق ساقیٔ گل فام سے

میرا رشتہ درد سے آلام سے
آشنائی گردشِ ایام سے

دانہ رکھتے ہی اتر آئے پرند
اس قدر مانوس تھے وہ دام سے

ہر قدم پر غم سے یارانہ رہا
زندگی گذری بڑے آرام سے

اجنبی سب ہیں، سبھی نا آشنا
ہے فقط پہچان ان کے نام سے

حق پرستی کا ملا ہے یہ صلہ
یاد کرتے ہیں سبھی دشنام سے

جس سے چاہیں پوچھ لیں گھر کا پتہ
شہر میں سعدی ہیں کچھ بدنام سے

آر۔ پی۔ شوخ
شاہ آباد، مارکنڈا - ہریانہ ۔ ۱۳۲۱۳۵

شہر سے چل تو پڑیں سوئے بیاباں راہیں
خارزاروں میں ہوئیں چاک گریباں راہیں

ساتھ اس کا تھا تو جنگل میں رہے راہ کشا
اس سے بچھڑے تو ہوئیں ہم سے گریزاں راہیں

ضبط نے روک کے دیکھے ہیں بہت بار یہ اشک
آپ ہی آپ بنا لیتی ہیں ندیاں راہیں

میں تو اک موڑ پہ چھالے کی طرح بیٹھ گیا
ہو سکیں کاٹ کے مجھ کو بھی نہ آساں راہیں

ہم نے دیکھا ہے بدلتی ہوئی راہوں کا مزاج
چل پڑیں خوش، دو گھڑی ہو کے پشیماں راہیں

جانے کب سر ہوں سلاسل کے مراحل یارو
گیسوئے یار سے پہنچیں لبِ زنداں راہیں

غزلیں

حسن نظامی

شمشیر نگر، جھریا (بہار)

دل کی دہلیز سے باہر نہیں ہونے دیتا
کوئی ہے جو مجھے بے گھر نہیں ہونے دیتا

آگے بڑھنے کی بھی تحریک دلاتا ہے مجھے
پیچھے مڑنے پہ بھی پتھر نہیں ہونے دیتا

میرا سایہ بھی حریفوں کی طرح لگتا ہے
اپنے ہی قد کے برابر نہیں ہونے دیتا

زندگی آج بھی ہے میرے لئے دشت کنیا
اس کا عرفان ہی شنکر نہیں ہونے دیتا

ساری دنیا کو نئی راہ دکھاتا میں بھی
قافلہ غم کا ہی رہبر نہیں ہونے دیتا

مفلسی غم کو منور نہیں ہونے دیتی
خواب تعبیر کو بہتر نہیں ہونے دیتا

لوٹ آتی ہے ہنسی لب پہ پھر شام ڈھلے
مجھ کو مغموم وہ دن بھر نہیں ہونے دیتا

اپنی پہچان ضروری تھی نہیں تو اے حسن
جاہ کر وہ مجھے ہمسر نہیں ہونے دیتا

حنیف نجمی

راٹھ، ہمیر پور (یوپی)

کچھ فکر اگر ہے جسم کی اوقات کے لئے
اک گھر جلاؤ روشنیٔ ذات کے لئے

ہے روشنی تو خیر ضروری، مگر حضور
کیا گھر جلاؤں اپنا بس اک رات کیلئے

کچھ ایسے منکرینِ خدا بھی ہیں شہر میں
مشہور ہیں جو اپنی کرامات کے لئے

جس بات پر ہوں سارے زمانے سے میں خفا
روٹھا ہے مجھ سے وہ بھی اسی بات کیلئے

جس سے کوئی امید ہی باقی نہیں رہی
اب کون جائے اس سے ملاقات کے لئے

اب ان کے ذہن میں بھی ابھرتے ہیں کچھ سوال
اور ہم بھی مستعد ہیں جوابات کے لئے

نجمی انھیں کو شمس و قمر کہہ رہے ہیں لوگ
رسوائی کا سبب تھے جو دن رات کے لئے

اشتیاق حسینی

گذر جدھر سے ہوا ہم جہاں جہاں گذرے
لیے حیات قضاؤں کے درمیاں گذرے
جو سر سے باندھ کے نکلے کفن شہادت کو
وہ لوگ کوچۂ قاتل سے کامراں گذرے
لٹا دی جن کی محبت میں زندگی ہم نے
ہمارے پیار سے ہو کر وہ بدگماں گذرے
بہار آئی تو ایسا لگا نگاہوں میں
چمن سے جیسے خزاں ہی کا کارواں گذرے
نہ چھوڑ پائے جو نقشِ قدم کہیں اپنا
وہ لوگ گذرے جہاں سے تو بے نشاں گذرے
قدم زمیں پہ ہیں ثابت اگر تو کیا غم ہے
ہزار سر سے ترے قہر آسماں گذرے
نہ رہ سکے گی وہ روپوش چشمِ بینا سے
نگاہِ دل سے حقیقت اگر عیاں گذرے
وہ دے گئے مجھے ارشدؔ جو لمسہائے وفا
نہ جانے کیوں مرے احساس پہ گراں گذرے

مصطفیٰ مومن

یہ کس کی تصویر خواب سی ہے
جو سانس ہے وہ عذاب سی ہے
برس رہا ہے یہ زہر کیسا
بہار بھی اک عذاب سی ہے
نجانے کیا کہہ رہا ہے موسم
فضا مسلسل خراب سی ہے
شعاعیں بکھری ہیں ناگنوں سی
بدن پہ دھوپ آفتاب سی ہے
وہ اک نظر دل کی وسعتوں میں
چھپی ہوئی اضطراب سی ہے

غزلیں

آج کل رسمِ مہر و وفا جرم ہے
دو دھڑکتے دلوں کی دعا جرم ہے
دیکھنا جرم ہے سوچنا جرم ہے
اک کھلا جرم ہے اک چھپا جرم ہے
گوپیاں ہیں پریشاں سی اب بھی مگر
بانسری کی سریلی صدا جرم ہے
وقت بھی اب سنا ہی گیا فیصلہ
ٹھیک کیا ہے یہاں اور کیا جرم ہے
رنگ بدلا ہے کچھ ایسا ہر بات کا شمیمؔ
کل جفا جرم تھی آج وفا جرم ہے

مشرف عالم ذوقی
(دلی)

ترجمہ: تبسم فاطمہ

مسلمان

قسط ۱۱

دلی ۱۹۸۶ء — ۱۹۹۰

افروز نے ایک نگاہ مولوی صاحب کے چہرے پر ڈالی پھر نواب صاحب کا خط آگے کر دیا۔
عنایت اللہ ایک ہی نظر میں خط پڑھ گئے۔
"ہوں، کیسے ہیں نواب صاحب؟"
"اچھے ہیں۔"
"ہوں۔ تمہیں کام کی تلاش ہے۔"
"جی۔"
"یہاں کوئی عزیز؟ پرسانِ حال ہے؟"
"جی۔ کوئی نہیں۔"
"نواب صاحب بھی کمال کی چیز ہیں۔ جبوں جانتے ہیں کہ وہ نوابوں کا زمانہ ختم ہو گیا جب ہاتھی پالے جاتے تھے۔ اے لڑکی....."
مولوی صاحب نے ذرا زور سے کہا۔ معاف کرنا تمہیں برا تو لگے گا مگر بن بلائے مہمان کی دعوت کرنا آج کے دور میں ہاتھی پالنے کے برابر ہوتا ہے۔ روحانی روٹی گئی سادی جیباتی آ گئی۔ خیر۔ تم نے کہا، تمہارا یہاں جاننے والا کوئی نہیں۔

افروز کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ آدمی ہے۔ شکل و صورت سے بھی اکھڑ۔ دکھتا ہے کیا ہوگا۔ اگر اس آدمی نے اسے یہاں رکھنا پسند کیا تو، اتنی بڑی دلی۔ وہ کہاں جائے گی۔ کس کے پاس جائے گی۔

ٹھیک ہے تم اندر جاؤ۔ ابھی ہماری اک ضروری میٹنگ چل رہی ہے۔
مولوی عنایت اللہ اسے دوسرے در سے اندر لے آئے۔ آواز دی۔ "بیگم، ذرا دیکھنا آیا ہے۔"
"اچھا جی۔ آتی ہوں۔"
ذرا سی دیر میں شلوار جمپر میں، بھرے بدن کی ایک بوڑھی عورت نے اندر قدم رکھا۔ کی آنکھوں میں افروز کو دیکھتے ہوئے الجھن سی ہے۔ کسی رشتہ دار کا چہرہ بھی نہیں مل رہا ہے

دھان پان سی لڑکی ہیں۔
" یہ ہماری بیگم ہیں ۔" مولوی صاحب نے تعارف کرایا۔
افروز نے دیکھا۔ کسی زمانے میں خوبصورت رہی ہوں گی۔ اور خوبصورت ہی نہیں بلکہ دلکش بھی۔
" کہئے۔ کون ہیں ؟"
بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
" نواب الطاف حسین نے بھیجا ہے۔ کام کی تلاش ہے۔ کچھ دن ہمارے یہاں رہیں گی۔ گھبراؤ نہیں۔ جوان لڑکی ہے۔ بڑے بڑے روٹیاں نہیں توڑے گی۔ تمہارا ہاتھ ہی بٹائے گی۔
مولوی عنایت اللہ چلے گئے تو بیگم صاحبہ نے اشارہ کیا۔ ساتھ ساتھ آنے کا ــــ چہرے پر عجیب سی سنجیدگی طاری تھی۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ چہرے کی تراش خراش سے جھلک رہا تھا کہ قاعدے قانون کے معاملوں میں کافی سخت رہی ہوں گی۔ تھوڑی ہی دیر میں بیگم صاحبہ نے سارا گھر دکھا ڈالا۔ اور گھر کی تاریخ کا خلاصہ بھی سنا دیا۔ جیسے یہ کہ اس گھر کے دو حصے ہوگئے۔ پیچھے کا ایک حصہ مرمت کے بعد کرائے پر اٹھا دیا گیا۔ ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہوگئی۔ لڑکا مسقط میں رہتا ہے۔ بڑا لڑکا شبیر ہے۔ اس سے چھوٹا نسیم۔ دونوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ مولوی عنایت اللہ تو کچھ کرتے دھرتے نہیں ہیں۔ ویسے جو پیدا کرتا ہے وہ پالتا بھی ہے۔ جس کا جہاں کا رزق ہے اُسے ملتا ہی ہے۔ اب پھر ان کا کیا قصور، جس نے پرانے زمانے کی آن بان شان دیکھا ہو، وہ بھلا کافروں کی نظروں میں ذلیل کیوں ہو۔ وہ تو اللہ خیر ہوا کہ بیٹے سمجھدار نکل گئے۔ کرائے کے پیسوں سے ہی دونوں لڑکوں نے تجارت شروع کردی۔ آج صدر بازار میں اچھی خاصی دو دکانیں ہیں۔ آمدنی بڑھ رہی ہے۔" اے جی، ہاں کیا نام ہے اللہ کی بندی۔۔۔۔ افروز۔۔۔۔ وہ تو کہتے ہیں سب اللہ میاں مرضی ہے۔ جسے چاہے دے۔ جسے چاہے بھوکے مارے ــــ اور ایک بات جان لو ــــ جس کا رزق جہاں ہے، اسے ملتا ہی ہے۔ کسی کو دو وقت کھلانے سے گھر میں غریبی نہیں آجاتی۔ انشا اللہ کرم ہی کرتا ہے۔ پروردگار اوپر بیٹھا سب دیکھ رہا ہے۔ اور کیوں نہ دیکھے جی۔ ہم کسی کے محتاج ہیں۔ انشا اللہ سب کچھ اوپر والے کا دیا اس گھر میں ہے۔ زیادہ ہوتا ہے تو خیرات ہی کر دیتے ہیں۔ اب چلو ــ انشا اللہ کر کے تم نے گھر دیکھ لیا۔ اب بچوں سے بھی مل لوگی۔ ماشاء اللہ سب اچھے ہیں۔"
بیگم صاحبہ نے مولوی صاحب کے بارے میں بھی بتایا کہ زبان کڑوی سہی مگر دل کے نیک ہیں ــــ پردہ کے سخت قائل ہیں۔ کیا مجال سینے سے دوپٹہ زرا بھی اِدھر اُدھر ہو تو مسقط والی لڑکی جب آتی ہے تو وہ بھی مولوی صاحب کے سامنے آج بھی تھر تھر کانپتی ہے کہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔
رات کے ۹ بجے تک شبیر اور نسیم بھی دکان سے لوٹ آئے۔ افروز سے ان کا بھی تعارف کر دیا گیا۔ دونوں عام سے لڑکے تھے۔ جنہیں بیکار قسم کی باتوں سے زیادہ اپنے دھندے سے مطلب تھا۔
رات کے کھانے پر جب سب بیٹھ گئے تو مولوی عنایت اللہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا ــــ اتنے بڑے شہر میں تم اکیلی ہو۔ اور سب سے اہم بات

کہ لڑکی ذات ہو۔ دلّی کا تو خیر معاملہ ہی دوسرا ہے۔ کام ملنا تو آسان ہے لیکن عزت بچانی مشکل ۔"

" اکیلی لڑکی کے لئے تو عزت بچانی کہیں بھی مشکل ہے۔ چاہے شہر چھوٹا ہو یا بڑا۔

بیگم صاحبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

شبیر نے کہا " مسلمان لڑکیوں کا کام کرنا جائز نہیں ہے۔"

نسیم نے کہا " وہ بھی دلّی جیسے شہر میں۔ ابھی تم اس شہر سے واقف نہیں ہو۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ " ہم تو اپنے بچوں وبچیوں کی شادی کو لے کر بھی کافی محتاط ہیں۔ اب رخسانہ کا ہی لے لو۔ کتنی نسبت آئی۔ لیکن ہم نے بھی طے کر لیا تھا شادی ایسے گھر میں کریں گے تو شریف اور صاف خاندان میں ۔ اب ماشاء اللہ شبیر کو ہی لو ۔ نسبت ڈھونڈی جا رہی ہے ۔ لڑکیاں تو کئی ہیں۔ ہماری کوئی فرمائش بھی نہیں۔ لیکن بس ہم اتنا چاہتے ہیں کہ لڑکیاں بڑھی لکھی نہ ہوں۔ پڑھنے لکھنے سے لڑکیوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے ۔"

افروز کو برا لگا۔ کہیں اس تنقید کا محرک وہ تو نہیں۔

مولوی صاحب فوراً بولے ۔ " افروز کا معاملہ دیگر ہے۔ نواب صاحب نے خط میں لکھا ہے کہ اس کا پورا خاندان فساد میں شہید ہو گیا۔

شبیر اور نسیم کھاتے کھاتے رک گئے ۔

شبیر کے چہرے پہ ناراضگی کی ایک لہر آ کر ٹھہر گئی ۔ پتہ نہیں ان کافروں کو مسلمانوں سے کیا دشمنی ہے ۔ میرا تو خون کھول جاتا ہے یہ سب سن کر ۔"

نسیم غصے سے بولا " انہیں تو ۔۔۔"

پھر جانے کیا سوچ کر کہتے کہتے رک گیا۔ شاید اسے افروز کا خیال آگیا تھا۔

بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں ۔۔۔ ہاں تمہارے ساتھ تو مجبوری ہے۔ کماؤ گی نہیں تو کھاؤ گی کیا۔"

مولوی صاحب کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ پھیل گئی ۔۔۔ رومالی روٹی کی سادی چپاتی آگئی ۔ زمانہ کتنا بدل گیا ۔۔۔ فساد میں پولس کے جوان گھر گھر میں گھس کر مسلم عورتوں کی عزت تک لوٹنے سے نہیں چوکتے ۔ آزمائش کا دور ہے۔"

افروز ان پورے مکالموں کے دوران چپ ہی رہی ۔ وہ کیا کہتی کہ وہ اپنی پہچان بنانے آئی ہے لیکن کیسی پہچان ؟ یہاں کے لوگ اس لفظ کو کتنا سمجھ پاتے ۔۔۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر خاموش ہی رہی ۔۔۔

کسی نئے آشیانے کی تلاش تک اسے چپ ہی رہنا تھا۔

راجپوت ٹریول ایجنسی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے افروز کے ذہن میں مسٹر باوا کا صرف ایک ہی جملہ گونج رہا تھا ۔۔۔

" لو ویکنسی مس افروز ۔ تم مسلمان ہو مگر کرنا ۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں ۔ مسلمان لڑکیاں ایسی بہت کم ہوتی ہیں جو تمہاری طرح اسٹرگل کرنے باہر نکلتی ہیں ۔ تمہارے یہاں اس قدر پردہ ہے ۔ بائی دی وے ۔ آگے ویکنسی نکلی تو ۔ ۔ ۔ ۔"

ٹھک ٹھک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مسلمان . . . . .

تم مسلمان ہو . . . . . .

تمہارے یہاں اتنا پردہ جو ہے . . بائی دوے . . آگے . . . . .

کتنی ہی جگہوں پر اسے اس لفظ سے واسطہ پڑا تھا . . . مسلمان . . . . .

مسلمان نہ ہوا سڑے گوشت سے آتی بدبو ہو گئی ۔۔۔ کسی کو یہ لفظ گالی کی طرح لگا تھا اور کوئی ایسے چونکا تھا جیسے اچانک دھماکہ ہو گیا ہو۔

لیکن وہ حقیقت میں کیا تھی . . . . .

بائی اماں کے گھنگھرؤں کا رشتہ تو مذہب سے بس اسی قدر جڑا تھا کہ وہ نیاز اور فاتحہ کر لیتی تھی ۔۔۔

اس سے زیادہ . . . . .

لیکن یہ سچ تھا کہ وہ مسلمان تھی ۔

زندگی اس عجیب و غریب اتار چڑھاؤ نے اس کے اندر زہر ہی زہر بھر دیئے تھے ۔ ہر چیلنج اور رکاوٹ کو جھیلتے ہوئے وہ مضبوط اور بہتر ہوتی جا رہی تھی ۔ وہ لڑنا جان رہی تھی ۔ وہ بولنا سیکھ رہی تھی ۔ اب وہ صحیح معنوں میں دنیا دیکھ رہی تھی ۔ اس کی آنکھیں کھل رہی تھیں ۔

دلّی آنے کے بعد واقعات کا ایک کارواں چلا تھا ۔ مولوی عنایت اللہ کا گھر کوئی کم سیاسی اکھاڑا نہ تھا ۔ اور ان کے دونوں لڑکے . . . . جو زرا زرا سی بات پر بھڑک جاتے اور ہندو مسلمان نکالنے لگتے تھے ۔

ایک دن اس نے دلّی کی سیر بھی کی تھی ۔۔۔ مغلیہ دور کی عمارتیں بھی دیکھی تھیں ۔ اور اچانک سن سے رہ گئی تھی . . . . یہ کیسی ویرانی ہے . . . کیسی اداسی . . . شہنشاہیت وقت کے ملبے میں دفن ہو چکی ہے . . . مگر لوگوں کے ذہن میں آج بھی موجود ہے ۔۔۔ غلامی ہمیشہ زندہ رہتی ہے ۔

" تم مسلمان ہو . . . "

یہ لفظ ہتھوڑے برسا رہی تھی ۔۔۔

راجپوت ٹریول ایجنسی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے وہ ایکدم چونک گئی ۔

ہاں وہی لڑکا ہے ۔۔۔ وہی ۔۔۔ جو باہر انتظار میں بیٹھا تھا ۔ لمبا چوڑا ، گورا چہرہ ۔۔۔ چہرے پر چھائی ہوئی خوفناک اداسی ۔ وہ اسی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔۔

" معاف کیجئے گا ۔۔۔ "

افروز گھبرائی نہیں ۔۔۔

" کیا ہے . . ؟ "

" آپ . . . آپ کا اپوائنٹمنٹ ہو گیا کیا ؟ "

" نہیں ۔۔۔۔۔ "

" میں بھی کام کی تلاش میں آیا تھا ۔ "

اس کے چہرے پر مایوسی تھی

" تھوڑا ساتھ دیں گی آپ ؟ "

" جی ۔۔۔ "

" بس یوں ہی ۔ تھک گیا ہوں ۔ بات چیت کر کے تھوڑا دل بہلانا چاہتا ہوں ۔ "

" جی ۔۔۔ "

وہ ساتھ ساتھ چلنے لگی

" میرا نام شعیب ہے ۔ مسلمان ہوں ۔ گریجویٹ

ہو جانے کے بعد نوکری کی راہ نکلنے لگا ۔ یہ میری بے وقوفی تھی ۔ میرے کئی دوست تجارت میں چلے گئے ایک دوست نے سمجھایا بھی تھا ۔ محنت مت کرو ۔ کوئی فائدہ نہیں ۔۔۔ بڑی بڑی نوکریوں پر پہلے سے ہی ہندو امیدوار بیٹھے ہوئے ہیں ۔ تمہیں نہیں ملنے والی ۔۔۔"

" جی ۔۔۔۔" وہ بولے چلا جا رہا تھا ۔

" میری غلطی تھی ۔ میں یہ سب نہیں سوچتا تھا ۔ اپنے ٹیلنٹ پر بھروسہ تھا ۔ بہت جگہ عرضیاں دیں ۔ ۔۔۔ مگر ۔۔۔ نوکری کا ارمان لئے باپ انتقال کر گئے ۔۔۔ وہاں ۔۔۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں ۔ ۔۔۔ اس نے اشارہ کیا ۔۔۔

" جی ۔۔۔۔"

اس نے انکار نہیں کیا ۔۔۔ چائے کی میز پر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے ۔

اس نے پھر کہا ۔۔۔ آپ حیران ہو رہی ہوں گی کہ میں یہ سب آپ کو کیوں بتا رہا ہوں ۔ لیکن کبھی کبھی کوئی چہرہ ایسا لگتا ہے کہ اپنا پن کا احساس ہوتا ہے تب اندر سے آتی ہے کہ اپنا من ہلکا کر لو ۔ یہ وہ چہرہ ہے جسے تم اپنا دکھ بتا سکتے ہو ۔ معاف کرنا ۔ مجھے غلط مت سمجھنا ۔ میں بھی اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کو نوکری نہیں مل سکتی ۔۔۔ آخر مل ہی رہی ہے ۔۔۔ حکومت سے لے کر ہر جگہ اچھے اچھے عہدوں پر مسلمان مل جائیں گے ۔۔۔ پھر بھی ۔۔۔ اسے غلط طرح سے مت لیجئے گا ۔۔۔ تھوڑی بہت بے ایمانی تو ہے ہی ۔۔۔ کاسٹ ازم یہاں بہت زیادہ ہے ۔ میری سروس کی عمر نکل گئی ۔۔۔ لیجئے ۔۔۔ چائے پیجئے ۔

بیرا چائے رکھ گیا تھا ۔ افروز نے چائے پیتے ہوئے نوجوان کو غور سے دیکھا ۔

مایوسی کفر ہے ۔۔۔ میں کیا کروں ۔ اب یہاں پرائیویٹ دفتروں میں دھکے کھا رہا ہوں ۔ آپ ؟

" میں ۔۔ افروز تھوڑا جھجکی ۔۔۔

معاف کیجئے گا ۔ یہاں لڑکیوں کو نوکری ذرا جلد مل جاتی ہے ۔ قاعدے سے آپ کو بھی مل جانی چاہئے تھی ۔ کیوں ؟ ویسے آپ کی کوالیفیکیشن ؟

" میں فرسٹ پاس ہوں "

اس نے نظریں جھکا لیں ۔ آگے کے لئے راستے اچانک بند ہو گئے ۔

" اوہ ۔۔۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ۔ پھر ایک بے معنی قہقہہ لگایا ۔

" ویسے ہم نے شروعات ہی غلط کی ۔ یعنی جو بعد میں پوچھنا چاہئے تھا وہ پہلے پوچھ لیا ۔ سب سے پہلے تو آپ کا نام آتا ہے ؟

" افروز ۔۔۔!"

" آپ ۔۔۔۔ آپ مسلمان ہیں

وہ ایکدم چونک پڑا ۔

" یہاں کہاں رہتی ہیں آپ ؟"

" مجھے کام بھی چاہئے اور رہنے کی جگہ بھی ۔

" فیملی ؟

" کوئی نہیں "

" یعنی ۔۔۔۔؟ "

"شہید ہو گئے۔"

اس کا چہرہ اچانک فق ہو گیا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"مائی گاڈ ـــــ لیکن اکیلے آپ۔۔۔۔"

افروز نے محسوس کیا، وہ اس کی عمر اور اکیلے پن کا اندازہ لگا رہا تھا۔

"اتنی بڑی دنیا ـــ کوئی نہیں ہے ـ آپ کی ہمت کی داد دینی پڑے گی۔"

"کوئی ہمت کی بات نہیں ہے۔" افروز کو برا لگا۔

"ایک مجھے ہی کیا ـ میرے جیسے بہت سے لوگ ہیں ـــ بزدلی کی تھکا دینے والی کہانیاں ہی انسان کو کمزور بنایا کرتی ہیں۔ جیسے ایک جنگ آپ لڑ رہے ہیں، ویسے ہی میں لڑ رہی ہوں ـــ آخر فرق کیا ہے؟"

"آئی کانگریچولیٹ یو۔۔۔۔"

شعیب مسکرایا ـ بہت دنوں بعد ایک ایسی مسلم لڑکی ملی ہے۔۔۔۔۔۔

وہ ایکدم غصے میں آ گئی ـــ پھر وہی مسلم لڑکی۔۔۔ آخر کتنی مسلم لڑکیوں کو دیکھا ہے آپ نے۔۔۔؟ فلموں میں جھانکئے تو وہاں بھی سینکڑوں مسلمان لڑکیاں آپ کو نظر آ جائیں گی ـــ آخر مسلم لڑکیوں کا کام کرنا آپ جیسے ترقی پسند لڑکوں کو آج کے زمانے میں بھی کیوں عجوبا لگتا ہے ـ آخر اس میں بڑی بات کیا ہے ـ جیسے سب کرتے ہیں ویسے میں کرونگی۔

"آپ کے خیال سے قوت ملی ہے۔"

شعیب خوش خوش نظر آ رہا تھا

میں تو یہاں سے مایوس لوٹ کر گھر واپس ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔ لیکن ایک بات ہے ـ آپ برا تو نہ مانیں گی۔

"بالکل نہیں۔"

"آپ اکیلی ہیں۔ نوکری بھی کرنا چاہتی ہیں ذرا کچھ دن ـ کچھ دن ایک تجربہ کر کے دیکھتے ہیں۔ کیا ضروری ہے ہر جگہ مسلمان نام کو impose کیا جائے۔ کیوں، کیوں، کیا فرق پڑتا ہے۔

"مطلب؟" وہ چونکی

"اس سے تم زیادہ محفوظ رہو گی۔ یہ میرا اپنا تجربہ بتاتا ہے

اس نے پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"شیکسپیئر نے کہا تھا، نام میں کیا رکھا ہے؟ نام میں سچ مچ کچھ نہیں رکھا۔ لیکن وقت کے ساتھ نام پر اثر پڑا ہے۔ اب اگر تم نام بدلتی ہو تو اس سے تم بہت سارے بے مطلب سوال و جواب سے بچ جاؤ گی۔ مثلاً۔

۔۔۔ جیسے تم نے پہلے کہا۔ اتنا پردہ ہے۔ آخر تم مسلمان لڑکی ہو کر گھر سے باہر کیسے نکلی۔ کسی قسم کی کوئی سختی تو نہیں ہے؟ کہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔ خفا مت ہونا ـ ہمارے محدود معاشرے میں تم قدم قدم پر ایک سمجھوتا کرتی پاؤگی اور تمہارا جینا دوبھر ہو جائے گا۔"

"جی۔۔"

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی

افروز چپ تھی

"آؤ چلیں۔"

اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ٹھک ٹھک۔۔ تم مسلمان ہو۔ جیسے ہزاروں توپیں ایک ساتھ گرج رہی ہوں۔

وجے

ترجمہ: عزیز انصاری

انتقال

کمپارٹمنٹ میں ہم صرف تین مسافر تھے

ایک میں اور دو وہ ——

ہلکے سینٹ کی خوشبو سامنے کی برتھ پر لیٹی دوشیزہ کی طرف بار بار متوجہ کر دیتی تھی۔ اس بیمار عورت کے چہرے پر شام کے وقت ڈھلکے ہوئے سورج مکھی کا عکس ابھر اٹھتا تھا۔ ہڈیوں سے بھرا چہرہ — بونی چیکس! شاید گوشت پہلے بھی نہ رہا ہو۔ لیکن گہری اجلی کیف ضرور رہی ہوگی۔ مرد نے بڑے سلیقے سے اسے بستر پر لٹایا تھا۔ جو چادر گردن تک اڑھائی گئی تھی۔ اس پر کہیں شکن تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک اچھے ٹرینڈ نرسنگ ہینڈ کے ذریعے ہی ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ بینگنی رنگ کے صاف غلاف پر اس کا چہرا منو وہائٹ نام کی کہانی کی ہیروئن جیسا لگ رہا تھا۔ اور احساس ہو رہا تھا کہ کبھی بھی وہ بیدار ہو کر کھڑی ہو سکتی ہے۔ غلاف اور چہرے کے رنگ سے ایک عجیب سا کنٹراسٹ ابھر آیا تھا جیسے جامنی پلیٹ میں کسی نے چپے کے پھول [illegible] دیئے ہوں۔

مرد میرے پاس سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی عمر تیس سال ہوگی مگر اس کے پرکشش چہرے پر تھکان کا سایہ تھا اور آنکھیں دور کہیں افق کی کسی ٹیکری پر ٹکی ہوئی لگتی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا یہ آدمی اپنے اندر زندہ سرنگ میں سفر کرتا رہتا ہے۔ ڈرتے ہوئے! کھڑکی کے ساتھ ہلکا اندھیرا تیزی سے دوڑ رہا تھا اور بمبئی کے بازاروں میں روشنی جل اٹھی تھی۔ جیسے کسی گنبد پر بگلوں کے جھنڈ اڑ رہے ہوں۔ سلیٹی اندھیرے اور ہلکی پیلی روشنیوں میں بھی تکیہ اور دوشیزہ کے بونی چیکس والا کنٹراسٹ ابھرا ہوا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کنٹراسٹ کے ساتھ میری زندگی بھی کہیں نہ کہیں چسپاں ہے۔ بغل میں بیٹھا ہوا مرد مسلسل سگریٹ پیئے جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنی [illegible] یا بہن کی تندرستی کو لے کر بہت فکر مند ہے۔ مجھے یہی لگا۔ لیکن کوئی بات ایکدم پوچھنا فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں ہندوستان میں بھی تہذیب کے خلاف ہے جہاں آدمی اپنے سے زیادہ دوسروں کے بارے میں جاننے کو بے چین رہتا ہے... پاگل رہتا ہے جیسے کہ چھید سے

دوسروں کی زندگی میں جھانک کر اس کی تندرستی
ٹھیک رہتی ہو۔ میں جانتا تھا کہ یہ آدمی اور کچھ نہ
بولنے پر بھی رات ہونے سے پہلے مجھ سے اوپر کی
برتھ پر سونے کا اصرار ضرور کرے گا۔ جس سے وہ اپنی
بیوی یا بہن کی تیمار داری رات میں آسانی سے کر سکے
اور یہی رشتے والی بات کی جستجو مجھے پھر سے کریدنے
لگی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ
دھکیل کر بیرا اندر گھسا۔ اس نے تھرمس اس مرد
کو تھما دیا اور واپس جاتے ہوئے دروازہ بھی بند
کرتا گیا۔ کھڑکی سے سگریٹ باہر پھینک اس نے ایک
صاف گلاس میں تھرمس سے دودھ نکالا۔ ایک
صاف نرم تولیہ اس دوشیزہ کی گردن کے چاروں
طرف لپیٹ چمچہ سے دودھ پلانا شروع کر دیا۔ ایک
لٹ جو کھڑکی سے آئی ہوا سے چہرے پر آکر بکھر اٹھی
تھی اسے سہلا سہلا کر پیچھے کیا۔ دودھ پینے میں کمل
کی پنکھڑیوں جیسے کھلتے ہونٹ سنگ مرمر کی تراش
کا بہترین نمونہ لگ رہے تھے۔ تندرستی کی حالت
میں اس کی خوبصورتی اور ان سے ابھرنے والی مہک
کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہونٹوں
نے پیچھے بکھر اٹھے دودھ کو تولیہ کے نرم دباؤ سے
صاف کر مرد نے ہونٹوں میں ہی کچھ بدبدایا۔ معمولی
سی حرکت دوشیزہ کے ہونٹوں میں بھی محسوس ہوئی
اور مجھے لگا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے
قریب ہیں کہ ہونٹوں کی حرکت سے ہی بات اچھی طرح
سے سمجھ لیتے ہیں۔ لفظوں کی آواز کی انھیں ذرا بھی
ضرورت نہیں ہے۔ مگر آخر ان دونوں کے درمیان
کیا رشتہ ہے۔ جاننے کے لئے بیقرار ہو اٹھتا
ہوں۔

• دودھ پیتے وقت دوشیزہ کے گلے کی نسیں
قوس وقزح کی طرح ابھر آئی تھیں جو ان کے بے
مثال حسن کا ثبوت دے گئیں تھیں۔ اگر اس نے
پان کھایا ہوتا تو وہ بھی صاف دکھائی دے جاتا۔
لگ رہا تھا کہ اپنی تندرستی کے عالم میں یہ دوشیزہ
خوبصورتی کی گنگنی جھیل رہی ہوگی جسے چھونے
کے لئے کشمیر کے سفید پہاڑ بھی للچاتے ہوں گے
اس کے ہونٹوں پر کیسر کا یا غنچہ مہکتا ہوگا۔ شاید
خدا حسین جسموں کو اپنی پوری توجہ کے ساتھ تراشتا
ہے کہ کوئی بھی حادثہ یا سایہ اس کی خوبصورتی کو
کم نہیں کر سکتا۔ اسی لئے لالٹین کی طرح ٹھنڈے
جسم سے بھی ہلکی ہلکی چراغ کی روشنی ابھر رہی
تھی۔ مجھے محسوس ہوا یہ آدمی بہت بڑا خوش نصیب
ہونے کے ساتھ ہی بدنصیب بھی ہے۔

اچانک ہزار میل دور کا ماضی کیکٹس کے جنگل
کی طرح گھیر لیتا ہے۔ مارتھا ہی تو ہے ---آئرش
ہونے پر بھی گندمی رنگ لونی چکس! برفیلے دنوں
میں بھی لبوں کے کناروں پر مہوا کی مہک کھیلتی رہتی
زیادہ قریب آنے پر بدری ناتھ کے گرم پانی کے چشمے
کا احساس جاگ اٹھتا۔ ساری تھکان مٹ جاتی

ہم دونوں دوپہر، جس رستوران میں روزانہ
ایک ساتھ اپنے آفس سے لنچ کرنے آتے تھے
اس رستوران کا منیجر پوری طرح مارتھا پر فدا
تھا۔ جب تک وہ رستوران میں ہوتی منیجر سارے
کام بھول کر اسی پر نظر ٹکائے رہتا... دوپہر

...نچ کے وقت وہ ضرور حاضر رہتا۔ اس کی آنکھوں میں
...گہری خواہش ہوتی۔ ایک دن کہیں کسی جگہ مارتھا
...ملاقات ہوگئی تو اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہندوستانی
...چکر میں کیوں پڑی ہے۔

مارتھا نے اسے گھڑک دیا تھا۔ اس کے بعد پھر
...کہنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ ساؤتھ اینڈ کی ایک گلی
...سے جب ہم دونوں گذر رہے تھے اس وقت مارتھا
...نے یہ بات بتائی۔ میری مٹھیاں تن گئیں تھیں اور میں
...نے اس کی دھنائی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے
غصے کو پہچان مارتھا نے بغل میں گدگدی کر کہا تھا۔
نو فائٹ، نو ڈویل یو اینڈ نو گاندھی کلچر۔ آئی ایم
یورس اینڈ یورس اونلی (کوئی لڑائی دنگا نہیں
گاندھی جی کے طریقے میں میں تمہاری صرف تمہاری ہوں)

لیکن غیر ممکن بات ہو ہی گئی۔ میں سلور ڈویلنگ
کے موڑ پر انتظار کرتا رہا پر مارتھا نہیں آئی۔ اس
کے اپارٹمنٹ پر گیا پر مارتھا نہیں ملی اور نہ ہی اپنے
آفس پہنچی۔ پورے دس دن میں اس کی تلاش
کرتا رہا۔ جب بھی لنچ کرنے گیا ڈیگوڈ کے چہرے
پر بھی گہری فکر اور ندامت کو محسوس کیا۔

ہار کر پندرہ دن کی تعطیل لے کر فرانس اور
جرمن گھومنے چلا گیا۔ وہاں کی موٹی تگڑی اور تیز
خوشبوؤں سے لبریز عورتوں کو دیکھ کر جھرجھری
چھوٹ جاتی۔ لوٹ کر آیا تو مارتھا بہت یاد آئی پھر
جھکائے گلی سے جا رہا تھا کہ ایک فٹ بال آ پیچھے
سے آکر چپک گئی۔ کئی لڑکے ایک ساتھ سہم کر کھڑے
ہو گئے۔ میرے گمبھیر چہرے کو دیکھا تو ان کے چہرے
اور اتر گئے۔ مجھے لگا کہ غمزدہ ہونے پر بھی مجھے مسکرانا
چاہیے۔

ریستوران میں ایک عجیب حادثہ ہونے جا رہا
تھا۔ اندر قدم رکھا ہی تھا کہ منیجر کے آر پار دکھائی
دینے والے کیبن میں مارتھا دکھائی دے گئی۔ خوب
سجی دھجی تھی پر چہرے پر گہرا اسپلاین تھا۔ جو لطف
کے بار بار استعمال سے بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس
دن بھی مجھے ٹیسو کے پھول یاد آ گئے تھے۔ ہانپتا دوڑتا
اندر پہونچا اور چاہا کہ مارتھا کو اپنی آغوش میں بھر لوں
پر بیچ میں ڈیگوڈ آ گیا۔ کہاں گئے تھے مسٹر کوہلی؟ آپ کو
الوائٹ کرنے گئے تھے ہم دونوں۔ منیجر چلا گیا تو میری
آنکھیں جل پڑیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاہا کہ مارتھا کو جی بھر
پھٹکاروں اور رسل ڈالوں۔

مگر ہچکیوں کے بیچ مارتھا نے جو کہانی سنائی
اس نے مجھے غصے کے ریگستان کے سائبیریا میں پہونچا
دیا۔ چند حیثیتوں نے اس کا اغوا کر لیا تھا۔ روز
زنا کرتے۔ اچانک کسی نے پولس کو خبر کر دی اس
سنسان مقام پر ہونے والے زبردست حادثہ
کی۔ پولس نے رہا کروایا مارتھا کو۔ مارتھا کہہ رہی تھی۔
میں مرنا چاہتی تھی پر ڈیگوڈ نے مرنے نہیں دیا۔

میرا انتظار کیوں نہیں کیا! میں نے ہوش میں
کہا۔ ایک درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ مارتھا نے کہا
تھا انڈین ورجینیٹی کے معاملے میں بہت سینسی ٹیو ہوتے
ہیں۔ اس لئے رام نے شک نہ ہونے پر بھی ایک طعنے
پر سیتا کو نکال دیا تھا۔ ایک خنجر سا دل کی سات
پرتوں کو چیرتا نکل گیا تھا۔ میں نے خود کو بھی جونے کے
الزام سے بچانا چاہا تھا مگر حل کا راستہ کہاں تھا۔
مارتھا کسی اور کی ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے انتظار کیا ہی

نہیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس آدمی نے دروازہ کھولا۔ بیرا رات کے کھانے کی تھالیاں رکھ رہا تھا۔ اس نے برتھ پر ایک اخبار بچھا دیا۔ اور اپنے ساتھ میری تھالی بھی رکھ دی۔ اس کے برتاؤ نے مجھے چھوا۔ روٹی چباتے ہوئے اس نے پوچھا" دلی جا رہے ہیں؟ جی۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔ ہم تو آگرہ اتر جائیں گے، پانی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے کہا ——— میں اپنی بے چینی کو روک نہیں سکا، پوچھ لیا۔ آپ کی بیوی ہیں؟

جی نہیں کہتے کہتے اس نے روٹی کا نوالہ منہ میں ٹھونس لیا۔ ہار کر پوچھنے کے لئے مجبور ہوا۔ بہن ہیں؟ لیکن اس نے سر ہلا کر نہیں میں جواب دیا۔ اس کے چلتے ہوئے جبڑے نے مجھے بھول بھلیاں میں بھٹکا دیا باہر کوئی اسٹیشن آگیا تھا اس لئے روشنی اور شور دونوں ایک ساتھ اندر کود پڑے تھے۔

کھانے کے بعد اس نے الائچی مصری پیش کی جسے میں نے دیوار پر لگی ہوئی ہدایت" کہ انجان لوگوں سے کھانے پینے کی کوئی چیز قبول نہ کریں ورنہ پچھتانا ہوگا" کے باوجود قبول کر لیا۔

گاڑی چلی تو دوشیزہ نے دھیرے سے ٹانگ ہلائی۔ مرد نے افسوس کے ساتھ مجھ سے باہر جانے کی گذارش کی۔ میں سمجھ گیا کہ شاید پاٹ لگانا ہے۔ کاریڈور کے ایک کونے میں کھڑا ہو کر میں انتظار کرتا رہتا ہوں۔ پاٹ لے کر وہ دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ میں پھر رشتے کی گتھی میں الجھ جاتا ہوں۔ بیوی نہیں، بہن نہیں تو کون ہے۔ دوسرا رشتہ ہونے پر موت کے بستر پر پڑی اپنی لڑکی کو کون دوسرے کے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کے لئے کہے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آل کلیئر کا اشارہ دیا۔ اور میں کمپارٹمنٹ میں واپس آگیا۔ اس نے اپنا بستر نیچے کی برتھ پر لگا لیا تھا اور میرا ہولڈال اوپر کی برتھ پر رکھ دیا تھا جس کے لئے میں نے اسے دوبارہ شکریہ ادا کیا۔ اس سے پہلے کہ میں بستر کھولوں اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ابھی تو صرف نو بجے ہیں ابھی تو نیچے یہیں آرام سے بیٹھئے، کہتے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف سرک گیا۔ اور وہیں سے ہاتھ بڑھا کر تیز روشنی بند کر دی اور نیلا بلب جلا دیا جس کی روشنی سے دوشیزہ کے چہرے کا زردی مائل رنگ ہرا لگنے لگا۔ مجھے بہاری کی ست سئی کے مصرعے یاد آگئے!

" پیت ہرت دُتی ہوئی "۔ اچانک اس نے منہ کھولا۔ آپ ہمارے رشتے کے بارے میں کچھ سوچ رہے تھے نا! میں نے سر ہلا کر اس کے سوال کی تائید کی۔

اس نے سگریٹ کا گہرا کش کھینچا اور اپنے اندر گہراتے ہوئے درد کو ٹھنڈی سانس کے سپاہی سوکھتے سے سوکھتے ہوئے بولا۔ رشتہ بننے جا رہا تھا کہ حادثہ ہو گیا۔ پھر سگریٹ کو دیوار میں لگی ایش ٹرے میں ٹھونستے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کی اپنی ایک دوائیوں کی فیکٹری ہے اور اس نے اکسفورڈ میں بھی پڑھائی کی تھی۔ سوسن نے بمبئی سے ہی ایم۔ جی۔ بی۔ ایس کیا تھا۔ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے لیکن روزگار میں لگنے کے باوجود کافی دنوں تک شادی کی جستجو میں وقت گذر گیا۔ سوسن

گھر والے عیسائی تھے اور اس کے پارسی۔ اسی لئے
وں ہی ان کی شادی کی مخالفت کرتے رہے تھے
لر اس نے اپنا ایک فلیٹ لیا اور سوسن ہوسٹل
رہنے لگی۔ اکیس دسمبر شادی کی تاریخ طے پائی تھی
سوسن شادی سے پہلے اپنے پیار کے امر ہونے کی
م تاج محل میں لینا چاہتی تھی۔ دس نومبر کو ہم دونوں
سے کھنڈالا گئے۔ وہیں پھسلی تھی سوسن — میں
تار ہا بڑی مشکل سے مدد ملی۔ فرسٹ ایڈ کے بعد
بمبئی لایا۔ سوسن کے گھر والے جھانکنے بھی نہیں
مشہور ڈاکٹر فرلنس نے آپریشن کیا۔ جان بچ
مگر زندگی ختم ہو گئی۔ اسپتال سے سوسن کو گھر
آیا۔ پورے ڈیڑھ سال سے نیم بے ہوشی کی حالت
ہے۔ کسی نے کہا تاج محل لے جاؤ۔ شاید سدھر
ے حالت.... اسی لئے آنکھوں سے دیکھتی ہے
ی کبھی مسکراتی ہے۔ ٹٹی پیشاب کا پیر ہلا کر اشارہ
ی ہے۔

"کسی دوسرے ملک کے اسپشلسٹ کو....."

مجھتا ہوں۔ جی ہاں امریکہ کے ڈاکٹر کارلو اور جرمنی
ڈاکٹر بدر ہانے نے جانچ کی مگر بے کار۔ کہتے
ہا امریکہ میں سینکڑوں ایسے مریض پندرہ بیس
سالوں سے اسپتالوں میں لاعلاج پڑے ہیں ان کے
ئے کوئی علاج نہیں اور انہیں مارا بھی نہیں جا سکتا
ہے کہ ان کے دماغ کی ترنگیں پوری طرح سے مری نہیں
ں۔ اوسی لوسکوپ پر اچانک ہی ترنگیں ابھر آتی
یں۔ اس ملک میں آسانیاں ہیں مگر ہندوستان
یں تو اسپتال کیا کوئی نرس بھی مسلسل دیکھ بھال
نے کے لئے نہیں ملتی ہے۔ ایک آہ بھرتے ہوئے اس
نے کہا۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا ہوں۔ شاید
ایک عرصہ کے بعد غبار نکالنے کا موقع ملا تھا اسے
وہ کہہ رہا تھا میں نے اسے روز مرتے ہوئے دیکھا ہے
اور اس کے ساتھ خود اپنی موت کا احساس ہوا
ہے۔ اسو اسے سو گنے دن سے ٹنگی ہے صلیب
پر سوسن اور اس کی ہتھیلیوں میں ٹھکی کیلوں کا
درد میں نے محسوس کیا ہے۔ کئی بار اس کی موت
کی التجا کی پھر سجدے میں جھک گیا کہ جو میرے لئے جی
رہی ہے میں اس کی موت کی التجا کیسے کر سکتا ہوں۔
ایک سچا پارسی کبھی کسی کی موت کا ارمان نہیں پال
سکتا۔

ایک عجیب سا گیلا پن اس کی آنکھوں میں اتر
آیا تھا۔ انجانے میں اپنے پریم کا درد اس کے سامنے ظاہر
کر دیتا ہوں۔ اس کی آنکھیں نم ہو اٹھتی ہیں۔ پھر ہم گڈ
نائٹ کہتے ہوئے اپنے اپنے بستروں پر لیٹ جاتے
ہیں۔ جانتا ہوں کہ گہری نیند سونا بھی اس کے لئے
غیر ممکن ہے۔ بیچ بیچ میں تیمارداری کے لئے بھی تو
اسے اٹھنا ہے۔

جلد ہی نیند آنے لگتی ہے پھر یاد آتا ہے کہ
دوشیزہ کا نام تو سوسن ہے پر مرد کا نام تو پوچھنا
ہی بھول گیا۔ گاڑی ایک پیاری لے کے ساتھ رفتار
پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔

باہر تیز شور ابھرا تھا اور نیچے کھڑکی کے کانچ
سے ڈھیر سارا اجالا کود پڑا تھا۔ آنکھیں رگڑ کر نیچے
اترتا ہوں۔ مرد اپنے بستر پر نہیں تھا۔ سوچا باہر گیا
ہوگا کچھ لینے.... گاڑی کافی دیر رکتی ہے شاید۔
باہر جھانکتا ہوں سلے لور ڈر سٹیشن کا نام پڑھتا

ہوں جانسی تھا ۔ اپنے آپ دھیان اس دوشیزہ کی طرف چلا جاتا ہے ۔ ٹھیک سینے کے اوپر ایک پھول رکھا ہوا تھا ۔ گہری سنسنی اور تذبذب ابھرتا ہے تبھی تختے پر گلاس سے دبے کاغذ پر دھیان جاتا ہے ۔ اٹھا کر پڑھتا ہوں ۔ سوسن رات کے قریب تین بجے مر گئی ۔ ہونٹ دبا کر روتا رہا پھر لگا کہ جیسے ساری عمر جا رہا ہے اور تبھی کے بے جان جسم کی دیکھ بھال کرتا رہا ہوں اسے اپنے ہاتھوں سے دفن نہیں کر سکوں گا ۔ یہ کام آپ کے سپرد کئے جا رہا ہوں ۔ آپ پیار کی اہمیت اور جدائی کی تکلیف سے واقف ہیں ۔

اچھل کر کھڑا ہو جاتا ہوں ۔ گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا ۔ اندر ہی اندر خوف کھائے جا رہا تھا کیا موت سے چند قدموں کے فاصلے پر میں سوتا رہا اور موت سوسن کو لے گئی ۔ شاید یہ پھول کسی سٹیشن پر لگی کیاری سے توڑا ہو گا اس نے ۔ پر وہ تھا کون ؟ اُف نام بھی نہیں پوچھا ۔

سر سے چادر ہٹا غور سے دیکھتا ہوں ۔ بند پلکوں پر گہری سیاہی پھیلی ہوئی تھی ۔ بدحواسی کے عالم میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہوں ۔ خیال کریدتا ہے تو کیا مجھے دفن کرنا ہو گا اسے ۔ لیکن یہ میری کون ہے ! سونپ دوں گا اگلے سٹیشن پر پولس کو ۔ تبھی اندر کچھ کراہ اٹھتا ہے ۔ کسی کے جذبات کی بے عزتی کرے گا ! کیا ہوا دفن کرنے میں تھوڑی تکلیف ہو گی تو ۔ اگر سوسن کی جگہ عابدہ ہوتی تو کیا تو اسے دفن نہیں کرتا ۔ !

پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہوں ۔ گاڑی [illegible]

ہے ۔ اچانک لگتا ہے کہ بے جان چہرے پر ہونٹ ہلے ہیں ۔ خوف مجھے برتھ سے چپکا دیتا ہے ۔

اچانک مردہ جسم کا بایاں پیر ہلتا ہے ۔ خوفزدہ ہو کر چیخنا چاہتا ہوں ۔ پھر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے الٹا کر چہرے پر جھک جاتا ہوں ۔ سوسن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور بایاں ٹخنہ ہل رہا تھا ۔

ایک گہری اداسی میں ڈوب جاتا ہوں ۔ کیا اسے مردہ سمجھ مجبوری میں چھوڑ گیا وہ یا چھوڑنے کی چال چلی تھی اس نے ۔ یہ کیسا منتقل ہونا ہے ۔

لگتا ہے کہ اگر مردہ ہوتا تو میرا کم از کم ایک دن خراب ہوتا ۔ پر اب میں سوسن کو کہاں لے جاؤں گا ۔ میری پیشانی سے بے خبر سوسن کا گھٹنہ مسلسل ہل رہا تھا ۔

مایوس خوفزدہ اور فکر سے گھرا ہوا ..... برتھ کے نیچے پاٹ تلاش کرنے کے لئے جھک جاتا ہوں ۔

٭٭

(بقیہ مسلمان)

دونوں باہر آ گئے

چلتے وقت شعیب نے ایک بار پھر کہا ۔ افروز اس بارے میں سوچنا ضرور ۔

سامنے ٹریفک کی لال بتی روشن تھی اور گاڑیوں کے بے ہنگم شور تھے ۔

٭٭

● پرنٹر پبلشر ابن منظر نے سہیل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا ۔

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

نام کتاب :- **غزل گلاب** (غزلوں کا مجموعہ)
فن کار :- کالی داس گپتا رضاؔ
ضخامت :- ۱۵۲ صفحات ، قیمت :- ۸۰ روپے
پتہ :- ساکار پبلیشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ، جوبلی کمپاؤنڈ
۴ نیلامبر فی لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰

کالی داس گپتا رضاؔ کی غزلوں کا یہ مجموعہ عبداللہ کمال کی ترتیب و انتخاب کا ثمرہ ہے چنانچہ بجا طور پر انہوں نے بلا شرکت غیرے ایک ابتدائیہ " الاؤ جلتا ہے " کے عنوان سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ انتخاب میں انہوں نے اپنی ذاتی پسند کو معیار بنایا ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے بعض غزلوں کے چند اشعار حذف کر دیتے ہیں۔ ایک ایسی صورت حال میں جب رضا صاحب نے جناب کمال کو یہ کہہ کر اپنی غزلیں سونپ دی تھیں کہ " تم ان غزلوں کا جا ہے جو حشر کرو تمہیں اختیار ہے"۔ جناب کمال کی اس کتر بیونت کا کوئی شکوہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب گویا جو مجموعہ کلام " غزل گلاب " کی صورت میں اپنی بہار دکھلا رہا ہے۔ اس میں جناب عبداللہ کمال کا خون جگر بھی صرف ہوا ہے اور یوں ہم اس کے ذریعہ کالیداس گپتا رضا وایا عبداللہ کمال تک پہنچ سکتے ہیں چونکہ جناب عبداللہ کمال خود ایک کامیاب فن کار اور دیدور اہل قلم ہیں اس لئے غزل گلاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور جناب رضا کے کلام سے مئے دو آتشہ کا لطف ملنے لگتا ہے۔ عبداللہ کمال نے اس ترتیب و انتخاب کے عمل میں بظاہر اپنے Detached ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ایک خوبصورت تمثیل یہ دی ہے کہ :-

" شعر کا ، قاری سے وہی رشتہ ہے جو ایک پرندے کا نومولود بچے سے ہوتا ہے۔ پرندہ ہوا کے دوش پر جس طرح اپنے پَر پھڑ پھڑاتے بچے کو ہولے ہولے اڑنا سکھاتا ہے۔۔ نئی نئی دشائیں دکھاتا ہے اور دانہ و دام میں تمیز کرنا سکھاتا ہے بالکل یہی رویہ اچھے شعر کا اپنے قاری کی سوچ سے ہوتا ہے "۔

بات دلچسپ ہے مگر واضح رہے کہ ہر قاری چوزہ نہیں ہوتا کم از کم عبداللہ کمال تو نہیں ہو سکتے، یہ بات تازہ واردانِ بساط ادب کے لئے صحیح ہو سکتی ہے وہ قاری جو خود فنکار ہو، احساسات و تجربات کی گوناگوں

صورتحال سے گزرتا رہتا ہو اور اس کے حسین تر
اظہار ان پر قادر ہو۔ وہ یقیناً صریر خامہ میں نوائے
سروش سننے کی توانائی بھی رکھتا ہے۔ بندہ کبھی کبھی
معذوری و مجبوری کی سرحدوں سے نکل کر بندۂ مولا
فنکار بھی ہو جاتا ہے ـــ غرض اس مجموعہ سے عبداللہ کمال
کے خوشگوار اثرات کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آخر
اس کی ضرورت بھی کیا ہے

کالی داس گپتا رضا کی شاعری کو کسی مخصوص نسل
سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اچھی شاعری نسلی
امتیازات سے ماورا ہوتی ہے۔ شاعری کے لئے جس
طرح ذاتی تجربات کی اہمیت ہے اس قدر مضبوط مشاہدات
اور توانا محسوسات کی بھی۔ ذاتی تجربات سے ابھرنے
والی اچھی شاعری ذات سے شروع ہو کر کائنات تک
پھیل جاتی ہے۔ پھر میر تقی میر سے ہماری ملاقات ہوتی
ہے۔

تخلیقی تحرک کا ایک سفر یہ ہوتا ہے کہ کائنات
کو ذات میں سمیٹ لیا جائے۔ اولاً ذکر میں فن آپ بیتی
سے جگ بیتی بنتا ہے، موخرالذکر میں جگ بیتی آپ بیتی
بن جاتی ہے۔ INDUCTION اور DEDUCTION
کے یہ دونوں اصول اچھی شاعری کے وسیلے ہیں۔ جناب رضاؔ
جگ بیتی کو آپ بیتی بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ عصری احساسات
ان کی نجی واردات بن جاتے ہیں۔ ہر بات دل پر بھاری پتھر
رکھ کر نہیں کی جاسکتی۔ کالی داس گپتا رضاؔ کے شعری
اظہار میں فراغ و کشاد اور بشاشت و اعتماد کے عناصر
انہیں ممتاز بناتے ہیں۔ ایک مختلف الجہات متین و
سنجیدہ علمی و ادبی شخصیت سے کامیاب شعری اظہارات
کی جس قدر توقع کی جاسکتی ہے جناب رضا اس سے
کچھ زیادہ اس کی تکمیل کرتے ہیں۔ ماورائے شاعری
اتنے سارے علمی و ادبی جھمیلوں میں ایک احساس پُر اعتماد
مضطرب، متفکر اور متحیر شاعری اپنی تمام تر سرمستیوں کے
ساتھ زندہ ہے یہ بڑا اعجاز ہے۔ اس زندہ طلسمات
سے ہماری عقیدت بڑھتی ہی جاتی ہے

جناب عبداللہ کمال کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں
کہ انہوں نے جناب رضا کے کلام کو ہنر مندی سے آراستہ
کیا ہے اور وقیع ابتدائیہ لکھا ہے "انا" سے متعلق
ان کا یہ جملہ یاد رہے گا کہ

"انا کے بغیر شاعری ایسا ہی ہے جیسے زہر کے بغیر
سانپ"

● علیم اللہ حالی

نام کتاب:۔ بہار اردو، گلشن مشرقی افریقہ میں
مصنف:۔ کالی داس گپتا رضاؔ
ضخامت:۔ ۲۳۲ صفحات ▲ قیمت:۔ ۱۰۰/روپے
پتہ:۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کالی داس گپتا رضاؔ کو ان کی غیر معمولی اور مسلسل
شعری و نثری، نیز تحقیقی و تنقیدی خدمات کی بنا پر میں
اردو کا قطب لکھنا ہی چاہتا تھا کہ زیر بحث کتاب میں
مطبوعہ رپورٹنگ سے یہ علم ہوا کہ اہل افریقہ موصوف
کی قطبیت کا عرفان پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ
اس خطۂ ارض میں اردو کی بے لوث و بے مثال خدمات
اور رضا صاحب کے فیوض و برکات کی وجہ سے انہیں
اردو کا قطب کہا جاتا ہے۔ قطب ہر جگہ قطب ہی رہتا
ہے۔ افریقہ سے مراجعت کے بعد بمبئی میں مقیم ہو کر آج تک

انہوں نے اردو تصنیف و تالیف کے جواہر ریزوں کا جو انبار لگایا ہے وہ اردو کے شیدائیوں کے لئے قابل رشک بھی ہے اور قابل فخر بھی۔

زیر بحث کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مشرقی افریقہ میں اردو زبان و ادب اور شعر و سخن کے ارتقا کی ایک دستاویز ہے۔ جناب رضا کی خوبیٔ تحریر نے اسے کئی دوسری خوبیاں بھی عطا کردی ہے۔ یعنی ایک طرف یہ اس خطے میں اردو سرگرمی کی تاریخ ہے تو دوسری طرف وہاں کی سیاسی، سماجی، مدنی اور تہذیبی صورت حال اور اس کے تغیرات کی آئینہ بردار بھی ۔۔۔ مشرقی افریقہ کے مختلف خطوں میں ادبی سرگرمیوں کے علاوہ متعدد علمی و ادبی اشخاص کا ذکر بھی ہے جن سے ہم آج تک واقف نہ تھے اور اگر جناب رضا ان کا تعارف نہ کراتے تو ہم ان سے بغیر ملے ہوئے مر جاتے۔

اس کتاب کے مطالعہ کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ مشرقی افریقہ کے مختلف شہروں میں اردو زبان و ادب کا ماحول بنتے بنتے اب اس قدر مضبوط ہو چکا ہے کہ اسے ایک اہم مرکز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ریگستان کو اردو کا نخلستان بنانے میں جناب کالیداس گپتا رضا کی انتھک کاوشوں کا کتنا بڑا حصہ ہے اسے جاننے والے جانتے ہیں اور کچھ اس کتاب سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آج جو کام وہاں ساحر شیوی اور دوسرے ارباب کر رہے ہیں اس کی تخم ریزی جناب رضا پہلے ہی کر چکے تھے۔ انہوں نے وہاں اردو خدمت کی وہ جوت جلائی کہ روز بروز روشنی بڑھتی ہی جاتی ہے۔

"بہار اردو۔ گلشن مشرقی افریقہ میں" نہایت معلوماتی دستاویز ہے۔ پریم گوپال متل کے حسن اہتمام نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

● علیم اللہ حالی، گیا

نام کتاب :- دیدہ و شنیدہ (خود نوشت)
مصنف :- سید شہاب الدین دسنوی
صفحات :- ۱۳۶ ھ قیمت :- ۳۵ روپے
ناشر :- لبرٹی آرٹ پریس - دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲
تقسیم کار :- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی اور اس کی شاخیں

"دیدہ و شنیدہ" سید شہاب الدین دسنوی کی خود نوشت سوانح ہے۔ شہاب صاحب کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ اپنی علمی، ادبی، سیاسی سماجی اور تنظیمی صلاحیتوں اور مصروفیتوں کی بنا پر انہوں نے ملک اور بیرون ملک اپنا ایک مخصوص مقام اور اپنی پہچان قائم کرلی ہے۔

شہاب صاحب کا وطن صوبہ بہار کا مشہور قریہ دسنہ ہے۔ جس کی خاک سے سینکڑوں نامور علماء اور شعراء علم و ادب پیدا ہوئے جس کی زیارت مشاہیر علماء ادبا اور ارباب اقتدار نے بصد خلوص شوق و تمنا کی، جو کبھی جید علماء اور شہ زور ادبا کا مسکن رہا ہے۔ جس کی عالمانہ بصیرت اور علمیت کا ڈنکا کبھی سارے عالم میں بجتا تھا۔ آج بھی اس کی مٹی میں علمیت، ذہانت، اخوت و محبت، علم و بردباری، شرافت و عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کبھی یہ قریہ بزرگوں کا مسکن رہا ہے۔ مجھے تو خاک طیبہ کے بعد اگر کسی خاک کو آنکھوں سے لگانے کی اجازت دی جائے تو میں خاک دسنہ کو ترجیح دوں گا۔

سوانح خود نوشت ہوں یا بالقلم دیگراں ان

کی اپنی جداگانہ علمی ادبی تاریخی، سیاسی اور سماجی
حیثیت ہوتی ہے۔ یہ اپنے عہد کی معتبر اور باوثوق دستاویز
ہوتی ہے۔ مگر ان میں خودنوشتوں کی تو بات ہی الگ
ہے۔ ان کے کسی بھی اعتبار سے معتبر نہ ہونے پر لب
کشائی نہیں کی جاسکتی۔

خودنوشت سوانح لکھنا جوئے شیر لانے سے
کم کٹھن نہیں۔ اپنے اور اپنے مرید کے حالات و واقعات
کا ہر قدم دودھاری تلوار سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کے
دل و دماغ پر وسوسے کا گہرا کُہر چھایا رہتا ہے۔ وہ اس
خوف کے بوجھ سے دبا رہتا ہے کہ کہیں کسی جذبہ بیجا سے
مغلوب ہو کر وہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھے جس کے لئے اس
کی بازپرس ہو۔ قلم سے نکل کر صفحہ کاغذ پر بکھرنے سے
قبل اس کی تحریر کا ہر لفظ چٹانوں سے ٹکراتا ہے۔ اس
لئے اسے ہمیشہ ہوشیار، بیدار اور چاق و چوبند رہنا
پڑتا ہے اور دماغ و دل کے دریچوں کو وا رکھنا پڑتا ہے
اسی لئے عام سوانح عمریوں کے مقابلے میں خودنوشتوں
کی ادبی علمی سیاسی اور سماجی و تاریخی حیثیت زیادہ
باوزن ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ نوشتہ نگار کی علمی
ادبی صلاحیت، زبان و بیان پر اس کی گرفت، قوت
اظہار، اندازِ پیش کش، معلوماتی ذخیرہ، زاویۂ فکر و نظر
غرض کہ ساری خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں —
قاری کو اس کی شخصیت اور سیرت کے سمجھنے کا پورا پورا
موقع ملتا ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ یہ کام کتنے دل
گردے کا کام ہے کہ کوئی شخص خود اپنے قلم سے سرِ محفل
عریاں کر دے۔ اور کہے کہ مجھے دیکھو اور پرکھو۔

بہر حال شہاب صاحب نے اپنی خودنوشت لکھ کر
بڑی جواں مردی اور جسارت کا ثبوت دیا ہے۔ انہیں
علمیت، شرافت، خلوص محبت اور سنجیدگی و متانت و
وراثتاً اور خاک دسنہ کی تاثیر دونوں سے حاصل
ہوئی ہے۔ اس لئے [illegible] ان کی شخصیت
اور تحریر دونوں سے نمایاں ہے۔

کتاب کا آغاز عنوان "وطن" سے کیا گیا ہے
جس کے یہ دو اشعار اپنے اندر دسنہ کی پوری تاریخ
چھپائے ہوئے ہیں۔

دسنہ جو ایک قریہ تھا عالم میں انتخاب
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا

دسنہ جس کا نام یہی گاؤں ہے حضور
جس کی بنی ہے دھوم بہت دُور دُور تک

اس کے پڑھتے ہی مرحوم دسنہ کے عہد شباب کی تصویر
رقص کرنے لگتی ہے۔ اس کے تحت آئے ذیلی عنوانات
اس تصویر میں رنگ و روغن بھرتے اور سلسلہ بیان کو
مسحور کن بناتے ہیں۔ ان کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ ہم بہ نفس نفیس وہاں موجود ہیں۔ دیگر عنوانات
کے تحت مونگیر، پٹنہ، کلکتہ اور بمبئی کا ذکر آیا ہے۔
انداز بیان میں یہاں بھی شگفتگی اور سحر انگیزی ہے۔ ان
عنوانات کے تحت سپرد قلم کئے گئے مضامین میں انھوں
نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں، ادبی اور ثقافتی مشغولیتوں،
سربرآوردہ شخصیتوں سے ملاقاتوں اور اہم مقامات کا
ذکر اور اپنی نوکری کا تذکرہ بڑے دلچسپ اور پراثر
انداز میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اداروں سے
اپنے تعلق اور [illegible] سیاسی سرگرمیوں پر بھی روشنی
ڈالی ہے۔ انجمن حمایت اسلام اور [illegible] انسٹی
ٹیوٹ کی [illegible] تاریخ بیان کی ہے جو بڑی ہی معلوماتی،

اور پُر مغز ہے۔ بیرونی ممالک کے سفر کے تحت جن
سطروں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بھی معلومات سے
بھرے پڑے ہیں۔ غرض کہ پوری کتاب نہ صرف ایک
نادر ادبی شہ پارہ ہے بلکہ اپنے عہد کی ایک مستند
تاریخی دستاویز بھی ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم حصہ انجمن اسلام،
غالب کا خط ذکریا کے نام اور دسنہ لائبریری مرحوم
ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی
ہے کہ شہاب صاحب نے نہ تو اپنے متعلق کچھ چھپا رکھا
ہے اور نہ ہی کسی کا ذکر کرتے وقت تعصب، بغض
یا تنگ نظری سے کام لیا ہے۔ ہر جگہ ان کی صاف
گوئی عیاں ہے۔

طرز تحریر سادہ، دلکش اور رواں دواں ہے۔
انداز بیان میں ایسی سحر کاری ہے کہ قاری ان میں کھو جاتا ہے
اور کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ کہیں بھی بوریت طول
بیانی یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ تحریر میں الفاظ و
بیان کی چاشنی اور تبسم کی زیریں لہریں ہر جگہ موجزن ہیں۔

طباعت صاف ستھری ہے، سرورق جاذب نظر
ہے۔ چند نادر تصاویر جو کتاب کے شروع میں ہیں اس
کی افادیت کو بڑھاتے ہیں۔ قیمت اس کی افادیت کے
مقابلے میں بہت کم ہے۔

اپنے اندر ملی درد، اسلامی تاریخ ادب سے
تعلق اور ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کے لئے اس
کا مطالعہ کافی سودمند ہوگا۔ یہ کتاب ہاتھوں
ہاتھ لی جانی چاہیئے۔

● سید ابوالفیض سیدابادی

نام کتاب :- اکثر یاد آتے ہیں
مصنف :- مظہر امام
ضخامت :- ۱۶۰ صفحات ۰ قیمت :- ۷۵ روپے
ناشر :- ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۷

" اکثر یاد آتے ہیں " ممتاز شاعر و نقاد مظہر امام
کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جن کا تعلق اکثر یاد آنے
والی چند مشہور و معروف شخصیتوں سے ہے۔

" اکثر یاد آتے ہیں " کے ذریعہ مظہر امام نے جن چند
شخصیتوں سے وابستہ یادوں کو خوبصورتی سے تحریری
قالب میں اتارا ہے۔ وہ شخصیتیں ہیں :-
۱۔ جگر مراد آبادی ۲۔ مولا[illegible] آبادی ۳۔ اشک
امرتسری ۴۔ جمیل مظہری ۵۔ پرویز شاہدی ۶۔ کرشن
چندر ۷۔ اختر قادری اور ۸۔ خلیل الرحمن اعظمی۔

یہ ایسی شخصیات ہیں جو اردو دنیا کو بھی اکثر یاد
آتی رہتی ہیں۔ کیونکہ مذکورہ تمام شخصیتوں کا تعلق اردو
زبان و ادب سے عشق کی حد تک گہرا ہے۔ اور جہاں عاشقانہ
تعلق ہو تو ظاہر ہے یادوں کا ایک نہ ایک ختم ہونے والا
سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ مظہر امام سے ان
شخصیات کے تعلق کی نوعیت صرف ادبی یا قلمی نہیں تھی
بلکہ مظہر امام نے ان شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کو بہت
ہی قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اور اس طرح ان
شخصیتوں سے منسوب کھٹی میٹھی یادوں کا ایک انبار
ان کے سینے میں محفوظ ہو گیا۔

شگفتہ انداز بیان اور دل نشین اسلوب
مظہر امام کی نثر نگاری کی پہچان ہے۔ زیر نظر کتاب کے
مضامین میں یہ خصوصیت موجود ہے اور اس کے سبب

قاری کی دلچسپی شروع سے ہی قائم رہتی ہے۔ وہ
پڑھتا ہے تو پھر پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور متعلقہ
شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کو اچھوتے انداز میں
سامنے دیکھ کر طمانیت کے ساتھ ساتھ انکشافاتی مرحلوں
سے گذر کر ایک نئی تاریخ کی آگہی کا احساس پاتا ہے
زیر نظر کتاب میں جن شخصیتوں پر مصنف نے
لکھا ہے۔ ان پر اب تک بہت سارے مضامین
لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی ذاتی، فکری، فنی و دیگر گوشوں
پر بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے، کئی پر تو رسالوں کے
خاص نمبر بھی نکلے اور تحقیقی مقالے بھی کتاب کی صورت
میں لکھے گئے ہیں لیکن ان سب کے باوجود وہ مقالے،
وہ مضامین وہ نمبر اور وہ کتابیں ادھوری لگتی ہیں۔
مثال کے طور پر ہم جگر مرادآبادی کو لیں۔ ان پر بہت
کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھنے کا عمل جاری ہے۔ لیکن
مظہر امام نے اپنی یادوں کے ذریعہ رائلٹی کی رقم وصول کرنے
کلکتہ آنا۔ ایک مشاعرہ میں ایک خاکہ کے ذریعہ جگر صاحب کا مذاق
اڑانا۔ جگر صاحب کا زخمی ہونے اور پرویز شاہدی
و دیگر لوگوں کے ملنے جلنے کا واقعہ اور اس ملاقات
کی تفصیل، جوش کے اخلاقی کردار سے جگر کا بعض
پردوں کا اٹھانا نیز دیگر واقعات کے تذکرے سے
کتنے لوگ واقف تھے؟ یہاں جگر مرادآبادی کا ذکر بطور
مثال کیا گیا ہے ورنہ اس کتاب میں شامل مضامین کی
تمام شخصیتوں کے بارے میں مظہر امام نے کئی نئے حقائق
پیش کئے ہیں۔

"اکثر یاد آتے ہیں" کے مضامین سے مظہر امام
عریاد کی غیر معمولی قوت یادداشت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے
تقریباً تمام واقعات کا ذکر تاریخ اور سنہ عیسوی کے
پڑھیا ... [illegible] سے قطع نظر مختلف

ادبی رسالوں میں مظہر امام کے شائع ہونے والے مراسلے
بھی ان کی غیر معمولی یادداشت کا مزید ثبوت پیش کرتے
ہیں۔ جن کی نوعیت تحقیقی اور تاریخی ہوتی ہے۔
جہاں کہیں بھی مظہر امام کسی مقام کی نشاندہی
کرنے سے قاصر نظر آئے تو محض اٹکل بازی یا اندازے
کی بنا پر کچھ بتانے کے بجائے انہوں نے اس بات کا
اعتراف کیا کہ ان کو یاد نہیں۔ جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں۔
جمیل صاحب سے میری پہلی ملاقات پرویز صاحب
کے گھر پر ہوئی یا رضا مظہری کے یہاں یا 'بزم احباب'
کی نشست میں' صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا۔" کسی نے
مصنف کی معاونت کی کوشش کی اور وہ کوشش
لاحاصل بھی رہی تو بھی مصنف نے اس شخص کی مہربانی
کا اعتراف کیا ہے۔ حالانکہ اکثر لوگ اسے کوئی اہمیت
نہیں دیتے یا زیادہ سے زیادہ زبانی طور پر اس کا ذکر
کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن مظہر امام لکھتے ہیں "شین مظفر پوری
نے "روزنامہ ہند" میں مجھے جگہ دلانے کی کوشش کی۔"
اس کے علاوہ پرویز شاہدی و دیگر شخصیات کی
اخلاقی معاونت کا بھی اعتراف کیا ہے۔
"اکثر یاد آتے ہیں" کے مضامین سے نئی نئی معلومات
بھی سامنے آتی ہیں جن کو انکشافات کا درجہ حاصل ہے
ملیح آباد کی طرح دربھنگہ آم کے لئے دور دور تک
شہرت رکھتا ہے۔ یہ تو معلوم تھا لیکن پریم جنید نے
بنارس میں رہ کر اپنے قریب کے ملیح آباد یا لکھنؤ کے آموں
کو نہیں رکھ کر اپنے افسانے میں دربھنگہ کے آم کا تذکرہ
کیا ہے۔ یہ پہلی بار "اکثر یاد آتے ہیں" سے معلوم ہوا۔
مختلف شخصیات کا ذکر کرتے وقت مظہر امام
نے ... ان کی خصوصیات پر بھی نظر ڈالی ...

کی کمزوریوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ جمیل مظہری اور اختر قادری والے مضمون میں عبدالعلیم آسی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ خلوت میں ملحدانہ خیالات کا اظہار کرتے اور جلوت میں سیرت النبیؐ پر تقریر کرتے۔ جمیل مظہری کے سلسلہ میں لکھتے ہیں ـــ "مجھے محسوس ہوا کہ وہ تضادات کا ملغوبہ تھے ـــ کبھی تشکیک اور الحاد اور کبھی شدید مذہبیت . . . "
جمیل صاحب لوگوں کو غلط فہمیوں اور خوش گمانیوں میں مبتلا کرنے میں ماہر تھے" ان جملوں سے خود مظہر امام کے ذہنی رویئے کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ دورنگے طرز عمل کو پسند نہیں کرتے۔

زیر نظر کتاب میں شامل مضامین کی تمام شخصیات سے مظہر امام کے برسوں سے تعلقات رہے اور ان سے بچھڑے ہوئے بھی سالوں گزر گئے۔ ان سبھوں سے وابستہ یادیں اور نقوش تو ضرور دھندلے ہو گئے ہوں گے لیکن دھندلے نقوش سے بھی مظہر امام نے جس قدر حقائق اجاگر کئے ہیں وہ قابل تعریف ہیں کیونکہ انہوں نے ایک قیمتی ذخیرہ کو برباد ہونے سے بچا لیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اردو دنیا کی نگاہوں سے اردو کی قابل قدر شخصیتوں کے مختلف اہم گوشے ہمیشہ کے لئے اوجھل رہ جاتے۔

کتاب صوری اعتبار سے بھی خوب ہے۔ کتابت اور طباعت دونوں سلیقہ مندی کا مظہر ہے۔ ادب پبلی کیشنز کو بھی داد دینی ہوگی جس نے سنجیدہ ادب کو خوبصورت طریقہ سے چھاپنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

● عطا عابدی، دہلی

نام کتاب :۔ **غالبؔ کا ایک مشتاق شاگرد**
مصنف :۔ کالی داس گپتا رضا
ضخامت :۔ ۱۴۰ ▲ قیمت ۹۰ روپے
ملنے کا پتہ :۔ ساکار پبلیشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی

بال مکند بے صبر غالبؔ کے شاگردوں میں سے ایک تھے، انہوں نے غالب سے جو اصلاحیں لی تھیں اگرچہ ان کا سراغ نہیں ملتا لیکن انہوں نے جگہ جگہ غالبؔ کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔ وہ غالب سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور اپنی مثنویوں، قطعات اور غزل کے اشعار میں اپنے استاذ کا ذکر بڑے احترام عقیدت سے کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے انہیں بہت کچھ دیا تھا۔ اس کا پورا ثبوت جب منشی مہیش پرشاد مہیا نہیں کر سکے تو جناب رضا کے پاس کہاں سے آجاتے۔ البتہ سحر عشق آبادی کے حوالے سے ایک شعر میسر ہوتا ہے جس میں غالبؔ نے بے صبر کے ایک مصرع میں شکست ناروا کا عیب دور کیا تھا۔ بے صبر کا شعر یوں تھا ؎

میں نے کہا ترا جو بے صبر تھا رات مر گیا
کہنے لگا وہ کون تھا میں اسے جانتا نہیں

غالبؔ نے اصلاح کے بعد یوں کر دیا۔

اس سے کسی نے یہ کہا بال مکند مر گیا
کہنے لگا وہ کون تھا میں اسے جانتا نہیں

اس کے علاوہ اور کہیں غالب کی اصلاحیں نظر نہیں آتیں

کچھ باتیں مراسلت سے بھی طے ہوتی ہیں۔
غالب نے متعدد شاگردوں کو خطوط کے ذریعہ
فن رموز اور کلام کی اغلاط کی طرف متوجہ کیا ہے
افسوس ہے کہ بال مکند بے صبر کے نام غالب کے
خطوط بھی دستیاب نہیں ہیں۔

اب ایسے میں جناب کالی داس گپتا رضا
نے جو مواد بھی اکٹھا کیا ہے اور انہیں جس طرح
تحقیقی منازل سے گزار کر مرتب کیا ہے وہ رضا
کے علاوہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔
جناب رضا نے بے صبر کا کلام بھی شائع کر دیا ہے

بلاشبہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بال مکند بے صبر
اوسط درجے میں خوش گو شاعر تھے۔ شعری مرتبے
کے لحاظ سے ان کی بہت بلند حیثیت نہ بھی بنتی ہو
تو بھی تاریخی، تہذیبی اور لسانی حوالوں کی جو کڑیاں
ایسے فن کاروں کے ذریعہ ہاتھ آتی ہیں ان کی اہمیت
سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جناب رضا کے ایسے
کارناموں سے انسانی اور فنی تاریخ کی ترتیب سے
تکمیل ہو رہی ہے اور جستہ جستہ انہوں نے اتنا کچھ
کر لیا ہے کہ ایک ذخیرہ تیار ہو گیا ہے۔ جناب رضا
کا علمی و ادبی ذوق و شوق کبھی نہ تھکنے والا ہے اور سنجیدہ
علمی کام کرنے والوں کے لئے فی زمانہ ایک نہایت پائیدار
اور موثر تحریک ہے۔

● علیم اللہ حالی

بقیہ :- مشاعرہ فٹ پاتھ ۔۔۔

ہاتھی تو مر کر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔
"حضور، اونٹ جنگلی نہیں ہوتا۔"
ریگستانوں میں جنگل ہوتے ہی نہیں تو جنگلی
کہاں سے ہوگا۔ ویسے جنگل کا انسانی تہذیب و
ارتقاء سے گہرا رشتہ ہے۔"
"یہ سچ بھی ہے ۔۔"
"اونٹ کے کارن ۔۔"
اونٹ اور ہاتھی کے جھگڑے میں فٹ پاتھ
رسے جا رہے تھے۔ اکثر بحث کا نتیجہ یہی ہوتا
ہے کہ اصل موضوع غائب ہو جاتا ہے۔ جھگڑا
رہ جاتا ہے۔
کافی دھوپ دوڑ کے بعد یہ راز کھلا کہ
دن میں دکانداری اور رات میں انسانی مخلوق میں
اضافے کے لئے فٹ پاتھ بے دریغی سے استعمال
ہو سکتے ہیں۔ ان پر جو مخلوق آ گئی ہے یا اگائی
جاتی ہے۔ وہ روایت کی پابندی کرتے ہوئے
زندگی بھر کسی کی شوخئ تحریر کا نقش فریادی ہی
رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں
ہر وہ چیز اور کام جو غلط اور ناجائز ڈھنگ
کیا جائے۔ آخر کو سودمند ثابت ہوتا ہے
فٹ پاتھ کا، چونکہ اس ملک کے
عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ان کو قبول
جانا بہتر ہے۔ مقامات آہ و فغاں اور بھی
ہیں۔

● براہ کرم اپنی تخلیق اور خطوط
صاف اور خوشخط لکھیں :-

شہرِ خیال

غیر معمولی رہا۔ آپ نے کئی فنکاروں کی شخصیت پر مضامین یکجا کر لئے اور متعلقہ اصحاب نے نہایت گہرائی کے ساتھ ان فنکاروں کی شخصیت کا احاطہ کیا ہے۔ یوں فنکاروں کے فن اور انکی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئے اس طرح ان کے فن کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ اس نوع کے تجربے ضروری ہیں۔ میری جانب سے مبارکباد۔
محبی علیم اللہ حالی صاحب اور دیگر احباب سے آداب کہئے۔

● پروفیسر سلیمان اطہر جاوید۔ تیری پتی

○ آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۲ ستمبر وصول ہوا۔ اس سے دو روز قبل آپ کے موقر جریدہ سہیل کے دو شمارے بھی ملے۔ ایک شمارہ میں میری ناچیز ادبی کاوشوں پر محب مکرم جناب رستوگی صاحب نے ازراہِ کرم گستری، ایک طویل مضمون لکھ دیا۔ ستم بالائے ستم کہ آپ نے اسے چھاپ بھی دیا۔ (خیر رستوگی صاحب کا مضمون کون نہیں چھاپے گا؟) آپ کا سہیل میں ہمیشہ شوق سے پڑھتا ہوں۔ دبستان عظیم آباد کی شمع ادب اردو آپ نے اب تک روشن رکھی ہے۔ خدا آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

● سید مظفر حسین برنی۔ دہلی

○ [illegible] کئی ماہ سے "سہیل" بھی پہنچ رہا ہے اس [illegible] ممنون ہوں۔ آپ جس بلند معیار، وسیع انداز اور [illegible] کے ساتھ "سہیل" شائع کر رہے ہیں وہ لائق [illegible] ہر شمارہ کی طرح ادھر تازہ شمارہ بھی کئی چیزوں [illegible] لیکن شمارہ [illegible] اور فنکار [illegible]

○ "سہیل" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ محترم جناب اصغر علی انجینئر صاحب کی پریم چند حیات اور فن پر آخری قسط بھی پڑھی۔ اس مضمون کو کتابی شکل میں پڑھنے کا اشتیاق ہے۔ محمود کے تحت مذہب اور سیاست پر آپ کی مختصر اور گراں قدر رائے یقیناً قابل ستائش ہے اور ہم اتفاق کرتے ہیں۔ دیگر مضامین بھی معیاری ہیں۔ نظموں نے متاثر کیا خاص طور پر خورشید طلب کی بوسنیا کے پس منظر میں تین نظمیں نہایت موثر ہیں۔ غزلیں سبھی "سہیل" کے معیار کے مطابق ہیں۔ شروَن کمار ورما کی کہانی بدلتے رنگ، مشرف عالم ذوقی کی دسویں قسط "مسلمان" اور عفت اقبال کا سمجھوتہ ذہن و دل میں گھر کر گئے۔

● رؤف جاوید، گوالیار

○ [illegible] آف ڈیفنس کی ملازمت کے باعث [illegible] تھا۔ یہاں [illegible] سے کلکتہ جانا پڑا۔ کلکتہ میں آٹھ سال قیام رہا۔ اب پھر چند ماہ قبل تبادلہ کروا کر [illegible]

وطن شاہجہاں پور آکر ادب کی خدمت میں نہایت خاموشی
کے ساتھ مصروف ہوں۔ دوران قیام کلکتہ جب مغربی
بنگال اردو اکادمی میں جانا ہوا تو آپ کا وقیع اور
معیاری جریدہ سہیل بھی پڑھنے کو ملا اور مشمولات سے
نہایت محظوظ ہوتا رہا۔ چند روز قبل شاہجہاں پور میں
سہیل کے دو شمارے ۳ اور ۴ نظر سے گزرے
بہت پسند آئے۔ ایسے جریدہ میں کیوں نہ کلام شائع
ہونے کے لئے بھیجوں جس کی مجلس مشاورت میں محترم
قمر رئیس، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، اصغر علی انجینیر،
قیصر عثمانی، شاہد احمد شعیب، ڈاکٹر محمد ملک، ڈاکٹر
علیم اللہ حالی اور سید احمد قادری جیسے اہم اور نامور
ادبا و شعرا کی شمولیت "سہیل" کی عظمت و وقار
کی ضامن ہے۔

● نسیم شاہجہانپوری، شاہجہانپور

○ "سہیل" کے شمارہ ۳ جلد ۵۳ میں جناب
تارا چرن رستوگی کا مضمون "دہلی کے چار شعرا بہ نظر
انتقاد" اول تا آخر بغور پڑھا۔ مضمون اختلاف
رائے کی گنجائش رکھتا ہے۔

موصوف نے جن نامور شعرا مخمور سعیدی،
عنوان چشتی، رفعت سروش اور راج نرائن راز کے
بعض اشعار پر تنقید و تنقیص نیز اصلاح کی زحمت فرمائی
ہے۔ مضمون پڑھ کر ان کی نیت کے اخلاص پر شبہ ہوتا ہے
اس میں شک نہیں کہ موصوف تنقیدی بصیرت بھی رکھتے
ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے
اس مضمون میں اپنی ادبی صلاحیتوں کا بے جا استعمال
کرکے چاروں شعرا کو کمتر ین اور غلط گو ثابت کرنے کے
لئے جو راستہ اپنایا ہے اس سے ان کی فنی و ادبی بصیرت
کے بجائے ان کے ذہن کی کثافت صاف دکھائی دے رہی
ہے۔ مخمور سعیدی کے اس شعر کے بارے میں سے

سُن لی صدائے کوہ ندا اور چل دیئے
ہم سے کسی نے کچھ نہ کہا اور چل دیئے

موصوف کا اعتراض کوہ ندا کی علامتی معنویت اور
اس کے تاریخی کردار سے عدم واقفیت کا جواز فراہم کرتا
ہے۔ جناب عبدالمتین نیاز کھوپالی نے اپنے خط مطبوعہ
"سہیل" شمارہ ۶ جلد ۵۳ صفحہ ۴۰-۴۱ پر اس
شعر کا مفہوم بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے مجھے
موصوف کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے۔

ملک کے دوسرے نامور اور باوقار شاعر جناب
عنوان چشتی کی شخصیت، شاعری اور دلبستان
ابر گنوری سے وابستگی پر بلا وجہ اپنی بیزاری کا
اظہار کرتے ہوئے دلبستان ابر گنوری کو نام نہاد
اور حضرت ابر احسنی گنوری کو ناکام شاعر قرار دیتے
ہوئے اور ان کے شاگردوں کی فوج کا اعتراف
کرتے ہوئے یہ بھی بے ساختہ تحریر فرما دیا کہ ابر صاحب
کی عمر بھر کی شاعری میں ایک بھی معیاری شعر تلاش بسیار
پر بھی نہیں ملتا۔ عنوان چشتی کے استاد گرامی حضرت
ابر احسنی گنوری جو اب بقید حیات بھی نہیں ہیں اور
عنوان چشتی کے بارے میں ان کا انداز تحریر غیر
منصفانہ ہے۔

ڈاکٹر موصوف کو تحریری طور پر اس قدر جذباتی
نہیں ہونا چاہئے تھا ان کی یہ ادا ہمیں ذرا بھی پسند
نہیں آئی۔ اس طرح کے اعتراضات راج نرائن راز اور رفعت
سروش کی شاعری پر بھی کئے ہیں جس سے مخاصمت کی بو آتی ہے

بانی:۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی -

بیادگار: زین العابدین احمر وادریس سنہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

- شمارہ ۱۰-۱۱ جلد ۵۳

بدل اشتراک

- فی شمارہ .... ۵ روپے
- زر سالانہ .... ۵۰ روپے
- لائف ممبری .... ۱۰۰۰ روپے

فہرست

★

▲ خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سُہیل

ریور سائیڈ روڈ، گیا

فون نمبر ۲۱۵۷۳

درخت لگائیں ۔ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے اہم جان ہے۔ اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔
(۲) یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے مہیا وسائل کا استعمال پورے ویدک سے کریں۔

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتے ہوئے
اس کی حفاظت آنے والی نسل کے لئے کریں۔

(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہتر لائحہ عمل ہے اس سے فرار نقصان دہ ہوگی۔

(۵) باڑھ اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات اتنا پراگندہ ہو جائے گا
کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا۔

(۶) سرزمین کی وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات
اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے۔

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی اس سرزمین پر پہلے ہوئی تھی
انہوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے جس سے انسان کا اس سرزمین پر افزائش
ہوئی۔ آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے
(۸) درخت لگائیں ۔ جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں اور اس سرزمین کی
ماحولیات کو بہتر بنائیں۔

جاری کردہ :۔ محکمہ جنگلات و ماحولیات، بہار
/22 H.(H-50)93-94

شذرہ

سیکولرزم اور ہمارا ملک

ہمارے ملک کا آئین مذہبی ناوابستگی (سیکولرزم) کا عہدنامہ ہے۔ شاید اسی لئے کانگریس پارٹی اس بنیادی نقطے کا حوالہ بار بار دیتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب سے لے کر اب تک کانگریس کی سچی دلچسپی اس بنیادی نقطے سے نہیں رہی ہے۔ اس سیاسی جماعت کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس نے نظریات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ لیکن یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ اعلیٰ نظریات جو ملک کو سیکولرزم کے راستے پر چلاتے ہوئے اس کے اتحاد اور سالمیت کا تحفظ کریں۔ اقتدار کے پیچھے پیچھے نہیں بھاگ سکتے۔

کانگریس کی تاریخ کے ابواب بتاتے ہیں کہ محض اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے اس نے آئین کے زریں اصول کو داؤ پر چڑھا دیا ہے۔ اور جب جب ضرورت ہوئی ہے دائیں بازو کی رجعت پسندی اور اکثریتی فرقے کی مذہبیانہ احیا پرستی کو بڑھاوا دیا ہے۔ انتخابات کی یہ حکمت عملی کئی بار آزمائی گئی ہے بلاشبہ اس سے اس جماعت کو اقتدار سنبھالنے کا موقع تو ملا لیکن ووٹوں کی قیمت چکانے کے لئے اسے سیکولرزم کو کئی قسطوں میں نیلام پر چڑھانا پڑا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اقتدار کو اچھے نظریات کے ذریعہ حاصل کرنا چاہئے تھا پھر اقتدار میں آجانے کے بعد ان کے تحفظ و بقا کے لئے مستعدی کے ساتھ فضا سازگار رکھنی چاہئے تھی۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کانگریس کا شانہ ایک طرف اس طرح جھکتا چلا گیا کہ اس میں مستقلاً جسمانی عیب پیدا ہوچکا ہے (آج بھی یہی گومگو کی صورتحال ہے۔ یہ وقت تھا کہ سر اٹھاتی ہوئی رجعت پسندی اور سماجی طاقتوں کی پوری طرح سرکوبی کرکے ایک بار پھر عوام و خواص کو یہ بتایا جائے کو ہندوستان کی سالمیت، تحفظ اور امن و سکون کے لئے کیا کرنا ہے۔ مگر مصلحتوں کو خاطر میں لاتے والی کانگریس ڈری سہمی کوئی قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے تو اب اپنی ناطاقتی کی وجہ سے اٹھا نہیں پاتی۔ فکری اور عملی زوال کا کیسا منظریہ سامنے آیا ہے

مسعود منظر

گیان چند

نوطرزِ مرصّع، اسلوب اور ادبی اہمیت

آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے:

"میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نوطرزِ مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔"

اس بیان میں تھوڑی سی بھول چوک ہے۔ تحسین کا نام محمد عطا حسین خاں نہیں۔ الٹے طریقے پر محمد حسین عطا خاں تھا۔ کتاب کا پورا نام انشائے نوطرزِ مرصع تھا۔ آصف الدولہ ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ سے ایک سال پہلے یعنی ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ کو وفات پا گئے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ۲۵ جنوری ۱۷۷۵ء کو ہوا۔ تحسین نے صراحت کی ہے کہ وہ داستان کو پوری کر کے نواب شجاع الدولہ کو گزراننا چاہتا تھا کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے نواب آصف الدولہ کی مدح میں ایک قصیدہ جوڑ کر انہیں پیش کر دی۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ داستان جنوری ۱۷۷۵ء یا ممکن ہے ۱۷۷۴ء کے اواخر ہی میں مکمل ہو چکی تھی۔

یہ تو ہوئی تکمیل کی بات۔ شروع کب ہوئی۔ لکھتے ہیں کہ وہ جنرل اسمتھ کے ساتھ دریا کی سواری سے کلکتے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک عزیز نے یہ قصہ سنایا۔ انھیں لالچ آیا کہ اسے رنگین اردو میں لکھ دیا جائے چنانچہ انھوں نے ابتدا کے کچھ فقرے لکھ بھی دیئے۔ جنرل اسمتھ کون تھا؟ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے ڈاکٹر سید سجاد حسین نے نوطرزِ مرصع پر تحقیق کر کے ۱۹۳۲ء میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ ان کی دریافت کے مطابق جنرل اسمتھ نے یہ دریائی سفر ۱۷۶۸ء میں کیا تھا۔ نوطرزِ مرصع کی داغ بیل پانی کے اسی سفر میں پڑی۔

مصنف لکھتا ہے کہ اس نے اس داستان کو ہندی (یعنی اردو) میں لکھنے کا ارادہ اس لئے کیا کہ "آگے کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا"

ایجاد تازہ سے کیا مراد ہے۔ اردو میں نثر لکھنا یا اردو
نثر میں داستان لکھنا؟ میرا خیال ہے کہ تحسین کی
مراد نثر میں داستان لکھنا ہی ہے۔ کیونکہ اردو نثر
میں تو ان سے پہلے بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔
میں مانتا ہوں کہ انھیں دکنی نثر کا علم نہ رہا لیکن فضلی
کی کربل کتھا ۱۷۳۲ء میں وجود میں آ چکی تھی۔ اس کا
علم ہونا چاہئے تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ نوطرزِ مرصع
شمالی ہند کی پہلی نثری داستان بھی نہیں۔ اس
سے تقریباً چوتھائی صدی پہلے یعنی ۱۷۵۲ء کے
لگ بھگ نواب عیسوی خان بہادر قصۂ مہر افروز و
دلبر لکھ چکے تھے۔

قصۂ مہر افروز و دلبر اردو میں سبزۂ بیگانہ ہے
اردو کے مزاج سے بدرنگ لگتا ہے اردو کے تنے پر
برج بھاشا کی قلم لگادی ہے۔ مہر افروز و دلبر اور نو
طرزِ مرصع اردو زبان کی نوعیت کی دو انتہاؤں کو پیش
کرتی ہیں۔ ایک پورب کو دیکھتی ہے، دوسری پچھم کو۔
مہر افروز و دلبر سے زیادہ ہندی زدہ اور نوطرزِ مرصع
سے زیادہ عربی فارسی زدہ کوئی دوسری کتاب نہیں۔
لیکن قصۂ مہر افروز و دلبر کا عدم وجود یکساں ہے
کیونکہ اس کی حالیہ اشاعت سے پہلے کسی نے اس
کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ جب کہ نوطرزِ مرصع وجود میں
آتے ہی اتنی شہرت پا چکی تھی کہ بعد کے ہر بڑے
داستان نگار نے اس کا تذکرہ کیا۔

تحسین نے داستان کی تصنیف میں یہ فائدہ
مدنظر رکھا ہے کہ "جو کوئی زبان اردوئے معلیٰ سیکھنے
کا حوصلہ رکھتا ہو تو اس کے مطالعے سے کلام کرنے
کا شعور حاصل کرے گا۔"

تحسین نے باقاعدہ خوش نویسی کی مشق کی تھی۔
ان کا خطاب مرصع رقم تھا۔ ممکن ہے کتاب کے نام
انشائے نوطرزِ مرصع میں ان کے خطاب مرصع رقم
کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو لیکن اس سے اہم تر
وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس چار لفظی مرکب میں کتاب
کے اسلوب کی جملہ خصوصیات سمادی ہیں۔ یہ
کتاب انشا پردازی کا نمونہ ہے، انشا کی یہ طرز نئی
ہے اور یہ طرز مرصع ہے۔

مغلوں کے ہندوستان میں شاہی دور بڑے
ٹھسّے کے ہوتے تھے۔ عمائد زرق برق پوشاک
میں ملبوس رہتے تھے۔ ان کی طرز ماند و بود کا عکس
ان کے اسلوب تحریر پر بھی پڑا۔ تشبیہہ و استعارے،
صنائع بدائع سے معمور، مرصع مسجع نثاری انداز،
سبک ہندی کہلایا۔ اس میں لکھنا علمیت کی نشانی
سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں فارسی کا وہی دبدبہ
تھا جو آج انگریزی کا ہے۔ فارسی علمی زبان تھی۔
اردو محض عوامی۔ اردو نثر لکھنا کسی کے لئے موجب
فخر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ابتدائی اردو نثاروں
نے اردو اس جھاڑ بور اسلوب میں لکھی کہ انھیں
فارسی انشا پردازوں سے کم نہ سمجھا جائے۔ فضلی
اور تحسین نے اپنے عہد کے مطالبے کو پورا کیا۔

کمپنی کے انگریز کاروباری نثر کے دلدادہ تھے
فورٹ ولیم کالج میں انھوں نے اسی کو رائج کیا لیکن
یہ سلیس اسلوب قبول عام نہ پا سکا۔ کربل کتھا،
نوطرز مرصع، مہجور کی انشائے گلشن نوبہار، سرور
کی فسانۂ عجائب، سرسید کی آثار الصنادید کا پہلا
ایڈیشن سلیس نثر میں لکھا گئے۔ حد یہ ہے کہ

فورٹ ولیم کالج کے ہیڈ منشی میر بہادر علی حسینی نے
نثر بے نظیر کا پہلا ایڈیشن سلیس نثر میں لکھا تھا۔
لیکن دوسری بار مرصع اسلوب میں لکھنے پر مجبور ہوئے
جمیل جالبی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق یہ روپ
کراچی کے ایک نسخے میں موجود ہے۔ (تاریخ ادب
اردو جلد ۲ حصہ ۲ ص ۱۱۰۲)

نوطرز مرصع میں عربی فارسی صفات، مسجع فقروں
تشبیہہ اور استعاروں، صنائع بدائع کی ریل پیل ہے۔
شاید مصنف ایک دبدھا ہے کہ اردو کی ادبی نثر کیسی
ہو۔ اس لئے وہ حتی الوسع اسے فارسی کا رنگ دے
رہا ہے۔ وصفی فقروں کی کثرت کا اندازہ اس مثال
سے لگایا جا سکتا ہے کہ شجاع الدولہ کے نام سے پہلے
بارہ تیرہ سطروں میں یہ فقرے لائے ہوئے۔ پوری کتاب
میں شروع سے آخر تک جملوں میں شامل فقروں کی
نحوی ساخت فارسی کے انداز پر ہے۔ مثلاً

بیچ عبارت رنگین، مطالعہ دو گلدستہ بہاریں
کے ہے، بیچ کھینے حقیقت [illegible] نہیں کہ اس وقت
تک اردو میں صفتی یا اضافتی ترکیبیں فارسی کی طرح
ہوتی تھیں۔ شعر میں دیکھئے سب کچھ اردو کے فطری
انداز سے ملے گا۔

اہل مشرق بالعموم اور اہل اردو بالخصوص شاعری
کے گرویدہ ہیں۔ وہ اسی نثر پر جان چھڑکتے ہیں جس
میں شعریت گھلی ہو۔ اگلے زمانے کے انشا پرداز نثر اور
شعر کے انداز مدغم کر دیتے تھے۔ [illegible] تحسین
کو کہنا ہے کہ آدھی رات کے وقت ایک صندوق قلعے
کی دیوار سے نیچے آیا۔ اسے یوں کہتے ہیں۔
[illegible] وقت زلف خاتون شب، لی، کمر تک
پہنچی اور چشم خلائق کی، خمار نشۂ غنودگی کے سے،
سرمست خواب غفلت کے، ہوئی یکایک صندوق
چوبیں۔ نزار دیوار کے سے۔ مانند خورشید کے،
برج حمل کے سے، جلا بخش دیدۂ تماشائیں کا ہوا۔"
اس نثر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اسی دور
میں، انھیں انشا پردازوں کے ذہن و قلب میں اتر
آنا ہوگا۔ تنقید نگار کے سامنے ایک مسئلہ ابھرتا ہے
کہ ماضی کے ادب پاروں کو اپنے دور کے پیمانے سے
پرکھے یا ان کے عہد تخلیق کے معیار سے۔ مصنف
اسی اسلوب میں لکھے گا جس کی اس وقت مانگ ہوگی۔
ہمارے مذاق کے مطابق نہیں۔ اس زمانے کے خوش
ذوق، پڑھے لکھے قاری کو یہ انشا سمجھنا دشوار نہ تھا۔
بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسی کا رسیا تھا۔ سلیس انداز
کو [illegible] سمجھتا تھا۔ نوطرز مرصع سے لطف لینے
کے لئے [illegible] فقروں کو صحیح
لطف و اضافت کے ساتھ اسی تواتر سے پڑھنا
ہوگا کہ نثری آہنگ کھل کر سامنے آجائے۔ صحیح مقام
پر [illegible] کے فقروں کا مفہوم آئینہ ہو
جائے گا۔

[illegible] خاں نے فسانۂ عجائب کے طرز
تحریر کے لئے لکھا ہے کہ اس کی نثر میں بہت سے مقامات
پر [illegible] اور کہیں اپنی دکھائی دیتا ہے جو مصنف کی
[illegible] کی وجہ سے ہے۔ سرور کے سامنے مرصع اسلوب
کے نمونے تھے۔ [illegible]
اردو نثر میں [illegible] کوئی نمونہ نہ تھا۔ اگر وہ فضلی کے
کربل کتھا سے واقف نہ رہا ہو۔ اس طرح اس نے
اردو نثر میں مرصع اسلوب کا پہلی بار تجربہ کیا۔ اس

کے طویل جملوں میں بعض اوقات نثری آہنگ چھپتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے باوجود اس کتاب کی بہت اہمیت ہے میر امّن نے اس پر اپنے شاہکار باغ و بہار کی بنیاد رکھی، حکیم مہجور نے انشائے گلشن نو بہار لکھی تو بے اختیار ان کا جی چاہا کہ "اس قصہ فصیح و ملیح کو یہ خطہ گلزار و یہ صفحہ رنگین، زبان ہندی میں، بطرز نو طرز مرصع کے لکھیے۔ اور سرور نے فسانہ عجائب میں نوطرز مرصع کو باغ و بہار پر ترجیح دی۔ میر امّن کے لئے لکھتے ہیں کہ "یہ نسبت مولف اوّل عطا حسین خاں کے سوختہ منہ کی کھائی ہے۔

اسلوب کے علاوہ اس داستان کی تہذیبی اہمیت بھی ہے اس میں اس دور کے طبقۂ اُمرا کی معاشرت کے چکا چوند کرنے والے مرقعے ہیں۔ باغ و بہار میں دوسرے درویش کی سیر میں پہلی ضیافت کی جو تفصیل دی ہے اس میں کھانوں کی کثرت دیکھ کر ہوش اڑتے ہیں۔ یہ بیان میر امّن کی استادی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسی کو نوطرز مرصع میں دیکھا تو یہاں کھانوں کا انبار باغ و بہار سے زیادہ ہی ہے، کم نہیں تحسین کی بد نصیبی تھی کہ میر امّن جیسے آنائے اُردو نے اس داستان کو دوبارہ لکھا جس کی وجہ سے تحسین کا کارنامہ ماند پڑ گیا، لیکن یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ اس وقت شمالی ہند میں اردو نثر میں کوئی ادبی تصنیف نہ تھی بجز بد رنگ گم نام قصہ مہر افروز و دلبر کے۔

نوطرز مرصع شمال میں نثر کے ایک اہم اسلوب میں پہلی ادبی تصنیف ہے جس کا دوست، دشمن ہر ایک نے ذکر کیا۔ اگر تحسین کے ساتھ نہیں تو ... کے ساتھ

سہی، نظر انداز کوئی نہ کر سکا۔

شارق

بقیہ: ترقی پسند تحریک .....

اور پابندیوں یا پالیسیوں کی حمایت کرنے کے کچھ فوائد ضرور تھے لیکن تخلیقی آزادی اور تحریک کی ارتقاء کے کچھ اپنے تقاضے تھے۔ جمہوری نظام میں تخلیقی آزادی اور ان تقاضوں کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند مصنفین اب ہیئت اور مواد دونوں اعتبار سے نئے تجربوں کی طرف راغب ہوئے۔ ترقی پسندی کی جو ایسی روایتیں قائم ہو چکی تھیں ان سے بغاوت نہیں تو ان سے گریز کے آثار ضرور نمودار ہوئے۔ یوں بھی بدلتے ہوئے حالات ادیب کو نیا مواد اور نئی ہیئتیں فراہم کرتے ہیں۔

ادھر جدیدیت نے "نظریے کی موت" DEATH OF IDEOLOGY کا نعرہ لگایا تھا۔ "نظریے کی موت" ایک مہمل نعرہ ہے۔ ہندوستان میں تو کیا مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک میں بھی نظریہ مضبوط سے مضبوط تر ہوا ہے۔ ہر سماج میں کچھ مفادات ہوتے ہیں اور کچھ قدریں۔ نظریہ مفادات کے ادراک بھی عبارت ہے اور قدروں کے اعتراف بھی۔ کوئی بھی سماج نہ مفادات سے محروم ہو سکتا ہے نہ قدروں سے اس لئے نظریے کی موت کبھی واقع نہیں ہوتی البتہ تبدیلی حالات سے نظریے میں لچک پیدا کرنے کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ لچک ترقی پسند تحریک میں ہندوستانی جمہوری اور لبرل نظام میں ناگزیر تھی اور چھٹے دہے کے بعد پیدا ہوئی۔ یہ ترقی پسند

اصغر علی انجینئر

ترقی پسند تحریک ۔ انتقادی جائزہ

ترقی پسند تحریک چھٹی دہائی میں ہی ایک نئے موڑ پر آ چکی تھی۔ اس تحریک پر ترقی پسند مخالف عناصر تو ہمیشہ سے حملے کرتے رہے ہیں لیکن چھٹی دہائی کی ابتدا میں خود ترقی پسند مصنفین کو بھی اس تحریک کے طریقۂ کار پر دوبارہ سوچنے پر پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اور چھٹی دہائی سے نویں دہائی کی ابتدا تک ہم طویل ذہنی سفر طے کر چکے ہیں۔ اتنا ہی نہیں سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ممالک میں پچھلے چند سالوں میں جو زبردست تبدیلیاں آئی ہیں اس نے ہمیں بالکل نئے سرے سے غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا ہے حالات اتنی تیزی سے بدلے ہیں کہ آج ایک بھی ترقی پسند مصنف ایسا نہیں ملے گا۔ جو ان تبدیلیوں کا اعتراف نہ کرے۔ ہمیں یہ کھلے دل سے تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی کے حقیقتیں اتنی خود مختار ہوتی ہیں اور ان کی اپنی ایسی منہ زور سچائی ہوتی ہے کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنی خود مختاری منوا کر ہی رہتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنے ذہن کا ہر دریچہ بھیڑ کر اندھیرے کمرے میں بیٹھ جائے۔

یہاں ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں جدیدیت کی نظریاتی بنیادوں سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ ہم بیرونی حملے کی نہیں داخلی تنقید کے قائل ہیں۔ جدیدیت کی نظریاتی بنیادیں اتنی کھوکھلی اور بے جان ہیں کہ کئی ادیب تخلیق کار جو دس بیس برس پہلے جدیدیت کے زبردست حامی تھے۔ بالآخر اس سے مایوس اور DISILLUSIONED ہو کر دستبردار ہو گئے۔ اور کچھ تخلیق کار تو ترقی پسندی کی نئی سمتیں اور نئی راہیں تلاش کرنے لگے۔ ان میں شعرا بھی شامل ہیں۔ اور کئی ناول اور افسانہ نگار بھی۔

ہم پہلے ترقی پسندی اور جدیدیت کا مختصر

جائزہ لینا چاہیں گے تاکہ ہم صحت مند تنقیدی رویہ اختیار
کرتے ہوئے ترقی پسندی کی فنی راہیں اور سمتیں مقرر
کرسکیں ۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک اس صدی
کی تیسری دہائی میں شروع ہوئی ۔ یہ تحریک زندگی
کی دھڑکنوں کے ساتھ سانس لیتے ہوئے ابھری
یہ زندگی کا اثبات کرتے ہوئے جامد اور فنی ابھرتی
ہوئی حقیقتوں کی نفی کرنے والی روایتوں کے خلاف
بغاوت تھی ۔ اس بات سے کون انکار کرے گا کہ زندگی
مسلسل انقلاب کا نام ہے اور ہمیں موجودہ حقیقتوں
سے بھی آنکھیں ملانا ضروری ہوتا ہے ۔

تیسری دہائی سے پہلے اردو ادب میں ادھر
ادھر تبدیلی کی لہر ضرور محسوس کی گئی تھی لیکن یہ معاشرے
کی جامد روایتوں سے ٹکر لینے کا دم خم نہیں رکھتی تھی
ہمارے معاشرے میں روایت پرستی کی جڑیں اتنی
گہری اور مضبوط تھی کہ اس میں تبدیلی لانے کے لئے ایک
مضبوط اور منظم تحریک کی ضرورت تھی ۔ سرسید احمد
خان جیسی قدآور شخصیت بھی اوپری اور درمیانے
طبقوں میں اس کی کچھ ہلچل پیدا کرسکی تھی ۔ سماجی
اور مذہبی امور میں نئے شعور کی ایک جھلک اس
نے ضرور پیدا کی لیکن اوپری طبقے اسے اپنے طور پر
اور اپنے مفاد میں استعمال کرنے لگے ۔ دوسرے
لفظوں میں ان طبقوں نے سرسید کی اس تحریک
کو اپنے مفاد میں کو آپٹ کرلیا ۔ درمیانے اور نچلے
طبقوں میں اس کی کچھ بوندیں ٹپک کر رہ گئیں ۔ اس
تحریک نے ادبی روایتوں کی جڑوں کو ہلانے میں بھی
خاص کامیابی حاصل نہیں کی تھی ۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حسرت موہانی نے غزل
کو ایک نیا موڑ دیا تھا اور سیاست اور ادب
کے ادھاروں کو ملانے کی کامیاب کوشش کی تھی
لیکن یہ ایک شخصی کوشش تھی اور اس کوشش نے
ترقی پسند تحریک کو راستہ بھی دکھایا ۔

جہاں برطانوی سامراجیت ہمارے ملک
اور سماج کے لئے ایک سیاسی لعنت تھی وہاں
اس نے ہمیں کچھ نئی قدروں سے روشناس بھی
کرایا ۔ سرسید وغیرہ نے انہی نئی قدروں کا استقبال
کیا اور روایتی سماج میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش
کی ۔ لیکن سرسید خود درباری امرار کے خاندان سے
تعلق رکھتے تھے ۔ اور انہوں نے مغرب سے انہی قدروں
کو قبول کیا جو نام نہاد شرفار کے طبقوں کے مفاد میں
تھیں ۔ ظاہر ہے شرفا بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ
رہنے کے لئے مغرب سے درآمد کی ہوئی اوپری طبقوں
کو عزیز چند قدروں کو اپنانا چاہتے تھے ۔ اور سرسید
نے ان کو یہ راہ دکھلائی اور مغرب سے درآمدہ ان
قدروں کو اپنانے کے لئے جواز بھی پیدا کیا ۔ لیکن ان
نئی قدروں میں عقلیت پرستی ضرور تھی لیکن یہ انصاف
پرستی سے بے خبر تھیں ۔

سرسید کی تحریک اور تیسرے دہائی کی ترقی پسند
تحریک میں اور باتوں کے علاوہ ایک بنیادی فرق یہ
بھی تھا کہ سرسید کی تحریک کا سارا فوکس عقلیت
پرستی پر تھا جب کہ ترقی پسند تحریک کا فوکس عقل
پرستی کے ساتھ ساتھ انصاف پرستی پر بھی تھا
اور ایک معنی میں ترقی پسند تحریک نے انصاف پر

کو اپنا محور بنایا۔ سرسید کی تحریک نے اگر سماج کے اونچے طبقوں کو ایک نئی روشنی دی تو ترقی پسند تحریک نے مظلوم اور محروم طبقوں کو ایک نئی دِشا دی۔ ان کو زندگی گزارنے کا ایک نیا حوصلہ دیا۔

ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک روسی انقلاب کے زیر اثر جنمی تھی اور اس کے بانی روسی انقلاب کے فیضان سے تحریک حاصل کر رہے تھے۔ فرانس کے انقلاب کے بعد روسی انقلاب انسانی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس انقلاب نے دنیا کے مظلوم اور محروم طبقوں کو بیدار کیا تھا اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کی امنگ پیدا کی تھی۔ ظلم اور استحصال کے خلاف بغاوت تو ہمیشہ ہوتی رہی ہے لیکن مظلوم اور محروم طبقوں نے اپنی حکومت اور اپنا نظام قائم کرنے میں پہلی بار کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کامیابی نے جہاں مظلوموں اور استحصال کردہ طبقوں کو نیا عزم اور حوصلہ عطا کیا تھا۔ وہاں جابر اور مستبد طبقوں میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔

ظاہر ہے جس تحریک کو ایسے انقلاب سے انسپیریشن ملا ہو وہ تحریک کتنی زندگی سے بھرپور اور حوصلہ مند رہی ہوگی۔ تیسری دہائی میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک میں ظلم اور استحصال کو للکارنے کا جوش و ولولہ تھا اس نے جاگیردارانہ معاشرے کی ہر جامد روایت کی نفی کی اور ظلمت پرستی کو للکارا۔ اس سے اس ادب کی دنیا میں زلزلہ آیا جو شرفاء کا ادب تھا۔ اور فرصت یافتہ طبقوں کا تخلیق کردہ ادب تھا۔ اس میں مظلوم اور محروم طبقوں کی محرومیوں اور نامرادیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ادب کا رشتہ زندگی سے کم اور شرفا کے تصورات حُسن اور حُسن کاری سے زیادہ تھا۔ جیسے "ادب برائے ادب" کا نام دیا گیا تھا۔ بھلا اسے ادب کو محنت کشوں کی زندگی اور امنگوں اور آرزوں سے کیا واسطہ۔ ترقی پسند تحریک نے شرفاء کے ادب کی ترجیحات کو الٹ کر رکھ دیا۔

اس سے ادب کا رشتہ نہ صرف زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں سے جڑا بلکہ اس میں ایک نئی تخلیقی قوت پیدا ہوئی اور اس کے ذریعے زندگی کی دھڑکنیں مثبت قدروں کا ادب تھا۔ زندگی کی تخلیقی قوتوں کا ادب تھا۔ اور زندگی کے احترام کا ادب تھا۔

اس کے برخلاف جدیدیت زندگی کی نفی کرنے والی طاقتوں کی حامی بن کر ابھری۔ اگر ترقی پسند ادیب نے انقلابی قوتوں سے فیضان حاصل کیا تو جدیدیت نے اس یوروپ کی نقل کرنا چاہی جو دو جنگوں کے درمیان معلق زندگی کی مایوسیوں میں سانس لے رہا تھا۔ دو عالمی جنگوں نے جو تباہی مچائی اس نے زندگی کی نفی کرنے والی قدروں کو پروان چڑھا دیا۔ زندگی میں مایوسیوں کا اندھیرا پیدا کیا اور زمان و مکان بے حقیقت بن کر رہ گئے۔ اگر اس دور کے یوروپین ادب کا مطالعہ کیا جائے تو زندگی کی طرف یہ رجحان واضح ہو کر ابھرے گا۔ دوران جنگوں کی تباہ کاریوں کی وجہ سے ہر مثبت قدر اور ہر نظریئے اور آئیڈیالوجی سے لوگوں کا اعتقاد

ہی اٹھ گیا۔ چنانچہ جدیدیت ہر مثبت قدر اور ہر
آئیڈیالوجی کی نفی کرتی ہے۔ اور اس کا مذاق اڑاتی
ہے۔ یوروپ کے بحرانی دور نے زندگی کے چہرے کو
ہی مسخ کرکے رکھ دیا۔ ان یوروپی ادیبوں نے اعلان
کردیا کہ زندگی لایعنی ہے اور اگر زندگی لایعنی ہے
تو ادب کیسے بامعنی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ادب
میں لغویت (ABSURDITY) کو اہمیت
دی گئی۔ لغو اور مہمل ڈرامے، کہانیاں اور شاعری
تخلیق کی جانے لگی۔ کچھ یوروپی ادیبوں کے لئے
زندگی محض انتظار بن کر رہ گئی اور ایک ایسا
انتظار جو نہ صرف کبھی نہ ختم ہونے والا ہے بلکہ
لایعنی بھی ہے۔ "گودو کا انتظار" نام کا ڈرامہ اس
کی بہترین مثال ہے۔

دوسری طرف یوروپ کے سرمایہ دارانہ
سماج اور شہری زندگی نے انسان کو محض کسب
معاشی اور استحصال کا آلہ کار بنا دیا۔ اس کے
سوا زندگی کے کوئی معنی ہی نہ رہے۔ زندگی کی کوئی
اہمیت ہی نہ رہی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی حرکیت
(DYNAMIES) کا محور ہے منافع اور
سرمایہ اندوزی اور سرمایہ اندوزی کے ذریعے
اور سرمایہ اندوزی جیسے کارل مارکس نے ACCUM
ACCUM- اور -ALATE, ACCUMALATE
ULATE- (ذخیرہ اندوزی، ذخیرہ اندوزی اور
ذخیرہ اندوزی) کہہ کر بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے۔
اس سے زندگی اوپری طبقوں کے لئے محض مادی
اشیا پر قبضہ کرنے (HAVING) کی جد و جہد
بن کر رہ جاتی ہے اور وہ اس میں ایسے محو ہوتے ہیں

کہ اپنے وجود (BEING) سے ہی بے خبر ہو جاتے
ہیں۔ تحلیل نفسی کے ماہر اور دانشور ایرک فرام
کہتا ہے کہ ہماری زندگی سرمایہ دارانہ معاشرے میں
HAVING پر مرکوز ہے اور (CANS-
(HUMAN) پر ہوگی تو ہم زندگی کے تمام اعلیٰ مقاصد
اور اعلیٰ قدروں سے لاپرواہ ہو جائیں گے۔ ایسے
قرآن مجید۔۔۔ میں اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ
الْمَقَابِرَ (یعنی بے جا بہتات نے تمہیں ہر بات سے
غافل بنا دیا ہے اور اسی غفلت کے عالم
میں زندگی تمام ہو جائے گی) کہہ کر بیان کیا ہے
جب ہماری ساری توجہ اپنے وجود
اور وجود کی اعلیٰ اور ماورائی قدروں سے ہٹ
کر محض زیادہ دولت بٹورنے پر مرکوز ہو جائے
تو بڑی شدید قسم کی انفرادیت جنم لیتی ہے اور
سماجی اور جماعتی قدریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یہ
انفرادیت جدید شہری اور صنعتی معاشرے میں
اجنبیت کا شدید احساس پیدا کرتی ہے۔
جدیدیت میں اسی وجہ سے اجنبیت کے احساس
کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ایک حساس ادیب
اور تخلیق کار میں یہ کربناک احساس پیدا ہونا
فطری بات بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد
یوروپی معاشرے میں اجنبیت ALIENATI
ON - کا یہ احساس اتنا شدید ہوا کہ سارتر نے
انسان کو ایک جزیرے سے تشبیہہ دی۔ وجودی
فلسفہ بھی انہیں احساسات کی پیداوار تھا۔ اس
فلسفے میں انسانی وجود کی زیادہ اہمیت ہے نہ
کہ زندگی کے مقصد اور معنی کی۔ طبعی وجود کی

اولیت پر ہی اس فلسفے کی بنیاد ہے۔ زندگی
کے نہ کوئی معنی ہیں نہ مقصد اور اگر ہیں بھی تو
اس کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ثانوی ہے۔
اس لئے زندگی اور سماج میں آئیڈیالوجی
کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جدیدیت پر معنی
میں زندگی کی طرف اور خصوصاً اجتماعی زندگی
اور نظام کی طرف بالکل منفی رجحان رکھتی ہے
یہ زندگی کا نظریہ نہیں بلکہ حالات کا ردعمل
ہے اور اس لئے اس کی اہمیت ہنگامی ہے اور
یہی وجہ ہے کہ یوروپ میں حالات بدلنے کے
ساتھ ساتھ جدیدیت کی اہمیت کم ہوتی گئی۔
آج یوروپ کے تخلیقی ادب میں ہمیں وہ رویئے
نہیں ملتے جو دوسری جنگ عظیم اور دو عالمی
جنگوں کے درمیانی دور میں نظر آتے تھے۔ اب
نہ "گودو کا انتظار" جیسا ڈرامہ لکھا جاتا ہے نہ
"قلب ماہیت" (METAMORPHOSIS)
جیسی کہانی زندگی کی طرف اب یوروپی ادب میں
منفی رویئے مجھے نہیں ملتے۔

لیکن حالات کی تبدیلی نے مغربی ادب کو
دوسرے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج مغربی ممالک
اپنی مادی ترقی کے ایسے دور سے گذر رہے ہیں۔
جس میں مال و دولت اور اشیاء کی ہر طرح سے
بہتات ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ایک
وجہ تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال بھی ہے۔
ابھی یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے۔ اس
پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ غرض یہ ہے
کہ دولت کی بہتات سارے معاشرے کو صارفیت
(CONSUMERISM) اور عیش و عشرت
(HEDONISM) کی طرف لیجاتی ہے۔ ایسے
سماج کا تخلیقی ادب بھی زندگی کے ایسے رجحانوں
سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادب پر بھی
صارفیت اور عیش پرستی کے رجحان غالب
آجاتے ہیں۔ چنانچہ مغربی ادب کے آج یہی غالب
رجحان ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے اس اثر کو
اور شدید کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے اب ہر
بات لمحاتی (INSTANT) بن کر رہ گئی ہے
گویا ان کی اہمیت INSTANT COFFEE سے
سے زیادہ نہیں ہے۔ مغربی معاشرے میں جنسی
رویوں پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ محبت
اور عشق کی قدروں کی جگہ فوری جنسی تعلقات
(INSTANT SEX) نے لے لی ہے۔ جس کسی
طرح فوری طور پر اپنے جذبۂ جنسی کو تسکین دینا۔
ظاہر ہے اس سے زندگی کی اعلیٰ قدریں متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتیں۔ آج کے معاشرے کا مغربی
ادب محض فوری اور لمحاتی تلذذ کا ادب بن کر
رہ گیا ہے۔ اور غضب تو یہ ہے کہ ہمارے ملک
میں بھی الیکٹرانک میڈیا ایسے فوری تلذذ کی
ہمت افزائی کر رہا ہے۔

مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات واضح
ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کو ایک
نیا موڑ دیا اور اس کا رخ کلاسیکی حسن پرستی
سے احتجاج کی طرف موڑ دیا۔ گویا ترقی پسند ادب
بنیادی طور پر احتجاج کا ادب تھا۔ ظلم اور

استحصال کے خلاف احتجاج روایت پرستی کے خلاف
احتجاج، عورتوں کی کمتر سماجی حیثیت کے خلاف
احتجاج۔ غرض کہ ہر ممکنہ ناانصافی کے خلاف
احتجاج ترقی پسند ادب نے تخلیق کاروں اور
مصنفوں کو اپنے زوال آمادہ معاشرے پر
تنقیدی نگاہ ڈالنا سکھایا اور روایت پرستی
کے جمود کو توڑ کر مستقبل کی طرف بڑھنے اور
نئی ابھرتی ہوئی حقیقتوں سے آنکھیں دوچار
کرنے کا حوصلہ بخشا۔ یہی رول ۱۸ ویں صدی کے
فرانس میں چارلس ڈکنس جیسے ادیبوں نے
کیا تھا۔ خود چارلس ڈکنس اس ادبی رویے کو
انتقادی حقیقت نگاری ۔ (CRITICAL
REALISM) ۔ کا نام دیتا ہے۔

سوشلسٹ ریلزم

لیکن ترقی پسند تحریک کا ایک اور پہلو تھا۔
وہ صرف اپنے سماج اور اپنے دور کی قدروں
پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتی بلکہ مستقبل کی تعمیر
کی سمت بھی مقرر کرتی ہے اور سوشلسٹ سماج
کا خاکہ کمیونزم سے لیتی ہے اور اسے ادب
کا جزو بناتی ہے۔ ترقی پسند تحریک میں یہیں
سے آئیڈیالوجی کا رول شروع ہوتا ہے۔
ہم اگر ترقی پسند ادب پر نگاہ ڈالیں تو آئیڈیا
لوجی کا یہ رول اس کے لئے جہاں قوت کا سرچشمہ
رہا ہے وہاں اس کی کمزوری کا باعث بھی بنا
ہے۔ ترقی پسند تحریک کا معروضی جائزہ لینے
کے لئے اس بات کی وضاحت بہت ضروری

ہے۔ ترقی پسند ادب پر تنقیدی نگاہ ڈالے بغیر
ہم اس کا ایماندارانہ اور معروضی جائزہ نہیں
لے سکتے۔

ہم نے اوپر عرض کیا کہ آئیڈیالوجی ترقی پسند
ادب کے لئے قوۃ کا سرچشمہ بھی تھی اور اس کی
کمزوری کا باعث بھی۔ آئیڈیالوجی جہاں کہ زندگی
کا نظریہ ہے اس لئے ہمیں یہ ایک نئی دِشا دیتی
ہے اور ہمارے لئے زندگی کے معنیٰ اور اقدار بھی
مقرر کرتی ہے۔ یوں آئیڈیالوجی ہمارے
جذبات کو گرماتی ہے۔ اور ان مقاصد اور
اقدار کے لئے جوش عمل اور موجودہ حالات
کے خلاف جذبات کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔
اور یوں ہمارے لئے یہ قوۃ کا سرچشمہ بن جاتی
ہے۔ مذہب بھی جب آئیڈیالوجی کی شکل لیتے ہیں
تو یہی رول ادا کرتے ہیں۔ اور اپنے ماننے والوں
میں جوش عمل اور نئے سماج کی تعمیر کا ولولہ
پیدا کرتے ہیں۔ مارکس کا تو مشہور مقولہ ہے کہ
فلسفے کا کام محض دنیا کی افہام و تفہیم نہیں
بلکہ اسے بدلنا ہے۔ اس لئے ترقی پسند مصنفین
دنیا کو بدلنے کا ولولہ اپنے سینے میں لئے ہوئے
تھے۔ اور بورژوا سماج کو بدل کر وہ ایک
نئے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے اور
ادب کو بھی اس آئیڈیالوجی کی امانت تصور
کرتے تھے۔

لیکن اگر ایک دوسرے زاویئے سے دیکھا
جائے تو آئیڈیالوجی تحریک کے لئے کمزوری کا بھی
بن جاتی ہے۔ ہر نظریہ ہر آئیڈیالوجی اپنے ماننے

والوں میں راسخ العقیدگی (DOGMATISM)
پیدا کرتا ہے۔ راسخ العقیدگی تبدیلی کی نفی کرتی
ہے۔ اور اپنے ماننے والوں کو محض عقیدے
کی سچائی پر راسخ رہنے پر اصرار کرتی ہے۔ عقیدہ
محض اقدار پر ہو تو الگ بات ہے لیکن وہ اقدار
پر محدود نہیں رہتا۔ لیکن اپنے دائرے میں اس
کی عملی شکل کو بھی سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اقدار
ماورائی ہو سکتی ہیں لیکن ایک مخصوص دور میں
ان کی عملی صورت [illegible] ماورائی نہیں ہو سکتی
عمل ہر دور میں ایک خاص شکل اختیار کرتا
ہے۔ ایک ٹھوس پروگرام کی شکل اور اس
طرح وہ امکان کے لامحدود دائرے سے خارج
ہو جاتا ہے۔ اقدار میں امکانی کیفیت ہوتی ہے
اور عمل ہنگامی اور فوری ہوتا ہے۔
لیکن ہم [illegible] آئیڈیالوجی اور نظریئے
کو امکانی صورت میں ماننے لگتے ہیں اور
اس کے مستقبل کے نئے امکانات سے منکر
ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہم راسخ العقیدگی
(DOGMATISM) کی طرف مائل ہو جاتے
ہیں۔ ڈاگمیٹزم ہمارے لئے زیادہ قابل قبول
ہوتا ہے کیونکہ اس سے ہمیں تحفظ کا احساس
ہوتا ہے۔ فکر غیر یقینیت پیدا کرتی ہے اور
DOGMA یقینی کیفیت اس لئے عام طور
پر انسان ڈوگما کی طرف مائل ہوتا ہے یہاں
تک کہ سائنٹیفک اپروچ کا دعویٰ کرنے والے
بھی اکثر غیر شعوری طور پر ڈوگما پرستی
کرتے ہیں۔

اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ فکر کے لئے
یقینی کیفیت غیر مفید ہوتی ہے اور فکری عمل
میں سوالات اٹھانا اور تشکیک کا سہارا
لینا زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔ مفکر
اکثر متشکک ہوتا ہے لیکن عمل کے لئے یقینی
کیفیت نہایت ضروری ہوتی ہے۔ انسان اسی
پر عمل کرتا ہے جس پر اسے یقین ہو۔ غیر یقینی
کیفیت عمل کے لئے مناسب نہیں ہوتی اور
سماجی اور سیاسی انقلاب عمل اور فعالیت
کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس لئے ہر انقلابی پارٹی
اپنے حامیوں کو اپنے عملی پروگرام پر ایمان لانے
کا تقاضہ کرتی ہے جو روس میں کمیونسٹ پارٹی
نے کیا۔ اپنے حامیوں میں راسخ یقینی کیفیت
پیدا کرنے کے لئے پارٹی پروگرام کو واجب احترام
قرار دیا اور واجب احترام بھی ایسا کہ کوئی بھی سوال
[illegible] گناہ۔ اس طرح ترقی پسند مصنفین بھی
سائنٹیفک سوشلزم کے نام پر شدید قسم کے
DOGMATIS کی طرف راغب ہو گئے۔ کسی
نے بھی اگر آواز اٹھائی اسے ترقی پسند تحریک
دشمن قرار دے کر تحریک سے خارج کر دیا گیا۔
ترقی پسند مصنفین نے پارٹی پروگرام کی طرف اسی طرح
احترام و عقیدت پیدا کرنے کی کوشش کی جس طرح
مذہبی عقائد کی طرف ہوتا ہے۔ آج ترقی پسند مصنفین
خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اب اس رویئے کو
ناپسند بھی کرتے ہیں۔
یوں تو سیاسی کارکنوں کو بھی پارٹی پروگرام
کی طرف انتقادی رویہ اختیار کرنا چاہئے تھے لیکن مصنفین

اور دانشوروں کو، جن کا تعلق تخلیقی فکر سے ہے، کبھی بھی سیاسی پروگرام کی طرف عقیدت مندانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ تو آزادی فکر کے علمبردار ہیں۔ ان کا کمٹ منٹ کسی پارٹی پروگرام سے نہیں ہوسکتا، ان کا کمٹ منٹ صرف اقدار سے ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن ماضی میں ترقی پسند مصنفین نے پارٹی پروگرام اور انقلابی اقدار میں فرق نہیں کیا اور پارٹی پروگرام سے ہی وابستہ کر لیا نتیجہ یہ ہوا کہ پارٹی پروگرام کے تحت ادب تخلیق ہونے لگا۔ ترقی پسند ... پارٹی اسٹبلشمنٹ کا ادب ہی بن کر رہ گیا

آزادی ... کی تحریک میں ترقی پسند ادب کا بڑا اہم حصہ تھا اور اس کا اپنا ایک منفرد مقام بھی۔ لیکن تلنگانہ تحریک کی ناکامی کے بعد اس تحریک میں جمود پیدا ہونے لگا۔ اسی زمانے میں اس کی چند کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر جدیدیت کی تحریک نے شدت اختیار کی اور اس پر جارحانہ حملے کئے۔ اس سے نئے لکھنے والوں میں زبردست ذہنی انتشار پیدا ہوا اور تقریباً دو دہے اسی ذہنی انتشار میں گذرے۔ جہاں ترقی پسند تحریک جمود کے دور میں داخل ہو چکی تھی وہاں جدیدیت مغربی ادب کی محض بھونڈی نقالی تھی۔ یہاں وہ حالات ہرگز پیدا نہیں ہوئے تھے۔ جن حالات نے مغرب میں جدیدیت کو پروان چڑھایا تھا۔ نہ ہمارے ملک نے جنگ کی تباہ کاریاں دیکھی تھیں نہ یہاں زندگی بے معنی ہوئی تھی اور نہ ہی یہاں عام لوگوں میں ALIENATION کا کربناک اور جان لیوا احساس تھا۔ ہمارا معاشرہ تو اس وقت بھی روایت پرستی اور جاگیردارانہ ذہنیت کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور آج بھی اس سے پوری طرح آزاد نہیں ہوسکا ہے۔ جاگیردارانہ معاشرے میں اجتماعیت اور روایت پرستی پنپتی ہے۔ انفرادیت اور انفرادی آزادی نہیں۔ اور جدیدیت کی بنیاد ہی اجتماعیت کے کمزور ہونے، زندگی کے بے معنی ہونے اور انفرادیت کے پروان چڑھنے پر ہے۔

یہ ہمیں ضرور کہنا پڑے گا کہ جدیدیت کے جارحانہ حملے نے ترقی پسندوں کو جھنجھوڑا اور انہیں سوچنے پر مجبور کیا۔ اس کی وجہ سے تحریک پر طاری جمود ایک حد تک ٹوٹا۔ ترقی پسندوں نے اپنی تحریک اور اپنے رویوں کا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا۔ ہندوستان میں یہ ممکن ہو سکا کیوں کہ سوویت یونین کے برخلاف یہاں جمہوری طرز حکومت تھی اور اخباروں اور رسالوں میں کھل کر اس پر بحث ممکن تھی۔ اس بحث نے تحریک کے لئے نئی دشائیں اور نئی راہیں پیدا ہونا شروع ہوئی اور جو موضوعات آج تک شجر ممنوعہ تھے ان پر بھی لکھا جانے لگا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تبدیلیاں بڑی صحت مند تبدیلیاں تھیں اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ یہ تبدیلیاں ناگزیر ہوتی جا رہی تھیں ---

ہندوستان میں جمہوری نظام کی جڑیں دن بدن گہری ہوتی جا رہی تھیں اور یہاں کا ادیب بڑی حد تک آزادی کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ ان حالات میں پارٹی کنٹرول ممکن نہ تھا۔ پارٹی سے جڑے رہنے

سہ سطری نظمیں

صابر فخرالدین
یادگیر (کرناٹک)

صبح سے شام تک
دھوپ تھی تیز تر
چھاؤں بھی
کم نہ تھی
پھر بھی سایہ نہ تھا !!

جزیرے
ڈھونڈنے والو
سمندر میں
اتر جاؤ !!

آؤ لوگو
جینے کا ساماں
کریں
مرنے کی تیاری
کیوں ہے !!

گھر میں کوئی نہیں
مگر پھر بھی
تختیاں نام کی
لگی تو ہیں !!

ساری باتیں
سچی نکلیں
چہرہ
لیکن
جھوٹا نکلا !!

کھلی جب آنکھ تو
سارے کے سارے
خواب
بے تعبیر
ہو کر رہ گئے تھے !!

وہ پرندے
جو دکھائی دے رہے ہیں
آسمان کی بلندی پر
وہ کیا
آفاق کی
زد میں نہیں ؟

دوہے

ضیاالانجم، جبلپور

دن کاٹے کٹتا نہیں کٹے نہ کاٹے رات
ساجن ہوتے تو سکھی ہوتی اور ہی بات
ایسی آگ لگی تن من میں ہوئیں دعائیں راکھ
اڑتی دیکھی ہے ضیا پر پرزوں کی ساکھ
دو من مٹی ڈال کے چلے گئے سب یار
بھول گئے سب دوستی بھول گئے سب پیار
فرصت سے میں آؤں گا ملنے تجھے ضرور
پتہ بتا دے زندگی عرضی کر منظور
آئی صدی اکیسویں گئی بیسویں یار
ظلم سہا اس پار کا اب کیا ہوا اس پار
آج تمہارا ہے سنو کرو انوکھی بات
ہم ہیں بیتے کل ضیا کیا اپنی اوقات
دل سے دل جب نا ملے ملا ہاتھ سے ہاتھ
دشمن بھی دے جائے ہے وقت پڑے پر ساتھ
سوز والم کی آنچ سے پتھر بھی گل جائے
برف کے پانی سے ضیا ترا بدن جل جائے

نثار جیراجپوری
اعظم گڑھ

ساون آیا جھومتا چلے ہوا چہو اور
راکھ ہوئے انگار سب دکھیا ہوئی چکور
ننھا بچہ سمئے کا کھاتا پھرے تھپیڑ
روئے بیٹھا موڑ پر برگد کا اک پیڑ
کھوہ کے اندر بیٹھ کر گیان کے دیپ جلائے
بوند جو ٹھہرے سیپ میں موتی وہ کہلائے
گیانی ہو کے عقل کا کیسا ہے یہ پھیر
گھر میں پھیلی روشنی باہر ہے اندھیر
جگ میں تو ڈھونڈے صدا سونے کا ہی مول
تو کیا جانے باورے مٹی ہے انمول
ایک ہی ماں کی کوکھ سے اک کالا اک گور
ایک ہے صوفی اولیا دوجا ہے اک چور
سوتے اٹھتے جاگتے رہے تو میرے پاس
تو میرا ہے سائیاں تجھ میں ترا نواس

ماجد الباقری

گوجرانوالہ (پاکستان)

اس شہر میں میلانِ نظر ایک نہیں ہے
ہے جسم وہی ، کاندھے پہ سر ایک نہیں ہے

احساس کی سرحد پہ کھڑی اب ہیں فصیلیں
یہ کیسی عمارت ہے کہ دَر ایک نہیں ہے

ہر لمحہ سفر میں ہیں سفارت ہو کہ کرسی
آرام جہاں کرتے ہیں گھر ایک نہیں ہے

پنجروں میں پرندے تھے یہ خالی تو نہیں تھے
اب پنجروں کا انبار ہے پَر ایک نہیں ہے

وارث کو ملی موت غلاموں کو حکومت
ہر وقت دعاؤں کا اثر ایک نہیں ہے

مہنگی یہاں نیلام ہوئی تھی یہ کھڑی فصل
پتوں کے ذخیرے ہیں ثمر ایک نہیں ہے

ماجد کو ہٹانے سے نہ بدلے گی عدالت
مقصد سبھی لوگوں کا اگر ایک نہیں ہے

عنوان چشتی

نئی دہلی (انڈیا)

خوبصورت ہے بہت، پھر بھی بلا کہتے ہیں
لوگ اک شخص کو کیا جانئے کیا کہتے ہیں

سجدہ کرنا ہے تو کیوں غیر کے قدموں پہ جبیں
ہم تو خود اپنے ہی پیکر کو خدا کہتے ہیں

نشۂ غم تو بڑی چیز ہے ہم ایسے لوگ
آنسوؤں کو بھی مئے ہوش ربا کہتے ہیں

بیقراری میں جو ہونٹوں پہ بکھر جاتا ہے
لوگ اُس حرفِ تمنا کو دعا کہتے ہیں

اپنی حد میں وہ مہِ نو سے بہت اچھا ہے
لوگ جس چیز کو مٹی کا دیا کہتے ہیں

ایسے تاریک مزاجوں پہ ترس آتا ہے
روشنی سے جو اندھیرے کو برا کہتے ہیں

زندگی درد ہو یا داغ ہمیں پیاری ہے
ہم اِسے پھول سے بچوں کی دعا کہتے ہیں

ڈاکٹر ظفر حمیدی
مظفر پور

کچھ گاتی ہوئی شب ہے نکلا مہ کامل ہے
اور ڈوبتے تاروں کا افسانہ بھی شامل ہے
وہ خود ہے اک آئینہ اور میں بھی ہوں آئینہ
آئینہ مقابل تھا، آئینہ مقابل ہے
دنیا کو بہت دیکھا گویا کہ نہیں دیکھا
پہلے ہی نہیں جس میں وہ بھی کوئی محمل ہے
یہ موت تو اک پل ہے جس پر سے گذرنا ہے
برزخ سے کہیں آگے شاید میری منزل ہے
شمشیر برہنہ کو تلوار نہیں کہنا
کس درجہ طلسماتی پائے مرا قاتل ہے
جو موج بھی آتی ہے ٹکرا کے پلٹتی ہے
مدت سے پیاسا ہی بھیگا ہوا ساحل ہے
لوٹا ہوا یہ پیکر رازوں کا خزانہ ہے
ہیں مہر بلب لیکن کچھ کہنا ہی مشکل ہے
اپنوں کا یا غیروں کا شکوہ وہ کرے کیسے
تھوڑی سی شرافت کا جو خون بھی حامل ہے
بیچارہ ظفر اکثر پڑھتا ہی رہا پھر بھی
پہلے بھی وہ جاہل تھا اور آج بھی جاہل ہے

بزمی عباسی
چیریا کوٹی، گورکھپور (یو۔پی)

چاند سے چہرے پہ بکھری زلف عنبر فام ہے
ساتھ روشن صبح کے کتنی سہانی شام ہے
یا مری توبہ رہے یا آبروئے میکدہ
اب شکست پارسائی یا شکست جام ہے
داستان خون تمنا کی سناؤں کس طرح
ہر جگہ میرے فسانے میں تمہارا نام ہے
ہم جلاتے ہیں بجھاؤ تم محبت کے چراغ
وہ ہمارا کام ہے اور یہ تمہارا کام ہے
چاک دامان خرد ہے چاک دامان جنوں
عشق کا آغاز وہ یہ عشق کا انجام ہے
دوسروں کے گھر کی دیواریں گرانے کے لئے
خود ہی اپنے گھر کی دیواریں گرانا عام ہے
اک نظر دیکھا ہے تم کو دیکھتے ہیں سب مجھے
میرے چہرے پر لکھا جیسے تمہارا نام ہے
کیوں لہو دے کر سجایا ہم نے اپنا گلستاں
اہل گلشن کا یہی بزمی کے سر الزام ہے

ڈاکٹر اختر نظمی

دولت گنج، گوالیار

دھوپ سے جو بچائیں، وہ سائے نہیں
پیڑ میں نے ہی ایسے لگائے نہیں
روشنی کا کرایہ، نہ دے گا کوئی
یہ چراغ آپ نے تو جلائے نہیں
ہم سے پوچھو کہ یہ وقت کیا چیز ہے
تم کو قسمت نے یہ دن دکھائے نہیں
اس لئے دشمنوں کی ہے تعداد کم
دوست میں نے زیادہ بنائے نہیں
صبح سے شام تک جو مرے ساتھ تھے
میں نے گھر تک وہ ہنگامے لائے نہیں
راہ میں تم کو موتی پڑا مل گیا
تم سمندر کی تہہ سے تو لائے نہیں
بات کیا ہے، تھکن اب تک اتری نہیں
اتنے لمبے سفر سے تو آئے نہیں
گھر بنانے کا کیسے تصور کریں
خواب میں بھی گھروندے بنائے نہیں
میں نے اپنائے کانٹوں بھرے راستے
خود یہ چل کر مرے پاس آئے نہیں
بھول نظمی ہوئی مجھ سے بے شک ہوئی
فائدے زندگی سے اٹھائے نہیں

پی۔ پی۔ سری واستو رند ساغری

نونڈا۔ (یو۔پی)

بھٹک جاتے ہیں رستہ پوچھتے ہیں
یہ کس موسم کے پہلے قافلے ہیں
اندھیرے در پہ دستک دے رہے ہیں
دئے اونچی منڈیروں پر جلے ہیں
اجڑتی رات کے بے ربط منظر
مری آنکھوں میں اب تک چبھ رہے ہیں
یہ مانا جسم تھک کر سو گیا ہے
مگر کچھ خواب اب بھی جاگتے ہیں
فضائیں اس لئے بوجھل ہیں شاید
خرابے کے مسافر چل پڑے ہیں
شعور و فکر سے پھر رابطہ ہے
کہاں سے بات نکلے دیکھتے ہیں
اترتی رات کا پچھلا پہر ہے
جناب رند چلئے گھومتے ہیں
شجر دل کا ہوا پتوں سے خالی
خزاں کی رت کے سارے سلسلے ہیں

شاہد جمیل

جوکی ہاٹ، ارریہ

اب مرے قصے میں تیری بس یہی پہچان ہے
تیرا ہر غم یاروں کی تفریح کا سامان ہے
ایسا لگتا ہے کہ تجھ کو بھولتا جاتا ہوں میں
اب تو تیرے بارے میں سب سوچنا آسان ہے
تیرے آ ملنے، الجھنے اور چلے جانے کے بعد
درد میرے واسطے، اب کھیل کا میدان ہے
ایک دل اور چار جانب شوروں کی بھیڑ بھاڑ
کشتیوں کی قید میں اب کے برس طوفان ہے

ہوس کے رنگ سبھی آسمان والے ہیں
ملال ہجر نے کیا بال و پر نکالے ہیں
میں آسمان سے تاروں کی وجہ کیا پوچھوں؟
تمہاری یاد نے آنسو بہت اچھالے ہیں
لہو کی بوند کا قصہ تو صرف اتنا ہے
کہ تیرے خواب نے سب اشک رنگ ڈالے ہیں
تجھے بھلا نے کے سب راستے سجا دوں گا
انا کی شاخ پہ پھر پھول آنے والے ہیں

ڈاکٹر حنیف ترین

مراد آباد

مشکل ہے فہمائش اس گہرائی کی
خواب میں ہنستے بچے کی رعنائی کی
سورج جس سے منوا نگنے وہ آیا ہے
غیر مناؤ تم اپنی عینائی کی
تیری یاد کی فصلیں ہر دم سبز رہیں
سردی، گرمی، یا ہو رت پروائی کی
پھول کھلے یا شاید ان کے ہونٹ ہلے
جھینپ گئی کیوں انگلی لے شہنائی کی
مایا ناگ نے اپنا گھر تبدیل کیا
قیمت جانے تب ہم پائی پائی کی
دھیان کے جنگل میں جب یاد کے غول بھٹکے
ٹوٹ گئی بجتی پائل تنہائی کی
پربت، تو سر کرنا بعد میں آئے حنیف
زیر کرو تم پہلے طاقت رائی کی

نشاط الایمان

سورج گرہن

اُس کا علاقہ اب تک اس جنون کے طوفان سے محفوظ تھا جو کنول چھاپ رتھ یاترا اور پھر اسے آگے بڑھنے سے روکنے پر کئی مقامات کے سینکڑوں جان و مال کو تباہ و برباد کر چکا تھا اور جس کی کرگس جیسی بھیانک آواز سارے ملک میں گونج رہی تھی ــــ اس کے کانوں تک بھی یہ آواز پہنچی تھی۔ اور وہ چند لمحوں کے لئے متفکر اور پریشان ہو گیا تھا۔ مگر پھر وہ اپنی عادت کے مطابق مسکرایا اور اس آواز کے بوجھ کو اپنے سر سے دور پھینک دیا تھا۔

مسکرانا اس کا بہترین ہتھیار تھا۔

آس پاس کے کثر لوگ اسے دیوانہ اور احمق سمجھتے تھے۔ کیونکہ مسکرانے کے ساتھ اس کی باتیں عام لڑکوں سے بالکل جُدا ہوتی تھیں۔ اس کا انداز زندگی بھی بہتروں کے لئے باعث حیرت تھا۔ وہ شاذونادر ہی اپنے کسی ہم عمر سے باتیں کرتا تھا۔ وہ سیر و تماشا اور ہنسی مذاق سے قطعی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ وہ اکثر تنہا ہوتا یا اپنے مربیوں کی ہدایت کی بجا آوری کرتا ہوتا۔

اس کے مربی تھے سبزی فروش غلامو اور تنبولی رامو ــــ وہ ان ہی دونوں کے چھتر سایہ اور پیار کے سائبان میں سولہ سترہ برس کا ہو رہا تھا ــــ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور وہ کس ذات برادری کا تھا، کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ اور یہ بات غلام دین اور رام مورتی بھی نہیں جانتے تھے۔

ا

ایک دن جب آخری پسنجر ٹرین اسٹیشن سے گذر گئی اور چاروں طرف اندھیرے پھیلنے لگے تو غلامو اپنی ٹھیلا گاڑی پر بچی کھچی سبزیوں اور پھلوں لوے کر اپنی جھگی کی طرف چل پڑا۔ وہ ایک ایسی راہ سے گذر رہا تھا جس کے ایک طرف ریلوے لائن چلی گئی تھی اور دوسری طرف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں اور جھاڑیوں کی دوسری جانب ریلوے کے عملوں کے لال لال کوارٹر تھے جہاں سے کہیں کہیں بجلی کی روشنی کی جھلک نظر آتی تھی۔

غلامو نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ آگے اسے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت اس راستے سے اس کے سوا کوئی اور گذرتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا رہا توں توں رونے کی آواز اسے اپنی طرف یوں کھینچتی جارہی تھی جیسے ماں کی مامتا بچے کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

غلامو نے چاند تاروں کی روشنی میں دیکھا، راستہ کے کنارے ایک تین ساڑھے تین سال کا لڑکا بیٹھا رو رہا تھا۔ اس سے ایک دوری پر ایک بوڑھی کتیا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں کتیا کی موجودگی سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس بچے کی نگہبانی کررہی ہو۔ غلامو کو دیکھ کر کتیا اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی دُم ہلانے لگی۔ لیکن غلامو کی ساری توجہ بچے کی طرف تھی۔ اس کا پورا بدن گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اور وہ بڑا کمزور دکھائی پڑ رہا تھا۔ غلامو کا دل درد سے تڑپ اٹھا۔ پتہ نہیں کون ظالم اور بے درد اسے یہاں چھوڑ گیا تھا یا وہ خود بھٹکتا ہوا ادھر چلا آیا تھا۔ وہ اپنی ٹھیلا گاڑی کو کنارے لگا کر اس کی طرف لپکا۔ اسے پیار سے اٹھایا اس کے جسم کے گرد و غبار جھاڑے۔ اسے سینے سے لگایا اور پیشانی کے بوسے لئے۔ غلامو کی اس پیار کی گرمی سے اس کا رونا بند ہوگیا۔ اس کے بعد غلامو نے ٹھیلا گاڑی پر جگہ بنائی اور بچے کو وہاں بٹھایا اس کے ہاتھ میں ایک گاجر دیا اور سیدھا اپنے دیرینہ اور رازو نیاز کے ساتھی رامو کے پاس پہنچا۔

اس وقت رام مورتی کی پان سگریٹ کی دکان پر بالکل سناٹا تھا۔ دکان اور دکان کے قریب لالٹین کی اونگھتی ہوئی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور رامو چپ چاپ بیٹھا ایک بیڑی پئے جا رہا تھا۔ اس نے جب غلام دین اور اس کے ٹھیلے گاڑی پر خلاف توقع ایک بچے کو دیکھا تو فوراً دکان سے نیچے اتر آیا۔

"لو یار، سنبھالو اس بچے کو تو" غلامو نے کہا "تمہاری گھر والی موجود ہے اسے دیکھ ریکھ کرے گی۔ میری بیوی تو میکے گئی ہوئی ہے" اور اس کے بعد اس نے رامو کو بتایا کہ یہ بچہ اسے کہاں اور کس حال میں ملا ہے۔

"لیکن دوست، اچھا ہوگا ہم اسے اپنے پاس رکھنے سے پہلے پنچن بالو کے پاس لے چلیں" رامو نے رائے دی۔ "وہ جیسا کہیں گے ہم ویسا کریں گے۔ ورنہ ہوسکتا ہے ہم کسی جنجال میں پھنس جائیں۔ زمانہ اچھا نہیں ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا رامو۔ اس پہلو پر تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

اور پھر اس وقت دونوں اس بچہ کو لے کر پنچن بالو کے ہاں پہنچ گئے۔ پنچن بالو اس قصبہ اور علاقہ کے بااثر آدمی اور حکمراں گروپ کے سرگرم ایم ایل اے تھے۔ اتفاق سے وہ مکان کے لان میں موجود تھے۔ ان کے پاس چند خوش پوش آدمی مختلف کرسیوں پر بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

پنچن بالو نے بچہ کی سرگزشت سنی اور وہاں سے اٹھ کر فون والے کمرہ میں گئے علاقہ کے تھانیدار سے رابطہ پیدا کیا۔ ٹھیک ہے حضور، اگر کسی بچے کی گمشدگی کی رپورٹ دی گئی تو ہم آپ سے ملیں گے۔ ابھی بچہ غلامو اور رامو ہی کے پاس رہے۔ وہ دونوں اچھے اور نیک دل آدمی ہیں۔ تھانیدار نے ان سے

کہا۔ اور وہ باہر آکر ان دونوں سے بولے ـــــ بچہ فی الحال تم دونوں کی نگرانی میں رہے گا۔ جب کوئی اس کا والی آئے گا تو ہم تم کو بلائیں گے۔"

دونوں دوست نے ان کو سلام کیا اور بچہ کو لے کر گھر آگئے۔ دونوں کی جھگیاں ایک دوسرے سے سٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ دن اور آج کا دن ـــ برسوں بیت گئے۔ اس بچے کا کوئی حق دار نہیں آیا اور وہ بچہ ان دونوں کی دیکھ ریکھ اور نگرانی میں نوجوانی کی سرحد میں داخل ہوگیا تھا۔ اور اس کے خمیر میں ان دونوں ساتھیوں کے سبھاؤ اور پیار اس طرح حلول کر گئے تھے جیسے سوکھی دھرتی میں بارانِ رحمت کے قطرے جذب ہو جاتے ہیں ـ اور وہ ایسی ایسی باتیں کہنے لگا تھا کہ رامو اور غلامو کے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا۔ بعض دفعہ تو دونوں بڑی حسرت سے اس کا منہ دیکھنے لگتے تھے۔

دونوں دوستوں نے اس کا نام کبیرا رکھا تھا۔ کیونکہ ان کے بڑوسی منشی داس نے کہا تھا کہ ایک جولاہے کو بھی ایک بچہ کچھ اسی طرح ملا تھا۔ اس نے اس کا نام کبیر رکھا تھا۔ وہ کبیر جو بعد میں کبیر داس کہلایا دنیا میں اپنا نام زندہ کر کے گزر گیا۔ اس لئے رامو اور غلاموں نے بھی سوچ بچار کے بعد اس کا نام کبیرا رکھا تھا۔ کبیرا کو ان کی اتھاہ محبت کے ساتھ ان کی گھر والیوں کی بھی بھرپور مامتا ملی تھی۔ وہ ان کے کنبے کا مشترکہ فرد تھا۔ وہ کھانا پینا دونوں گھرانوں میں کر لیتا تھا۔ ویسے بھی غلامو اور رامو کے رہن سہن اور معاشرت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مگر ذات برادری کے گھروندہ میں رہنے والے

چند لوگ حقارت سے کبیرا کو اگھوری کہتے تھے اور اس سے اس طرح دور رہتے تھے جیسے کوئی کٹر برہمن ہری جن سے دور رہتا ہے لیکن وہ تھا کہ ایسے کرم خوردہ برتاؤ کا ذرا بھی برا نہیں مانتا تھا ـــــ بہرحال وہ غلامو اور رامو کا بیٹا تھا اور یہ دونوں انسانی برادری کے افراد تھے۔ اس لئے وہ بھی انسان تھا۔ پھر انسان انسان میں بھید بھاؤ کیا۔ فرق تو اچھی عادت اور بری عادت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں یہ بات بلب کی لو کی طرح روشن تھی ـــ ـــ" ارے کبیرا! تجھے کوئی کبیر محمد کہے یا کبیر بھگت برا نہ ماننا۔ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی نسل سے ہیں۔ جب ہمارے پرکھے دھرتی پر پھیلے تو مقامی آب و ہوا سے ان کے رنگ روپ بدلے اور اپنے سے کسی برتر طاقت اور انوکھی چیز کو دیکھ کر ان کے مزاج میں اس کے لئے عقیدت اور پرستش کا مادہ پیدا ہوا کیونکہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھول چکے تھے اور اس طرح وہ ایک دوسرے سے الگ الگ دکھیے جانے لگے۔ مگر اس ظاہری اور ذہنی فرق کے باوجود ہم اول تا آخر منش اور آدمی ہیں۔ ہماری اس بنیادی پہچان کو نہ کوئی بدل سکتا ہے اور نہ کوئی مٹا سکتا ہے۔" کچھ دنوں پہلے ایک فقیر نے اس سے یہ باتیں کہی تھیں اور اسے یہ باتیں بڑی اچھی لگی تھیں۔ اس لئے وہ ان کو ہمیشہ اپنے ذہن میں کھلے ہوئے پھولوں کی طرح رکھتا تھا۔

لیکن اس تازگی کے باوجود وہ ایک خلش کا شکار ہوگیا تھا ـــ ان دنوں ملک میں جو فتنہ و فساد کی لہر چل رہی تھی۔ وہ کیوں؟ جب ہم لوگ ایک

ی نسل سے ہیں۔ ہم کیوں اپنے ہی بھائیوں اور بہنوں
کا خون کر رہے ہیں۔ اور ہم کیوں مندر مسجد کے نام
پر دیش میں آگ لگائے ہوئے ہیں۔ کیا دھرم اور انسانیت
نے ایسا کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ فقیر بابا پھر ملتا
تو اس سے کبیرا یہ سب پوچھتا۔ مگر وہ نہیں ملا اور
اس کی خلش بڑھتی گئی۔ آخر جب وہ بہت بے چین ہوا
تو اس نے ایک روز یہ سوال اپنے مربیوں سے کیا۔
لیکن غلامو اور رامو کی سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ
یہ درندگی کیوں برپا ہے۔ اور یہ راون رتھ کیوں نکلا۔
جبکہ یہی کیا کم ہے کہ آئے دن جہاں تہاں دنگا فساد
ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان میں ہم ہی جیسے لوگ مارے
جاتے ہیں۔ اور برباد ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ خاطر
خواہ جواب نہیں دے سکے۔ کبیرا کو جواب ملا تو
صرف یہ کہ وہ سب پاگل ہو گئے ہیں۔ لیکن پاگل تو وہ
بھی ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ اس کے کردار اور گفتار
کی وجہ سے اسے پاگلوں میں شمار کرتے ہیں۔ مگر وہ تو
کسی کا خون نہیں بہاتا۔ کسی کے گھر میں آگ نہیں لگاتا
کسی کی آبرو پر ڈاکہ نہیں ڈالتا اور کسی کے کاروبار کو برباد
تو نہیں کرتا، پھر وہ پاگل کیوں ہوا؟ ــــ اس سے
آگے کچھ سوچ کر وہ آپ ہی آپ مسکرا اٹھا تھا۔

ایک دن جب کبیرا اپنے رامو بابا کی
ہدایت پر پان کے پتوں کا بنڈل لے کر دکان پر آیا تو
رامو نے بڑے پیار سے اسے اپنے قریب بٹھایا اور بولا۔
ــــ بیٹے کبیرا! خون خرابہ کرنے والوں کی آندھی ادھر
بھی آ رہی ہے۔ میں اس کی آہٹ سن رہا ہوں۔ ان کا
ذات پات اور چھوت چھات قائم رکھنے والا سنگھاستھا
خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس کی
حفاظت کی خاطر رام جی کا جھنڈا لہرایا ہے اور ان کی
آڑ لے کر اپنی دکان چمکا رہے ہیں اور یہاں وہاں اپنی طاقت
کا رعب جمانے کے لئے دنگا فساد کر رہے ہیں۔ سینکڑوں
برس کی بھائی چارگی اور روشن مریادا کی دھجیاں اڑا
رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں دشمنی پیدا کر رہے ہیں۔
اور ہم جیسوں کو الّو بنا کر تجوریاں بھر رہے ہیں۔ تو
پھر نے دو یہ خونی گاڑی بہت دور تک نہیں جائے گی
اوپر والا سب دیکھ رہا ہے۔ ایک دن اس گاڑی کو
اندھے کھڈ میں گرنا ہی ہے ــــ ہاں تو [illegible] با
یہ ہے کہ تم جہاں تہاں ایسی باتیں بول جاتے ہو [illegible] ہے
پتھر دل کے لوگ اور بھائی چارگی کے دشمن بھڑک اٹھتے ہیں
مگر تمہیں پاگل اور ناسمجھ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ بھگوان
کے لئے آج کل ایسی باتیں کہنا چھوڑ دو۔"
وہ رامو بابا کی باتیں سن کر اپنی عادت کے مطابق
مسکرایا اور جواب میں کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتا
تھا ــــ بابا! شریف آدمی آخر کب تک یہ غارت گیری
اور بربریت کو دیکھتا رہے گا۔ کل ہی کریم دادا بابا
غلامو سے کہہ رہے تھے۔ غلامو! پرانے زمانے میں بھی
دشمنی اور عداوت کے جھگڑے چل رہے تھے لیکن ماحول
زہریلا نہ ہونے پاتا تھا۔ اب تو حالت یہ ہے کہ گھر
سے یہ دعا مانگ کر نکلنا پڑتا ہے کہ باہر سے بحفاظت
لوٹ آئیں ــــ بابا! بتاؤ تم اس علاقہ کی سڑکوں کو
کس قدر پختہ [illegible] چوڑی دیکھتے ہو۔ بازار کتنی رنگا
رنگ چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ گلیوں میں کتنی
سجا ہی ہے۔ [illegible] مکان کتنا صاف اور چمکیلا نظر آتا
ہے۔ لوگ [illegible] کیسے پرکشش لباس میں بھائی

دے رہے ہیں ــــ لیکن سوچو کہیں چین و سکون بھی ہے۔ کسی کا دل خوف اور ڈر سے پاک بھی ہے۔ اب تو سماں یہ ہو رہا ہے کہ زہریلے سانپوں کو دودھ پلاتے دیکھ رہا ہوں۔ اور انسانوں کو کوئی پوچھتا نہیں۔ انسان کی حیثیت کتے بلی سے بھی بدتر بنادی گئی ہے۔ اس پر بھی تم کہتے ہو میں اپنی زبان سینت کر رکھوں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ حق بات کا پرچار ضرور کروں گا۔ پرواہ نہیں اس راہ میں میری جان چلی جائے ــــ اور کبیرا ان ساری باتوں کو اپنے من میں لئے ایک طرف نکل گیا۔ رامو اس دیوانے کو بڑے پیار سے دیکھتا رہا۔ اور ایشور سے منت کرتا رہا کہ وہ اس پاگل لڑکے کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

اور پھر کئی دنوں کے بعد غلامو نے کبیرا سے کہا۔ بیٹے! کل سے تم اِدھر اُدھر نہ جاؤ گے۔ آج ہم اور رامو بازار میں جو کچھ دیکھ کر آئے ہیں وہ آنے والی پاگل پن کی آندھی کا نوید دے گیا ہے۔ ہم لوگوں کا مرنا جینا کیا اس دور میں دونوں برابر ہیں۔ مگر ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تم اس آندھی کے شکار بنو۔ پروردگار سے دعا کرتا ہوں کہ تمہاری عمر لمبی ہو!

کبیرا غلامو بابا سے بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن جس طرح اس نے رامو بابا سے کچھ نہیں کہا اسی طرح وہ غلامو بابا سے بھی اس ننگے ناچ کے بارہ میں ایک لفظ نہ بولا اور ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح بولا ــ تو یہ ــــ ٹھیک ہے بابا۔ میں آپ کی ہدایت کا پالن کروں گا۔ اور پھر وہ حسب عادت مسکراہٹ بکھیرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وہ جس محلہ میں رہتا تھا وہاں ملی جلی کثیر آبادی تھی۔ اور آبادی کے بیشتر افراد متوسط طبقہ، چھوٹے موٹے کاروباری گروہ اور محنت کش اور مزدور جماعت کے تھے۔ چند دادا قسم کے لوگوں اور غنڈوں کو چھوڑ کر ان سبھوں کو سیاست سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ انہیں سیاست کے زینہ پر چڑھ کر اقتدار کے لئے بے لگام اشتعال انگیزی اور آپس میں بے اعتمادی پیدا کرنے کا خیال آتا تھا۔ وہ سب امن آشتی سے رہتے ہوئے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ دیتے آرہے تھے۔ لیکن چند دنوں سے کنول چھاپ رتھ والوں اور ان کے ہمنوا لوگوں نے اپنے کرتب یہاں بھی چھوڑ دیئے تھے اور ان گرگوں نے آبادی کے کچھ بے چہرہ لوگوں کو شہ دے کر غلط راستے پر ڈال دیا تھا اور وہ سب لفنگوں اور غنڈوں سے مل کر ایسی حرکتیں کرتے اور ایسی آوازیں بلند کرتے تھے جن سے شر و فساد کی چنگاری نکلتی ہوئی نظر آتی تھی ــــ بس اس چنگاری کو شعلہ بنانے کے لئے کسی موقع اور بہانے کی ضرورت تھی۔

اور ان کو یہ موقع اجودھیا میں فتنہ انگیز کارسیوکوں کے برہنہ رقص اور کنول چھاپ رتھ یاترا پر حکومت کی بندش نے دے دیا۔ بندش کے فوراً بعد وہ یہاں کے انتظامیہ کے چوکس ہونے کی وجہ سے اپنے خون آشام رقص کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن کارسیوکوں پر ظلم کی مبالغہ آمیز تشہیر نے ان کی شیطنیت کے سارے بند کھول دیئے ــ اور دیکھتے دیکھتے کبیرا کا علاقہ آگ اور خون کے دریا میں ڈوب گیا۔

کبیرا اس وقت ایک ایسے راستے سے گذر رہا تھا جہاں ابھی ظلم و ستم کا یہ کھیل شروع نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ علاقہ پنچی بالو جیسے لوگوں کا تھا۔
لیکن وہ وہاں سے گذرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ جہاں تہاں کچھ بھیڑیے کھڑے تھے اور ان کے تیور بتا رہے تھے کہ ادھر سے بھی کسی وقت ہلاکت اور خونریزی کا سیلاب گذرے گا۔

جب وہ وہاں سے ایک موڑ لے کر دوسرے راستے پر پہنچا تو دیکھا دو تین لوگ اس کی طرف بے تحاشہ بھاگتے آ رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے دو غنڈے دوڑ رہے تھے۔ غنڈوں کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے ہتھیار تھے۔ اور بھاگنے والے نہتے تھے۔ کبیرا ایک جگہ رک گیا۔ درندوں نے کبیرا کو نہیں دیکھا اور دیکھا بھی ہوگا تو اسے دیوانہ اور خبطی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا۔

اب شام [illegible] ہو چلی تھی۔
کبیرا اپنی گلی میں آیا [illegible] ایک منظر دیکھ کر اس کا ذہن چور چور ہو گیا۔ چند ہی مکانات سلامت تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں سے بلڈوزر چلایا گیا ہو۔ اس کے مربیوں کے گھر کا بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ان کی جھگیوں کی جگہ راکھ کے تودے تھے اور وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک انسانی ڈھانچہ بھی جلا ہوا نظر آ [illegible]
لہو ہو گیا تھا — پتہ نہیں اس کے بابا [illegible]
گھر والوں کا کیا ہوا۔ وہ اندر سے ٹوٹنے لگا۔
یک بارگی وہاں کی فضا نے دیکھا کہ اس کے لب مسکراہٹ کی جگہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی۔

اور ابھی وہ اس گہرے درد اور غم کے ہالے میں تھا کہ آدمی کی طرح دکھائی دینے والے دو وحشی اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔
" ارے ملوانی! اسے چھوڑ۔ یہ تو پاگل ہے" ایک جنگلی نے کہا۔
" نہیں سنگھا، تم اسے پاگل نہ کہو" دوسرے درندہ نے جواب دیا۔" میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے اس کی باتیں سنی ہیں۔ یہ جس ملے جلے کلچر کی پہچان ہے اور جس گنگا جمنی سنسکرتی کی یہ تصویر ہے وہ ہمارے عزائم اور منصوبوں کے راستہ کے پتھر ہیں۔ اسے بھی اپنے راستہ سے ہٹانا ہے"
اور پھر پل بھر میں کبیرا کا بدن اس سنسان گلی میں خون میں لت پت پڑا ہوا تھا!

ختم

پرنٹر پبلشر [illegible] منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا۔

مشرف عالم ذوقی

مسلمان

ترجمہ: تبسم فاطمہ

قسط ۱۲

دہلی سنہ ۱۹۸۶ء

میرا نام انجو ہے

وہ شخص چہرے سے ہی خوفناک لگ رہا تھا۔ کافی لحیم شحیم۔ چمکتا ہوا اجلا کرتا پائجامہ ہے۔ فائیلوں سے گھرا ہوا۔ کاغذات ادھر ادھر بکھرے ہوئے انجو کی بات اس نے بیچ میں ہی کاٹ دی۔

"مجھے نام سے نہیں کام سے مطلب ہے۔"

جیب سے نکال کر سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے بیل پر ہاتھ رکھا۔ جینڈلے سر والا ایک ادھیڑ عمر کا چشمے والا آدمی سامنے آیا۔

"جی سر"

"منڈن۔ یہ آج سے ہمارے دفتر میں کام کریں گی۔ انہیں سب کام سمجھا دو۔ اس نے اشارہ کیا۔ جائیے سب کام اچھی طرح سمجھ لیجئے۔"

"جی"

انجو کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ کیا کرے ——

خوش ہو یا حیران — وہ تو ایک اخبار میں، ایک ہفتہ وار اخبار کے لئے ضرورت ہے، کا اشتہار دیکھ کر آئی تھی — لیکن یہاں ۔ ۔ ۔ ۔ نہ اس سے کچھ پوچھا گیا نہ ہی۔۔ ۔۔۔ اور یہ شخص — فی الحال اسے کام کی ضرورت تھی۔ نوکری چاہئے تھی۔ پیسے چاہئے تھا۔ اس لئے اس نے حامی بھر لی۔

کام —— اس نے کام کا جائزہ لیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں —— پیسے کمانے کے کتنے طریقے ہیں۔ صرف ڈھنگ آتا ہو۔ کیسے کیسے بزنس ہیں — وہ شخص جس کا نام راج سنگھل تھا۔ وہ کسی اخبار وخبار کا ایڈیٹر نہیں تھا بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پہلے دن ہی اس نے سب کچھ دیکھ لیا۔ اس سے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ دفتر کے کمرے میں آئی تو وہاں "کام" چل رہے تھے — پانچ چھ لڑکیاں۔ اتنے ہی لڑکے — پرانے پرانے ماہناموں اور اخباروں سے کٹنگ کر رہے تھے اور کٹنگ سلیقے سے پر چپکائے

جارہے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ سب۔۔۔۔"

ٹنڈن خاموش طبع آدمی تھا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

ہمارے ساتھ رہیے۔ چند دنوں میں سب کچھ جان جائیے گا۔

ذرا ٹھہر کر اس نے بتایا۔ سنگھل صاحب دس ماہناموں کے مدیر ہیں، چھ ہفتہ وار ہیں۔ ۱۲ پندرہ روزہ ہیں — اور ۸ روزانہ —

"لیکن یہ سب"

"بازار میں نہیں جاتیں۔ یہی نا۔"

ٹنڈن نے ٹھنڈی سانس بھری — ہم صرف کاغذی کارروائی پوری کرتے ہیں۔ مختصر میں بتاؤں تو سنگھل صاحب کاغذ کا کوٹہ کھاتے ہیں۔ یہی بزنس ہے ان کا۔

ٹنڈن بنا — آم کھاؤ۔ گٹھلی سے کیا کام۔ پیسے وقت پر ملتے رہیں۔ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیے۔

دھیرے دھیرے اسے سب کچھ معلوم ہو گیا کہ سنگھل کتنی بڑی توپ ہے۔ اس کے اثر و رسوخ کتنے ہیں۔ اس کی کس قدر سیاسی پہنچ ہے۔ کتنا دیئے لئے رہتا ہے — یہی نہیں، اس کا یہ بزنس کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے — لیکن آج تک کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی — سنگھل صاحب قانونی داؤ پیچ اتنا جانتے ہیں کہ ان کا کوئی کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔

انجو ایک ہی چیز سوچ رہی تھی۔ وہ نوکری کرے یا نہیں —

لیکن ابھی نوکری ضروری تھی — وہ مولوی عنایت

اللہ کے گھر زیادہ دنوں تک بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہاں مسلمان ہونے کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی چلتا تھا۔

انجو: اُلّا تھا۔۔۔۔ فرقہ واریت کا جنم یہیں سے ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا — جب تم ایک مخصوص زاویہ پر آکر ٹھہر جاتے ہو — پھر — دوسرا ملک؟ دوسرا آدمی؟ دوسرا مذہب۔۔۔؟

یہ دوسرا کیا ہوتا ہے انجو۔۔۔؟

یہ دوسرا ہی تو جہنم ہے —

یہ دوسرا ہی تو سارے فساد کی جڑ ہے —

یہ دوسرا آخر کہاں سے ٹپک پڑتا ہے —

نہیں — وہ اس مکان میں نہیں رہے گی۔

یہاں آس پاس، گلی کوچوں میں، تنگ تنگ گلیوں سے گزرتے، اندر باہر کرتے، وہ ایک گھناؤنے احساس سے دوچار ہوتی رہی ہے۔

"تم کون ہو۔"

"ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔۔"

یہ دستکیں، مستقل ہونے والی یہ دستکیں اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔۔۔۔

"تم مسلمان ہو۔۔۔۔۔"

پھر تیز قہقہہ کی آواز۔۔۔۔ نام میں کیا رکھا ہے۔۔

ایک بار نام بدل کر دیکھو تو سہی۔۔۔۔۔۔

مسلمان کے نام پر تو مکان بھی نہیں ملتے۔۔۔ کئی لوگ تو مسلمان سمجھتے ہی بھگا دیتے ہیں۔ جانتے مکان نہیں ہے۔

ملیچھ کہیں کا۔۔۔۔۔

ایک تجربہ کر کے دیکھو افروز۔۔۔۔۔

پھر وہ ان تنگ گلیوں سے نکلی تھی۔ جہاں

مولوی عنایت اللہ رہتے تھے۔ اور اسی بے نام دفتر
میں اس نے اپنی ایک حجرہ لے لی تھی۔
اندر ایک عجیب قسم کا غصہ، جسے وہ کوئی
نام دے سکنے سے مجبور تھی۔ قطرہ قطرہ کر کے جمع
ہو رہا تھا۔ اس غصے کا انت کیا تھا۔؟
جب کوئی بہت بڑی مجبوری ہو تو۔۔۔۔۔
شروع شروع میں یہ انجو نام اُسے کچھ عجیب
سا لگا تھا لیکن جب کسی کی ذات ایکدم سے اکیلی
ہو تو اجنبیت کا احساس جاتا رہتا ہے۔
اتنا تک تو ٹھیک تھا، لیکن جہاں رہنے کے
لئے اس نے کمرہ لیا تھا۔ وہ جگہ اسے زیادہ راس
نہیں آرہی تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں مکان چھوڑنے
کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن فی الحال کم پیسوں میں اپنے
لئے اچھے مکان کا بندوبست وہ کہاں سے کرتی۔
یہ ڈیلائٹ سینما کے پیچھے کا علاقہ تھا۔ جو پرانی
دلّی کا علاقہ ہی کہلاتا تھا۔ چھوٹی سی تنگ گلی پار کر کے اندر
جانا پڑتا تھا۔۔۔ یہ ایک خستہ حال کمپلکس تھا۔ ون
روم فلیٹ۔ یہاں تقریباً آبادی مسلمانوں ہی کی تھی۔ یہ
جگہ بھی عنایت اللہ صاحب کی مہربانی سے ہی ملی تھی۔
ڈیلائٹ سینما سے اندر گھستے ہی ناک پر
رومال رکھنا پڑتا تھا۔ کٹے ہوئے بھینس کے گوشت
کی تیز بدبو، خون کے چھینٹے۔۔۔ پوری گلی اور آس
پاس کا علاقہ پانی سے تربتر رہتا۔ کھونٹے سے کالے
کالے بھینس چاروں طرف بندھے نظر آتے۔
اسے یہ کوئی قتل گاہ نظر آتی۔ جہاں
چاروں طرف خون بہہ رہا ہے۔ تیز بدبو چاروں طرف
پھیلی ہے۔ انسانی جسم لہولہان چاروں طرف پڑے
ہیں۔۔۔ اسے محسوس ہوتا۔۔۔۔ افروز تمہارے اندر
کی عورت سو رہی ہے۔۔۔۔ ایک دن وہ پتھر کی ہو کر
رہ جائے گی۔
وہ کٹتے ہوئے بھینسوں کی دل چیرنے والی
صدا سنے گی۔ گلیوں میں پھینکی ہوئی ہڈیوں کو دیکھے
گی اور ایک دن جذبات و احساسات سے بیگانہ ہو جائے
گی۔
شیش محل جہاں وہ رہتی تھی، یہ اس جگہ
کا نام تھا۔ کیسا؟ عجیب نا؟ اسے خود حیرت
تھی۔۔۔ کہاں تو صرف ایک زلزلے کے جھٹکے کے
انتظار میں کھڑا مکان اور کہاں۔۔۔
مکان کے رہنے والے بھی عجیب تھے۔۔
یہ اس کی زندگی کا سب سے خوفناک تجربہ
تھا۔ کہنا چاہیے۔۔۔ زندگی کی جو تلخیاں اس نے
یہاں آکر محسوس کیں۔ پہلے کبھی محسوس نہیں کیں۔۔۔
ایک دن ایک خوبصورت سی گول مٹول سی بچی
اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔
"کچھ پیسے ہیں۔ اماں سبزی کے لئے مانگ
رہی ہیں۔ میرا باپ اسمیک پیتا ہے۔ سب پیسے
اسمیک میں اڑا دیتا ہے۔"
"اسمیک"
یہ نام تو اس نے دلّی آکر ہی سنا تھا۔ لوگ
اس طرح کا زہریلا نشہ بھی کرتے ہیں۔ یہ تو اس نے
یہاں آکر ہی سب سے پہلے جانا۔۔۔ اور یہ چھوٹی سی بچی
اس کو سب پتہ تھا۔ پتہ تھا کہ بالو بھائی رکشے
والا اسمیک پی کر مر گیا۔۔۔ ایک دن ایسے ہی اس
کا باپ بھی مر جائے گا۔۔۔

ٹن... ٹنے....
کوئی گوشت کوٹنے والا موسل' سے اس کے
غ پر ضرب لگا رہا تھا —
علی الصباح اڑوس پڑوس میں مہابھارت
ڑ جاتی — گالی گلوچ شروع ہو جاتے۔ اسے دیکھنے
ں شک بھری آنکھیں ہوتیں — ایسی ہی، ایک
ں بھری صبح، ایک جھری بھرے چہرے والی عورت
ں کے آگے رو رہی تھی —
میرا مرد... مجھے مارتا ہے — اسمیک پیتا ہے
......

اس نے بہت غور سے دیکھا، تب پتہ چلا۔
ورت کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس کی ہوگی۔ اس سے
ادہ نہیں — خوراک کی کمی نے اس کی یہ حالت بنا
ی تھی — اس کا دل — غصّے سے بھر جاتا —
یغ — تبلیغ چلانے والے مولوی عنایت اللہ جیسے لوگ
ن گھروں میں کیوں نہیں آتے۔ یہ بھی تو ایک جگہ ہے —
بلی ان سنی بھوکی انتڑیوں کو تبلیغ سے زیادہ روٹی
ضرورت ہے اور مولوی عنایت اللہ جیسوں کے پاس
ن کے لئے روٹی نہیں —
ایک دن اچانک راستہ میں اسے شعیب مل گیا
عیب ان چند مہینوں میں برسوں کا بیمار نظر
رہا تھا۔
کہاں رہتے ہو —؟
اس نے پتہ دے دیا —
آنا مت — ورنہ لوگوں کو الزام لگاتے دیر
نہیں لگے گی —۔
شعیب ہنسا — اس نے ایک دفتر کا فون

نمبر دیتے ہوئے کہا — یہاں رِنگ کرسکتی ہو۔ یہ
میرے دفتر کا ہی فون نمبر ہے۔ ہمارے وجود کی طرح
ایک بے نام دفتر — وہ پھیکی ہنسی ہنسا —
" مطلب "
" خیر چھوڑو — تم اپنی سناؤ۔"
" میں "
وہی زندہ دل ہنسی شعیب کے لبوں پر اتنا لٹنے
کے باوجود قائم تھی — ایک نیا دوست مل گیا ہے —
وِنئے — فی الحال اسی کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں —"
" یعنی مکان مل گیا "
" مکان یہاں ہم جیسوں کو کہاں ملتا ہے۔ ایک
کمرہ ہے بس —"
" تم خوش قسمت ہو — پتہ نہیں مجھے بھی یہاں
اور کتنے دھکّے کھانے باقی ہیں —"
" پھر وہی مایوسی "
" نہ — مایوس نہیں ہوں — لیکن ہارنے —
مستقل ہارنے کی بھی اپنی حد ہوتی ہے — کبھی کبھی
لگتا ہے تقدیر میں اچھی نوکری لکھا کر لایا ہی نہیں۔
" ایسا کیوں سوچتے ہو۔"
" شعیب پھر ہنسا — میرا عقیدہ اب پہلے سے
زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں
کے لئے ایک اچھی سی نوکری اب ناممکن سی چیز بن کر
رہ گئی ہے "
" چلو گھر چلتے ہیں...."
انجو بوجھل قدموں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

دبیز

امجد حسین

تیمور نجیب نگر — دلی ۱۳

انفلیشن
(INFLASION)

"زیادہ سوچنے اور فکر کرنے سے کام کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔" کبھی مجھے سمجھاتے ہوئے ابا حضور نے کہا تھا۔ اور میں نے بہی کوشش کی کہ سوچنا ترک کر دوں۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ ہاں! یہ ضرور ہوا کہ سوچنا کم کر دیا۔ لیکن ادھر چند دنوں سے پھر میں بہت زیادہ سوچنے لگا ہوں۔ اور نتیجتاً پڑھائی کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی۔ شاید اسی لئے ابا حضور نے کہا تھا کہ کم سوچو۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف پڑھتے رہو — لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ "سوچ" ہی میری تنہائی کے بہترین ساتھی ہیں۔ میں مختلف موضوع پر سوچتا ہوں۔ خیالی پلاؤ پکاتا ہوں۔ خیالات میں میں نے وہ وہ معرکے سر کئے ہیں جن کے لئے آدمی اپنی زندگی تک قربان کر دیتا ہے اور کچھ نہیں نکلتا۔ کسی مسئلے کا تجزیہ کرتا ہوں اور اس کا حل تلاش کرتا ہوں۔ کسی کو یاد کر لیا کرتا ہوں۔ کسی کو برا بھلا کہہ دیتا ہوں۔ یہ تمام کام میں خیالوں ہی میں کرتا ہوں اس لئے کہ میرے اندر اتنی قوت نہیں ہے کہ کسی غلط کام کو روک سکوں۔ بلکہ اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ کسی کے سامنے کسی کو برا بھلا کہہ سکوں۔ اسی لئے کہ مجھے تمام انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں کسی کے سامنے بھی کسی کی بات کرتے ہوئے ڈرتا ہوں، پتہ نہیں کس کے اندر کون چھپا بیٹھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سوچ لیا کرتا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں اچھی اچھی کتابیں ہیں۔ مختلف موضوع پر۔ کتابوں کی نمائش لگی ہے۔ میں نے کتابوں کو کھنگال ڈالا ہے۔ ایک سے ایک کام کی کتابیں ہیں۔ قیمت پوچھنے پر مایوسی ہوتی ہے۔ میں خرید نہیں سکتا۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ دل پر جبر کر کے واپس چلا آتا ہوں۔ لیکن دوسرے دن پھر جاتا ہوں۔ ابھی نمائش پندرہ دن رہے گی۔ میں پانچ دنوں سے روزانہ نمائش میں جا رہا ہوں۔ یہ جاننے کے

باوجود کہ کتابیں مہنگی ہیں میں انہیں خرید سکتا ہیں کتابوں
کو دیکھتا ہوں۔ قیمت دیکھتا ہوں اور مایوس ہو کر
رکھ دیتا ہوں۔ ایسی حالت میں میرے پاس سوچنے
کے علاوہ اور کوئی دوسرا چارہ نہیں رہتا ہے۔ اور
میرے خیالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے" یہ
کتابیں پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہیں یا نمائش کے لئے۔
آخر وہ کیسی قسم کے لوگ ہیں جو یہ کتابیں پڑھتے ہیں"
انہیں سوچوں میں غرق میں نمائش سے نکل کر
لائبریری میں داخل ہو جاتا ہوں۔

میں لائبریری پابندی سے آیا کرتا ہوں ابھی میں
اپنی جگہ پر بیٹھا ہوں۔ ایک صاحب ادھیڑ عمر کے۔ دھوتی
اور کرتے میں ملبوس لائبریری میں داخل ہوتے ہیں۔
لڑکوں کو پڑھائی میں مصروف دیکھ کر انھیں بڑی
مسرت ہوتی ہے۔ جس کا اظہار ان کے چہرے سے
ہو رہا ہے۔ میرے سامنے ایک صاحب بیٹھے ہیں۔
انھوں نے بھی ان صاحب کو دیکھا ہے۔ بلکہ ان کا
بغور جائزہ لیا ہے۔ اور اپنے برابر والے کی کان
میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگتے ہیں
مجھے صرف ایک لفظ ہی سمجھ میں آسکا ہے جو "ب"
سے شروع ہوتا ہے اور "ی" پر ختم ہوتا ہے اور
میں بآسانی سمجھ گیا ہوں کہ وہ لفظ ایک مخصوص
خطۂ زمین کے رہنے والوں کے لئے استعمال ہوتا
ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ استعمال اب اتنا وسیع ہو گیا
ہے کہ لوگ اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ——
کسی خطۂ زمین سے تعلق رکھنے والے کا نام بلکہ یہ ایک
کیفیت ہے جو بلا تفریق صوبہ کسی پر بھی طاری ہو سکتی
ہے" اور اسی کا اطلاق ان دو اصحاب نے ان پر

کیا تھا جو ابھی دھوتی اور کرتے میں ملبوس لائبریری میں
آئے تھے۔ میرے تخیلات کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا
ہے: ایسا لگتا ہے میرے ابا اس لباس میں
تشریف لائے تھے۔ انھیں تو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ہمارے
بیٹے پڑھ رہے ہیں۔ کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔
انھوں نے اور نہ جانے کیا کیا۔ ان کے جذبات زخمی ہوں
گے۔ لیکن میرے چہرے پر جو مسکراہٹ کی لکیر نمایاں ہوئی
ہے وہ ان کے لباس کو دیکھ کر ہوئی ہے۔ کیا یہی ہماری
تعلیم ہے؟ کیا اسی کے لئے انہوں نے اپنی نظریں ہمارے
اوپر گاڑ رکھی ہیں۔ اور ہماری طرف آس لگائے بیٹھے ہیں۔
کیا... کیا... میرا طائر تخیل پرواز کرتا جا رہا ہے۔ اور
اچانک مجھے خیال آتا ہے کہ کچھ نوٹس بنانا تھے۔ میں
نوٹس بنانے کی غرض سے کتاب ایشو کروانے کے لئے کاؤنٹر
پر پہنچا ہوں۔ کاؤنٹر پر ایک صاحب ان سے مخاطب ہیں
جو کتابیں ایشو کرتے ہیں: "غلطیاں تو ہوتی ہی رہتی
ہیں ہاتھ ملانے سے کیا مضائقہ ہے" میں نے بھی ان کی
تائید کر دی ہے۔ اب وہ صاحب جو کتابیں ایشو کرتے
ہیں مجھ سے مخاطب ہیں۔ اب آپ ہی دیکھئے صاحب!
اعتماد کرنے کا یہ تو مطلب نہیں ہوا۔ انھوں نے بغیر
کارڈ دیئے کتاب لے لی اور اسے پینٹ کے اندر چھپانے
کے لئے کسی محفوظ مقام کی تاک میں تھے۔ میں نے بھانپ
لیا فوراً پکڑ لیا: "بڑے افسوس کی بات ہے" میں
ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ کتاب ایشو کروا کر میں واپس
آگیا۔ میں نے پڑھنے کے لئے کتاب کھولی۔ مجھے INF-
LATION - پر نوٹس بنانا تھے۔ INFLATION یعنی
قیمتوں میں اضافہ آج کل اتنی جلدی جلدی قیمتوں
میں کیوں اضافہ ہو رہا ہے؟ جا ہے وہ کوئی بھی شے

خورد و طعام کی چیزیں ہوں یا آرام و آسائش کی۔ وہ پیار ہو، محبت ہو، خلوص ہو، سچ ہو، عزت و احترام ہو، ایثار و قربانی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن زندگی تو بڑی سستی ہے۔ زندگی کے علاوہ تمام چیزیں، تمام اقدار، اخلاق، عادات و اطوار، وغیرہ ساتھ ہی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کتابیں نہیں خرید سکتا۔ طائر تخیل متحرک ہو گیا ہے۔ کیوں نہ میں بھی نمائش سے کوئی کتاب غائب ہی کرلوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں نمائش میں داخل ہو گیا ہوں۔ بہت دیر کے بعد ایک کتاب پسند کی ہے۔ اب اُسے چھپانے کے لئے موزوں موقع کی تلاش میں ہوں۔ مجھے موقع مل گیا ہے۔ میں نے شرٹ کے اندر ڈال لی ہے۔ اور اب دروازہ سے باہر نکلنے والا ہوں۔ لیکن کسی نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ میں پوری قوت سے چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اچانک خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور پھر پڑھائی میں مشغول ہو جاتا ہوں۔

جوں جوں ڈائری کے اوراق پلٹتا جا رہا ہوں ایک ایک کر کے تمام واقعات ذہن کے پردے پر ابھرتے جا رہے ہیں۔ جن پر زمانے کی گرد پڑ چکی ہے۔ میں شاید اپنا ماضی تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن میرا ماضی تو وہی تھا جو میرا حال ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ جب بھی، تمام چیزیں مہنگی تھیں۔ اب بھی مہنگی ہیں۔ اس زمانے میں بھی جان سستی ہے اب وہی حال ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں میں طالب علم تھا۔ زندگی گزارنے کے طور طریقے سیکھنے کی عمر تھی اور اب عملی زندگی میں داخل ہو گیا ہوں۔ جو کچھ اپنے ماضی میں سیکھا ہے اسی کے مطابق اپنے حال کو سنوارنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں ۔۔ لیکن ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ ماضی میں میں نے کیا سیکھا ہے ۔۔۔ کیا پایا ہے ۔۔۔ کیا دیکھا ہے ؟

یہی نا! کہ "ایک شور بلند ہوا ہے۔ تمام لوگ ایک طرف کو بھاگ رہے ہیں۔ کسی کا حادثہ ہو گیا ہے۔ ٹرک سے ۔۔۔ یہ ٹرک والے بھی بہت تیز چلاتے ہیں۔ یہ سڑک بند کر دینی چاہئے۔ وہ ڈرائیور پکڑا گیا کہ نہیں۔ ابھی تک زندہ ہے۔ چلو۔ چلو سب لوگ اکٹھا ہو رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی نیند میں خلل پڑ رہا ہے۔ یہ بھی کوئی وقت ہے ملنے کا۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اپنی ملکیت جو اپنے آبا و اجداد کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے، برباد کی جا رہی ہے۔ شیشے توڑے جا رہے ہیں۔ گالیاں بکی جا رہی ہیں۔ پولس آئی ہے۔ لاٹھی چارج ہو رہا ہے۔ اپنی جان بچا کر لوگ بھاگ رہے ہیں۔ ہوائی فائرنگ بھی شروع ہو گئی ہے۔ تھک ہار کر لوگ واپس اپنے گھروں میں پہنچ گئے ہیں ۔۔ تبصرے ہو رہے ہیں۔ پولس کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے نکل جاتے کچھ باتیں کر لیتے تو کیا تھا؟ کیا انھیں یہ کہنا چاہئے تھا کہ جب تک غنڈہ گردی اور بلوہ ہوگا پولس آتی رہے گی؟ کیا لڑکوں کو شیشہ توڑنا چاہئے تھا۔ کیا کینٹین لوٹنا چاہئے تھا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا طائر تخیل پھر پھڑپھڑانے لگا ہے"

یہ طالب علمی کے زمانے کی اشتعال انگیزی تھی۔ جو اب عملی زندگی میں دوسری شکل میں داخل

ہو گئی ہے۔ پہلے انتظامیہ سے کر دی جاتی تھی اور
اب آپس میں۔ مذہب کی بنیاد پر، رنگ و نسل
کی بنیاد پر، فرقے کی، عقیدے کی بنیاد پر...
لیکن میں سوائے سوچنے کے کر ہی کیا سکتا ہوں
میری زندگی میں بہت سارے مواقع آئے
ہیں جہاں میں سوچتا رہا ہوں۔ اور کچھ کر نہیں سکا۔
جب میں نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی تب بھی یہ
سوچتا رہ گیا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ اتفاق
سے نوکری مل گئی۔ اپنی شادی کے وقت بھی
میں تخیل کی بلند پروازیوں سے اس وقت لوٹا جب
مجھے ابا حضور نے کہا کہو قبول ہے۔ میں زندگی
کا آدھے سے زیادہ حصہ گذار چکا ہوں۔ مجھے
اپنے طائر تخیل کی قوت پرواز پر فخر ہے۔ زندگی
کے انتہائی برے دنوں میں بھی اس نے میرا
ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ اپنی مفلوک الحالی،
تنگ دستی اور تہی دستی کے زمانے میں جب
میرے پاس ایک وقت کے کھانے کے لئے پیسے
نہیں تھے۔ میں نے طائر تخیل کی مدد سے محل تعمیر
کئے ہیں۔ یہ میرا مخلص ترین دوست، ہمدم، غمخوار و
غم گسار ہے۔ اپنی زندگی سے متعلق تمام خاکوں
کو اسی کے ذریعے عملی جامہ پہناتا ہوں۔

ادھر چند دنوں سے شہر کی فضا بہت خراب
ہو گئی ہے۔ طرح طرح کی خبریں آ رہی ہیں۔ لوٹ مار،
آتش زنی... وہ تمام جرائم جیسے پیشہ ور مجرم بھی کرتے
ہوئے ہچکچاتا ہے اچھے خاصے شریف النفس لوگ
کر رہے ہیں۔ ایام طالب علمی کی سیکھی ہوئی اشتعال
انگیزیاں عملی زندگی میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان کے اندر
بیٹھا ہوا شیطان متحرک ہو گیا ہے۔ سارا نظام
درہم برہم ہو گیا ہے۔ ضروریات کی چیزیں نہیں مل پا
رہی ہیں۔ کرفیو میں ایک گھنٹے کے لئے چھوٹ ملی ہے۔
لوگ دکانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ چیزیں بہت مہنگی
ہو گئی ہیں۔ قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔
لیکن یہاں [illegible] آیا ہے۔ لیکن جان
بہت سستی ہو گئی ہے۔ کیونکہ کوئی قیمت ہی نہیں ہے
یہاں کی۔ میرا بیٹا تین دنوں سے غائب ہے۔ ملک
صاحب کے بیٹے اسپتال سے واپس گھر لوٹے ہی نہیں۔
خان صاحب کے خاندان کو نذر آتش کر دیا گیا۔ دن
بدن حالات سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ ابھی ابھی
ایک دھماکہ ہوا ہے۔ آواز دھیرے دھیرے قریب
ہو رہی ہے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا ہے
ہجوم شاید میرے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے کھڑکی
بند کر دی ہے۔ اپنے گھر کے تمام افراد کے ساتھ اوپر
والے کمرے میں آ گیا ہوں۔ حسب معمول میرا طائر تخیل
پھر پرواز کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا
ہے کہ اب اس کے پر میں اتنی قوت نہیں ہے۔ اس
کے پر شکستہ ہو چکے ہیں۔ دروازے پر دستک ہو
رہی ہے میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں کچھ سوچوں
یا کچھ کروں۔ اب دروازے کو زور سے پیٹا جا رہا ہے
طائر تخیل ہمت ہار گیا ہے۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوت
سلب ہو گئی ہے۔ اور دروازہ ٹوٹ گیا ہے۔ ہجوم گھر
کے اندر داخل ہو گیا ہے اور میرے کانوں میں ابا حضور
کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں "جب انسان سوچنے اور
فکر کرنے سے کام نہ لے تو صلاحیت ختم ہو جاتی ہے"

دیپک

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

نام :۔ **پیتل کا آسمان**
شاعر :۔ عبدالمتین نیاز
قیمت :۔ ۲۰ روپے　صفحات :۔ ۱۲۸
تقسیم کار :۔ ۲۳۶ صوفیہ ہاؤس موتیا پارک، بھوپال ۱
مکتبہ شرقیہ ابراہیم پورہ بھوپال

" پیتل کا آسمان " عبدالمتین نیاز کا شعری مجموعہ ہے۔ نیاز کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ نغمہ شعور، حرف وصدا، دشت معانی اور تتلیوں کی گیت، کے ذریعہ بہت پہلے ہی دنیائے فن میں اپنی شناخت اور مقام حاصل کر چکے ہیں۔ موصوف ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جس کا ثبوت یہ صاف ستھرا نکھرا اور شستہ مجموعہ بذات خود ہے کیونکہ مشک آنکہ خود بگوید نہ کہ عطار، موصوف کا تعلق نوابوں اور رؤسا کے شہر بھوپال سے جس کی گود میں اردو پلی اور پروان چڑھی نیز جس کی مٹی نے کیف جیسا عظیم المرتب شاعر زبان اردو اور دنیائے شعر وسخن کو دیا۔ کتاب کے آغاز میں بعنوان " کہتا ہوں کہ سچ ... سمجھتے " جو مفید اور کارآمد باتیں نیاز نے قلم بند کی ہیں وہ ان کی شاعری، ان کے فکری و فنی نقطۂ نظر اور شخصیت کو سمجھنے جاننے اور پرکھنے میں پوری مدد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں اس مضمون کے چند اقتباسات۔

" میں فکری طور پر ترقی پسند ہوں۔ جدیدیت میرا رویہ اور روایت میری بنیاد ہے۔ میں نے ان نکات کی کتنی پاسداری کی ہے قارئین جو گہری علمی بصیرت اور شاعرانہ سمجھ بھی رکھتے ہیں اس کا اندازہ میرے متذکرہ شعری انتخابات کے مطالعے (سے) ..... کر سکتے ہیں۔

جہاں تک میری شخصیت کا سوال ہے وہ ایک عام آدمی سے الگ نہیں ہے ــــــ البتہ میری شخصیت میں کڑواہٹیں دینے میں میرے ارد گرد کے ماحول (نے) کافی طاقتور کردار ادا کیا ہے۔ ماحول کے ان تلخیوں کی پرچھائیاں میرے فن کا ایک حصہ ہیں .....

شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر میرے لہجے کا کھردرا پن مذکورہ کڑواہٹوں کی ہی دین ہے۔ "

اقتسابات بالا سے نیاز کی شاعری کی سمت لب ولہجہ اور ماخذوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری میں دردمندی، اخوت ومحبت کا پیغام، اعلان حق، بے باکی

اور برجستگی کے جو حوالہ جات اور پیغامات بکھرے
پڑے ہیں ان سے بھی ہم آشنا ہوتے ہیں۔ نیازؔ نے
صغر سنی سے ہی جن حادثات و حوادثات زمانہ اور
نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آٹھ
سال کی عمر سے ہی اپنی دنیا آپ سنوارنے اور بنانے
کی جدوجہد کی اور آج تک کر رہے ہیں۔ ایسی حالت
میں ان کی شاعری میں جو جرأت مندانہ اظہار یا پیام
زیست ہے وہ انہی کی دین ہے۔ اور ان کا یہ قول حرف
بہ حرف صداقت پر مبنی ہے۔

ظلم کے سامنے سچ کہنے کی ہمت کرنا
شاعری کرنا ہے اعلانِ نبوت کرنا

لیکن ان تمام حالات کا جس طرح نیاز نے مردانہ وار مقابلہ
کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے عشرت قادری کا یہ شعر
ان پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔

بیتیل کا آسمان، سفر میں جہاں ملا
سب راہ روکتے ایک شجر سایہ دار ہم

نیاز کی غزلیں روایتی انداز اور رنگ و آہنگ کی ہیں
ان میں روایتی غزل گوئی کی ساری خصوصیات بدرجہ
اتم موجود ہیں۔ ترنم، موسیقیت، للکار، جھنکار،
کیف و سرور، مستی، لطافت، نزاکت، حسن و حرکت،
زندگی، پیغام، درس عمل سب کچھ ہے۔ اظہار میں بہت جدت
اور فکر و خیال میں ترقی پسندی ہے۔ ان کی غزل گوئی میں
حق کا اعلان بالجبر ہے۔ حقیقت کا اظہار ان کی خو میں
شامل ہے۔ زندگی کی تلخیوں کا بے باکانہ اظہار اور اس
سے لوہا لینے کا عزم بھی ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔ کبھی
کبھی یہ طنز کے تیر بھی بکھیرتے ہیں۔ ان میں معنویت
گیرائی گہرائی اور وسعت سب کچھ ہے۔ یوں تو اس

مجموعہ کے تمام اشعار قابل تحسین ہیں، مگر چند اشعار
جو مجھے بہت اچھے لگے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ہوا کا ہاتھ پکڑ کر بلندیوں پہ نہ جا
یہ اعتبار تجھے خاک میں ملا دے گا

تار قبا ہے تو یہ نہ رفوئی شکم میں ہے
یارو ہماری زیست کا معیار دیکھنا

یہی سب ہے جو خوابوں کی بات کرتے ہو
کہ زندگی کو ابھی تک جیا نہیں تم نے

عزیز رکھتے ہیں سچائی کو جو دولت سے
نوازتا ہے زمانہ انہیں شہادت سے

تاریخ ہنس پڑے گی جو مجھ کو کہو گے غیر
میرے لہو کا رنگ بھی خاکِ وطن میں ہے

پھولوں کا اہتمام تو ہم سے نہ ہو سکا
اس کے حضور زخموں کی چادر ہی لے چلیں

نظمیات کا حصہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ
نظمیات اور دوسرا حصہ یادِ رفتگاں۔ یہ دونوں حصے
بہت خوب ہیں ان میں تسلسل، روانی، موضوع سے
وابستگی، کیف و سرور کی زیریں لہر کے ساتھ فن
نظم نگاری کی دوسری خوبیاں بھی بدرجۂ اتم موجود
ہیں۔ یادِ رفتگاں کے اشعار بولتے اور حقیقت بیانی
پر مبنی ہیں۔ ______ عمومی طور پر
نیاز کی غزلیں اور نظمیں فنی اور عروضی
خامیوں سے پاک ہیں۔ الفاظ سیدھے سادے،
روزمرہ کے ہیں۔ زبان شستہ ہے۔ معنی و مطالب
صاف ہیں۔ قاری کو ان کے کلام کے سننے یا سمجھنے میں
کسی قسم کی ذہنی کوفت یا بوجھل پن کا احساس نہیں ہوگا
الفاظ کا موزوں و مناسب استعمال ہوا ہے۔

طباعت اغلاط سے پاک ہے اور بڑی صاف ستھری ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ جو شاعر کے ذوق سلیم کا پتہ دیتا ہے۔ قیمت بالکل معمولی ہے۔ ایسی کتاب کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والوں کو یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لینی چاہئے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔

▲ سید ابوالفیض سیدابادی

کتاب :- جنوب کا شعر و ادب
مصنف : علیم صبا نویدی
نوعیت :- تحقیق و تنقید
ضخامت :- ۱۴۴ ▲ قیمت :- ۱۰۰/ روپیہ
پتہ :- (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، علی گڑھ
(۲) مکتبہ کہسار، بریہ پورہ، بھاگلپور، (بہار)

موجودہ شعر و ادب میں علیم صبا نویدی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں انہوں نے شعر و ادب کی مختلف جہتوں میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن کے باعث ان کی امتیازی شناخت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ انہیں کارگزاریوں کی ایک اہم پیش کش ان کی کتاب "جنوب کا شعر و ادب" ہے جو ان کی تنقیدی و تحقیقی کاوشوں کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ پیش نظر کتاب چودہ مضامین پر مشتمل ہے جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) شہر مدراس میں اردو نثر کا ارتقا (۲) تمل ناڈو میں اردو افسانہ (۳) تمل زبان کے جدید افسانہ نگار (۴) غالب کا ایک ہمعصر۔ لطیف آرکاٹی (۵) نواب تجمل حسین خاں ایمان گریاموی (۶) مولانا عبدالحئی احقر بنگلوری (۷) پروفیسر غلام حسین دہلی مدوری اور نظم کائنات (۸) علامہ قدری باقوی کا فکری سفرنامہ (۹) مولانا راہی فدائی اور تذکرہ میں اردو (۱۰) مصنف دوہا اور ساغر جیدی (۱۱) ڈاکٹر راہی قریشی اور عکس کی ہجرت (۱۲) اکرام کاوش اور آب زر (۱۳) عبدالقادر ادیب — بحیثیت انشائیہ نگار (۱۴) یعقوب اسلم کی افسانہ نگاری —

تمام مضامین انفرادی نوعیت کے حامل ہیں ان کے ذریعہ علیم صبا نویدی نے جنوب خصوصاً تمل ناڈو کے شعراء و نثار کی خدمات کو منظر عام پر لانے کی سعی و بلیغ کی ہے۔ ان کے شعری و نثری کارناموں پر تنقیدی و تحقیقی روشنی ڈال کر شعر و ادب میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ ان کا تعلق اس سرزمین سے کافی گہرا ہے۔ انہیں بہت قریب سے یہاں کے ادیبوں اور شعروں کی شناسائی کا موقع ملا۔ لہٰذا علیم صبا نویدی نے ان کی شخصیت اور کارناموں کو حق و صداقت کے آئینے میں منعکس کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ کوئی کارنامہ حرف آخر نہیں ہوتا۔ تحقیق کے در ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں۔ اب یہ قارئین حضرات کا فرض مقدم ہے کہ وہ اس معتبر کارنامے سے رابطہ قائم کریں اور اس کی قدر و قیمت متعین کریں۔ اور تبھی ایک قلم کار کی کاوشوں کا صحیح صلہ مل سکتا ہے۔

اس کتاب میں وہ مضامین شامل ہیں جو مختلف ذرائع ابلاغ کی وساطت سے عوام تک وقتاً فوقتاً

پہنچتے رہے ہیں۔ اور اب یہ اجتماعی صورت ہی قارئین کے پیش خدمت ہے تاکہ قارئین بیک وقت ان کا مطالعہ کر کے تحقیق و تنقید کے نئے گوشے سے روشنی حاصل کریں۔ یہ کتاب باطنی خوبیوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی مزین ہے اس کا سرورق دلکش و دیدہ زیب ہے۔ قیمت بھی موزوں و مناسب ہے بلکہ اس لحاظ سے کم ہے کہ یہ قیمت ایک قلم کار کی محنت و جدوجہد کا حق کبھی نہیں ادا کر سکتی ہے۔ اس کی مشقتوں کا اجر تو اس سے کہیں بالاتر ہے۔

● ڈاکٹر فرحانہ شاہین

کتاب :- **اثر خامہ**
مصنف :- علیم صبا نویدی
نوعیت :- شاعری
ضخامت :- ۱۳۶ ● قیمت :- ۱۶؍ روپے
ناشر :- کتب خانہ عزیزیہ — اردو بازار، دہلی ۶

موجودہ دور میں علیم صبا نویدی ایک ایسی منفرد و ممتاز شخصیت کا نام ہے جو اپنے علم و فن کی روشنی سے دنیائے ادب کو درخشندگی بخشتے ہیں۔ کوشاں ہے۔ شاعری اور نثر دونوں ہی فنون میں ان کی شہرت و عظمت ہمہ گیر ہے۔ پیش نظر کتاب "اثر خامہ" علیم صبا نویدی کا شعری مجموعہ ہے۔ انہوں نے شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کر کے جدت و ندرت کی فضا بخشی۔ علیم صبا نے شعری لوازمات زندگی کے گہرے تجربات و مشاہدات سے اخذ کئے ہیں۔ زندگی کی متفرق، متحرک و متبدل تصاویر کا بہت قریب سے مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ "اثر خامہ" ان کی ذہنی، فکری، قلبی واردات اور عصری آگہی کا حقیقی آئینہ دار ہے۔ موضوعات اور طرز ادا ہی ایک ایسا توازن ہے جو شاعری کو حسن و دلکشی اور تاثر بخشتا ہے۔ عام موضوعات بھی ان کے شعری قالب میں حسن و خوبی ڈھل کر اپنی عظمت منوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے یہ چند اشعار خاص طور پر قابل داد ہیں۔

غبار درد میں خود کی تلاش مشکل تھی
وگرنہ میں نے کہاں آپ کو نہیں ڈھونڈا

حبیب سے کیا ہے اپنوں میں پہچان کا شعور
ان مٹ مہک وفاؤں کی غیروں میں آگئی

خامشی عافیت ذات ہے خاموش رہو
ورنہ ماحول میں پھر زہر گماں پھیلے گا

علیم صبا نویدی کے یہاں الفاظ کا انتخاب اس کی نشست و برخواست اور پھر ان کی مناسبت سے دیگر الفاظ کی پیش کش اعلیٰ پائے کی ہے۔ وہ لفظوں کے کاریگر معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں موضوعات اور انداز پیش کش دونوں ہی باوقار ہیں وہاں اشعار کی عظمت دوبالا ہوگئی ہے۔ یہ چند اشعار پیش خدمت ہیں ——

وہ اس قدر جلا کہ دھواں روشنی میں تھا
اس کے لہو کا ذکر کہاں روشنی میں تھا

اس گھر کی بیوگی کو بھلا کون دے سہاگ
جس گھر کا باوقار تبسم شہد میں تھا

ہمارے زخم ہیں انمول کیا خرید و گے
اگرچہ شہر میں سب کا لہو ہوا سستا

صاحبان فن کا یہ انداز فکر ہے کہ شاعری دریا کو کوزے میں سمانے کا نام ہے یعنی شاعری ایک مشکل فن ہے۔ طویل تر خیالات و جذبات کو دو مصرعوں میں پیش کرنا کمال ہنر مندی ہے۔ بڑی بحر میں کہنا کچھ حد تک آسان ہے لیکن چھوٹی بحر میں خیالات کی ادائیگی عروج ہنر مندی ہے۔ علیم صبا نویدی نے اپنے افکار کے موتی چھوٹی بحر کے نازک دھاگوں میں بھی بڑی فنکاری اور خوش اسلوبی، کے ساتھ پروئے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار اسی حقیقت کے غماز ہیں —

آخری اظہار آنسو بن گیا
زخم خوردہ چاہتوں میں چھن گیا

میرا رشتہ ان مٹ رشتہ
میں ہی میں ہوں ازل ابد میں

" اثر خامہ" میں واقعی علیم صبا نویدی کے خامہ کا اثر ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کی جولانی سے ذہن دل کی متفرق کیفیات کو بڑی خوش اسلوبی اور فنی چابکدستی سے شعری پیکر عطا کیا ہے۔ کتاب کا کاغذ عمدہ اور سرورق کافی دلکش و رعنا ہے۔

▲ ڈاکٹر فرحانہ شاہین

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی — بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنہاروی

سُہیل گیا
ماہنامہ

شمارہ ۱۲ جلد ۵۳

بدل اشتراک

- فی شمارہ .... ۵ روپے
- سالانہ .... ۵۰ روپے
- لائف ممبری .... ۱۰۰۰ روپے

فہرست

★

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سُہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر :- ۲۱۵۷۳

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام

ترقی کے نئے باب

۲۰ نکاتی پروگرام کا خاص مقصد ہے غربت کے خلاف جدو جہد۔ صوبہ میں اس پروگرام کے موثر اُپ سوتر کے لئے خاص نشانہ مقرر کئے گئے ہیں اور پوری لگن کے ساتھ ہر سطح پر اس کی حصولیابی کے لئے کوشش کئے جا رہے ہیں۔ اس کے تحت سال ۹۳-۱۹۹۲ء میں حاصل کامیابیاں قابل ذکر ہیں۔

○ سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت 2,49,898 خاندانوں کو فائدہ دلایا گیا ○ جواہر روزگار یوجنا کے تحت ۵۲۔ ۹۴ لاکھ مانو دوس کا سرجن کیا گیا ○ 102 چھوٹے دیہی اور سلپی کرت اکائیاں قائم کی گئیں ○ بھومی سدھار یوجنا کے تحت 8,369 ایکڑ خالی زمین تقسیم کی گئی ○ صوبہ کے 5/82 گاؤں میں صاف پینے کے پانی کا انتظام کیا گیا ○ خود بچوانی کرن کے تحت 2,76,842 لوگوں کی نس بندی کرائی گئی ○ خاندانی منصوبہ بندی کی ان یانیہ وردھی کے ذریعہ 2،76،809 لوگ مستفید ہوئے ○ بچوں کا ٹیکہ کرن پروگرام کے تحت ڈی۔پی۔ٹی کے 19,94,106 پولیو کے 19,55,877 بی سی جی کے 21,93,394 اور میزلس کے 18,14,393 ٹیکے لگائے گئے ○ 20,930 آنگن باڑی مراکز قائم کئے گئے ○ مختلف منصوبوں اور پروگراموں کے تحت 9,63,189 انوسوچت جاتی اور 33,267,1 انوسوچت جن جاتی کے خاندانوں کو مستفید کرایا گیا ○ بے گھر لوگوں کے درمیان 21,628 جگہ دی گئی ○ اندرا آواس یوجنا کے تحت انوسوچت جاتی اور جن جاتی کے لوگوں کے لئے 25,953 گھروں کی تعمیر کی گئی ○ مالی طور پر کمزور اور کم آمدنی والے لوگوں کے لئے 496 اور 268 مکانوں کی تعمیر اور الاٹ کیا گیا ○ تنگ بستیوں میں سدھار پروگرام کے تحت گندی بستیوں میں رہنے والے 7,464 لوگوں کے لئے پینے کا پانی، جل داہ انتظام، نالی سدھار، غسل خانہ، پیخانہ، گلی تعمیر، بجلی وغیرہ کی سہولیات مہیا کرائی گئی ○ 20,337 ہیکٹر میں 20,979 پودے لگائے گئے ○ جن وترن پرنالی کی 686 دکانیں کھولی گئیں ○ 258 گاؤں میں بجلی 2,592 لیمپ سیٹوں کو بجلی سے تعلق 1,75,064 اچھے قسم کے چولہوں کی تعمیر اور 3,152 بائیو گیس سینٹر قائم کیا گیا۔

جاری کردہ: **محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار**

142 [illegible] (59-[illegible]) 93-94

تخلیق کی معنویت / معنویت کی تخلیق

ہمارے تخلیق کاروں کو خالی وقتوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنا چاہئے کہ ہم کیوں لکھتے ہیں۔ اپنی محنت، دماغی صلاحیت اور قاری کے انہماک کے نتیجہ میں ہم معاشرے کو کیا دے رہے ہیں — کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم صرف متعارف ہونے کی کمزور و ناقص خواہش کے اسیر ہو گئے ہیں —؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ معمولی یافت ہمارا مقصود ہو گئی ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم معنویت اور مقصدیت کی سمت متعین کئے بغیر محض عادتاً یا تفریحاً لکھ رہے ہوں۔

یہ سوالات ہم کیوں اٹھائیں — ہم اس کے مجاز ہی نہیں، یہ تو فن کار کے اپنے غور و فکر کا نکتہ ہے۔ جب تک تخلیق کی معنویت متعین نہ ہو اور اس کا ہلکا اور دھندلا سا خاکہ بھی ہمارے ذہن میں نہ ہو اس وقت تک ادبی تخلیقات معاشرے میں ذمہ دارانہ درجہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ اس لئے اپنے فن پاروں میں اخذ و جذب کی خصوصیات پیدا کرنے کے لئے، انہیں بقائے دوام اور عالمی پیمانوں میں اتارنے کے لئے نیز ادبی فن پاروں کو تلازمہ حیات بنانے کے لئے ہمیں بہر حال یہ سوچنا ہوگا کہ ہم اپنے مسائل سے کس حد تک جڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہی ادب دائمی اور آفاقی ہو سکتا ہے جو عصری بھی ہو۔ اپنے عصر کو چھوڑ کر ہم مستقبل میں نہیں پہنچ سکتے۔ ادب عصری فاصلوں کے تسلسل میں زندہ رہتا ہے۔ جست اور چھلانگ کا عمل ادبی تخلیق میں ہم سے زمین و زماں دونوں چھین لیتا ہے۔

جب تک ہم معنویت کی تخلیق سامنے نہ لائیں اس وقت تک تخلیق کی معنویت کا مفہوم پورا نہیں ہو سکتا۔

— مسعود منظر

علی احمد فاطمی
(الہ آباد)

اقتدارِ حیات کے مسائل اور اُردو غزل کے امکانات

جہاں تک اس عنوان کا تعلق ہے شاید اس کے دو مطلب نکلتے ہیں پہلا یہ کہ ان دلنوں زندگی کی قدروں پر جو مصائب آن پڑے ہیں اور آج جو ماحول بن گیا ہے تو ایسے شکستہ ماحول میں پختہ شاعری کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ اور شاید ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے زخم خوردہ ماحول میں اچھی، نرم اور کومل شاعری ان زخموں پر کتنا مرہم رکھ سکتی ہے، ماحول اور معاشرہ کو بہتر بنا سکتی ہے، بہرحال ذرا سے نازک فرق کے ساتھ دونوں ہی صورتوں میں اردو کی نئی شاعری اور بالخصوص نئی غزل پر براہ راست تبصرہ کرنے سے قبل دو ایک باتیں سمجھ لینی ضروری ہیں۔ ادب کے معاملات بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں اور پھر اس کے امکانات و توقعات کی باتیں کرنا اس سے بھی زیادہ نازک اور مشکل، یقیناً باتیں کوئی نئی نہ ہوں گی لیکن مضمون کے تعلق سے اس کا ذکر زیادہ نامناسب بھی نہ تھا۔

اہل علم واقف ہیں کہ صرف اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ادب میں، ہر دور میں شاعری کی مختلف تعریفیں ہوتی رہی ہیں۔ اور اس کے معیار و منصب، اندیشوں اور امکانات پر خوب خوب روشنی خرچ کی جاتی رہی ہے۔ لیکن آج تک کوئی جامع تعریف ممکن نہ ہو سکی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہر دور کی تعریفات میں اُس دور کے مذاق و مزاج اور تہذیبی مطالبات پس پردہ بہرحال کام کرتے رہے ہیں اور شاعری بھی ہر دور میں نئے نئے انقلابات، حادثات، تجربات و احساسات کے آبگینوں سے ٹکراتے ہوئے انسانی ذہن کی رنگا رنگی، بوالعجبی اور خلائیت کے طرح طرح نمونے اور جلوے پیش کرتی رہی اور ان سب کے ذریعہ کبھی وہ اپنی سابقہ تعریف کو تقویت پہنچاتی رہی اور اکثر ان کو رد بھی کرتی رہی۔ زندگی سے اٹوٹ رشتے کا اظہار کرتی رہی اور کبھی کبھی ایسا

بھی محسوس ہوتا ہے کہ زندگی سے اس کا کوئی ربط اور تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس بے تعلقی میں بھی ایک تعلق پوشیدہ رہتا ہے۔ بس ذرا سمجھنے اور تلاش کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس تعلق اور بے تعلقی کی اپنی ایک الگ منطق اور نفسیات ہوا کرتی ہے۔ جو متوازی لہریں ادب میں اپنا سفر طے کرتی رہتی ہیں۔ ضرورت وقت کے حساب سے ان سب کی تحقیق و تنقید کے معیار بدلتے رہتے ہیں۔ بے تعلقی کے حوالے سے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری اندرونی احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ خود رو پودے کی طرح پھوٹتی ہے۔ کیٹس (Keats) نے کہا تھا کہ اگر شاعری پتوں اور پھولوں کی طرح نہیں اگتی تو وہ بے کار ہوتی ہے بائرن (Byron) نے اسے لذوے کی تشبیہ دی تھی کہ وہ خود بخود اندر سے پھوٹتا ہے۔ غالب نے اس بات کو دوسرے انداز سے یوں کہا تھا۔

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

انگریزی کے ان رومانی شعرا نے شاعری کا کام محض مسرت بہم پہنچانے کے علاوہ کسی اور کام سے انکار کیا اور دیگر تمام رشتوں کو اچھی شاعری کے لئے زہر قرار دیا کیٹس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "ہم ایسی شاعری سے نفرت کرتے ہیں جس کے پیچھے کوئی ٹھوس غرض ہو۔ شاعری کو فلسفہ سیاست یا مذہب کا غلام نہیں ہونا چاہیئے۔ شاعری کا تعلق محض مسرت سے ہے۔ اس پر بھی بہت بحثیں ہو چکی ہیں اور یہ فلسفہ اپنے محدود معنوں میں رد بھی ہو چکا ہے۔ اور مسرت کے ابدی و آفاقی فلسفہ کے رو سے زندگی سے اس کا اٹوٹ رشتہ قائم ہو چکا ہے اسی لئے آگے بڑھ کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے مسرت کو اہمیت تو دی ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "شاعری کا کام صرف مسرت بہم پہنچانا ہی ہوتا تو مسرت بہت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوتی، شاعری میں ہمیشہ کسی نہ کسی نئے تجربے کا ابلاغ ہوتا ہے یا پھر کوئی مانوس تجربہ نئے ادراک کے ساتھ پیش ہو رہا ہے....." ایلیٹ نے اپنے مضمون "شاعری کا سماجی منصب" میں مسرت کے ارد گرد پیدا ہونے والی اشیا پر اچھی بحث کی ہے۔ یہ مسرت، اخلاق، اقدار، تجربات و احساسات اور اس طرح کی اور اشیا شعری پیکر میں شاعر کی ذاتی تخلیقی اظہار کا وسیلہ تو بنتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی شے خیالی یا تصوراتی نہیں ہوتی۔ یہ ساری کی ساری چیزیں سماج اور معاشرہ سے متصل اور مستعار ہوا کرتی ہیں۔ انسانی رشتوں کی وابستگی اور شکستگی، ان کے رد و قبول کی سطحیں و نوعیتیں ان کے ذرائع اظہار تو مختلف ہوتے ہیں لیکن معاشرہ کی مرکزیت اور اس سے وابستگی پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ باطنی احساسات، خارجی دباؤ کے محتاج رہتے ہیں۔ یہ کوئی نظریہ یا آدرش کی ہی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری عمل یا نیچرل فنومینا ہے جس کے عمل سے تقریباً ہر فنکار گزرتا ہے۔ انہیں فطری رشتوں اور احساسات کو آگے چل کر ایک ترقی یافتہ شکل دیتے ہوئے، منصوبہ بند طریقے سے اینگلز اور دوسرے دانشوروں نے کہیں ادب اور کہیں سماجیات، اقتصادیات کے حوالے سے اپنے اپنے نظریات پیش کئے۔ ادب ہو یا تہذیب، زبان ہو یا کلچر سب کے سب تہذیبی اور اقتصادی تمدن

کے بہرحال محتاج نہ سہی تو متاثر ضرور ہوتے ہیں ۔ مارکس کا یہ نظریہ ایک زندہ حقیقت بن کر ابھرا اور ساری کائنات پر چھا گیا ۔ ادب نے بھی اسی مستحکم نظریہ کے ذریعہ انقلاب برپا کر دیا ۔ گذشتہ سو پچاس برس کا ادب اس کا بہترین ثبوت ہے ۔

ایک نازک بات اور عرض کرتا چلوں ۔

زندگی اور ادب کے نرم و نازک تعلقات ۔ اٹوٹ وابستگی، نظریاتی پختگی، خارجی دباؤ کے تحت باطنیت کی رنگا رنگی کے باوجود تخلیق ادب اور اس سے زیادہ تخلیقی عمل کے معاملات بڑے عجیب وغریب ہوا کرتے ہیں ۔ زندگی کے واقعات و حادثات، فنکار کے دل و دماغ ضمیر و خمیر، فکر و خیال اور تخلیقی سوتوں میں ایک ہلچل اور طوفان برپا کرتے رہتے ہیں ۔ فنکار کا ذہن اسے کس روپ میں کس زاویہ سے قبول کرتا ہے ۔ یہ بالکل اس کا ذاتی معاملہ ہوا کرتا ہے ۔ یہیں سے اندرونی احساسات کی نیرنگی ۔ ردّ و قبول کی آزادی و بے باکی اور غیب سے مضامین کی آمد کے سلسلے جوڑے جا سکتے ہیں اگر ان صورتوں کو شعور و وجدان اور فکر و نظر سے قدرے الگ کر کے اور قدرے آزادانہ طور پر کیٹس کی زبان میں پودے کی طرح خود بخود اُگنے اور پنپنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو معاملات کے عجیب و غریب ہو جانے میں کسر کم ہی رہ جاتی ہے ۔ ایسا تخلیق ادب کبھی متعین راہ پر چل سکے گا اور کوئی ایسا مقصد اور عظیم ادب جنم لے سکے گا اور ایسے ادب سے کسی صحت مند اور صالح توقعات لگائی جا سکتی ہے ۔ کہنا مشکل ہے ۔ میں اس خیال کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں کہنا چاہوں گا ۔ کیا وجہ ہے کہ جب دکن میں عادل شاہی اور قطب شاہی دور تھا ۔ شیعی تہذیب کا دور دورا تھا ۔ دربار سے لے کر بازار تک مرثئے کا چلن عام تھا، تمام شاعر مرثیہ گو پہلے تھے غزل گو بعد میں لیکن ایسا ابھرا ہوا ماحول انیس و دبیر جیسا شاعر پیدا نہ کر سکا ۔ انیس و دبیر لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہ بات بھی عجیب سی لگتی ہے کہ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری لکھنؤ کے اس دور میں بام عروج پر پہنچی جب لکھنؤ سے حکومت کا زوال ہو رہا تھا ۔ اودھ کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسے غروب ہوتے ہوئے ماحول میں بھی لکھنؤ کے شعرا خالص رومانی اور عشقیہ رنگ کی غزلیں کہہ رہے تھے ۔ معشوق کی نرگسی آنکھوں میں غرق، اس کی سیاہ زلفوں میں اسیر، ہجر میں بے قرار اور وصل میں سرشار تھے اور دوسری طرف خطۂ دہلی میں عین انہیں دنوں پورے زور و شور سے اصلاحی اور بیداری کی لہر پنپ رہی تھی ۔ سرسید، آزاد، شبلی حالی وغیرہ، صرف سماج میں ہی نہیں بلکہ ادب میں تبدیلیوں کا سیلاب لا رہے تھے اور اس کے بے رحم سماج کے سنگین مطالبات کے پیش نظر ایک انقلاب برپا کر رہے تھے تو ایسے میں لکھنؤ میں انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری اور لکھنوی غزل گو شعرا ایسی نرم و نازک، رنگین اور کنگھی چوٹی کی شاعری کیوں کر رہے تھے ۔ اس سب کا تجزیہ کیا جائے تو بڑی دلچسپ باتیں سامنے آ سکتی ہیں اور یہ بات بھی جا سکتی ہے

کہ انگریزوں کے خلاف سر اٹھانے اور ان کے ظلم و جبر
کی ننگی تلوار کو لٹکتا دیکھ کر دلی میں بیداری اور لکھنؤ
میں بے قراری کی شکلیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ دلی
کی بیداری نے تو آگے چل کر روشن خیالی اور سائنسی
خیالوں کی پوری ایک تحریک چلا دی لیکن لکھنؤ کی
بے قراری نے ان کی نوابی اور تہذیبی رویوں کے
پیش نظر کہیں فرار کی شکل میں حسن و عشق کی وادیوں
میں پہنچا دیا۔ اور کہیں پناہ کی شکل میں رسول اور
آل رسولؐ کے سائے میں پہنچا دیا۔

سماج کی ناگزیریت کے باوجود تخلیق عمل کی
یہ رنگارنگی اور بوالعجبی کبھی کبھی ناقابل فہم منزل پر
لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ کبھی یہ ہموار ماحول میں زبان کو
گنگ اور قلم کو خشک کر دیا کرتی ہے اور کبھی نا
ہمواری کے پرت در پرت سنگریزوں سے تخلیق
کے اکرے پھوٹتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہمواری اور
ناہمواری، تخلیق اور عدم تخلیق کے اس پیچ و خم
نے ہی ادب کو انفرادیت دے رکھی ہے اور عظمت
بھی۔ ایسی صورت میں کسی بھی صنف ادب کے بارے
میں کسی طرح کی پیشین گوئی یا امکانات کی باتیں کرنا
محض قیاس اور تلاش کی بات تو ہو سکتی ہے
حقیقت اور صداقت کی مہر مشکل سے لگ سکتی ہے۔
اور وہ بھی اردو غزل کے ساتھ کہ جس کی صنفی نزاکتیں
خود اپنے آپ میں بے مروت، بے رحم، نازک اور مشکلات
سے لبریز ہیں۔ جہاں قبول (Acceptence) ——
زیادہ رد (Rejection) کا خطرہ زیادہ بنا رہتا
ہے۔ جہاں نسیم صبح کے چھو جانے سے بھی رنگ کے میلے
ہو جانے کا خدشہ ہو وہاں نقد و نظر کے معاملات

اور بھی دقت طلب ہو جاتے ہیں۔ لیکن زندگی کی سچائیوں
کی اپنی ایک الگ نزاکت اور طاقت ہوا کرتی ہے۔
اور جب دو عظیم طاقتیں ملتی ہیں تو ٹکراؤ یقینی۔
بقول رابرٹ بلیک۔ "جب انسان اور پہاڑ ملتے ہیں
تو بہت کچھ واقع ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ
وقوعے ہوتا ہے جب انسان اور شاعری ملتے ہیں"
اردو کی نئی غزل کے امکانات کو غزل کی صنفی
نزاکتوں اور زندگی کی سفاک صداقتوں کے درمیان
تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اردو غزل جہاں اپنی لطافتوں و نزاکتوں
کی وجہ سے قبول خاص و عام ہوئی وہاں اس کی محدودیت
اور محبوبیت سے متعلق اس پر تنگ دامانی اور گردن
زدنی کے الزامات بھی لگائے گئے حالانکہ اردو
غزل نے اپنی پہلی غزل پر ہی اپنے آپ کو مخلص حسن و
عشق کے دائرے سے نکال کر صوفیانہ و حکیمانہ خیالات
سے مالا مال کیا۔ میر، سودا، درد وغیرہ کی شاعری اس
طرح کے خیالات سے بھری پڑی ہیں۔ غالب نے آگے
بڑھ کر فلسفۂ حیات اور اس کی مختلف افکار سے
اس کا دامن لبریز کیا اور غزل میں زندگی کے وہ
رنگ پیش کئے کہ غزل کے روایتی قارئین و شائقین
دنگ رہ گئے۔ اتنا سب کچھ کہنے کے باوجود غالب
کو یہ محسوس ہوتا رہا۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اور پھر جب ملک اور سماج پر ایک ایسا وقت آیا
جب غلامی سے بیزاری اور جنگ آزادی اپنے
عروج پر پہنچی اور پورے سماج میں قومیت او

سیاست کو مرکزیت حاصل ہوگئی تو باطنی احساسات کی بنیاد پر پرورش پانے والی غزل خارجی دباؤ، سیاسی جبر اور سماجی نشیب و فراز کی تاب نہ لاکر پس منظر میں چلی گئی۔ اقبال، چکبست، اکبر، جوش وغیرہ نے اگرچہ غزلیں بھی کہیں لیکن ان کی گرجتی چمکتی نظموں کے آگے خود ان کی غزلیں ہی نہیں بلکہ پوری اردو غزل لڑکھڑا گئی اور ایسا لگا کہ غزل کا عہد ختم ہوگیا اور غزل واقعی اپنی تنگ دامنی کا شکار ہوکر روپوش ہوگئی لیکن جب ترقی پسند شاعروں کا دور آیا اور اس عہد کے بعض شعراء بالخصوص فیض اور مجروح نے خارجی اور سیاسی موضوعات کو غزل کے نرم و نازک پیمانے میں اتارا بلکہ جذب و پیوست کیا اور غزل کی تعظیم و تکریم کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے پہلی بار براہ راست سیاست سے اس کا رشتہ جوڑ دیا تو غزل کی وسعت قلبی۔ فراخدلی اور وسیع داماتی کو دیکھ کر سبھی دنگ رہ گئے۔ جب مجروح نے کہا۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے، اسی بانکپن کے ساتھ

تو غزل میں یہ سیاسی کجلاہی واقعی پورے بانکپن کے ساتھ سمائی اور تمام فرسودہ روایتی الزامات پر پانی بھی پھر گیا۔ ہر چند کہ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا اور غزل کے لئے بڑا نازک دور لیکن فیض، مجروح جذبی، مجاز، سردار جعفری وغیرہ کی گراں قدر غزلیہ شاعری سے یہ مشکل مرحلہ بہ آسان طے ہوا اور غزل کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جہاں سے اُردو غزل کے مختلف رنگ (shaaes) دیکھے جا سکتے ہیں۔

انگریز رخصت ہوئے، ملک آزاد ہوا تو ہندوستانی عوام نے پیر پھیلائے۔ ایک بے مقصد اور غیر منظم زندگی سامنے آئی۔ معاشرہ لڑکھڑایا تو غزل بھی بہک گئی۔ علامتی غزل، آزاد غزل اور کل ملاکر جدید غزل اور اب تو ابہام اور اشکال سے بھرا یہ دور بھی رخصت ہوا لیکن جو دور زیادہ اپنے سابقہ دور سے زیادہ پیچیدہ اور سفاک نکلا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ بے مقصد اور بے لگام حرص و ہوس کی زندگی کا جو انجام ہونا تھا وہ ہوا۔ ترقی و تبدیلی کے نام پر اس دنیا میں پہنچ گئے جہاں بے باکانہ جرائم بے محابانہ سیاست کے غلام ہیں، بے رحم فرقہ واریت مذہبی تقدس کی بیڑیوں میں قید۔ دفتروں میں بدعنوانی اور رشوت ستانی، علم و انصاف کے اداروں پر بے اطمینانی، جھوٹ، دھوکا، مکر و فریب اور پورے سماج میں لاقانونیت اور ان سب پر حاوی تشدد۔ تشدد اور تشدد ــــ اس بارودی ماحول میں انسانیت روپوش، انسانی قدریں، پارہ پارہ۔ شرافت، اخلاق، وفاداری، قصۂ پارینہ، اصول آدرش داستانوں خیالات اور بھی بہت کچھ جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ صرف واقف ہی نہیں بلکہ براہ راست جھیل رہے ہیں۔ بھوگ رہے ہیں۔ ان سب کے درمیان جن چیزوں نے سب سے زیادہ اپنی اہمیت کھوئی ہے وہ ہے انسان کی انسانیت اور اس کا سب سے بڑا ہتھیار، قلم اور لفظ کی عظمت و حرمت ــ ماضی میں کبھی، انقلاب کی حامل ہوئی انسانوں کی صف کے صف صاف کردی گئی، قتل و غارتگری کے بازار گرم ہوئے

لیکن اس بدلی میں بھی سورج چمکا، انقلابی و
احتجاجی شاعری ہوئی الفاظ کی حرمت اور شاعری
کی عظمت نے اپنا اثر دکھایا۔ آزادی تقسیم ہند،
فرقہ واریت کے عین درمیان اعلیٰ ادب تخلیق ہوا
اور اس کا جادو بھی چلا جس پر آج بھی لوگ سر
دھنتے ہیں اور یہ عجیب بات بھی ہے کہ اچھا ادب
عام طور پر مشکلات ([illegible]) میں ہی پیدا
ہوتا ہے ایسی مشکلات کہ جن کے حل کرنے اور جن
سے ٹکرا جانے کا ایک بڑا مشن نظروں کے
سامنے ہو۔ فکر کی سالمیت اور قلم کی خلاقیت
اور مقصد کی انفرادیت غم زدہ ماحول میں جوش و
جذبہ بھر دیتی ہے جس سے بڑے ادب کی تخلیق
ہوا کرتی ہے۔ لیکن جہاں ایسا نہ ہو، زندگی کا
کوئی مقصد نہ ہو۔ فکر ساکت و جامد ہو۔ سماج
میں انتشار ہو اور پورا ملک ایک مکروہ سیاست
کا ننگا کھیل کھیل رہا ہو۔ آدرشوں پر زرگری کا قبضہ
ہو، قلم، شہر کی گرفت میں ہو۔ تخلیق اپنی نشر و
اشاعت اظہار و ابلاغ کے لئے سرمایہ داروں
کا منہ تک رہی ہو، لفظوں کا کاروبار ہو رہا ہو،
دھرم کے نام پر انسانوں کا قتل کیا جا رہا ہو، زبان
تہذیب کے حوالے سے نفرتوں کی دیواریں کھڑی کی
جا رہی ہوں، تو مشن، رجحان، ذہن، قلم وغیرہ کا
گمراہ ہو جانا یا منتشر ہو جانا کوئی غیر فطری حیرت
انگیز نہیں۔ لیکن شاعری تو پھر بھی ہو رہی ہے
ادب پھر بھی تخلیق کیا جا رہا ہے [illegible]
ضرورتاً بھی۔ کچھ کہا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ [illegible]
تو ہیں جو [illegible] چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ آ سیئے

ان چراغوں کی کپکپاہٹ اور سرسراہٹ کا سرسری
جائزہ لیں۔ شاید کوئی امید کی لو ہمارے ہاتھ
آجائے۔ لیکن پہلے ترقی پسند شاعر علی سردار
جعفری کی تازہ غزل کا ایک شعر پیش کر کے چلیں ؎

جب سے انسان کی عظمت پہ زوال آیا ہے
ہر اک بت کو یہ دعویٰ کہ خدا ہو جیسے

اور ایک بالکل نئے شاعر نے اپنے انداز میں
یوں کہا ؎

گھر سے چلو تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے
کیا جانے کون پیٹھ میں خنجر اتار دے

اسلم الہ آبادی

ایسی نازک، پیچیدہ اور سنگین صورتحال میں
اور ایسی شکستہ اور بکھری ہوئی صورتوں میں سب سے
پہلے انسان کو اپنے وجود کا احساس اور اپنے تحفظ
کا جذبہ بیدار ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اردو کی نئی غزل
میں اکثر و بیشتر اپنی ذات کی فکر۔ اپنے وجود اور اس
کے بقا و فنا کے سلسلے کہیں فطری، کہیں منطقی اور
کہیں فلسفیانہ انداز میں بکھرے پڑے ہیں کہیں کہیں
یہ خیال اپنی ذات کے اندر ان میں ڈوب جانے پر مجبور
کر دیتا ہے اور کہیں کہیں احباب کے دھوکے، اقربا
کے فریب، اپنوں کی بیگانگی۔ غرض کہ انسانی
رشتوں کی شکستہ حالی اور اس کے ارد گرد شاعر
کو پہنچا دیتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؎

[illegible]
[illegible]

عشرت ظفر

نہ دوستوں کی طرح ہے نہ دشمنوں کی طرح

یہ کون لوگ صفِ دوستاں میں آنے لگے

——— اکبر حمیدی

یہ کن عجیب زمانوں میں جی رہا ہوں میں
کہاں گئی مری آنکھوں کی روشنی ساری

——— اسعد بدایونی

یہ تجربہ بھی عجب ہے کہ اپنے آپ سے میں
کوئی سوال کروں اور اداس ہو جاؤں

——— رئیس منظر

میں آدمی ہوں مجھے آدمی نے گھاؤ دیئے
کسی چٹان میں کیسے شگاف ہوتا ہے

——— شاہد کلیم

قصرِ خواب ہوں حاصل نہیں کوئی میرا
ایسا مقتول کہ قاتل نہیں کوئی میرا

——— عین تابش

ان تمام صورتوں اور بدحالیوں سے سماج کی جو اوپر اوپر کی فضا بن رہی ہے اس نے سماجی ماحول۔ اصول و ضوابط ــ نظم و ضبط سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا ہے ــ خیر پر شر، حق پر باطل کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔ دھوکہ فریب، آج کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ سچائی، سادگی، ایمانداری، حقیقت پسندی سب دم توڑ رہی ہے۔ اس پر اقتصادی بدحالی، اخلاقی پامالی، مستقبل سے فکر مندی، قتل و غارتگری، علیحدگی پسندی اور دیگر سماجی اتھل پتھل [illegible] منعقی رہی ہیں، نئی طبقاتی کشمکش یا طبقوں کی نئی [illegible] اس پر پورے سماج [illegible] کمرشلائزیشن۔ ان سب سے مل کر نئے سماج کی جو تصویر ابھاری ہے وہ بڑی ہی عجیب و غریب ہے جس میں بس یہ [illegible] ہے کہ تحت [illegible]

کی پامالی اس دور کا مقدر بن چکی ہے باقی سب دھندلا دھندلا ہے۔ اس واضح اور غیر واضح سماج کی جو ملی جلی تصویروں کا عکس آپ کو اردو کی نئی غزل میں صاف جھلکتا دکھائی دے گا۔ چند اشعار اسی قسم کے بھی دیکھئے

ہمارے عہد کا ہر شخص بے تدبیر ہے شاید
نظر میں دُھند ہے پیروں میں بھی زنجیر ہے شاید

——— شاہد کلیم

جو تیرے شہر میں مجھ سے ملی ہے بے پردہ
وہ دوستی ہے مگر کاروبار کرتی ہے

——— نظام الدین نظام

اب تو اس شہر میں جینے کا مزہ ہی نہ رہا
اب تو قاتل بھی کرائے کے ہیں سازش ہے نہیں

——— نظام الدین نظام

کون نکلے گھر سے باہر کون دیکھے کیا ہوا
میرا ہمسایہ ہے خود میری طرح سہما ہوا

——— رئیس منظر

گھیرے ہوئے ہیں ہم کو مسائل زمین کے
ہم سے تو آسماں کی دعا لی نہ جائے گی

——— عطاء الرحمٰن طارق

زمیں کے اور تقاضے فلک کے کچھ اور کچھ
قلم بھی چپ ہے کہ اب موڑ لے کہانی کیا

——— عذرا پروین

لہو کی آگ میں جلتی ہیں حسرتیں کیا کیا
ہمارے ساتھ لگی ہیں ضرورتیں کیا کیا

——— شبیر آصف

ذہانتوں کو کہاں وقت خوں بہانے کا
ہمارے شہر میں کردار قتل ہوتے ہیں (اطہر عباسی)

راتوں کے گہرے سناٹے اب شاموں سے چھا جاتے ہیں
ہو کا عالم ہے بستی میں باتیں کرتا کوئی نہیں

اسعد بدایونی

بے سباتی۔ بے کسی بے ساز و سامانی بھی ہے
پھر بھی جیتے ہیں کہ ہر مشکل کو آسانی بھی ہے

نسیم صدیقی

حال کی بدحالی، بے چینی، افراتفری، تاریک مستقبل کا شدید احساس۔ تمام اندازۂ روایات کی شکستگی اور موجودہ دور کا بے ہنگم شور۔ کل ملا کر حال کرب و بے چینی کا استعارہ بن کر رہ گیا چنانچہ ایسے میں ماضی کی یاد اور اس کی بازیافت اہم جزو بن کر ابھری اور اردو کی نئی شاعری کی رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ ماضی کی یہ یاد کہیں خیالات کا سرچشمہ بنتی ہے تو اکثر غزلوں کی نئی تشکیل کی ذمہ دار بھی ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ کہیں یہ واقعہ کربلا کی طرف لے جاتی ہے تو کہیں اسرافیل، سلیمان، آدم زاد، سراب اور اندھے کنویں کی طرف لے جاتی ہے۔ واقعہ کربلا سے متعلق پروفیسر سید محمد عقیل اپنی کتاب غزل کے نئے جہات میں لکھتے ہیں:

"ایک ذہنی انتشار و بے یقینی اور دربدری کے احساس کے ساتھ معلوم نہیں کہاں سے واقعہ کربلا کی اشاریت اور مظلومیت، کبھی تیزی سے داخل ہو رہی ہے۔ میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ نئی غزل میں یہ کیفیت کہاں سے دبے پاؤں داخل ہوئی۔ بظاہر تو کوئی بیرونی دباؤ نہیں معلوم ہوتا نہ اس کیفیت میں تفاخر ہے نہ اعلان، نہ ترقی پسند دور کی للکار، حالات میں لپٹے ہوئے ان لوگوں میں جو کربلا کی اشاریت فرات، نوک سناں پر سر اور جھوٹے خون کی باتیں ملتی ہیں ان میں ایک طرح کی خود کلامی ہے بس اپنے دل سے باتیں کرنے یا اصلاح کرنے کی صورت ہے۔ مظلومیت ابھرتی ہے۔ اور نہ کسی مخالف کے ظلم کا اعلان، نہ انصاف نہ ملنے کی شکایت، بس جو کچھ مختصر سا شاعر کے ذہن میں موجود ہے اس کا اظہار وہ اپنے اشعار میں کر رہا ہے۔"

(ص ۱۵۴)

اردو کی نئی غزل میں واقعہ کربلا کی اشاریت یا بطور استعارہ اس کا استعمال ان دنوں کثرت سے ہو رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ایک لمبی بحث ہو سکتی ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصراً اسے یوں سمجھتے چلیں کہ واقعہ کربلا کی اشاریت میں اگر ایک طرف آج کی لاچاری اور مظلومیت سے رشتہ جوڑنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف انسانی و اخلاقی قدروں کے حوالے سے شر پر غالب آنے کی ایک موہوم سی صورت یا پھر سیدھی سی یہ بات ہو سکتی ہے کہ وہ آج کے رنج و غم کو غم امام حسینؑ سے وابستہ کر کے قدرے راحت و تسلی کی تلاش ہے۔ یا پھر کچھ نیا پن بس اس سے زیادہ بات بنتی نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ نئی غزل میں کہیں کہیں یہ ایک اچھا اور نیا پہلو ابھر کر آیا [illegible] کیفیت اور معنویت کی ایک نئی دنیا تلاش [illegible] ہے:

تمام وسعت صحرائے تشنگی میری
تمام سلسلہ دجلہ و فرات مرا

عشرت ظفر

یہ جو بکنے کے لئے رکھیں بازاروں میں

انہیں کاسوں میں کسی دن مرا سر بھی ہوگا

——— اختر لکھنوی

آج کوفے کے بازار میں ہیں
چادریں پھٹ گئیں جیسے سر سے

——— مس پنہاں

مجھ کو لاکھوں کی نہیں چاہت بہتر چاہیے
جو خدا کی راہ میں کٹ جائے وہ سر چاہیے

——— عتیق الہ آبادی

اردو کی نئی غزل میں ماضی کا تعلق ایک یاد کی شکل میں بھی ظاہر ہو رہا ہے اور بڑے کسک بھرے انداز میں۔ اچھے اور گذرے ہوئے لمحات کی یاد، صحت مند قدروں کی یاد رشتوں اور وفاؤں کی یاد — غزل میں یہ سب کچھ کہیں کہیں بڑے پرکشش انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔

راستو کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے اداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

——— اظہر عنایتی

چراغ روشنی لیتے جن کی صورت سے
وہ لوگ خاک ہوئے درد کی نہایت سے

——— توصیف

ایسے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

——— اظہر عنایتی

ماضی کی یہ کسک شاعری کا ایک حصہ تو ہے لیکن بڑا حصہ نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ نئی غزل میں کوئی بھی خیال، کوئی بھی احساس شاعری کا بڑا حصہ بن کر نہیں ابھرتا اگر یہ ان نئی غزلوں میں حالیہ سماج کی ایک ... وتیز اشتہا ... میں ہیں اگر ایک طرف خوف اور دھوپ کا جبنی ہے تو دوسری طرف روایتی طور پر بھی حسن وجمال کی شبنمی ٹھنڈک ہے حسن وعشق کے روایتی اذکار، لیکن مختلف پیرایہ اظہار کے ساتھ اس لئے نئے درد کی تمام اشیاء کے ساتھ ساتھ عشق بھی نیا اور اس کے انداز بھی نئے کہ جمالیہ کا تصور بہرحال اقتصادیات اور معاشیات سے براہ راست وابستہ رہتا ہے اور ساتھ ساتھ تاریخ اور جغرافیہ سے بھی ایسی ہنگامیت میں قلب اور واردات قلب کا ذکر طرح طرح سے کیا گیا ہے لیکن تمام ذکر بس رُکے رُکے اور ڈرے سہمے ہیں۔ چند اشعار اس رنگ کے بھی دیکھئے ؎

دھوپ اتنی تھی کہ جلتے ہیں گلابوں کے بدن
قہر اتنا ہے کہ ہونٹوں پہ سجے ہیں کانٹے

——— نیاز حسن

ہوا کے ہاتھ بھی پیغام وہ اگر بھیجے
خیال بن کے بھی اس کے مگر نہ جاؤں گا

——— انور محمود

ہجر کے صحرا میں تیری یاد کا کتنا غبار
اک مسافر بے سر و ساماں رہتا میرا دل

——— شہباز نقوی

اکثر تیری یادیں ہی اپنا سرمایہ ہوتی ہیں
اکثر تیری یادوں سے ہم کترانے لگتے ہیں

——— شعیب نظام

اب کسی پاؤں کی آہٹ بھی نہیں آتی ہے
چھپ گئے میرے غزالان سبک گام کہاں

——— اصغر مہدی ہوش

حسن وعشق، درد و کرب کے درمیان سے نکلتی ہوئی

یہ رہا نئی شاعری کا کون سا جمالیاتی تصور و تغزل پیش کرے گی۔ ابھی سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ پروفیسر عقیل صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا — شاید نئی نسل کے پاس تغزل کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ صرف معشوقہ کے حوالوں سے اپنی بات اور اپنی زندگی ہم لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔"

میں نے اپنے اس مختصر سے مضمون کو صرف ہندوستان کی شاعری تک محدود رکھا ہے۔ پاکستان میں ہونے والی شاعری اس کے علاوہ امریکہ، کناڈا، لندن وغیرہ کی اردو غزل کا ذکر نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے دربدری۔ بے گھری، ہجرت جیسے موضوعات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور نہ ہی غزل کی زبان اور ڈکشن کے بارے میں لب کشائی کی ہے۔ حالانکہ جدید دور کی نئی نئی اصطلاحیں، لفظیات۔ محاورات، ہندی انگریزی کے الفاظ جس طرح اردو غزل میں شامل و داخل ہوچکے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے نئی غزل کا لسانی و اسلوبیاتی مطالعہ ایک اچھا اور معنی خیز مطالعہ ہوسکتا ہے اس کے علاوہ شاعرات کی غزل گوئی کا بھی ایک اچھا رخ تلاش کیا جاسکتا ہے بہرحال متذکرہ بالا سمتوں میں رواں دواں اردو کی نئی غزل جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ کسی مخصوص سمت کا یقین نہیں کرتی۔ غزل میں ویسے بھی پروجیکشن کے امکانات کم ہوتے ہیں بس ایک اشاریہ ہی تیار کیا جاسکتا ہے۔ کسی مخصوص سفر اور راہ کی طرف مشکل سے ہی اشارہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے اندیشہ اور امکانات پر حتمی باتیں کی جاسکتی ہیں۔

آخر میں ایک سوال ضرور اٹھانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جدید دور میں اتنے کرب و درد و ستم، تنہائی و ویرانی، لاچاری و بے بسی، حبس اور گھٹن کے باوجود نئی غزل میں بے چینی و بے کسی کی لہر تو ہے لیکن احتجاج کی گونج نہیں۔ احتجاج تو درکنار مزاحمت بھی نہیں ہے۔ اور حد یہ ہے کہ اسلوب میں وہ روائتی شکوہ شکایت بھی نہیں ہے جس سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ معشوق کے جور و ستم کی شکایت۔ شیخ و ناصح کی شکایت، آسمان کی چشم بد اور فریب تقدیر کی شکایت۔ نئی غزل سے روائتی شکایت کا چلن کیا روٹھا۔ مزاحمت کا لہجہ ہی روٹھ گیا۔ جب کہ ایسے حالات میں نئی غزل کا مزاحمتی لہجہ اس کا ایک اہم لہجہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ پاکستان کی شاعری کا ہے۔ لیکن شاید ایسا نہ ہونے میں وہاں کی فوجی حکومت اور یہاں کی جمہوریت کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا لہجہ عام نہ ہونے سے اردو کی نئی غزل سیدھے معاشرہ و قوم سے رشتہ نہ جوڑ کر شاعر کی شخصیت کے حوالے سے سامنے آتی ہے اگرچہ اس میں تنوع ہے اور انفرادیت بھی۔ اگرچہ یہ لہجہ ترقی پسند غزلوں کی طرح ٹھوس اور مضبوط تو نہیں لیکن اس سے مختلف اور منفرد ضرور ہے۔

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ
پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ گیا سے
شائع کیا

نسیم احمد نسیم
کالی باغ، بتیا

بہار کی کہانیوں پر علاقائی اثرات

بہار میں لکھے جانے والے افسانوں پر یہاں کے رسم و رواج، بول چال اور رہن سہن کی چھاپ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دوسرے صوبے کے افسانہ نگاروں کے یہاں مثلاً راجندر سنگھ بیدی کے یہاں پنجاب کے بول چال اور رسم و رواج کی جھلک ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے یہاں بھی علاقائی زبان کے اثرات وافر مقدار میں دیکھ سکتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں تو اودھی کے بیشتر جملے، گیت اور کہاوتیں دکھائی دیتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے یہاں یوپی کے متوسط مسلم گھرانوں کے ایک طبقے کی زبان اور اُن کا لب و لہجہ جگہ بہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے وہ افسانے جنہیں بمبئی میں رہ کر انہوں نے لکھے۔ ان میں واضح طور پر اس علاقے کی زبان اور رہن سہن کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ غیاث احمد گدی، سلام بن رزاق اور علی امام نقوی کے علاوہ کئی دوسرے ادیبوں کے یہاں بھی بمبئی کی مخصوص زبان کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ حیدرآبادی (دکنی) زبان کی مٹھاس ہم ادب میں جابجا محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دہلوی زبان کی تابانی بھی اکثر مشاہیر کے یہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ بقول "احمد بدر" خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی اور شاہد احمد، دہلوی وغیرہ کی تحریروں میں دہلوی زبان اور وہاں کے مخصوص محاورات کی عکاسی ہوئی ہے۔

بہار میں اردو ہندی کے علاوہ کئی زبانیں الگ الگ علاقوں میں کثرت سے بولی جاتی ہیں — بھوجپوری، میتھلی، مگہی، پہاڑی وغیرہ۔ یہاں کے افسانوں پر زیادہ تر ہندی، بھوجپوری اور مگہی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں تھارو، آدی باسی اور دوسرے ٹرائبلس کثیر تعداد میں رہتے ہیں ان کے متعلق ہندی میں بہت سے مواد مل جاتا ہے۔ اردو کے چند ہی ادیبوں نے جیسے سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی اور

غیاث احمد گدی کو رکھ سکتے ہیں۔ جنہوں نے جنوبی بہار کے آدی باسیوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں میں چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ کے پسماندہ علاقے کی جھلک بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ بقول وہاب اشرفی، انہوں نے چھوٹا ناگپور کے پس منظر پر ایک بسیط ناول لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ان کی اچانک موت کے بعد اس ناول کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اختر اور ینوی نے اپنے افسانہ "حسرت تعمیر" میں چھوٹا ناگپور کے پچھڑے لوگوں کی زندگی کو بھرپور طریقے سے منعکس کیا ہے۔

شین مظفر پوری شمالی بہار کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے ان کی بیشتر کہانیوں میں شمالی بہار کی زبان اور رہن سہن کی جھلک نظر آتی ہے۔ احمد یوسف، شفیع مشہدی اور حسین الحق کے یہاں مگہی کے اثرات ملتے ہیں۔ احمد یوسف نے اپنی کہانی "لالٹین کی روشنی" میں ایک مگہی گیت کو شامل کیا ہے۔ قیوم خضر نے گیا کے گرد و نواح میں رائج خالص علاقائی زبان میں کئی کہانیاں لکھی ہیں جو سہیل (گیا) میں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ایک کہانی "چچا علی حسن" ہے اس کہانی میں جو زبان استعمال ہوئی ہے۔ اسے قیوم خضر نے "بہاری الفاظ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ پیش ہیں کچھ اقتباسات:-

"چچا علی حسن بچپن سے ہی بڑے نٹکھٹ (شریر) تھے۔ جوانی آئی تو اور بھی شہپٹ (بد کردار) ہوئے۔ دھن کٹی (دھان کوٹنے کی مل) کی آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ بھی دولت کی فراوانی تھی۔ کوٹھیوں کی تاک جھانک کا چسکا لگ گیا اس زمانے میں گیا کی گنڈئی مشہور تھی۔ جبیا (گیا شہر کی معروف بہادر شخصیت) کھلیفہ (خلیفہ) کا طوطی بولتا تھا۔ چچا علی حسن بھی اس کے چیلے تھے...... گیا چوک میں گھنٹہ گھر کے نکٹ (نزدیک) منت بھڑوے کا کوٹھا۔ اس کی دو بیٹیاں بڑی حسرت اور چھوٹی عشمت بلا کی ٹمیل (متوازن اور گٹھی بدن والی) تھیں..........

گیا جی کے گیوال، لونڈے بھی نِتّہ دن (ہر دن)، بیریا ڈوبے (سورج ڈوبنے کے فوراً بعد) گھروں سے گلہا دبا ہوا کرتا چنٹس بھری ہوئی دھوتیاں باندھے اپنی اپنی چھاچم ٹمٹموں پر نکلتے۔"

لوگوں کو منت کی یہ ٹھاٹ کھلتی تو ضرور تھی۔ مگر کون کیا کہے۔ مگر ایک دن ہوا یہ کہ شہر کے مشہور بانکے درباری خلیفہ اس کے کوٹھے پر چڑھ گئے اور منت سے بولے" ارے بھڑوے کی اولاد بھڑوا، منہ جلا۔ تے (تم) اپنے آپ کو کا (کیا) سمجھتا ہے...... ہم تیرے سے پوچھتے ہیں کہ تنکو (تھوڑا بھی) یہ ٹھاٹ باٹ تورا (تمہیں) سہاوت ہیں۔

اس کے علاوہ ٹھیٹھ سیٹھی کا خاص لب و لہجہ بھی کئی ادیبوں کی تخلیقات میں دکھائی دیتا ہے جیسے۔

" بول تو سرے ایسے رہے ہیں جیسے
دودھے نہ ملا کبھی "

بعض ادیبوں نے یہاں کے دیہاتوں کو Topography بھی موثر ڈھنگ سے پیش کی ہے اور بہار کے ہزاروں گاؤں کی تصویر کشی نمایاں طور پر

منادی

س. الضاف، بمبئی

ابابیلوں کا لشکر لے کے نکلیں
قبا، دستار، بگلوں کی قطاریں
نگر کی شاہراہوں، گاؤں کی پگڈنڈیوں پر
نمایاں سبزۂ خودرو کی مانند
سیاست کی چھتوں کے زیر سایہ
شریعت کی دکانیں
مقرر، نعرۂ تکبیر، تالی
بیاں شعلہ فشاں، آواز بجلی
رگوں میں خون کا طوفانِ نوح
کشتی ندارت
دلوں میں جوشِ سرفروشی
نگاہوں میں حقارت
اندھیرا تھا، دھواں تھا، الجھنیں تھیں
اور اس پر دھوپ کے چشمے لگے تھے
لہو سے سرخ دھرتی چیختی، تاکید کرتی
کسے فرصت کہ کوئی کان دھرتا
مری جھلسی ہوئی آنکھوں نے دیکھا
خدا کا گھر بچانے کا تھا دعویٰ
بچا پائے نہ میرا جھونپڑا بھی
منادی پھر الکشن کی ہوئی ہے
نگر کی شاہراہوں
گاؤں کی پگڈنڈیوں پر
سیاست کی چھتوں کے زیر سایہ
شریعت کی دکانیں
پھر اپنے گاہکوں کی منتظر ہیں
لہو سے سرخ دھرتی چیختی ہے

(دہرہ)

زلزلے اس وقت آتے ہیں

نذیر فتح پوری، پونہ

صدی اپنے گناہوں کا سفر جب ختم کرتی ہے
درختوں پر عذابوں کے پرندے پھڑپھڑاتے ہیں
مخالف جب ہوا چلتی ہے پتے ٹوٹ جاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

فسادی موت کا جب شنکھ دھرتی پر بجاتے ہیں
نہتوں پر محافظ گولیاں جس دم چلاتے ہیں
برہنہ کر کے تہذیبوں کو جب سڑکوں پہ لاتے ہیں
انا کی عصمتوں کے جب کھلونے توڑے جاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

خود اپنے ہاتھ سے گلچیں مسل دیتا ہے کلیوں کو
مٹا دیتا ہے جب وہ صفحۂ ہستی سے پھولوں کو
ٹھکانے پنچھیوں کے باغباں جب خود جلاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

بشر کی سجدہ گاہوں کو کھنڈر کرتا ہے جب شیطاں
عنانِ رہبری جب قاتلوں کے ہاتھ آتی ہے
[illegible] کے ایوانوں میں، تلوار سیاست سے
عقائد کے گلے جب دن دہاڑے کاٹے جاتے ہیں
ہماری بستیوں میں زلزلے اس وقت آتے ہیں

(دہرہ)

پانچ نظمیں

منصور اعجاز
الیوت محل

ہماری بوڑھی بزرگ آنکھیں
نہ دیکھ پائیں گی ایسے منظر
ہمارے بچوں کو دیکھنا ہے
یا ــــ صاف لہجے میں بولنا ہے
کہ ظلم اب حد سے بڑھ چکا ہے
رکو ــــ!
رکو، نہیں تو اب اس کے آگے
نہ تم رہو گے نہ ظلم ہوگا۔

●

جور و ظلم کی اک معیاد
اللہ سب کا سب کے ساتھ
اس کی لاٹھی بے آواز

●

عجیب جذبہ ہے عشق کا بھی
جنون ہے یہ کہ ہے عبادت
وہ میرے ہاتھوں میں پانی پانی
لہو لہو ــــ اس کی چشم تر میں
وجود میرا۔

●

تنہائی میں
دکھ میں سکھ میں
کوئی ساتھ نہیں ہوتا جب
رب ہوتا ہے، میں ہوتا ہوں
میں اس سے باتیں کرتا ہوں

●

اپنی ذات سے اونچا اٹھ کر
کوئی تو ایسا پیڑ لگائے
آنے والی نسل کو جس سے
راحت اور تہذیب ملے

نازؔ صہبائی

گڑگاؤں، ہریانہ

غزلیں

یہی وقعت ہے اک مزدور کی دیوان خانوں میں
محل تعمیر کرتا ہے جگہ ہے پائدانوں میں

نکل کر خواب گاہوں سے کبھی حال انکا پوچھا ہے
بھری برسات میں سوتے ہیں جو کچے مکانوں میں

بچا کر بھی کہاں آخر کوئی اپنے قدم رکھے
کہ سبزے پر ہوئے ہیں خار قابض گلستانوں میں

بھلا جائیں گے وہ طائر کبھی کیا اونچی اڑانوں پر
کہ دل جن کا پڑا رہتا ہے ہر دم آشیانوں میں

کچھ ایسے لوگ ہیں جن میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی
سجے رہتے ہیں نقلی پھول سے وہ پھول دانوں میں

زمیں پر ہی اگر تولا کیے اپنے پروں کو ہم
ہماری ہو چکی پرواز پھر تو آسمانوں میں

اگر حسنِ نظر ہو نازؔ تو کچھ بھی نہیں مشکل
نظر آئے گی منزل رہگذر ہی کے نشانوں میں

یہ کیا ہوا کہ آپ کے تیور بدل گئے
آیا جو میں قریب تو منظر بدل گئے

مدت کے بعد آئے جو اپنوں کے شہر میں
دیکھا تو ان کے طور ہی یکسر بدل گئے

صدیوں کے بعد بھی وہی اندازِ عشق ہیں
بس حسنِ انتخاب کے محور بدل گئے

ورنہ بگڑتا کام نہ بنتا ہوا کبھی
باتیں جو کیں اصول کی افسر بدل گئے

جو دوستی کا دم بھرا کرتے تھے رات دن
وہ دوست وقت پڑنے پہ اکثر بدل گئے

دنیائے جور میں یہ ہوا طرفہ انقلاب
مقتل بدل گئے، کہیں خنجر بدل گئے

بدلیں ہیں ساتھ وقت کے یوں فتنہ سازیاں
پتھر بدل گئے تو کبھی سر بدل گئے

چاہا کبھی کہ غم سے ملے نازؔ کو نجات
حالاتِ راہ و رسم ہی اکثر بدل گئے

غزلیں

نسیم شاہجہاں پوری
تارین جلال نگر، شاہجہانپور

جب کیا تجھ سے محبت کا ارادہ ہوگا
تم نے کیا کیا مرے بارے میں نہ سوچا ہوگا

حسن پر اپنے یقیں پھر تمہیں آیا ہوگا
خود کو جب میری نگاہوں سے بھی دیکھا ہوگا

زندگی! تجھ کو فراموش نہیں کر سکتا
تیری خاطر مجھے مرنا بھی گوارا ہوگا

وسعت ساقی سے کوئی جام عطا ہو کہ نہ ہو
ہم وہ میکش ہیں کہ ہم سے نہ تقاضا ہوگا

منزلِ عرضِ تمنا سے بہت گزرے ہم
اب تو ہر مرحلہ ترک تمنا ہوگا

آپ کو حوصلۂ ترک تعلق نہ رہا
اس سے کیا بحث! کوئی جان سے گزرا ہوگا

شمع کا کوئی بھروسہ نہیں محفل میں نسیم
اپنی ہی آگ میں پروانوں کو جلنا ہوگا

ظفر صہبائی
موتیا پارک۔ بھوپال

اے ہمسفر یہ راہبری کا گمان چھوڑ
کس نے کہا ہے تجھ سے قدم کے نشاں چھوڑ

پھر دیکھ زندگی کے مزے تجربوں کے رنگ
باہر قدم نکال ذرا سائبان چھوڑ

اب دوستی نہیں نہ سہی، دشمنی سہی
کوئی تو رابطے کی کڑی درمیان چھوڑ

اس کی وفائیں صرف ہواؤں کے ساتھ ہیں
یہ اعتمادِ دوستی بادبان چھوڑ

تلوار کی زبان سمجھنے لگے ہیں لوگ
اب یہ مہاتماؤں کا طرزِ بیان چھوڑ

تیرے جو سرپرست تھے کب کے چلے گئے
فرقہ پرستی تو بھی یہ ہندوستان چھوڑ

ہاتھی جو بک رہے ہیں وہ سرکس کے شیر ہیں
مردہ ہوا یہ دہشت شکاری مچان چھوڑ

غزلیں

انور شمیم
سمستی پور

جسم کی خاطر، تو تھے دریا بہت
روح تشنہ تھی، رہی تشنہ بہت

عشق تھا، یا تھی ہوس سوچا نہیں
صرف اتنا کہ اسے چاہا بہت

ٹوٹنے والے تھے، ٹوٹے خواب سب
دیر تک بچوں سا میں رویا بہت

ہاتھ تو آیا نہیں، کوئی سرا
ڈور سلجھاتے میں خود الجھا بہت

بات سچی تھی، مگر کڑوی لگی
تلخ تھا شاید میرا لہجہ بہت

کس کو کس چہرے سے میں پہچانتا
اور چہرے تھے، پس چہرہ بہت

بیچ سے رشتے سبھی غائب ہوئے
صرف ہے اب شور نقارہ بہت

چھڑکر تم ریت، دریا لاؤ گے
سن رہے ہیں کب سے بس خطبہ بہت

قرب میں تیرے، یہ اور اچھی لگی
خوبصورت یوں، تو تھی دنیا بہت

ایک تشنہ دہا، سیلو تو نا شمیم
کھا چکے ہر دوست سے دھوکا بہت

شاہد اختر
سہسرام (بہار)

بہت دنوں سے طبیعت علیل بھی نہ رہی
بچھڑ کے جینے کی تم سے سبیل بھی نہ رہی

ہماری راہ میں ساحل کی ریت روشن ہے
سمندروں کی رفاقت میں جھیل بھی نہ رہی

نہ کوئی حادثہ گزرا نہ ہم بہت چونکے
مرے سفر کی کہانی طویل بھی نہ رہی

بہت سنبھال کے ہم لوگ اس کو رکھ لیتے
ترے وصال کی ساعت قلیل بھی نہ رہی

وہ اپنے شہر نایاب کون دیکھے گا
شجر کی شاخ پہ اب کوئی چیل بھی نہ رہی

اختر بانو ناز
پربھنی (مہاراشٹر)

ان سے جب بھی مصالحت کرنا
پیش داغِ مفارقت کرنا

مدعا ہم سمجھ ہی جائیں گے
خط میں تم صرف دستخط کرنا

دل اگر فاصلہ کرے گا طے
تم نہ پھر کچھ مزاحمت کرنا

آگ میں آبشار ٹھہرے تو
دیکھے جذبوں کو برف مت کرنا

عکس کی جستجو میں رہنا ہی
خود کو بے آئینہ صفت کرنا

کچھ تو رشتے ہمیں نبھانا تھے
اور کچھ تھا مصالحت کرنا

جھوٹ کو سب نے جب سراہا تھا
تب سر آیا واقفیت کرنا

طالب عفو ہوں ناز سے وہ
چاہتا کہ ہوا بہت انا

غزلیں

مجاز نوری

دربھنگہ، (بہار)

ایک دن درد دل کی دوا لیں گے ہم
اے مسیحا تجھے آزما لیں گے ہم
اک نہ اک رات کو ماہتاب آئے گا
دل ہے ویراں تو کیا سجا لیں گے ہم
چارہ گر تیری ہمدردیاں خار ہیں
شدتِ درد میں مسکرا لیں گے ہم
اپنی آنکھوں کو تیری ادا یاد ہے
ہوں گے تنہا تو جادو جگا لیں گے ہم
آزمائش محبت کا دستور ہے
نوری اس کو بھی اب آزما لیں گے ہم

ایچ۔ اے۔ حبیب

میہوری

عجیب سی ہے یہ شکل جو میری راہ میں ہے
وگرنہ سامنے قاتل میری نگاہ میں ہے
ہزار سجدے کئے ہیں نے مقتلیں مانیں
اثر دعا میں میری اور نہ میری آہ میں ہے
جفائیں تیری کرم بن کے مجھ پہ چھائی ہیں
وفا تو میری ہمیشہ تیری پناہ میں ہے
مخالفوں کا کرم ہے جو رفعتیں پائیں
کہ دوستوں کی عنایت میری نگاہ میں ہے
یہ آتشوں کے بھی دریا ہمیں جلا نہ سکے
حبیب آگ سے زیادہ اثر تو آہ میں ہے

اختر حسین اختر

بتیا، چمپارن (بہار)

جب سے قسمت جا ملی ہے گردشِ ایام سے
حادثے جوڑے گئے ہیں سب ہمارے نام سے
رات دن دولت کے پیچھے بھاگتا ہوں اس لئے
تاکہ میرے بال بچے رہ سکیں آرام سے
مجھ کو یہ مجلت پسندی اک نظر بھاتی نہیں
بات کرنے آئے ہیں تو بیٹھئے آرام سے
کون جانے حال کیا ہوگا ہمارے دیش کا
لوگ نفرت کر رہے ہیں ایکتا کے نام سے
یہ غداری [illegible] پہ اختر نہیں سکتا [illegible]
ہے ازل سے میرا رشتہ مذہب اسلام سے

غزلیں

ارشد حسین
(ڈالٹن گنج)

ڈوبنے کا خوف کب دل میں مرے پلتا رہا
جوشِ دریا حوصلوں کے سامنے ٹلتا رہا

دوپہر کے گرم سورج سے کہاں مرعوب تھا
سوئے منزل دھوپ میں بھی راہرو چلتا رہا

آئینے کی زد سے تو باہر ہوا چہرہ مگر
مستقل دو ساغروں میں خونِ دل ڈھلتا رہا

سامنے آنکھوں کے آیا منظرِ آتش فشاں
حدتِ بے چارگی سے دل ہمیشہ گلتا رہا

رہروی میں ہر طرف تنہائیوں کی بھیڑ تھی
سایۂ وحشت سفر میں ساتھ ہی چلتا رہا

سازشیں ہوتی رہیں ارشد بجھانے کی مگر
تندِ طوفانوں کی زد میں بھی دیا جلتا رہا

سلام صدیقی
(دہلی)

اسی کی شوخ نظر کا تو یہ کرشمہ ہے
خدنگِ ناز جو پیوست ہے رگِ جاناں میں

فضائے کون و مکاں عطر بار ہے جس سے
اسی کی زلف کی خوشبو ہے زلفِ دوراں میں

ہزار چاہا بھلا دوں اُسے بھلا نہ سکا
اُجالا جس نے کیا ہے مرے شبستاں میں

یہ کارخانۂ قدرت کا ایک تحفہ ہے
جو عشق جاگزیں ہوتا ہے قلبِ انساں میں

اسی کی آتشِ سوزاں چمکتی ہے دل میں
جو خون بن کے لرزتی ہے چشمِ گریاں میں

سحر نصیب بہت خوش نصیب ہوتے ہیں
نہ پوچھ جو بھی گزرتی ہے شامِ ہجراں میں

نہیں ہے اس لئے ساحل کی جستجو مجھ کو
کہ ڈوبنا ہی مقدر ہے غم کے طوفاں میں

ابھی تو سایہ فگن ہے خزاں مرے دل پر
ابھی بہار نہیں ہے مرے گلستاں میں

مگر وہ وقت بھی آئے گا اے سلام کہ جب
بہاریں رقص کریں گی اسی بیاباں میں

نثار احمد نثار
(سمستی پور)

بے سبب کیا خیال ہے دل میں
رنج و غم ہے ملال ہے دل میں

زندگی کی رمق نہیں لیکن
ایک روشن جمال ہے دل میں

سچ تو یہ ہے کہ میں سوالی ہوں
کیا کہوں کیا سوال ہے دل میں

جیتے جی آئی ہے قضا اس پر
جو کبھی رکھتا ملال ہے دل میں

یوں تو نظروں میں کتنے پیکر ہیں
سب کو رکھنا محال ہے دل میں

قسط نمبر ۱۳

مشرف عالم ذوقی

(دہلی)

ترجمہ: تبسم فاطمہ

وہاں پھر کسی کی موت ہو گئی تھی۔ زور زور سے دہاڑیں مار مار کر رونے کی آواز آ رہی تھی۔ انجو نے باہر نکل کر پوچھا۔ وہی لڑکی تھی۔۔۔ اس کی ماں چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ لوگ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے ــــ لڑکی ماں کے سُر میں سُر ملا رہی تھی۔۔۔۔ میرا باپ اسمیک پیتا ہے۔۔!

کانوں کے پاس اس جملے نے جیسے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے تیزی سے دروازہ بند کیا ــــ اور پھر دفتر کے لئے تیار ہونے لگی۔

اب دفتر میں اس کی پہچان کے دائرے بڑھ چکے تھے۔ سیما، شانتا، چھایا، اگنی ولیش، رماکانت اور تنڈن ــــ سب کو ان کی مجبوریاں یہاں کھینچ لائی تھیں ورنہ ایسے بے نام دفتر میں کام کرنے کی، کسی کی خواہش ہوتی ہے۔

ابھی" پچھلے دنوں ہی اس سے تنڈن صاحب دریافت کر رہے تھے۔ تم مسلمانوں کے محلے میں رہتی ہو۔ ڈر نہیں لگتا۔۔۔ میں تو کہتا ہوں کہ جتنی جلد مکان خالی کر دو اتنا بہتر ــــ تم نہیں جانتی ــــ بھیڑ بکری کاٹنے والوں کے پاس ہمدردی اور پیار کا فقدان ہوتا ہے۔

شانتا بولی تھی ــــ چھی چھی۔۔۔ اتنی گندی جگہ۔

سیما نے کہا تھا۔۔۔ جو بھی ہو، مسلمان بہت گندے رہتے ہیں۔ کیوں انجو؟

اگنی ولیش نے بھی ہمدردی کا مظاہرہ کیا ــــ وہ جگہ ٹھیک نہیں تو پھر میرے محلے میں آجاؤ۔ بہت سے پراپرٹی ڈیلر میرے جان پہچان کے ہیں۔ تمہیں کوئی مناسب اچھی جگہ تو مل ہی جائے گی۔

وہ ہنسی تھی ــــ "پیسے بھی تو چاہئے۔

ہاں یہ تو ہے"

" سنگھل صاحب کے یہاں رہنا ہے تو فی الحال

اسی سے کام چلانا ہوگا۔"

تنہائی اور اکیلے پن کا احساس کیسی عجیب عجیب باتوں کو جنم دیتا ہے۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا لیکن رات کی تنہائیاں اس کا جینا حرام کر دیتیں ۔۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ اکیلے پن کی عادی ہو گئی۔

لڑکی اکیلی ہو تو لوگ کیسی کیسی نظروں سے گھورتے ہیں۔ بس، منی بس میں کیسی کیسی بدتمیزیاں ہوتی ہیں اور پھر وہی ایک سوال ۔۔۔
آپ اکیلی ہیں .... کمال ہے۔ کیسے رہتی ہیں آپ؟

دوپہر میں شعیب کا فون آیا تھا ۔۔۔
" اے گڈ نیوز فار یو ۔"
" کیا ہے ؟"
" شام کو ملنے پر ہی بتاؤں گا۔ مل رہی ہو نا ؟"
" دیکھا جائے گا ۔"
" نہیں ملنا ضروری ہے۔ میرے ساتھ ونئے بھی ہوگا ۔"

اور وہیں اس نے ونئے کو دیکھا تھا پہلی بار۔ شعیب کا روم پارٹنر ۔۔ شرمایا شرمایا سا ونئے ۔
" آپ کی تعریف سنی تھی ۔ آپ جیسی لڑکی کا..."
اس نے بات کاٹ دی۔ " آپ دلی کس کے ساتھ آئے تھے کیا ؟"
" نہیں اکیلے ہی.....؛ وہ چونکا ۔
" پھر..."
ونئے ایکدم سے چونک پڑا ۔ او۔ گریٹ !
ونئے شعیب سے ہنس کر بولا ۔" ۔ ن گئے یار تمہاری پسند ۔"
وہ شعیب سے بولی ۔۔ اب بتاؤ ۔ وہ گڈ نیوز کیا ہے ؟
" ایسے ہی کہہ دوں یا مٹھائی بھی منگواؤں ۔"
" فی الحال یوں بھی ٹھیک ہے ۔ کہیں چائے پی لیں گے ۔"
" میرا اعتقاد ٹوٹ گیا ۔"
اس نے قہقہہ لگایا ۔ ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری مل گئی ہے ۔ سیلری ٹھیک ٹھاک ہے ۔"
" تب تو صرف چائے سے کام نہیں چلے گا ۔"
انجو زور سے ہنسی ۔
چائے پیتے ہوئے ونئے نے پوچھا۔ "تمہیں انجو کہوں یا افروز ؟"
" کچھ بھی ۔ دوست کہہ سکتے ہو ۔"
" لیکن یہ نام کیوں بدلا ؟"
" مشورہ میرا تھا یار، شعیب نے قہقہہ لگایا ۔
" لیکن کیوں ؟" ونئے سنجیدہ ہو گیا ۔
" کوئی خاص بات نہیں ۔" انجو نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔ افروز سے بہت سارے سوال جواب پیدا ہو جاتے تھے ۔ کہاں کی ہو ؟ گھر کہاں ہے ؟ ممی ڈیڈی کہاں ہیں ۔ اور ایک بے کار سا سوال جسے سن کر مجھے غصہ آجاتا تھا۔ "کمال ہے مسلمان لڑکی ہو کر...."
" اتنے [illegible] دل پیدا نہیں ہوتے ؟"
" یہاں تو [illegible] ہے ۔ جواب یہاں بھی دینے پڑتے ہیں لیکن اتنے سارے نہیں ۔"
" پھر بھی یہ ٹھیک نہیں ۔"
ونئے بولا ۔۔ اس کمزور سسٹم کا ہم بھی ایک

حصہ ہو گئے تو ؟ ہمیں تو اس کے خلاف جنگ لڑنی
ہے ۔"

تمہیں بتانا بھول گیا ، شعیب تیزی سے بولا ۔
دنئے یہاں ریشپری میں الیکشن ہے ۔ IPTA کا
خاص ممبر ۔"

" اچھا ۔۔"

یہ ٹھیک نہیں انجو ۔ مذہب کو جن لوگوں نے
اپنے سیاسی صندوق میں بند کر رکھا ہے ، ہم ان
سے ڈر جائیں ۔۔ تم افروز ہو اور تم افروز ہی رہو
گی ۔ میں تو تمہیں افروز ہی پکاروں گا ۔ تمہیں کوئی
اعتراض ۔۔ ؟"

" بالکل نہیں ۔ لیکن پلیز ۔ آفس میں فون کرتے
وقت خیال رہے ۔ AWKWARD تو مجھے بھی لگتا
ہے ۔۔۔ لیکن جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہوئے زیادہ برا
لگتا ہے ۔ انجو کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ۔

دنئے بھی ہنس پڑا ۔۔ ایک زندگی میں ہمارے
کتنے چہرے ہو جاتے ہیں ۔ یہاں سب کے یہی حال
ہیں ۔ سب کے سب بھیس بدلے ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

ر... پھر بات چیت کو سنجیدگی کا رخ دے
دیا تھا ۔

انجو خیالی میں دوسری طرف دیکھنے لگی تھی ۔

★

پھر کتنے ہی سال آندھی اور طوفان کی طرح
گزر گئے ۔

وقت بدلا تھا اور بدلتے وقت کے ساتھ
انجو زمانے کی بدلی بدلی آنکھیں دیکھ رہی تھی ۔
اس بیچ کیسی کیسی سیاسی ہلچلیں تھیں ۔۔

ملک کے نقشہ پر چاروں طرف خون ہی خون
بکھر گیا ۔ کچھ موقع تو ایسے بھی آئے کہ اسے اپنے اس
غیر نام سے تسلی سی ملی تھی ۔

ہاں وہ محفوظ ہے ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن کہاں کون محفوظ تھا ؟ فرقہ وارانہ
آندھیوں میں کس کا خیمہ محفوظ تھا ؟

سرکاریں ٹوٹی تھیں ۔

پھر نئی سرکاریں آئیں ۔۔۔

خونی رتھ سڑکوں پر دوڑتا رہا ۔۔۔

وقت کے پہیئے خون میں ڈوبے تھے ۔ اور نفرت
کا رتھ تیز رفتاری سے پورے ملک میں دوڑ رہا تھا ۔

اس بیچ ملک کے سیاسی جغرافیئے نے بھی
کیسے کیسے حادثے قید کئے ۔۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ بھی
نہیں بھولی ۔ ۔ ۔ سب کچھ یاد ہے ۔ ۔ ۔

اور ہر بار ہمیشہ کی طرح جیسے کوئی ہتھوڑے
سے اس کے ذہن پر ضرب لگا رہا تھا ۔ ۔ ۔

" تم ۔ ۔ ۔ کون ہو تم ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

" انجو ہو یا افروز ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

یا وہ اپنے نام کی پہچان ہی کھو بیٹھی ہے ۔

تب ۔۔۔

تب وہ رانی منڈی میں تھی ۔ اسے سب کچھ
دھندلا دھندلا سا یاد ہے ۔

دوپہر کا وقت ہوگا ۔ بائی اماں کے گھنگھرو
ریہرسل میں مصروف تھے ۔ بوڑھے سازندے
رشید میاں پاس ہی بیٹھے تھے ۔ اچانک سڑک پر
ہلچل مچ گئی ۔ لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے ۔ ذرا سی
دیر میں پولیس جیپ سڑکوں پر ناچ رہی تھی ۔

وہ اٹھ کر بائی اماں کے ساتھ بالکنی پر آگئی
سڑک سنسان —
بدی ماما خبر لائے ۔ غضب ہو گیا ۔ اندرا
گاندھی قتل کردی گئیں ۔
کس نے قتل کیا ؟ سازندے رشید میاں کے
چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔
کہیں کسی مسلمان کا تو ہاتھ نہیں ؟
بائی اماں کا چہرہ فق ہو گیا ۔
اور رشید میاں کمزور آواز میں بولے تھے ...
گوہر جان دعا کرو کہ اس قتل میں کسی مسلمان کا
ہاتھ نہ ہو — گاندھی جی کے قتل کے وقت بھی شہر
ایسی ہی بھیانک چپّی میں کھو گیا تھا ...''
'' اگر کوئی مسلمان ہوا تو ؟'' بائی اماں کے
گھنگھرو کانپ کر رہ گئے ۔
افروز کے ذہن سے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں
اس وقت بھی چیخی تھیں — اور وہی گھنٹیاں اب
زیادہ تیز آواز میں چیخ رہی تھیں —
فرقہ وارانہ آندھیوں نے پورے ملک پر
قبضہ کر لیا تھا ۔ مندر مسجد کے ہنگامے نے وطن
پرستی کے پاک جذبے کا گلا گھونٹ دیا تھا ۔ اب
انسان کہاں باقی ہے ۔ باقی تھے ہندو یا مسلمان
یا فرقہ واریت کا ترشول —
نفرت کی تیز آندھی اٹھی تھی تو ....
یہ آندھی رہ رہ کر تیز ہو جاتی اور پورا
ملک گرد و غبار میں ڈوب جاتا ۔
وہ بدلنے والی تیز [illegible] سے بدلنے والی آنکھیں
کو محسوس کر رہی تھی ۔ وطن کے لئے [illegible] ہوئے [illegible]

کو ، فرقہ پرست پارٹیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ،
حکومت کے پاس اب ووٹ بینک کے نام پر کچھ تھا ۔
تو صرف دھرم کی غیر ضروری روٹیاں تھیں ۔ چپڑی
اور سوکھی روٹیاں ۔ دو کانوں پر خونی کیسٹ
تھے اور ہونٹوں پر لہولہان سے لفظ ۔
افروز سب کچھ دیکھ رہی تھی —
تقسیم کے وقت کی خونی داستانیں بھی اس نے
سُن رکھی تھیں ۔ یہ قصہ تب کتنے لوگوں کی زبان پر
تھے ۔ دردناک ، وحشتناک ، اور .....
لیکن اب کے قصے تو تقسیم کی کہانیوں کو بھی
شرما گئے تھے ۔
رتھ یاترائیں نکلتیں ...
نفرت یاترائیں نکلتیں .....
اور ملک کے نقشے پر لہو ہی لہو پسر جاتا ....
یہ سب کیا ہے ... ؟
کیا سب کچھ ایسا ہی رہے گا ... ؟ کچھ
نہیں بدلے گا ؟
ذہنوں کو خلیج کبھی نہیں ملے گی ....
اس نے دیکھا تھا — اور گہرائی سے محسوس
کیا تھا ۔ مذہب سب کے دلوں میں سختی سے ڈیرا
جمائے ہے ۔ باہر چاہے لفظوں میں اس چہرے پر
نقاب ڈالنے کی کوششیں کیوں نہ ہوتی ہوں ۔
مگر آسانی سے ان چہروں کے دوغلے پن کو ٹٹولا
جا سکتا تھا ....
سنگھل صاحب کا پریس اس لئے بہت
[illegible] ہوئے چھوڑ دیا تھا ۔ وہ ان برے دلوں کو
اب حافظے میں محفوظ نہیں رکھنا چاہتی تھی —

ایک بے نام سا دفتر۔۔، ایک بے نام سا اخبار، کبھی کبھی لگتا وہ بھی بے نام سی ہو گئی ہے۔ اسی کیفیت سے باہر نکلنے کے لئے اس نے قلم کا مورچہ سنبھالا تھا — اب وہ خاموش — اب ایک نیا دفتر تھا۔ ایک نیا سا پتا ایک جن مالنس۔

یہاں وہ دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ بائی اماں کے گھنگھرو اب بھی رہ رہ کر اس کے ذہن و دماغ میں گونج جاتا کرتے تھے۔ تب سب کچھ یاد آجاتا — بدی ماں بھی، دروازہ توڑ کر بے ہنگم سا قہقہہ لگاتا ہوا جاگیر کا چہرہ بھی نظر کے آگے دوڑ جاتا۔ انور اور قریشہ بھی۔

نواب الطاف حسین بھی۔۔۔۔

اور پھر وہ اک ایک کر کے بوجھل منظروں کی قید میں ہوتی — وہ سر جھکائے کھڑی ہے اور نواب صاحب اپنی خاندانی شمشیر کی دھار پرکھ رہے ہیں۔

سا پتا ایک جن مالنس — اب اس کے قلم کی دھار تیز تھی۔ اسے لگا تھا، بیتی باتیں اس نے وقت کے کوڑے دان میں پھینک دی ہیں۔ اور اب وہ نئے سرے سے اپنی پہچان بنانے میں جٹی ہے۔

اس دن فرقہ واریت کے خلاف منڈی ہاؤس میں ایک گوشٹھی ہوئی تھی۔ تب اس نے ونئے کو دیکھا تھا۔ چپ چپ خاموش رہنے والے ونئے کو — ونئے جی بھر کر بولا تھا — اس کے لفظ نہیں تھے آگ کے گولے تھے۔

اس نے ذرا دیر کو سوچا تھا۔۔۔ یہ ونئے جیسے لوگ مسیحا بھر کیوں ہیں؟

تب شعیب بھی اس کے ساتھ تھا — وہ دن کے ساتھ رہ رہا تھا۔

شعیب نے دبی زبان میں اس سے کہا تھا "اب یہ اکیلا پن کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں سہمے سہمے سے کچھ سوال تھے۔ وہ ان سوالوں کو اب دھیرے دھیرے بڑھنے لگی تھی۔ لیکن یکایک جلد بازی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھی — اس لئے کہ یہ ساری زندگی کا سوال تھا۔

انور اور قریشہ کے خط بہت دنوں تک آتے رہے۔ اب سال بھر ہونے کو آیا تھا، اس کے درمیان ادھر سے چپّی چھا گئی تھی۔ کبھی کبھی الجھن کا سا دل کانپ جاتا۔ جانے کیا بات ہے۔۔۔ لیکن اس نے خط لکھنے کا سلسلہ ختم نہیں کیا — دلوں کے ان معصوم رشتوں کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اس دن — جن مالنس کے لئے وہ غریبوں کی ایک بستی کا دورہ کرنے گئی تو — اسے ایک رپورٹ تیار کر کے دینی تھی۔ راجد ھانی کی وہ بستی جو سرکاری امداد سے آزاد تھیں اور جہاں جھگی والوں کو پانی، پاخانے سے لے کر کئی کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اس جھینس ٹولہ سے لے کر اس فلیٹ تک کا سفر کچھ زیادہ بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ وہاں بد تھی، کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی جاہلانہ باتیں تھیں تو یہاں کا پورا علاقہ بی۔ جے۔ پی والوں کے اثر میں تھا گھروں پر بھگوا جھنڈے لگے تھے۔ دیواروں پر

نونی نعرے لکھے تھے۔ کبھی کبھی آتے جاتے وہ
ان نعروں کی زد میں بھی آجاتی ۔۔ اور ایسے میں
تنہائی کا جان لیوا احساس، اس کے وجود پر
چھا جاتا ۔۔

لمحہ لمحہ ایک بکھراؤ ہی تو ہے تمہارے پاس۔
واپسی میں ان کا من کھٹا تھا ۔۔ گھر واپس
آئی تو قریشہ کا ایٹم بم، اس کا انتظار کر رہا تھا۔
قریشہ کے خط کو ہاتھوں میں لے کر وہ بہت دیر
تک پڑھنے کی ہمت نہیں پیدا کر سکی۔ خطرے کا الارم
مستقل بج رہا تھا ۔۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے
خط چاک کیا۔ ایک ننگی سچائی اس کی روح کو ریزہ
ریزہ کرتی چلی گئی ۔۔ لکھا تھا۔

افروز،

تم پوچھتی ہو خط کیوں نہیں لکھتی؟ جب
اپنا آپ خود ہی لہولہان ہو تو تمہیں لہولہان کرنے
سے فائدہ؟ گھر کی حقیقت تو تمہارے سامنے ہی کھل
گئی تھی ۔۔ تمہارے جانے کے بعد ہماری گھریلو
الجھنوں میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔ ایک ایک
کر کے گولہ کے باقی لوگوں نے بھی کرایہ دینا بند کر دیا۔
نواب صاحب کی نوابیت کی لاش تیار تھی۔ حویلی
نیلام ہونے کی نوبت آگئی تھی۔ قرض خواہوں کے
قرض چڑھتے جا رہے تھے۔ بنیوں نے شور مچانا
شروع کر دیا تھا۔ بھائی جان نے تھوڑے بہت
ٹیوشن بھی کئے، لیکن بھلا اس سے کیا ہونے والا تھا۔
اب ایک ہی راستہ تھا۔ حویلی بیچ دی جائے۔ حویلی
کی بولی لگ چکی تھی ۔۔

تم نے نواب صاحب کے کمرے میں ایک
خاندانی زنگ آلود شمشیر دیکھی ہوگی ۔۔ ایک
صبح ابّا اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ وہ خاندانی
شمشیر ان کے پیٹ کو چیرتی چلی گئی تھی ۔۔ مرتے
وقت بھی چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ جیسے
یہ بزدلانہ فیصلہ کرتے وقت بھی ذہنی کشمکش چل
رہی ہو ۔۔

اب لگتا ہے، یہ گھر بچانا تھا تو ابا کو
یہ فیصلہ بہت پہلے کرنا چاہئے تھا ۔۔ یوں بھی گھر
میں ان کی موجودگی اور ناموجودگی دونوں برابر
تھی۔ تم یقین کرو گی، ابّا کی موت پر صرف بھیّا
روئے۔ میں نے ایک بھی آنسو نہیں بہایا۔ امی
جان صرف چپ رہتی ہیں۔ کچھ بولتی نہیں ۔۔
حویلی بک چکی ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے گھر میں
کرائے پر رہ رہے ہیں۔ بھیّا انجینیئرنگ مکمل نہیں
پائے۔ اب ایک جگہ کلرکی کر رہے ہیں۔ رہ گئی میں۔
تو میری کوئی منزل نہیں۔ میں نے پڑھائی کب کی چھوڑ دی۔
تمہیں اور بوجھل نہیں کرنا چاہتی۔ امی کو
میری شادی کی فکر ہے۔ دو رشتے پہلے ہی کٹ چکے ہیں۔
میرے لئے کوئی تیسرا رشتہ بھی آئے گا۔ یہ خواب خیال
کی باتیں ہیں ۔۔ میں نے بھی امید اٹھا دی ہے۔
ہاں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کیا ہمارا سچ یہی تھا؟
تو نواب صاحب نے اس سچ کو بہت پہلے قبول
کیوں نہیں کیا؟ ایک بات اور سوچتی ہوں۔ میں نواب
خاندان میں کیوں پیدا ہوئی؟ سوچنے لائق بہت سی
باتیں ہیں لیکن سوچنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں زیادہ
بوجھل نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے خط بند کرتی ہوں۔

بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کے چلن پر
انکش لگانے کی خاطر انٹرزونل پارٹی اٹاوہ پہنچ چکی
تھی۔ میں بھی اس پارٹی کا ایک رکن تھا۔ افسر خصوصی
کی قیادت میں وہ پارٹی اٹاوہ پہنچ آئی تھی انہوں
نے اپنے چیکنگ انسپکٹروں سے طویل صلاح و
مشورہ کے بعد نقب زنی کے لئے نصف شب سے
آغاز کا وقت مقرر کیا تھا۔ پورا دن خالی پڑا تھا۔
میں اپنے عارضی قیام گاہ میں ایک بستر پر پڑا اپرا اخبار
میں چھپی ساری خبریں نگاہوں سے کئی بار چاٹ چکے
اکتاہٹ سا محسوس کر رہا تھا کہ معاً ایک خیال
مرے دماغ میں ابھرا کہ کیوں نہ میں اپنی منہ بولی
ماں کا درشن کر لوں جو اٹاوہ کے قریب پریم پور
گاؤں کی رہنے والی ہے۔ اس خیال کا شور اتنا
تیز تھا کہ میں اس کا تعاقب کرتا ہوا اسٹیشن سے
باہر ٹمٹم پڑاؤ پر آ کے ٹمٹم والے سے پوچھا۔
" بھائی۔ پریم پور گاؤں یہاں سے کتنی دور
پر ہے ؟"

ٹمٹم والے نے اپنی چابک سے سامنے نظر آتے
ہوئے گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
" وہی گاؤں پریم پور ہے بابو، پاؤں بڑھاؤ
اور پہنچ جاؤ ۔"
میرے پاؤں گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔
دس سال پہلے ایک صبح ڈاؤن طوفان ایکسپریس
جب پٹنہ جنکشن پر رکی تھی تو اس کے رکنے کے چند
سکنڈ بعد اناؤنسنگ سسٹم سے یہ اطلاع نشر
کی گئی تھی کہ کوچ نمبر تین ہزار دو سو باون میں کوئی
مسافر حرکت قلب بند ہو جانے سے مرگیا ہے۔ پولس
کے عملے فوراً دھیان دیں۔ اس صبح ہیڈ ٹکٹ کلکٹر
کے فرائض میں انجام دے رہا تھا۔ میں اپنے آفس سے
نکل کے اس کوچ کے قریب گیا تھا تو دیکھا کہ لاش
اتار کے پلیٹ فارم پر رکھی جا چکی تھی اور وہ ایک
چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک
ادھیڑ عمر کی عورت اپنی گود میں تقریباً پانچ سال
کی ایک چھوٹی بچی لئے بیٹھی تھی۔ دونوں ہچکیاں

لے رہی تھیں۔ بڑا ہی دل شکن منظر تھا۔ پولس انسپکٹر کی پوچھ تاچھ سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ عورت اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ بیٹا سے ملنے مظفر پور جا رہی تھی۔ دانا پور سے ٹرین کے کھلتے ہی اس کے شوہر کے دل میں شدت کا درد اٹھا تھا اور ایک ہچکی لے کر اس نے دم توڑ دیا تھا۔ پولس انسپکٹر ضروری رپورٹ مکمل کر کے اپنی ذمے داری پوری کرنے کی خاطر جب لوٹ گیا تھا تو میں بھی وہ تمام جانکاری حاصل کر کے اپنے آفس میں واپس آ گیا تھا۔

اسٹیشن پر اس طرح کے حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اتنا سنگین حادثہ بھی ہوتا ہے جس کو دیکھنے کی آنکھیں تاب نہیں لاتی ہیں۔ یہ حادثہ تو معمولی ایک قدرتی موت کا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل بے چین ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس عورت کی بے بسی تھی جو اپنے شوہر کی لاش کے قریب بیٹھی ہوئی غموں کی تیز دھاروں میں بہہ رہی تھی۔ اور بہتی ہوئی دھاروں سے اس کو نکالنے والا کوئی نہ تھا۔ پتہ نہیں کب اس کا بیٹا آئے گا؟ کب اس کے شوہر کی لاش آخری رسومات کے لئے وہاں سے اٹھائی جائے گی؟

اپنے روزمرہ کے دفتری کاموں کو نپٹانے کے سلسلے میں جب میں اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ سے ضروری کاغذات پر احکامات لے کر ان کے آفس سے باہر نکلا تھا تو میری نگاہیں کوئی انجانی طاقت کے زیر اثر ہو کے خود سے اس طرف دوڑ گئی تھی جہاں پہلے میں اس مسافر کی لاش کو دیکھ چکا تھا۔ لاش اب بھی اسی طرح پڑی تھی۔ بچی اب بھی اپنی ماں کی گود میں سہمی ہوئی بیٹھی بلک رہی تھی۔ آدمیت کے تقاضے بھی کچھ ہوتے ہیں اور وہ تقاضے آدمیوں کے دلوں میں ان دیکھی طاقتوں سے کبھی کبھی خود بخود جاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت میرا دل بھی ایک ایسا ہی تقاضا کا مرکز بن گیا تھا۔ بچی یقیناً بھوکی ہوگی یہ سوچ کے میں نے ایک اسٹال سے پوریاں اور یہ مٹھائیاں خریدی تھیں اور ان کے قریب جا کے بیٹھتا ہوا بچی سے بولا تھا۔

"روؤ نہیں، یہ کھاؤ۔"

بچی اپنی ماں کی طرف نگاہیں اٹھا کے اجازت کی طلب گار ہو گئی تھی۔

ماں اپنی بچی کی بھوک کی تڑپ سمجھ گئی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے پوریاں اور مٹھائیاں لے لیں تھیں۔ ایک مٹھائی کو ٹکڑے کر کے اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بچی کے منہ میں ڈالتی ہوئی مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"بابو، تمہاری اس دکھیا پر بڑی مہربانی ہوگی یہ پتہ لگا دو کہ میرے بیٹے کو خبر ہوئی یا نہیں؟"

میں وہاں سے اٹھتا ہوا بولا تھا۔

"ابھی دریافت کر کے آتا ہوں۔"

ریلوے پولس کے دفتر میں اس انسپکٹر سے صرف یہ جانکاری ملی تھی کہ مظفر پور ریلوے پولس کو خبر کر دی گئی تھی لیکن وہاں سے اس وقت تک کوئی پیغام نہیں آیا تھا اور جب میں نے اپنی واقفیت سے اس عورت کو آگاہ کیا تھا تو اس کا سیاہ مائل چہرہ حالات کی تپش سے پوری طرح کالا ہو گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے

کو زیادہ مضطرب اور نڈھال ہوتے ہوئے دیکھ کے کہا تھا۔

"گھبرائیے نہیں آپ کے بیٹے کو ضرور خبر ہو جائے گی۔"

"کئی گھنٹے بیت گئے بابو، نہ جانے وہ کب جان پائے گا، کب آئے گا۔ میں اپنے کو اب سنبھال نہیں پا رہی ہوں، تم میرے منہ بولے بیٹا بن کے مجھے جیون دان دیدو بابو۔"

"میں تذبذب میں پڑ گیا تھا، ہم دونوں کے درمیان مذہب کی آہنی دیوار کھڑی تھی لیکن یہ بھی کھلی ہوئی ایک سچائی تھی کہ ہر مذہب نے انسانیت کے علم کو اونچا اٹھانے کی تلقین کی ہے۔ میں نے مذہب کی آہنی دیوار کا تقدس برقرار رکھتے ہوئے انسانیت کی روشنی پھیلانے کا عزم کر لیا تھا۔

میں اس عورت کے قریب بیٹھ کے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں، میں انتظام کرتا ہوں اور تمام ذمہ داریاں سنبھالوں گا۔"

وہ عورت تشکر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی نگاہوں میں دعاؤں کی لہریں امنڈ آئی تھیں۔

میرے ساتھیوں نے سارا حال جان کے میرا بھرپور تعاون کیا تھا۔ چند ساعتوں میں چار سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ ان روپوں کو اپنے کلرک رگھوناتھ بابو کے حوالے کرتے ہوئے میں نے ان سے کہا تھا۔

"ہندو رسم و رواج کے مطابق کریا کرم کے لئے جو لوازمات ضروری ہوں خرید لائیں۔ ساتھ ہی ایک پنڈت کو بھی بلا لیں۔" ایک بار میں پھر پولس آفس میں آیا تھا تاکہ یہ جان سکوں کہ مظفر پور سے کوئی پیغام آیا تھا یا نہیں۔ نفی میں جواب پا کے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹا کے آجانے سے بات ہی کچھ اور ہوتی۔ وہ چتا میں آگ دیتا رسم پوری ہوتی، ماں کے بے قرار دل کو قدرے سکون ملتا۔ اس خیال کے ذہن میں جاگتے ہی میں اس کے لڑکے کو اس حادثے سے باخبر کرنے کی ایک نئی کوشش کرنے مسٹر بجاج کے پاس پہنچ گیا تھا۔ انہیں تمام حالات سے باخبر کرکے میں نے ان سے استدعا کی تھی کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس کے لڑکے کو اس حادثہ سے آگاہ کر دیں اور میں انہیں ٹیلیفون کا ڈائل گھماتے ہوئے چھوڑ کے جب اسٹیشن واپس آیا تھا تو رگھوناتھ بابو تمام ضروری سامان خرید کر لا چکے تھے۔ پنڈت جی بھی موجود تھے۔ پھولوں سے ارتھی سجائی جا رہی تھی۔ میرے بہت سے ساتھی ارتھی کو اپنے کندھوں پر اٹھا کے گھاٹ لے جانے کے لئے منتظر کھڑے تھے۔ لاش جب ارتھی پر رکھ کے رسومات مکمل کی جانے لگی تھیں تو دن ڈھل رہا تھا۔ وہ عورت روتے روتے اپنے غموں کے دباؤ سے بے سدھ سی ہو چکی تھی اور بچی اس کی گود میں سہمی ہوئی چپ تھی۔ تقریباً نصف گھنٹہ بعد جب ارتھی پلیٹ فارم سے اٹھائی جانے والی تھی ٹھیک اسی وقت مسٹر بجاج کے ہمراہ چند افراد آئے تھے ان میں وہ جوان لڑکا بھی تھا جس کو بلانے کی صبح سے کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ ارتھی کے پاس پہنچ کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا تھا۔ اس کی ماں کی بجھتی ہوئی

نگاہیں جوں ہی اس پر پڑی تھیں وہ ایک لمبی چیخ مار
کے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی کے
چھینٹوں کے پڑنے سے جب وہ ہوش میں آئی تھی تو
اس کا بیٹا اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس نے
اپنے بیٹا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر میری طرف
اشارہ کرتی ہوئی نقاہت بھری آواز میں بولی تھی۔

" وہ بابو تیرا منہ بولا بھائی ہے، اپنی زندگی
میں اس کو کبھی مت بھولنا۔"

پریم پور جاتے ہوئے شاہراہ کو چھوڑ کے جب
میں گاؤں میں داخل ہونے والی پتلی سی سڑک پر
چلنے لگا تو میرے ذہن کے پردے پر یادوں
کی چلتی ہوئی فلم ختم ہوگئی۔ گاؤں کے نزدیک
پہنچ کے میں نے اس بوڑھے آدمی سے جو سڑک کے
کنارے ایک کھیت میں جھکا ہوا پیال کا گٹھا
باندھ رہا تھا۔ پوچھا۔

" بابو ہری سنگھ کا مکان گاؤں میں کس
طرف ہے بابا؟"

وہ گٹھا چھوڑ کے سیدھا کھڑا ہوگیا اور اپنی
اچٹتی ہوئی نگاہیں میری طرف ڈال کے ایک پختہ
مکان کی طرف ہاتھ اٹھا کے بولا۔

" وہ اجلا مکان بابو ہری سنگھ کا ہے۔"

مکان کے دروازہ پر پہنچ کے میں نے دروازہ
میں لگی کنڈی کھٹکھٹائی۔

دروازہ کھلا اور ایک سانولی سلونی جوان
لڑکی نے لجاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

" کس کو کھوجت ہو بابو؟"

" رکمنی دیوی سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے جواب
دیا۔

وہ کھڑی وہیں سے پکار کے بولی

" میا رے کوئی بابو تو ہے کھوجت ہیں۔"

رکمنی دروازے کے سامنے مجھے کھڑا دیکھ
کے فوراً پہچان گئی۔ بے تحاشہ لپک کے اس نے
اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلایا اور اس کے حلقے
میں مجھے سمیٹ لیا۔ اس کا والہانہ انداز بالکل
میری ماں کی طرح تھا۔ وارفتگی کے عالم میں وہ بھی
مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا کرتی ہیں۔
جب میں ان سے ملنے جاتا ہوں۔ وہی چاہت کا
جوش تھا، وہی پیار کا غلبہ تھا۔ انسانیت کا
مینار مذہب کی آہنی دیوار سے بہت اونچا اٹھ
گیا تھا۔ وہ انتہائی خوش ہوتی ہوئی میرا ہاتھ
تھام کے مکان کے اندر لے گئی۔ تپائی پر جب میں
بیٹھ گیا تو اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

" کئی چٹھی تیرے نام چھوڑی لیکن بابو تم
نے جواب نہیں دیا۔ بڑا دکھ ہوا تھا۔ کیسے تجھے میری
یاد آئی؟"

" سچ کہتا ہوں تمہاری کوئی چٹھی مجھے ملی نہیں۔
اناوہ ڈیوٹی پہ آیا ہوا ہوں۔ تمہاری یاد مجھے تمہارے
پاس کھینچ لائی ہے۔"

" ارے چمپا تو گئی کہاں؟ تیرا منہ بولا بھائی
آیا ہے جلدی آ۔" اس نے چمپا کو آواز دی۔

وہی لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا میرے
سامنے آ کے کھڑی ہوگئی۔ اور اس نے اپنی عقیدت
کا اظہار اپنی ہتھیلیوں کو جوڑ کے کر دیا۔

" بابو تم نے چمپا کو پہچانا یا نہیں؟ یہ وہی

جس کو تم نے پوریاں اور مٹھائیاں کھلائی تھیں؟"
یہ جان کر اندر ہی اندر انتہائی خوش ہوا کہ میری ہمدردی کا معمولی جذبہ کسی کے دل میں برسوں برس بعد کسی یادگار بن کے پوری طرح اجاگر تھا۔ وہ دن میری زندگی کا روشن ترین دن بن گیا۔ میری آمد کی خبر پھیلتے ہی پاس پڑوس کی سن رسیدہ عورتیں باری باری آتی رہیں۔ سب کی سب مجھے جگ جگ جینے کی دعائیں دے کر خوش ہوئیں پچھلے پہر جب میں نے واپس ہونے کے لئے چمپا کی ماں سے اجازت مانگی تو وہ اداس ہوتی ہوئی بولی۔

" اتنے دنوں بعد تم آئے بھی تو چند گھنٹے کے لئے بابو، نہ جی بھر کے تمہیں دیکھا، نہ جی بھر کے تمہیں کھلایا، پلایا، سرکاری ڈیوٹی ہے تمہاری روک بھی نہیں سکتی لیکن جانے سے پہلے مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ تم چمپا کے بیاہ میں ضرور آؤ گے۔"
میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ــــ
" اپنا پورا پتہ میں نے تمہیں لکھ کے دیدیا ہے، چمپا کے بیاہ میں اس کا منہ بولا بھائی ضرور موجود رہے گا۔"
مکان سے باہر نکلا تو دروازے کے سامنے گاؤں کے بوڑھے، جوان اور بچوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ اس ہجوم کے افراد مجھے اپنے درمیان لے کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے، ان کے ہمراہ چلتے ہوئے جب میں اسٹیشن کے بالکل قریب پہنچ گیا تو میری نگاہیں اس افسر پر پڑ گئی جن کی قیادت میں چیکنگ پارٹی اناوہ آئی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ہجوم کو دیکھ کر ان کا چہرہ کوئی بڑا خطرہ کے احساس سے زرد ہونے لگا۔ حیران ہوتے ہوئے لپک کے انہوں نے افسری شان سے مجھ سے پوچھا۔
" کیا کر بیٹھے ہو تم؟"
اس سے پہلے کہ میں انہیں جواب دیتا۔ ہجوم سے نکل کے ایک بوڑھے آدمی نے بڑی متانت سے کہا۔
" جو یہ بابو کر چکے ہیں صاحب اگر بھارت کے سارے لوگ وہی کرنے لگیں تو نفرت کی آگ ہمارے دیش میں کبھی سلگ نہ پائے، ان کے نیک کام کا یہ پھل ہے کہ ہم انہیں اپنے گاؤں کا بیٹا مان کے عزت کے ساتھ اسٹیشن چھوڑنے آئے ہیں۔"
افسر کا زرد ہوتا ہوا چہرہ خطرہ کے احساس کے ٹل جانے سے معمول پر تو ضرور آگیا لیکن میرے اوپر چھائی ہوئی عزت کی چھاؤں ان کے لئے ایک چنوتی بن گئی۔

براہ کرم اپنی تخلیقات اور خطوط خوشخط لکھیں

منظر مظفر پوری
مظفر پوری

تین فٹ کی بلندی

کم سے کم بلندی کے لئے یہ دنیا کسی کام کی نہیں ہے یا یہ کہا جائے کہ خود بلندی ہی اس دنیا کے لئے بے کار ہے۔ اس کا دوش صرف اتنا ہے کہ وہ صرف تین فٹ کی ہے۔ جسم کے تمام اعضاء ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ دور سے دیکھنے والوں کو یہ تین فٹ کی بلندی گوشت کا ایک بڑا سا لوتھڑا نظر آتی ہے۔ عجب نہیں کہ اس کے سینے میں ایک گداز دل ہوگا جو اس کی جسمانی ساخت کی مناسبت سے وہ بھی چھوٹا سا ہوگا۔ لیکن یہ .... غیر ممکن ہے کہ اس چھوٹے سے دل کے اندر پناہ گزیں جذبات و احساسات بھی چھوٹے چھوٹے سے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جذبات و احساسات کا کوئی قد ہوتا ہی نہیں۔ بلندی لاکھ تین فٹ کی ہے مگر اس کے جذبات و احساسات اس کے قد کے برعکس کہیں بلند و وسیع ہیں۔ اس کے باوجود بھی حویلی والوں کی نگاہ میں اس کی کوئی قیمت ہے نہ کوئی مقام۔ سیٹھ جی، سیٹھانی اور ان کے بچے اس کی صورت دیکھتے ہی اپنی شکل ایسے ہی بگاڑ لیتے جیسے اب قے ہو جائے گی۔ محلے والوں کا بھی برتاؤ اس کے تئیں ٹھیک نہیں۔ ادھر حویلی سے باہر نکلتی ادھر درجنوں بچے اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ آج بھی جب وہ سیٹھ جی کا کھانا ان کے دفتر پہونچانے حویلی سے جیسے ہی باہر نکلی کہ محلے کے درجنوں بچوں نے اسے چاروں اطراف سے گھیر لیا۔

"بلندی ... بلندی۔ کل ہم لوگ سرکس دیکھنے گئے تھے تو ایک کنوارے جوکر سے ملاقات ہوئی جو تمہاری ہی قد کا ہے جب اس سے ہم لوگوں نے تمہاری شادی کی باتیں کیں تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔"

"جا بلندی ... چلی جا اس کے پاس، بیچارہ بڑی بے صبری سے تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"لیکن بلندی تو ابھی بچی ہے دوستو۔"

"ہونہہ... یہ تمہیں بچی نظر آتی ہے؟... ہماری ماؤں کی ہم عمر ہوگی۔"

"تو پھر ہماری ماؤں جیسی لمبی کیوں نہیں ہو جاتی؟ صرف تین فٹ کی ہی کیوں ہے؟"

"ہماری ماؤں جیسی لمبی کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ بونی ہے۔"

"تو پھر اسے بونی ہی کہا کرو نا، دوستو — بلندی کیوں کہتے ہو۔"

"ہاہا... ! تین فٹ کی بلندی... تین فٹ کی بلندی..."

چھیڑ خوانی کی جب انتہا ہوگئی تو بلندی غم و غصے سے مانو پاگل ہوگئی۔ ٹفن دان ایک طرف پھینک کر لپک پڑی ان بچوں پر۔ اور جب وہ اپنی اپنی جانیں لے کر بھاگ کھڑے ہوئے تب اس نے چین کی سانسیں لیں۔ پھر اس کے بعد وہ ماضی کے سمندر میں کود پڑی — ماں جنم دیتے ہی چل بسی۔ پھر بابو نے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا بھی پیار دے کر میری پرورش کی... لیکن جب میں دس برس کی ہونے کو آئی تو ایک روز وہ بھی شرک کی زد میں آکر اس بھری دنیا میں مجھے تنہا چھوڑ گیا — وہ تو بھلا ہو سیٹھ جی کا جنہوں نے اپنی حویلی میں پناہ دے کر مجھ کو دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے سے بچا لیا۔ حویلی میں ایک رامو کا کا بھی کام کرتے تھے جو اَب نہیں رہے۔ ان کا ایک لڑکا تھا سوم ناتھ، جو مجھ سے ایک دو سال بڑا تھا — بہت پیار کرتا تھا مجھے۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ بلندی جب تو سیانی ہو جائے گی نا تو میں تجھ سے بیاہ کر لوں گا۔ وقت گذرتا گیا۔ ایک روز نہاتے ہوئے میں اپنے بدن میں ہونے والی تبدیلی کو دیکھ کر میں فکرمند رہنے لگی کہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ جب اس تبدیلی کا سبب میں نے سوم ناتھ سے پوچھا تو وہ مجھے عجیب نظر سے گھورتے ہوئے بولا۔ "اب تو جوان ہوگئی ہے بلندی۔ اب میں بہت جلد تجھ سے شادی کرنے والا ہوں۔ بس تھوڑی لمبی ہو جا۔"

اس کی یہ باتیں بار بار میرے ذہن کو جھنجھوڑنے لگیں اب جب کبھی سوم ناتھ مجھے گھورنے لگتا تو میں شرم سے لال پیلی ہو جاتی۔ نیند میں ایک سے بڑھ کر ایک سپنے آنے لگے۔ جیسے کہ سوم ناتھ راج کمار بن کر میرے قریب آ رہا ہے۔ میں اور وہ ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے بچے ہمیں چاروں سمت سے گھیرے کھڑے ہیں۔

میں خود کو سوم ناتھ کی امانت مان کر لمبی ہونے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ لیکن اسی دوران، یہ محسوس کرنے لگی کہ وہ مجھ سے کترانے لگا ہے۔ حویلی والے بھی پہلے سے زیادہ اکھڑے اکھڑے سے نظر آنے لگے۔ سیٹھ جی کے بچے تو بات بات پر مجھے ستاتے: "بلندی اب تو جوان ہوگئی ہے۔ جا چلی جا سرکس میں۔" لیکن میں کسی کی باتوں کا خیال نہیں کرتی۔ ہاں! ذہن کو یہ خیال اکثر پریشان کرنے لگا کہ یہ سیٹھ جی کے بچے مجھ کو سرکس میں جانے کو کیوں کہتے ہیں؟ آخر یہ سرکس ہوتا کیا ہے؟ یہ سوال جب میں نے سوم ناتھ سے کیا تو وہ مجھ سے نظریں پھیر کر بولا —

"سرکس ایک ایسی جگہ ہے جہاں تجھے کام بھی مل جائے گا اور کوئی جوکر تجھ سے شادی بھی کر لے گا۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے سوم ناتھ؟" اس کی باتیں سن کر میں چونک پڑی۔ "شادی تو تو مجھ سے کرنے والا ہے نا؟"

"نہیں بلندی! میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تو بے حد بونی ہے اور بدصورت بھی۔ تیری بھلائی اسی میں ہے کہ تو سرکس میں چلی جائے" اتنا بول کر سوم ناتھ چلا گیا۔ اور میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں دیکھ کر رو پڑی۔ میرے سارے سپنے اسی وقت چکنا چور ہو کر بکھر گئے۔ اس روز کے بعد سے یہ احساس مجھے بار بار تڑپانے لگا کہ میں بونی ہوں۔ کالی بھی ہوں اور بدصورت بھی۔ اب تو محلے والوں کے علاوہ حویلی والے بھی مجھ کو چڑھانے لگے ہیں۔ "تین فٹ کی بلندی ... تین فٹ کی بلندی ... تین فٹ کی بلندی ..." یہ فقرہ سنتے سنتے میں تھک گئی۔ مگر یہ لوگ اب تک نہیں تھکے۔"

جب بلندی کی سوچ کا سلسلہ منتشر ہوا تو اسے ٹھکن داس اور سیٹھ جی کا خیال آیا۔ ایک انجانے خوف کا تصور کر کے وہ کانپ گئی۔ شام کو جب حویلی کے اندر داخل ہوئی تو سیٹھانی اسے دیکھتے ہی جل بھن گئی۔ اتفاق سے سیٹھ جی بھی اسی وقت دفتر سے آ گئے۔ "تیری وجہ سے آج مجھے دن بھر بھوکا رہنا پڑا۔" کہتے ہوئے وہ بلندی کے قریب آ گئے۔ اور جبراً اسے حویلی سے باہر نکال دیا۔

"اب تیرا گذارا یہاں نہیں ہونے والا۔ تیری گھناؤنی صورت دیکھ کر ہمیں الٹی آنے لگی ہے۔ ..... چل چھوٹ جا یہاں سے ..." بلندی بہت روئی گڑ گڑائی لیکن سیٹھ جی تھوڑا بھی نہیں پگھلے۔ حویلی کو الوداعی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ فکر کے بیکراں سمندر میں غرق ہو گئی کہ اب جاؤں تو جاؤں کہاں۔ بے ساختہ اسے سرکس کا خیال آیا۔ مسلسل کئی دنوں تک بھٹکتی رہی۔ لیکن سرکس کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔ آخر کار مایوس ہو کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی اور سڑک کی دوسری طرف اس نوجوان کو دیکھنے لگی جو دیوار کی پشت پر ایک بڑا سا پوسٹر چپکانے میں مشغول ہے۔ جب پوسٹر چپک گیا تو وہ نوجوان سڑک پار کر کے بلندی کے قریب میں آ کر بیٹھ گیا۔ اور بیڑی سلگانے لگا۔ اب بلندی کی نگاہ اس پوسٹر پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ جس میں مختلف قسم کے جانوروں کی بڑی بڑی تصویریں ہیں۔ جیسے کہ ہاتھی، چیتا، بھالو، شیر اور بندر وغیرہ، اور ان جانوروں کے نرغے میں گھرا ایک بونے قد کا آدمی بھی ہے جس کی ناک ابھری ہوئی ہے، دونوں گال سرخ ہیں، سر پر سینک کی بنی انگریزی ٹوپی اور ہاتھ میں ایک چھڑی بھی ہے۔ بلندی کی نظر اس تصویر پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ "کون ہے یہ آدمی؟ اس کی ناک اتنی ابھری ہوئی کیوں ہے؟" انہیں سوالات کے پیچ و خم میں الجھی رہی کہ بغل میں بیٹھے نوجوان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "اس پوسٹر میں کیا دیکھ رہی ہو؟"

"اس لمبی ناک والے کو؟" بلندی نے بڑی

معصومیت سے جواب دیا۔
"کیا تم اسے نہیں جانتیں؟"
"نہیں!"
"وہ جوکر ہے۔" مختصر سا جواب دینے کے بعد نوجوان نے بیڑی کا ایک لمبا کش لیا۔
"کیا جوکر ایسا ہی ہوتا ہے؟" ملبندی حیرت زدہ نظر آنے لگی۔
"ہاں... ! تم بھی سرکس میں کیوں نہیں چلی جاتیں؟"
"مجھے دیکھا نہیں ہے۔" وہ مایوس ہو کر بولی۔
"چلو میں تمہیں لے چلتا ہوں وہاں۔"
سرکس کے اندر داخل ہوتے ہی سبھی جوکروں نے ملبندی کا تہہ دل سے خیر مقدم کیا۔ برلا نام کے ایک جوکر پر جب اس کی نظر پڑی تو بے ساختہ اسے پوسٹر کا وہ جوکر یاد آگیا جس کی ناک ابھری ہوئی تھی۔ اور دونوں گال بھی سرخ تھے۔ اپنی اصلی ناک پر سے ابھری ہوئی مصنوعی ناک نوچتے ہوئے برلا جب اس کے قریب گیا تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی، پھر بولی۔ "اس طرح آپ نے اپنا حلیہ کیوں بگاڑ رکھا ہے؟"
"دنیا والوں کو پھنسانے کے لئے میڈم جوکروں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔"
بہت جلد ملبندی نے خود کو سرکس کے ماحول میں ڈھال لیا۔ آج اسے برلا کے ہمراہ اس کی بیگم کے رول میں پہلا شو دینا ہے ——— جبھی برلا خیمے کے اندر داخل ہوا۔ "شو کا وقت ہونے جا رہا ہے ملبندی، لہذا فوراً اپنا حلیہ بگاڑ لو۔"
"بگڑے ہوئے حلئے کو اب اور بگاڑنے کی کیا ضرورت ہے برلا جی؟"
"مجھے دیکھو ملبندی! بالکل تمہارے جیسا ہوں، تین فٹ کا، کالا اور بدصورت بھی۔ پھر بھی حلیہ بگاڑنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کروں گا تو سرکس کا مالک فوراً گیٹ آوٹ کر دے گا۔" اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی ملبندی کو اپنا حلیہ بگاڑنا پڑا۔
برلا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیئے جب وہ گراونڈ پر پہونچی تو سارے تماشائی میں ہلچل سی مچنے لگی۔ کوئی تالیاں بجانے لگا، کوئی سیٹی مارنے لگا۔ تو کوئی یہ فقرہ کسنے لگا کہ "کیا جوڑی ہے"۔ گھبراہٹ کی وجہ کر ملبندی ادھر ادھر دیکھنے لگی جبھی اس کی نظر سوم ناتھ پر جا کر ٹھہر جاتی ہے وہ ایک نئی نویلی دلہن کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ ملبندی کو یقین ہو گیا کہ وہ دلہن ضرور اس کی بیوی ہوگی۔ "میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا ملبندی، کیونکہ تو بونی ہے۔" اس کے یہ جملے ملبندی کے دل و دماغ کو بڑی بے رحمی سے اذیت پہونچانے لگے۔ آخری بار سوم ناتھ کو دیکھنے کے بعد ملبندی اپنے قریب کھڑے برلا کو امداد طلب نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ اس طرح لرز رہے ہیں گویا کہہ رہے ہوں۔ "اونچے قد والوں نے مجھے جا بجا محض اس لئے ٹھکرا دیا ہے کہ میں ان کے قد سے بے حد چھوٹی تھی۔ لیکن اب میں تمہاری پناہ میں آگئی ہوں برلا۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے نہیں ٹھکراؤ گے کیوں کہ تم بھی میری ہی طرح بدنصیب اور مظلوم ہو۔"
شو اختتام پذیر ہونے کے بعد ملبندی سیدھے

اپنے خیمے میں جاکر آرام کرنے لگی اور برلا کے ساتھ زندگی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسی طرح کچھ وقت اور گذرا —— برلا میں اپنے تئیں ہمدردی نیز دلنوازی کا جذبہ پاکر بلندی اسے دل ہی دل میں چاہنے لگی۔ آرزوئیں پھر سے مچلنے لگیں۔ اب سوم ناتھ کی جگہ برلا اس کے خواب و خیال کی رہ گذر میں آمد و رفت کرنے لگا —— "کیوں نہ برلا کے ہمراہ دنیا آباد کرلوں۔ وہ بھی تو مجھے چاہنے لگا ہے" یہ خیال بار بار بلندی کے ذہن کو جھنجھوڑنے لگا۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے اپنا حال دل برلا کے سامنے ظاہر کر دینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

رات کے دو بج چکے ہیں۔ بلندی دھڑکتے دل سے برلا کے خیمے میں داخل ہوتی ہے۔ برلا ایک تکیہ سے ٹیک لگائے لیٹا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پوسٹ کارڈ نما کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جسے بلندی نظر انداز کرتی ہوئی شرارت کی نیت سے اس کے قریب پہنچتی ہے۔ اور پھر جیسے ہی اس نے برلا کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھنا چاہا کہ اس کا وجود لرز گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا —— برلا کو اپنی موجودگی کا بغیر کوئی احساس دلائے بلندی صرف اسی کے خیمے ہی سے نہیں بلکہ سرکس سے بھی باہر نکل جاتی ہے — اس کے دل و دماغ میں اسی خوبصورت اور لمبی دوشیزہ کی تصویر بار بار برق بن کر گر رہی ہے جسے برلا پیار بھری نظروں سے دیکھ اور چوم رہا تھا ——

باہر ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہوا ہے — اتنا کہ — بلندی کو شبہ ہونے لگا کہ وہ اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں ؟؟؟

شہر خیال

● "فن اور فنکار" نمبر کے بعد سہیل کے شمارے مستقل مل رہے ہیں۔ ممنون ہوں۔ "فن اور فنکار" نمبر کئی اعتبار سے تشنہ رہ گیا۔

بہار کی چند اہم ادبی شخصیتیں ہیں جن پر مضامین شائع کئے جا سکتے تھے۔ مثلاً رضا نقوی واہی، مظہر امام، احسان دربھنگوی۔ اویس احمد دوراں، صدیق مجیبی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، شین مظفر پوری، عبدالصمد وغیرہ

میں شرمندہ ہوں کہ ایک مضمون میری شاعری پر شائع ہو گیا۔ یہ ذرا قبل از وقت ہے ۔۔۔ (کیونکہ مضمون تھوڑا جذباتی قسم کا ہے اور پیرایۂ بیان بھی ادبی تدلیل سے عاری ہے)

آپ "شہر خیال" کے تحت کئی نامناسب خطوط کو بھی شائع کر دیتے ہیں۔ علی گڑھ کے کوئی حقانی القاسمی صاحب سہیل کالم میں برابر نظر آتے ہیں۔ ان کو کوئی ادبی موضوع دے کر مضمون لکھوایئے۔ ان کے خطوط سے خیالات کی بد ہضمی کا پتہ چلتا ہے۔

پروفیسر تارا چرن رستوگی ماہر ادیب ہیں مگر کچھ دنوں سے ذاتی مخاصمت اور ادبی عناد کے تحت لکھنے لگے ہیں۔ دہلی کے چار شاعروں پر ان کی تنقیدی حاشیہ آرائی کم مرتبہ چیز نظر آتی ہے۔ موصوف کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تنقید کا میدان گندہ ہو جاتا ہے۔

● جمال اویسی، دربھنگہ
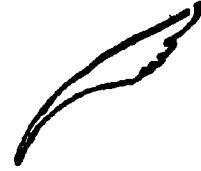
● سہیل کے دو شمارے یعنی نمبر ۶ اور سات پہلی بار چودھری ابن النصیر کی معرفت نظر نواز ہوئے ہیں۔ اب تک اس کے مطالعے سے محرومی کو میں اپنی ذاتی غفلت ہی گردانتا ہوں۔ اصغر علی انجینیر کے مقالے اور سید علی مظفر کی یادداشت پر مبنی دونوں اقساط بے حد مختصر ہونے کے باوجود اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں۔ شمارہ نمبر ۶ میں کرشن موہن کا "غالب" کو منظوم خراج عقیدت اور اداریہ کی شکل میں مظفر نواب پر آپ کا تعزیتی نوٹ مناسب، متوازن، مدلل اور معقول ہیں۔ غلام ربانی ([illegible]) کا مضمون اور ضیاء الانجم کے دوہے بالکل بونے اور بھرتی کے محسوس ہوئے۔ غزلوں میں یاور امان، کراچی عبدالمتین اور رؤف خیر ہی پسند آسکے۔ اس شمارے کے سبھی تبصرے اچھے لگے۔ "شہر خیال" کے تحت میں ان تمام مکتوب نگاروں سے متفق ہوں جنھوں نے تارا چرن رستوگی کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

شمارہ ۷ کا اداریہ بالکل بروقت اور جاندار ہے۔ علی عباس ازل کا "انجانے عقیدے" خورشید طلب کی بوسنیا کے پس منظر میں نظمیں، غفران کمار ورما کا بدلتے رنگ پسند آیا ۔۔۔ ● محمد ابراہیم صدیقی، الہ آباد

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

★

جلد ۵۳ — شمارہ ۱۲

بدل اشتراک

- فی شمارہ . . . . . . ۵/ روپے
- زر سالانہ . . . . . . ۵۰/ روپے
- لائف ممبری . . . . . . ۱۰۰۰/ روپے

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل

ریلوے سائیڈ روڈ، گیا

فون نمبر ۲۱۵۷۳ ؛ پن کوڈ ۸۲۳۰۰۱

نمود

سچّا ادب

سچے یا اصل ادب کی پہچان کیا ہے؟ وہ کون سے عناصر ہیں جن سے ادب کے سچے یا جھوٹے ہونے کی قدریں متعین ہوتی ہیں۔ اگر ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ سوال تہہ دار اور مختلف الجہات ہے، کئی دوسرے عوامل کو سمجھے بغیر یہ بتانا مشکل ہے کہ سچا ادب کسے کہا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں مختصر ترین لفظوں میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایسا ادب پارہ جو تخلیق کار کے سچے اور نہایت جذبے اور محرکات کا نتیجہ ہو اور جو قاری پر کم وبیش اتنے ہی شدید جذبے پیدا کر سکے، سچا ادب ہے۔

یہ ایک مجمل بات ہے جب ہم اس کی تفصیل کی طرف بڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ انسانی جذبے انسانی حالات کے مشاہدے اور ترجمانی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ فن کار اپنے معاشرے اور گرد ولواح میں جو کچھ دیکھتا ہے انسان کی مصیبت ومسرت کے جن کھٹے میٹھے محسوسات سے آشنا ہوتا ہے وہی سب کچھ ادب کا موضوع بنتے ہیں۔ اور اس طرح REPRODVCE ہوتے ہیں کہ مصیبت ومسرت سے پیدا شدہ محسوسات انسانی معاشرے کے لئے خیر وطمانیت کی قدریں بنا دیتے ہیں ـــــ اور یوں سچا ادب صالح معنویت کا منبع بن جاتا ہے۔

ادب صرف زندگی کی تصویر کشی نہیں، نہ یہ صرف ایسے اونچے اور معیاری نمونۂ حیات کا خواب دکھاتا ہے جو ہمارے معاشرے میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا یا یوں کہئے کہ ادب رومانی اور تخئیلی تصورات کی سیرگاہ بھی نہیں۔ ادب زندگی کے لئے ایک نسخۂ کیمیا تو پیش کرتا ہے مگر اسے استعمال کرنے والے کو خود بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اخلاقیات کا کوئی ٹانک پی رہا ہے۔ ادب اپنی جمالیات کے سہارے بڑے لطیف اور بسا اوقات غیر محسوس طور پر ہمارے لئے خیر و برکت اور مسرت وبہتری کا پیغام لاتا ہے ـــ یہی ادب ہے اور یہی سچا ادب ہے۔

مسعود منظر

محمد مثنیٰ رضوی

عطا محمد شعلہ — ایک شعلۂ مستعجل

[محمود آیاز کے نام جن کے ایک اداریہ
نے (سوغات ۲) میرے اندر اس تاثراتی
مضمون کے لکھنے کی تحریک پیدا کی۔]

عطا محمد کے نام سے میں پہلے پہل اس وقت واقف ہوا۔ جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا یہ بات (۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء) کے آس پاس کی ہے میں استادِ محترم پروفیسر اعجاز حسین کے کمرہ سے ان کا لکچر سن کر نکل رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ان کی میز پر رکھے ہوئے ایک اردو ہفتہ وار پر پڑی یہ بمبئی سے شائع ہونے والا رسالہ "نظام" تھا ایک مضمون نے خاص طور پر متوجہ کیا یہ دراصل ایک طویل اور جامع تبصرہ تھا جو عطا محمد نے کرشن چندر کی مرتب کی ہوئی کتاب "نئے زاویے" پر کیا تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کے تبصرے کا لب و لہجہ خاصا سخت تھا مگر اس میں جو تازگی اور طرفتگی تھی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ لکھنے والے کا نام ذہن پر نقش ہو گیا کچھ دنوں بعد اپنے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں ایک دوست کے پلنگ پر "نیا ادب" کا ایک شمارہ پڑا دیکھا۔ اِدھر اُدھر سے پلٹ کر دیکھا بڑے بڑے نام نظر آئے۔ عطا محمد کا ایک مقالہ بھی شامل تھا جس میں "جدید غزل" کے مزاج اور امکانات سے بحث کی گئی تھی پھر اسی ندرت اور جدت فکر کا احساس ہوا۔ میں نے ایک ہی نشست میں پورا مقالہ پڑھ ڈالا اس بار نقش کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ شاید یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہو کہ اسی ہوسٹل کے ایک دوسرے کمرہ میں ضمیر الدین احمد سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے ابھی تک اس ملاقات کا تاثر محو نہیں ہو سکی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ اردو کے نئے نقادوں پر بڑی لمبی گفتگو ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری کے طالب علم رہ چکے تھے اور ان کی تنقیدی نظر کے بڑے معترف تھے۔ ضمیر الدین احمد نے آگے چل کر افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی لیکن ان دنوں وہ افسانے لکھتے تھے یا نہیں مجھے اِس

کا علم نہیں اس ملاقات میں اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع ہے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر تھا عطا محمد کا اور ذکر چھڑ گیا ضمیر الدین احمد کا۔

جب میں ایم۔ اے کرنے کے لئے خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایما پر علی گڑھ پہنچا تو "نیا دور" (بنگلور) میں نئے نقادوں پر بڑے تیکھے سکو خیال انگریز انداز میں لکھے ہوئے مضامین کا ایک سلسلہ نظر سے گذرا یہ سارے مضامین عطا محمد کے زور قلم کا نتیجہ تھے ان میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کی تنقید نگاری پر بڑی سخت باتیں کہی گئی تھی۔ کلیم الدین احمد نے جس جارحانہ انداز میں اردو شعراء کی تنقید کی تھی عطا محمد نے اس سے بھی زیادہ کڑوے لب لہجہ میں کلیم الدین احمد کی خبر لی تھی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اس میں منطق اور استدلال کی قوت بھرپور موجود تھی۔ انتہائی فکر خیز اسلوب میں عطا محمد نے کلیم الدین احمد کی تنقیدی ڈھانچا کی پوری بنیاد اکھاڑ پھینکی تھی اس مضمون کے تیکھے پن اور نئے فن کا لطف اور مزہ آج بھی یاد ہے ان کی نظر میں کلیم الدین احمد شعری ذوق اور ادبی حس سے عاری تھے۔ سرور صاحب پر ان کا مضمون کم جارحانہ نہیں تھا۔ ان کے خیال میں سرور صاحب شعر و ادب کے متعلق اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی کے اسلوب نثر کا تجربہ اتارنے کی کوشش میں ان کی تنقید نگاری اور بھی ہلکی ہو گئی۔ مجھے عطا محمد کی یہ رائے قطعیت کا شکار نظر آئی۔ غالباً اس تاثر کا سبب یہ تھا کہ ان دنوں دوسرے نوجوان طالب علموں کی طرح آل احمد سرور کی تنقید مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔ مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں میٹھی میٹھی شیریں تنقید۔

کچھ دنوں بعد باقر مہدی کے ساتھ سرور صاحب سے ملنے ان کے بیرو روڈ والے مکان پر گیا وہ ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔ ان کے سامنے ،نیا دور، کا شمارہ پڑا ہوا تھا باتوں ہی باتوں میں میں پوچھ بیٹھا کہ عطا محمد کے اس مضمون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ عطا محمد نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میں نے انہیں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ عطا محمد ہیں کون صاحب، سرور صاحب کو تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اتر پردیش کے کسی ضلع میں نائب تحصیل دار ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین ہیں۔ ایک بار محمد حسن عسکری کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے اور کسی ادبی جلسے میں ایک مختصر سا مقالہ بھی پڑھا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اور ایک مدت تک ان کا خیال بھی نہیں آیا۔ اچانک ایک دن جب میں برادر محترم سبط محمد نقوی کے یہاں اکبر پور میں ٹھہرا ہوا تھا عطا محمد کا ذکر نکل آیا۔ باتیں کرتے کرتے سبط بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ عطا محمد کے نام سے میں واقف ہوں یا نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے کئی مضامین پڑھ چکا ہوں۔ جنہوں نے مجھے خاصا متاثر کیا پھر میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا سبط بھائی نے بتایا کہ عطا محمد اکبر پور کے تحصیل دار ہو کر آئے ہیں آج شام کو ان کے گھر چلوں گا ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عطا محمد سے ملاقات ہو گی وہ بھی اپنے ہی ضلع میں۔

شام کو میں جب سبط بھائی کے ساتھ تحصیل دار کے سرکاری بنگلہ کی طرف جا رہا تھا تو خوشی کے احساس کے ساتھ تھوڑی سی ہچکچاہٹ بھی تھی۔ اس دن یا ایک، دو دن پہلے "قومی آواز" کے میگزین والے حصہ میں آل احمد سرور پر میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جو کچھ زیادہ

تحسین آمیز تھا۔ دراصل مجھے عطا محمد صاحب کے اس مضمون کا خیال آگیا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اتنے میں ہم لوگ ان کے مکان پر پہنچ گئے جہاں پہلے ہی سے محفل جمی ہوئی تھی۔ ان سے باقاعدہ تعارف ہوا، ادب، سیاست، صحافت اور نہ جانے کن کن موضوعات پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ بڑے دلچسپ اور صاف گو آدمی لگے۔ میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں میرے اس مضمون کا ذکر نہ نکل آئے جو "قومی آواز" میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ حادثہ پیش نہیں آیا۔ اور میں بہت خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

دو تین دن بعد میں شام کے وقت ان سے پھر ملنے گیا۔ بڑے تپاک اور محبت سے ملے ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے ملنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، خاصے وجیہہ آدمی تھے۔ سرخ و سفید، لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم جسم والے مسکراتا ہوا چہرہ غرض کہ بیک وقت باوقار اور دل آویز شخصیت کے مالک تھے لوگوں سے پتہ چلا کہ جب اپنے دفتر میں ہوتے ہیں تو نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن میرا ان کے سرکاری معاملات سے کیا لینا دینا۔ دوسری ملاقات میں شعر و سخن کی محفل گرم ہوا تھی انہوں نے تحت لفظ میں اپنی کئی غزلیں بعض دوستوں کی فرمائش پر سنائی۔ مجھے پہلی بار ان کے اچھے شاعر ہونے کا علم ہوا ابھی تک میں ان کو ایک بانکے، تیکھے اور طبع نقاد کی حیثیت سے جانتا تھا اب مجھ پر ان کی شخصیت کا ایک نیا گوشہ روشن ہوا اپنے سرکاری حیثیت میں وہ جس قدر سخت اور بارعب شخص رہے ہوں لیکن نجی محفل میں بہت خوش اخلاق نرم گفتار اور دلچسپ النسان تھا وہ۔ ان کے ماتحت اہل کار بھی ملاقاتیوں میں شامل تھے اور وہ ان کے ساتھ بھی بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آرہے تھے اسی طرح کے ذہنی تحفظات کے بغیر اس بار انہوں نے مجھ سے شاد عظیم آبادی پر

وہ شاد عظیم آبادی پر نئے انداز سے ایک طویل مقالہ لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس شاد کا مجموعہ کلام "میخانۂ الہام" موجود نہیں تھا انہیں اس کی تلاش تھی جب میں چھٹیاں گذار کے بہار واپس پہنچا تو ایک لائبریری سے کتاب حاصل کرکے ان کے پاس بھیج دیا بعد میں بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ انہوں نے "میخانۂ الہام" کا مطالعہ غائر نظروں سے کیا تھا اور کئی نئے اور دلچسپ نکتے ان کے ذہن میں تھے مگر دفتری کاموں کی مشغولیت نے انہیں شاد پر تنقیدی مضمون لکھنے کا موقع ہی نہیں دیا اگر وہ یہ مضمون لکھ سکتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ شاد عظیم آبادی پر عزیز احمد کے تنقیدی مقالہ سے کم اہمیت کا حامل نہ ہوتا جہاں تک مجھے علم ہے شاد پر وہ اپنا مضمون نہیں لکھ سکے شاد پر ان کا لکھا ہوا کوئی مضمون میری نظروں سے نہیں گذرا۔

اکبر پور جب بھی جانا ہوتا ان سے ضرور ملتا ایک بار ان کے ساتھ۔ ٹونس ندی میں بوٹنگ کرنے کا موقع ملا اور دوسرے واقعات اور لطیفوں کے ساتھ ساتھ بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی پر لطف باتیں معلوم ہوئی۔ کشتی میں ان کے ماتحت کام کرنے والے چند حضرات بھی موجود تھے مگر وہ کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے بغیر لطیفے بھی سناتے رہے اور مذاق بھی کرتے رہے جب قربت کچھ اور بڑھی تو انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی

اور تعلیم کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ایسی باتیں بتائی
جن سے ان کے لئے جذبۂ احترام اور بڑھتا گیا وہ مغربی
اتر پردیش کے رہنے والے تھے میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل
کر کے ڈاکٹر بننا چاہتے تھے اس لئے انٹرمیڈیٹ کا امتحان
انہوں نے سائنس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا تھا آگے
چل کر ان کے معاشی حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا
کہ میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنا تو درکنار وہ اپنے
یونیورسٹی کی تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکے نامساعد حالات
سے مجبور ہو کر انہوں نے نائب تحصیل داری کے مقابلے کا
امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی ملازمت کرتے
ہوئے۔ انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کی ڈاکٹر
بننے کا جو شوق ان کو بچپن سے تھا اس نے کسی لمحے ان کا
ساتھ نہیں چھوڑا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کرنے
کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن اپنی ذاتی لگن اور مطالعہ سے
انہوں نے "ہومیوپیتھک" میں خاص مہارت حاصل کر لی
تھی۔ لوگوں کا مفت علاج کیا کرتے تھے اور ان کے بیان
کے مطابق فیل پاؤں اور گھیگھا ایک بیماری جس میں گلا غیر
معمولی طور پر سوج جاتا ہے کے بہت سے مریضوں نے ان
کے علاج سے شفا پائی۔ اکبر پور سے ان کا تبادلہ ہو گیا۔
اور اب صرف ان کی یاد باقی رہ گئی۔

ایک عرصہ بعد اچانک ایک دن یہ خبر معلوم ہوئی
کہ عطا محمد صاحب تحصیل ٹانڈہ کے تحصیل دار ہو کر آ گئے ہیں
یہ بات مجھے میرے ایک دوست عزیز نے بتائی جن کا مقدمات
کے سلسلے میں تحصیل سے اکثر واسطہ رہتا تھا۔ میری خوشی
کی کوئی حد نہ رہی ٹانڈہ اکبر پور سے ۱۲ میل ہے اور میرا
آبائی گاؤں سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ میں ان
سے خاص طور پر ملنے کے لئے ٹانڈہ گیا۔ دیکھ کر بہت خوش
ہوئے اور بہت محبت سے ملے بڑی دیر تک گپ شپ
ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت انہوں نے مجھے "نقوش" کے
شخصیات نمبر کا دوسرا حصّہ پڑھنے کو دیا جسے میں اپنے
چھٹیوں کے بعد بہار لیتا گیا ٹانڈہ میں انہوں نے
بڑی محنت اور جدوجہد کر کے ایک کل ہند مشاعرہ کروایا
تھا جس کی صدارت اختر انصاری نے کی تھی وہ اختر
انصاری کے پرستاروں میں تھے اور یہ محسوس کرتے تھے
کہ اردو ادب میں ان کو جو مقام ملنا چاہئے تھا وہ نہیں
ملا۔ اس طرح ادب میں اختر انصاری کی جو حق تلفی ہوئی
تھی عطا محمد اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے مگر یہ سودا انہیں
بہت مہنگا پڑا کیونکہ ٹانڈہ کے کچھ مفاد پرست سیاسی
کارکنوں نے ان کے خلاف پروپیگنڈہ کی ایک مہم چلائی
اردو کے ایک جاں نثار خادم اور محبت کرنے والے کی
حیثیت سے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا گیا۔ بات
دراصل یہ تھی کہ عطا محمد بڑے کھرے اور صاف گو
انسان تھے اور اصول کے معاملہ میں بڑے سے بڑے کو خاطر
میں نہیں لاتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے افسر کی موجودگی میں
تنگ نظر اور موقع پرست نیتاؤں کو غلط اور ناجائز
کام کروانے کا موقع نہیں ملتا تھا اس لئے وہ برابر ان
سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔
چنانچہ اب وہ گھڑی آ پہنچی تھی کہ وہ اپنا کھیل کھل کر
کھیل سکیں۔ عطا محمد ڈرنے والے آدمی تھے نہیں سپر ڈال
دینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو
ہونا چاہئے تھا۔ ان کا تبادلہ کر دیا ٹانڈہ کی جنتا
کو بڑا صدمہ پہنچا لیکن بدنیت نیتاؤں نے اطمینان
کی سانس لی۔

میں پچھلے کئی ماہ سے باہر تھا اس لئے مجھے ا

ہیں گیا
زمیوں کا علم نہیں تھا جن میں مفاد پرست
ں مصروف تھے ایک دن میں خاتمۂ زمینداری
BOND لینے کے لئے تحصیل گیا۔ عطا محمد صاحب
ر پر ملا مگر ان کو اپنی غرض نہیں بتلائی میں بے حد
ن اور متفکر تھا کیونکہ سنیچر کا دن تھا جب خزانہ
یں ہی بند ہو جاتا ہے لگتا تھا کہ دوپہر تک مجھے
BON نہیں مل سکیں گے کیونکہ ان کے ساتھ نقد
ملنے والی تھی۔ جیب میں جتنے پیسے تھے وہ کاغذات
STAMP خریدنے میں خرچ ہو گئے اگلا دن
کا دن تھا شام کی گاڑی سے مجھے بہار کے لئے
ہونا تھا چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں سمجھ میں نہیں
تا کہ کیا کروں اسی کشمکش میں ادھر ادھر ٹہل رہا
عطا محمد صاحب کا چپراسی تلاش کرتا ہوا آپہنچا
ن کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے کھانے
وران انہوں نے بار بار پوچھا کہ کس بات کی
انی ہے میں بار بار ٹالتا رہا لیکن انہوں نے کہا کہ
سی نہ کسی سلسلے میں یقیناً کافی متفکر ہوں جب
نے انہیں اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو بڑے زور
ہنسے۔ کہنے لگے بس اتنی سی بات ہے انہوں نے
ب کی ایک میز پر سے ایک مسودہ اٹھایا اور مجھے پڑھنے
ے دیا۔ احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر ان کا
ترین مقالہ تھا جو بعد میں "نقوش" کے کسی شمارے
شائع ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احتشام صاحب
ں سے بہتر مضمون نہیں لکھا گیا خود احتشام صاحب
کے معترف تھے نظام صدیقی نے اپنے ایک طویل
ہ میں جو "احتشام حسین ایک عہد ساز نقاد" کے
ان سے "آہنگ" کے احتشام حسین نمبر میں شائع

ہوا تھا۔ اس بات کا ذکر کیا۔ میں نے کہا جناب والا
میری دشواری یہ ہے کہ دوپہر تک خزانہ بند ہو جائے
گا۔ کہنے لگے حضرت آپ کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا
ہے وہ تحصیل کا بادشاہ ہے خزانہ میرے حکم سے شام
تک کھلا رہے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا مجھے اپنے
معاوضے کی رقم اور BONDS تقریباً ۹ بجے رات
میں ملے۔ رات کافی ہو چکی تھی اس لئے ان کو زحمت نہیں
دینا چاہتا تھا انہیں اطلاع دیئے بغیر اپنی قیام گاہ پر
چلا آیا صبح سویرے اٹھ کر سیدھے ان کے بنگلے کا رخ
کیا وہ ضلع کانگریس کے صدر سے مصروف گفتگو تھے بلکہ
یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کو کھری کھری سنا رہے تھے۔
وزیر صاحبان سرکاری دورے کرتے ہیں اور ان کے کھانے
پینے کے اخراجات بیچارے حکام کو برداشت کرنے پڑتے
ہیں پلٹ کر کبھی نہیں پوچھتے کہ بھیا یہ پیسے کہاں سے آئے
کہنے لگے کہ وزیر اعلیٰ ہو تو سمپورنانند جی جیسا ہو تم لوگوں
کو اس کی زندگی اور اس کے کردار سے سبق لینا چاہئے اپنے
دفتر سائیکل پر جاتا ہے اور صرف ۵۰۰ روپیہ تنخواہ لیتا
ہے اگر وہ اتنے میں گذر کر سکتا ہے تو تمہارے وزیر کیوں
نہیں کر سکتے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ میں
رات بھر اس خیال سے پریشان رہا کہ پتہ نہیں آپ کو معاوضے
کے BONDS ملے یا نہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور
فوراً ان کو اطلاع نہ کرنے کی وجہ بتلائی تب انہوں نے کہا
بحیثیت تحصیل دار کے ناندہ میں یہ ان کا آخری دن تھا وہ
تبادلے پر کسی اور ضلع میں جا رہے ہیں ایک لمبے عرصہ کے بعد
معلوم ہوا کہ وہ ترقی پا کر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں کبھی کبھی ان کی
خیریت مل جایا کرتی تھی۔ ایک دن کسی دوست نے بتایا کہ
عطا محمد شعلہ کا انتقال ہو گیا ایسا لگا جیسے زندگی میں کوئی

باشعور تجربہ کار ادبا کو شامل کرکے اس پرچے کی ادبی وقار
کو اور بھی اونچا کیا ہے۔ مگر ان ناموں کی شمولیت کے علاوہ
"سہیل" میں آپ جو ادب اب تک شائع کیا ہے وہ قابل
قدر ہے۔ قیصر عثمانی نمبر کی یاد ہنوز تازہ ہے۔ حال ہی
میں "سہیل" نے رضا اشک سستی پوری نمبر شائع کرکے
آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ "سہیل" بہار کے ادبا و شعرا
کی خدمات کو سراہتا اور ان کی اہمیت کا اعتراف کرتا
ہے۔ رضا اشک نمبر میں ملک کے مقتدر اہل قلم نے حصہ
لیا۔ ان کے مقالات سے رضا اشک کو یقیناً روشنی
ملی ہوگی۔ صحیح تنقید شعرا و ادبا کے اندر صحیح تنقیدی
شعور پیدا کرتی ہے۔

"سہیل" کے شمارہ ۱۲ جلد ۵۲ میں آپ
نے اپنے اداریہ "نمود" میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی
گہری سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ کانگریس کو اب
ختم ہو جانا چاہئے۔ اس ظالم نے اپنی غلط اقتصادی
پالیسیوں کی وجہ سے ہندوستان کے غریب اور بھوکے
ننگے عوام کی ناؤ ڈبوئی ہے۔ اس نے فرقہ پرست پارٹیوں
کی اس طرح پرورش وپر... ہے جس طرح زہریلے
سانپ کو دودھ پلا کر پالا جاتا ہے۔ اس نے ہندو
اکثریت کو فرقہ پرستی سکھائی۔ مسلم اقلیت کو بھی اسی
نے فرقہ پرستی کی طرف زبردستی ڈھکیلا۔ آج دونوں
فرقے ایک دوسرے کے خلاف زہریلے جذبات سے بھرے
ہوئے ہیں۔ اگر کانگریس اور اس کی حکومت چاہتی تو
دونوں کو صحیح معنوں میں سیکولر بنا کر ہندوستان سے
فرقہ پرستی کی لعنت ختم کر سکتی تھی مگر اس نے یہ کام کبھی
نہیں کیا۔ دکھاوے کے طور پر جمہوریت، سوشلزم اور
سیکولرازم کا نعرہ دیا لیکن اصل میں ملکی و غیر ملکی اجارہ
دار سرمایہ داروں کو کھلی چھوٹ دی کہ جو چاہو کرو۔
غریبوں کا خون چوس کر انہیں ٹی بی، کینسر اور دیگر مہلک
بیماریوں میں مبتلا کر دو۔ آج بھی کانگریسی حکومت جو مرکز
میں ہے اس کی ہندوستان دشمن اقتصادی پالیسی کی وجہ
سے امریکہ، برطانیہ، جاپان اور فرانس کی ملٹی نیشنل کمپنیوں
کو ہندوستان جیسے بڑے بھرے ملک کو دونوں ہاتھوں سے
لوٹنے کا سنہری موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ ڈنکل تجاویز کو اگر
ہری جھنڈی دکھا دی گئی جس کا قوی امکان ہے تو پھر
یہ ملک اور اس کے عوام اور بھی اقتصادی پسماندگی کے
شکار ہو جائیں گے۔ ڈنکل تجاویز ہماری اقتصادیات پر
مکمل کنٹرول حاصل کر لیں گے۔ زرعی و صنعتی پیداوار، ان
کی تقسیم کے سسٹم اور قیمتوں پر غیر ملکی خصوصاً امریکہ
کا ان ڈائریکٹ قبضہ ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ چاول کی
قیمت بیس روپے کیلو ہو جائے۔ آزادی کے بعد کانگریس
نے زمام حکومت ہاتھوں میں لینے کے بعد اور بھی عوام دشمنی
کا رخ اختیار کیا۔ اس کے رہنماؤں کے اندر سے رفتہ
رفتہ جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کے قیام و
استحکام کے لئے جذبات دھیمے پڑتے گئے اور آج ان کے
دلوں میں ان جذبات کی رمق دور دور تک نظر نہیں آتی۔
نیشنلزم کے جذبات بھی کانگریسی رہنماؤں میں اب شاید باقی
نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ہندوستان
میں سرمایہ کاری کی مکمل اجازت دے کر اقتصادی غلامی کی طرف
گامزن نہیں ہوتے۔

آزادی کے بعد اردو جیسی جمہوری اور سیکولر کردار کی
حامل شیریں اور ملک گیر زبان کی قبر کانگریس ہی نے کھودی۔
بظاہر اس کے رہنماؤں نے اردو زبان کی شان میں قصیدے
بھی پڑھے۔ اس کی شیرینی اور عوامی مقبولیت کی تعریف بھی

کی۔ بعضوں نے فخر یہ کہا کہ اردو ان کی مادری زبان ہے مگر سب جھوٹ۔ انہوں نے کبھی اردو اور اس کے رسم الخط کی اپنے طرز عمل کے ذریعہ گارنٹی نہیں دی۔ بلکہ آنجہانی نہرو اور ان کی صاحبزادی کے زمانۂ اقتدار میں تو اردو کے رسم الخط کو دیوناگری رسم الخط میں تبدیل کرنے کی گہری سازشش رچی گئی۔ خود پنڈت نہرو یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے اردو ادبا و شعرا کے ایک ایسے حصے کو اس معاملے میں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا جو ان کے دور اقتدار میں مشاہیر اردو ادب تصور کیے جاتے تھے۔ یہ وہ ادبا و شعرا تھے جو اپنی ساری ترقی پسندی کو طاق پہ رکھ کر اکثر معاملات میں آنجہانی پنڈت نہرو کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے تھے۔ اس سے اردو کے مقدر ہی کو صرف نقصان نہیں پہنچا بلکہ دیگر سیاسی و اقتصادی امور بھی الجھ کر رہ گئے۔ مزدور کش پالیسیاں وضع کی گئیں اور ہمارے بہت سے مزدور رہنماؤں نے ان پالیسیوں کی حمایت کی۔ کانگریس کے نقش قدم پر چل کر دوسری سیاسی پارٹیاں بھی اردو سے مخاصمت اور نفرت کرنے لگیں۔ یہ نفرت بڑھتے بڑھتے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ۱۹۶۷ء میں بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فسادات کرا گئی۔ اس کے بعد بھی ہمارے حکمراں طبقہ نے وقتاً فوقتاً اردو کے مسئلہ کو نزاعی بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اوپر سے اردو کی حمایت اور اندر سے اس کی بربادی کے سامان کرتے اور کراتے رہے۔ آزادی سے قبل بھی انڈین نیشنل کانگریس کا رویہ اردو اور اقلیت کے تئیں ہمیشہ مشکوک رہا حالانکہ اردو نے جنگ آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف بھرپور حصہ لیا۔ اقبال، حسرت موہانی، جوش، فراق فیض احمد فیض، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، مخدوم، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، اجتبیٰ رضوی، احمد ندیم قاسمی، مجاز و جذبی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، وامق جونپوری اور درجنوں شعرا نے برطانوی سامراج کے خلاف باغیانہ نظمیں لکھیں۔ ان میں سے اکثر شعرا کو قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ ادیبوں میں پریم چند ان جیسے مخلص و ایماندار افسانہ نگاروں نے گوری چمڑی والے آقاؤں کی نیند حرام کر دی تھی۔ پریم چند کو حکومت برطانیہ کا عتاب ہمیشہ خوف و سراسیمگی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ رکے نہیں۔ فکر و قلم کا سہارا لے کر حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہو کر وطن کی آزادی کے گیت گائے۔ اس نے مزدوروں اور کسانوں کے لئے اپنی ساری زندگی لکھا۔ ہندوستان اور اس کے عوام کی سیاسی و اقتصادی آزادی پریم چند کے ادبی موضوعات کا غالب اور مؤثر حصہ ہیں۔ جن شاعروں اور ادیبوں کا ذکر بطور بالا میں پنڈت نہرو کے دور اقتدار میں اسی طرح جیلوں میں ٹھونسا جس طرح برطانوی سامراج نے اپنے جبر و تشدد کے زمانہ میں مولانا حسرت موہانی جیسے زبردست مجاہد آزادی اور دیگر محب وطن اردو شعرا و ادبا کو قید بامشقت کی سزائیں دی تھیں۔ کانگریس کی منافقانہ پالیسیوں اور اس کی بداعمالیوں کی فہرست بہت لمبی ہے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی اس پارٹی کی اب ہندوستان کے عوام کو اس طرح ضرورت نہیں ہے جس طرح بی۔ جے۔ پی اور دیگر جارحانہ فرقہ پرست پارٹیوں کی ضرورت نہیں۔ مذاہب اپنی اصلی شکل اور اصلی روح میں اچھی چیزیں ہیں۔ مگر یہ پرائیویٹ چیزیں ہیں۔ ان کا سیاست سے کیا کام؟ مذہب تطہیر روح کے لئے ہے۔ یہ عبادت خانوں اور عبادت کے لئے ہے۔ حکومت کرنے کے لئے ہرگز نہیں ہے۔

، دسیاست کا باہم شیروشکر ہونا چنگیزیت ہے۔
اقبال کی حسین شاعری کا عاشق ہوں۔ اس شاعری
رزو شعریت پر جان چھڑکتا ہوں۔ مگر اقبال کی نظم
ہ وسیاست، کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ اقبال کی وہ
ری جو حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہے اور وہ شاعری
زدور طبقہ کے عالمی اتحاد پر زور دیتی ہے اور جس
سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بے مثال جوش وخروش
ظہار ہے میں اس کا والہ وشیدا ہوں۔ اقبال کی
شاعری بھی میری روح کو تڑپاتی ہے جس میں حرکت و
ن کا پیام اور ہجر و فراق کی کیفیت پنہاں ہے۔ بہرحال
یاست کو ریاست سے اور مذہب کو انسان کی باطنی
حانی تطہیر سے تعلق رکھنا چاہئے۔ میری دانست میں
با ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر افسوس کہ ایسا اب تک نہیں
۔ لیکن اس کے لئے انسان کی جدوجہد جاری ہے۔
ے نہ ایک دن خدا کی بنائی ہوئی یہ حسین وجمیل دنیا جو
تھی جنتِ ارضی ہے وہ غلط مذہب اور غلط سیاست
، پاک ہو کر رہے گی۔ افسوس مگر ہے تو اس کا ہے
غلط مذاہب کی آڑ لے کر حکمراں طبقہ نے ہمیشہ دنیا اور
ن پر بسنے والی ننگی، بھوکی اور پیاسی مخلوق کو تہہ تیغ
اور کل باغ عالم کو جہنم بنا ڈالا۔ اسرار الحق مجاز
ایک شعر یاد آرہا ہے جو اس تلخ اور خونریز کہانی
ایک کڑی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مجاز نے سرمایہ
ری کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے

بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر کل باغ عالم کو جہنم کر دیا اس نے

پہ اسی سے ملتا جلتا فراق کا بھی ایک شعر ہے جس سے
ری کو یہ عرفان حاصل ہوتا ہے کہ سرمایہ داری ر: محق

ہند کے نو شگفتہ پھولوں کو قبل از وقت مرجھا کر رکھ
دیتی ہے۔ مگر کیا یہ چند فرعون ہمیشہ فرعونیت
کرتے رہیں گے؟ کیا کمزور طبقہ ہمیشہ دبایا اور کچلا
جاتا رہے گا؟ کیا دنیا بھر کی اقلیتیں اس طرح تہہ تیغ
رہیں گی؟ کیا انسانی بھوک اور پیاس ہمیشہ اسی
طرح برقرار رہیں گی؟ کیا ہندوستان اور ہندوستان
سے باہر کی عبادت گاہیں اسی طرح مسمار کی جاتی رہیں
گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ سرمایہ داری جب تک باقی ہے،
امریکہ کی بالادستی اور اس کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو
کی جارحانہ پالیسی کا جب تک بول بالا ہے تب تک ساری
دنیا اس کربناک صورت حال سے دوچار رہے گی۔
یہ امریکہ ہے جو ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا
منصوبہ بنا کر اس پر اسی طرح عمل پیرا ہے جس طرح کبھی
برطانوی سامراج عمل پیرا تھا۔ اس معاملہ میں تو امریکہ
برطانوی سامراج سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے وہ
یوں کہ برطانیہ نے ہندوستان پر حکومت کرنے کی غرض سے
اس کو متحد رکھا۔ لیکن امریکہ نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے
کی ٹھان لی ہے۔ راجستھان میں اندرا گاندھی کے دور
اقتدار میں امریکہ کے صفیر نے وسیع پیمانہ پر دورہ کیا۔ اس
کے بعد ہی روپ کنور کا المیہ اور لاکھوں چولوں کے میلے کا
واقعہ ظہور ہوا۔ ہندوازم کے احیاء اور اس کے جارحانہ پن
میں امریکی صفیر کے راجستھانی دورہ کے بعد اور بھی شدت آئی۔
اندرا جی کی نظروں کے سامنے سات بہنوں (Seven Sisters)
یعنی سات دریاؤں کا وادی برہمپتر نامی امریکی منصوبہ تیار ہوا۔
جس کے تحت آسام وغیرہ میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اقلیتیں
خاص کر مسلم اقلیت بے گھربار ہوئیں۔ طرح طرح کی علیحدگی
پسند تحریکیں اپنی پوری جارحیت وبربریت کے ساتھ ابھریں

جن کو امریکہ اور کرسچن مشنریوں کی مکمل حمایت حاصل رہی۔ یہ خونریز تحریکیں ہنوز سرگرم عمل ہیں اور ہندوستان کو پارہ پارہ کرکے اس کی وحدت و سالمیت کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہیں۔

کمیونسٹ رہنماؤں اور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو آزادی کے بعد جیل کی ہوا اسی لئے کھانی پڑی تھی کہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کو نامکمل کہا تھا۔ ان کا یہ خیال صدفی صد درست تھا کہ ہندوستان نے سیاسی آزادی ضرور حاصل کی مگر اقتصادی غلامی کی ان دیکھی زنجیروں میں ہنوز جکڑا ہوا ہے۔ گوری چمڑی والے انگریزوں کی جگہ کالی چمڑی والے برلاؤں، ٹاٹاؤں اور دیگر ملکی اجارہ دار سرمایہ داروں نے لے لی۔ جن کی ہندوستانی پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں پا درفل لوبیاں ہیں۔ جتنے کانگریسی اور دیگر سرمایہ داروں کی پارٹیوں کے ایم۔پی اور ایم۔ایل۔اے ہیں وہ سب عوام دشمن اور ملک دشمن پالیسیوں کے حامل ہیں۔ ہمارے ملک پر غیر ملکی سرمایہ کی بالادستی ان کی وجہ سے ہے۔ کمیونسٹوں نے ہمیشہ ان حقائق سے پردہ اٹھایا اسی لئے وہ مغضوب و معتوب قرار دیئے گئے۔ جو نقشہ کار ہندوستان کا ہے لگ بھگ وہی پاکستان کا بھی ہے۔ وہ بھی امریکہ کا غلام اور ہمارا ملک بھی امریکہ کا حاشیہ بردار۔ پاکستان کے اردو شعراء و ادباء کو بھی وہاں کے حکمراں طبقہ کے سیاسی عتاب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں جس شاعر یا ادیب نے عسکریت پسندی اور فوج کی آمریت یا امریکہ کے خلاف لب کشائی کی اس کی خیریت نہیں رہی — فیض احمد فیض کے بعد حبیب جالب، فہمیدہ ریاض، احمد فراز، سب کے سب سیاسی طور پر معتوب اور مغضوب ہوئے۔ کیا برصغیر ہند و پاک کی آزادی ہنوز نامکمل نہیں ہے؟ کیا برطانیہ کی جگہ دونوں ملکوں میں امریکہ نے نہیں لی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ برطانیہ کے دور میں پاکستان نہیں تھا بلکہ وہ بھی ہندوستان ہی کا حصہ تھا۔ اور برطانیہ ڈائریکٹ حکومت کرتا تھا لیکن امریکہ دونوں ملکوں میں ان ڈائریکٹ حکومت کر رہا ہے؟ پاکستان میں زیادہ اور ہندوستان میں کم —

یہ تمام خونریزی۔ جبر و استحصال اور ظلم و تشدد ہم ہندوستانیوں خصوصاً اقلیتوں پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔ ان پر مایوسیوں اور خوف و ہراس کا عالم طاری ہے۔ مگر یہی انسان شروع سے آج تک تمام ظلم و جبر و استحصال کے خلاف لہو لہان ہو کر بھی جدوجہد کرتا آیا ہے۔ انسانی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ انسان نے کبھی ہار نہیں مانی ہے۔ آئندہ بھی نہیں مانے گا۔ وہ بھی بھوک، پیاس، افلاس، جہالت، بیماری اور بے قراری کو ختم کرکے رہے گا۔ کانگریس ہو یا بی۔جے۔پی یا دیگر جارحیت پسند زہریلی جماعتیں جو خود اکثریت میں مبتلا ہیں۔ اپنے اپنے اندرونی و بیرونی تضادات سے بھی ٹوٹیں گی۔ اور عوامی جدوجہد کا طوفان بھی ان کو نیست و نابود کر ڈالے گا۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں چند برس اور لگ جائیں۔ لیکن تاریخ کا عمل چند دن، چند مہینے اور چند سال نہیں دیکھتا۔ ویسے موجودہ زمانہ بہت تیز رفتار ہے۔ صدیوں کے مرحلے مہینوں اور مہینوں کے مرحلے چشم زدن میں طے ہو رہے ہیں۔ فیصلہ کی گھڑی ایسا لگتا ہے کہ قریب آگئی ہے۔ ہر پارٹی اپنا اپنا دفتر عمل لئے کھڑی ہے۔ عوام اس فیصلہ کی گھڑی کے حکم ہیں۔ میری دانست میں عوام کا فیصلہ آخر میں اس پارٹی کے حق میں ہوگا جو مزدوروں اور کسانوں کی ہے اور جو طبقاتی شعور و جدوجہد کا مشکل ترین کام کر رہی ہے۔ ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا استحصالی نظام اور امریکہ کی پولس مین شپ سے بے زار ہے وہ اس سے نجات پانے کی فکر کر رہی ہے۔ آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ مزدور اور کسان جو غالب اکثریت میں ہیں طبقاتی جدوجہد

ذریعہ سیاسی اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر رہیں گے۔ اسی
روکنے کے لئے سرمایہ دارانہ کیمپ کے دانشور، ادیب، شعراء
فلاسفر، جھوٹے اور نقلی مذاہب کو زبردستی تھوپنے والے
عیار و مکار رہنمایان سیاست ایڑی چوٹی کا زور لگائے
ہوئے ہیں۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد عوامی جمہوریہ چین،
شمالی کوریا، کیوبا وغیرہ میں امریکہ گورباچوف جیسے حرام کار
تلاش کر رہا ہے۔ مگر ابھی تک اس کو اپنے مقصد میں کامیابی
حاصل نہیں ہوئی ہے۔ شاید ۱۹۸۹ء یا اس سے قبل عوامی جمہوریہ
چین میں یلیتسن اور گورباچوف جیسا ضمیر فروش امریکی ایجنٹ
ابھرا تھا۔ مزہ تو یہ ہے کہ وہ چینی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل
سکریٹری اور حکومت کا سربراہ یعنی وزیراعظم تھا۔ اس کا نام
ژاؤ ژیانگ تھا۔ اس کی بیوی بھی امریکن ایجنٹ تھی۔ اگر
عوامی جمہوریہ چین کی سرخ فوج اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے
موجودہ رہنماؤں نے بروقت عملی اقدامات نہیں کئے ہوتے تو
سوویت یونین سے قبل امریکہ عوامی جمہوریہ چین کو خون
میں ڈبو دیتا۔ گورباچوف اس ڈرامہ کے وقت چین ہی میں
تھا۔ اب پھر اپنے وطن کی طرف

سی۔ پی۔ آئی اور سی۔ پی۔ آئی (ایم) کے علاوہ دیگر
لفٹ پارٹیوں بشمول آئی۔ پی۔ ایف اور سی۔ پی۔ آئی (ایم۔
ایل) کی طرف سے مسلسل یہ تجویز حکومت ہند کے سامنے پیش کی
جاتی رہی ہے کہ بابری مسجد نہ ہندوؤں کے حوالہ کی جائے
اور نہ مسلمانوں کے بلکہ اس کو گھیر کر قومی یادگار میں تبدیل
کر دیا جائے۔ میری دانست میں یہ تجویز بہت ہی سلجھی ہوئی تھی۔
اس سے نہ تو بابری مسجد شہید کی جاتی اور نہ خونریز واقعات
رونما ہوتے۔ عالمی سطح پر ہندوستان کی پیشانی پر کلنک
کا ٹیکہ بھی نہیں لگتا۔ مگر حکومت ہند نے [illegible] اور فرقہ پرست
[illegible] سمجھ [illegible] کر آخر [illegible] وہ شرمناک کام کیا جو تاریخ

کا بدترین المیہ تصور کیا جائے گا۔ اب بھی حکومت کو چاہئے
کہ وہ ہوش مندی سے کام لے اور بابری مسجد جہاں تھی اس
کو گھیر کر وہاں قومی یادگار کی تعمیر کرا دے۔ اس اقدام سے
حکومت ہند کی بدنامی ختم ہو جائے گی اور ایک نزاعی و زہریلا
مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ اگر آنجہانی راجیو گاندھی
اور ان کے بعد کے وزرائے اعظم نے کمیونسٹ رہنماؤں کی تجویز
کو سنجیدگی سے سنا اور اس پر عمل کیا ہوتا تو ہماری موجودہ
سیاست کی زبردست پیچیدہ گتھیاں آدھی نہیں تو بڑی حد
تک سلجھ چکی ہوتیں۔

اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ حالیہ انتخابات کے دوران
آٹھ امریکی سینیٹرز (SENATORS) کی ایک ٹیم بی جے پی
کے رہنماؤں کے ساتھ ایودھیا آئی تھی۔ اس منحوس و خطرناک
ٹیم اب ایودھیا اور ہندوستان کے کسی خطہ میں نہیں آئے اس لئے
یہاں کے عوام ہی کو آگے آنا ہوگا۔ یہ کام حکومت ہند کرے گی اس لئے
کہ وہ امریکی سیاست کے تابع عمل ہے۔

شمارہ ۶ جلد ۵۳ کا نمود پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔
سید علی مظفر کے انتقال سے اردو زبان و ادب اور اس کے
قاری ایک اچھے ادیب سے محروم ہو گئے۔ آپ نے "نمود" میں
مرحوم کی جن ادبی اور طبعی خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ واقعی قابل
قدر ہیں۔ ایسے پراگندہ طبع لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔
زیادہ تر ایسے لوگوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے جو شوریدہ سر ہیں۔

اس شمارہ کے متعلق اپنے تاثرات کافی تاخیر سے لکھ
کر بھیج رہا ہوں لیکن تاثرات کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ امید ہے کہ
آپ کو یہ پسند آئیں گے اور ماہنامہ "سہیل" میں چھپ جائیں گے۔

موجودہ شمارہ پچھلے شماروں سے زیادہ صاف ستھرا
اور معیاری ہے۔ اصغر علی انجینئر اور ڈاکٹر قمر رئیس صاحبان
نے پریم چند کے فکر و فن کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت کو

بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں اردو زبان و ادب کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اصغر علی انجینیئر کے دیگر مضامین بھی ا جو "سہیل" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں کافی وسیع اور پختہ و بالیدہ ادبی و سیاسی اور تاریخی نیز سماجی اور اقتصادی ادراک و شعور کے حامل ہیں۔ موصوف زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ادب اور آرٹ کے جمالیاتی پہلو بھی ان کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتے اور یہ بڑی بات ہے۔

سید علی مظفر مرحوم کی اگلی قسطوں کا انتظار ہے۔

"سہیل" کے قیصر عثمانی نمبر کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مزید یہ کہنا چاہوں گا کہ اس نمبر کے مطالعہ کے بعد قیصر عثمانی کی پیاری شخصیت میری روح پر چھا گئی۔ ۱۹۵۴ء میں بمبئی کا سفر میں نے بھی کیا تھا۔ ۶۶ پالی ڈنڈا روڈ پر واقع مشہور فلم ایکٹریس نگار سلطانہ کے خوبصورت بنگلہ میں چند روز بطور مہمان کے ٹھہرا تھا۔ نگار سلطانہ اس وقت "مغل اعظم" میں کام کر رہی تھیں۔ موصوفہ نے میری دلجوئی اور خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس وقت اگرچہ میں تنقیدی شاعر تھا اور میرے شعور میں ناپختگی تھی لیکن اس کے باوجود مجھ کو اس زمانہ کی اپنی بعض رومانی غزلیں اب بھی یاد ہیں۔ نگار سلطانہ کی قربت سے میں فائدہ اٹھا کر فلمی شاعر بن سکتا تھا لیکن میں نے جو کچھ وہاں دیکھا اس نے مجھے بمبئی کی فلمی ہستیوں کی ظاہری چمک دمک سے بڑی حد تک بیزار اور متنفر کر دیا۔ میرے بڑے بھائی احسان دربھنگوی بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں بمبئی میں نگار سلطانہ کے یہاں زیادہ دنوں تک قیام کروں۔ اس لئے میں دو ہفتے کے بعد وہاں سے کلکتہ لوٹ گیا۔ اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ میں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے جو بہار اردو اکیڈمی کی مالی تعاون سے بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔ قیصر عثمانی کی طویل نظم جو "سہیل" کے قیصر عثمانی نمبر میں یا اس کے بعد کے کسی شمارہ میں شائع ہوئی (مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے) ایک نادر الوجود شعری کارنامہ ہے۔ جس میں فلمی دنیا کی ظاہری چمک دمک کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کے گھناؤنے اور کھوکھلے پن کو پیش کرتی ہے۔

قومی یکجہتی اور اردو ادب غلام ربانی کا ایک فکر انگیز مقالہ ہے۔ انہوں نے اردو ادب کے جس تاریخی رول پر روشنی ڈالی ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ غالب نے سرسید کو اس وقت ڈانٹا تھا جب انہوں نے مولانا امام بخش صہبائی کے ساتھ مل کر دلی کے مردہ بادشاہوں کے مقبروں کے کتبوں کو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر پڑھنے کے بعد اپنی کتاب آثار الصنادید لکھی تھی اور اس پر غالب سے مقدمہ لکھوانے گئے تھے۔ غالب نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ دلی انگریزی فوج کی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی ہے اور آپ ہیں کہ مردہ بادشاہوں کے مقبروں پر حاضری دیتے پھر رہے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب کو دلی اور ہندوستان سے کس قدر محبت تھی اور وہ انگریزوں کی بربریت اور ہندوستان پر ان کے سیاسی اقتدار کے سخت خلاف تھے۔ حب الوطنی کا جذبہ غالب کا جزو ایمان تھا۔ یہ جذبہ آج ہم اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا جزو ایمان ہے۔ خدا اور اس کے رسول نے وطن کی محبت کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ اگر ہم میں سے کسی کو اپنے وطن سے محبت نہیں ہے تو وہ ایمان کے لازمی جزو سے محروم ہے۔ سرسید نے غالب کی ڈانٹ کے بعد اپنے ادبی و سیاسی طرز عمل کو یکسر بدل ڈالا اور ان کی ادبی و سیاسی بصیرت کتنے کام کی ثابت ہوئی اس سے

شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ ان کی نظروں میں ہندوستان واقعی ایک دلہن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس دلہن کی دو آنکھیں تھیں۔ اب بھی ہیں۔ ایک آنکھ ہندو قوم اور دوسری آنکھ مسلمان قوم۔ غلام ربانی نے جارحانہ قوم پرستی کی بجا طور پر مخالفت کی ہے۔ ان کو میری طرف سے مبارک باد پہنچے۔ انہوں نے حالی و اقبال کی ان نظموں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے جو حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول "مسلمان" قسط نمبر ۱ بڑے غور و انہماک سے پڑھا۔ اس قسم کے ناول اور افسانے اگرچہ آزادی کے بعد اور بھی لکھے جا چکے ہیں لیکن "مسلمان" کا اپنا ایک الگ [illegible] مقام ہے۔ البتہ ناول میں کہیں کہیں زبان کی غلطی کھٹکتی ہے۔ مثلاً بڑے زور کو بڑی زور یا دیکھنے کو دکھنا لکھنا زبان کی غلطی ہے۔ نسیم بن آسی کا افسانہ "پہلی تاریخ" بھی ایک اہم افسانہ ہے۔ اس کی الم انگیزی دل کو متاثر کرتی ہے۔

"شہرِ خیال" کے عنوان سے جو خطوط شائع ہوتے ہیں وہ کافی دلچسپ ہیں۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب ہمارے بزرگ ادیب و نقاد ہیں۔ ان کے لئے میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ ان کا ترقی پسند نظریہ ادب میرے لئے خاص طور پر کشش انگیز ہے۔ ان کی ناقدانہ بصیرت قابل قدر ہے۔ مگر دہلی کے چار شعراء پر جو اظہارِ خیال انہوں نے کیا ہے اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ اقبال کے متعلق بھی موصوف کے خیالات کو میں ناپسند کرتا ہوں اس لئے کہ اقبال اپنے تمام فکری تضادات کے باوجود برطانوی سامراج کے مخالف اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھے۔ ان کی شاعری بہت حسین اور پرسوز ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جس سے حسن و جمال اور سوز و گداز و شعریت ہی کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو اقبال بلاشبہ دنیا کے ممتاز ترین شعراء میں شمار کئے جائیں گے۔ بہر حال اگر ڈاکٹر تارا چرن رستوگی دہلی کے چار شعراء کو بہ نظر انتقاد نہیں دیکھتے تو "سہیل" میں عبد المتین نیازی، شبیر احمد قرار، شہپر رسول، نسیم الاسلام صہبا وغیرہ کے اتنے اچھے خطوط کس طرح شائع ہوتے؟ معاصرہ چشمک و رقابت بڑے کام کی چیز ہے۔ یہ لکھنے والوں کو خوراک فراہم کرتی ہے۔ بے جا غصہ اور جھنجھلاہٹ سے البتہ گریز کرنا ضروری ہے۔ مہذب اور شائستہ پیرایہ میں اگر اختلاف کا اظہار ہو تو اچھا ہے۔ لیکن ہم لوگ ایسا نہیں کر پاتے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کی حمایت میں بھی آپ نے جو خطوط شائع کئے ہیں ان سے آپ کی صحافتی دیانتداری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے یہ دنیا اتفاق و اختلاف آراء سے ہر دور میں گذری ہے۔ آئندہ بھی گذرے گی۔ ارتقائے حیات و کائنات کا راز تضادات کی کشمکش اور ان کے حل میں مضمر ہے۔ شباب للت اور شمس کنول کے خطوط کافی وزنی ہیں لیکن میں شمس کنول کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی اچھے شاعر و نقاد ہیں۔ مخمور سعیدی اور رفعت سروش نہ صرف موجودہ دور کے مشہور شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں بلکہ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ رفعت سروش کی نثری تحریریں میں نے پڑھی ہیں۔ مجھ کو وہ بڑی جاذب نظر اور جاندار محسوس ہوئیں۔ عنوان چشتی ہوں یا رفعت سروش اور مخمور سعیدی ان سب کی ادبی حیثیت ایسی ہے جس پر کیچڑ اچھالنا کسی طرح بھی اچھا نہیں ہے۔ راج نرائن راز کے شعری کارناموں سے چونکہ میں واقف نہیں ہوں اس لئے ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ بسمل عارفی نے جگن ناتھ آزاد کی نظم "بابری مسجد" پر اظہارِ خط میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ درست ہے۔ جگن ناتھ زندگی بھر سیکولر خیالات کے حامل رہے۔ اقبال کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں جگن ناتھ

آزاد کے مقالوں نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ سوا جعفری
اور جگن ناتھ آزاد نے اقبالیات پر موجودہ دور میں خوب لکھا
ہے اور نئے انداز سے لکھا ہے۔ ۱۹۶۲ء کی بات ہے گوہاٹی اور
شیلانگ کے تاریخی مشاعروں میں جگن ناتھ آزاد سے ملاقات ہوئی
تھی۔ فخر الدین علی احمد (مرحوم)، ڈی۔ کے۔ بروا، محترمہ حمیدہ سلطان
(فخر الدین علی احمد کی بہن) اور مظہر امام کی کوششوں سے انجمن
ترقی اردو، شاخ آسام، کے زیر اہتمام سرکاری سطحوں پر وہ مشاعرے
بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوئے تھے۔ اس وقت آسام
کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ وہاں کے گورنر شری وشنو سہائے
مراد آباد کے تھے۔ اور جب گورنر ہاؤس میں ہم مہمان شعرا اور
چند وزرا کو مدعو کیا گیا تو ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی۔
روشن صدیقی، جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، راقم الحروف، وف
ملکپوری، جذب آلونوی وغیرہ کے علاوہ سامعین میں فخر الدین
علی احمد، ان کی اہلیہ مسز عابدہ علی احمد، ان کے بھائی مسٹر اے احمد،
محترمہ حمیدہ سلطان جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (شاخ آسام)
آنجہانی ڈی۔ کے۔ بروا جو خود بھی آسامی زبان کے بہت اچھے شاعر
اور اس وقت کے وزیر تعلیم تھے۔ شعری محفل میں شریک ہوئے۔
میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور عین میرے قدموں کے پاس آسام
اور ناگالینڈ کے گورنر شری وشنو سہائے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں
پر ان کی بیوی اور بیری جمال صاحبزادی بھی تھیں۔ میں نے گورنر
موصوف سے گذارش کی کہ وہ میری جگہ پر چلے آئیں مگر انہوں نے
بے ساختہ خاکسارانہ کہا میں اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہوں۔ میں
مراد آباد کا ہوں۔ ان کا یہ جواب ذہانت اور اشاریت کی حسین
علامت تھا۔ ان کے جواب نے واضح کر دیا کہ اردو تہذیب
ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ اور جگر مراد آبادی
کی سرزمین جس سے ان کا تعلق تھا اس نے اردو شاعری کا صاف
ستھرا ذوق ان کے اندر پیدا کر رکھا تھا۔ مگر اب؟ کیا اب
بھی وشنو سہائے جیسے اردو شاعری کے دلدادگان حکمرانوں
میں پائے جاتے ہیں؟ اب تو صرف دکھاوا ہے۔ اصلیت نام کو
نہیں ہے۔

آسام کی خوبصورت راجدھانی شیلانگ میں ایک
اور شعری محفل آراستہ کی گئی تھی۔ آنجہانی ڈی۔ کے بروا کے
حسین دولت کدہ کر بیپٹو میریا میں اردو شعرا اور چند معزز
عمائدین شہر کی دھوم دھام سے ضیافت کی گئی تھی۔ طعام
کے بعد کلام کا دور شروع ہوا۔ بیچ میں ایک وزیر صاحب
(غالباً معین الحق چودھری) نے اردو شاعری کو گل و بلبل
کی شاعری کہہ دیا۔ جگن ناتھ آزاد سے وزیر موصوف کا یہ
نازیبا حملہ برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے معین الحق چودھری
کو منہ توڑ جواب دیا۔ اقبال کی شاعری کا بطور خاص حوالہ دے
کر جگن ناتھ آزاد نے اور بھی اپنی گفتگو کو مدلل بنا دیا تھا۔
میں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں یہ دلچسپ باتیں قدرے
تفصیل سے لکھی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد تقسیم ہند کے بعد لاہور سے ہجرت
کر کے اسی طرح ہندوستان آئے جس طرح ایل۔ کے۔ ایڈوانی
وغیرہ۔ وطن سے بچھڑنے کے غم نے ان کے دل کو بھی یقیناً درد و
داغ و سوز سے آباد کر دیا ہوگا۔ مگر انہوں نے نہ کبھی پاکستان
سے نفرت کی اور نہ مسلمانوں سے۔ بلکہ جب وہ ہندوستان آئے
اور مسلمانوں کی خاک و خون میں تڑپتی ہوئی زندگی دیکھی اور
یہ دردناک منظر دیکھا کہ مسلمان ترک وطن کر کے پاکستان
کی طرف ہجرت کر رہے ہیں تو ان کا دل تڑپ اٹھا اور انہوں نے
"بھارت کے مسلمان" کے عنوان سے ایک پر سوز نظم لکھی
جو ہندوستان کے معیاری اردو جریدوں میں شائع ہو کر
بہت مشہور و مقبول ہوئی۔

اب پھر "سہیل" کے شمارہ ۶۱ کے متعلق۔ کرشن

ہ کی نظم غالب ـــــ شاعر راز ہائے سینہ گداز" بہت
ر آئی۔ شاعر نے غالب کو بہت ہی اچھوتے انداز میں خراج
بدرت پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب واقعی
لب ثابت ہوئے۔ وہ ہنوز شاعر مستقبل ہیں۔ اگر
رو زبان ہندوستان میں باقی رہی تو غالب و اقبال
ی آفاقیت کے سبب باقی رہیں گے۔

ضیاء الانجم کے دوہے کے اشعار کے علاوہ یاور ارمان،
بد المتین نیاز، سعید عارفی، نعمان شوق، جمال اویسی،
بینت پرمار وغیرہ کی غزلیں خوب ہیں۔ نعمان شوق کی غزل
اور بھی دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ اس کو پڑھتے ہی دل کا
رجھایا ہوا پھول واقعی کھل اٹھا۔ اس کی ردیف مزہ دے
ئی۔ غزل کا ہر شعر از مطلع تا مقطع اپنے اندر گہری طنزیہ
اثر رکھتا ہے۔ مولانا خواہ آج کے ہوں یا بیتے ہوئے زمانہ
ے واقعی اسی طنز کے مستحق ہیں۔ ان کے کردار نے ہمیشہ مایوس
کیا ہے۔ نعمان شوق کو میری طرف سے دلی مبارکباد پہنچے۔ غزل
میں مولانا کی ردیف اور اس کا اتنا برجستہ و برمحل استعمال!
واہ کیا کہنا ہے۔

ناشاد اورنگ آبادی کی غزل کا مطلع اچھا ہے مگر
دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ محل نظر ہے۔ لفظ ختم کو انہوں نے
قسم، قدم وغیرہ کے وزن پر استعمال کیا ہے جو غلط ہے۔ ختم
کو رحم، وہم وغیرہ کے وزن پر ہونا چاہئے۔ غزل کے دیگر اشعار
اچھے ہیں لیکن پانچویں شعر میں شتر گربہ کا عیب ہے جو کسی
طرح بھی جائز نہیں ہے۔ ناشاد صاحب زبان و بیان اور
عروض کی طرف توجہ دیں تو اچھا ہے۔

آپ نے اپنے اداریہ "نمود" میں اقبال کے مشہور شعر کے
دوسرے مصرعہ میں غلطی سے تحریف کر دی ہے۔ اصل مصرعہ
یوں ہے۔ ؎ غنچۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے۔ دت

بقیہ خطوط ـــــ

وش کنیا تو دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے قرون وسطیٰ کے
حکمراں بھیجا کرتے تھے۔ دشمن اس حسینہ کے ساتھ ہم بستری
کرتے ہی اُس کے زہریلے لہو کے زیر اثر ہلاک ہو جاتا تھا

▲ شہاب للت، دلّی

سہیل کا تازہ شمارہ ہدست ہوا۔ غزل کی
اشاعت کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ سے
تھوڑی سی شکایت بھی ہے۔ آپ نے میری غزل کا سب
سے اچھا اور فکر انگیز شعر ہٹا دیا ہے ؎

لگتا ہے اب کہ جیسے خدا کو بھی ہے پسند
بندوں کا قتل اپنے مفادات کے لئے

آخر اس شعر میں کیا عیب ہے؟ بھائی اس میں اگر
لفظی معنوی یا فنی کسی قسم کا کوئی عیب ہوتا تو میرے
استاد محترم حضرت عنوان چشتی کے قلم کی زد سے یہ
شعر نکل ہی نہ پاتا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ اس شعر کو بھی شائع
کرکے سہیل کے باشعور قارئین کو اظہار خیال کا موقع
دیا جاتا۔ اس سے شعر کے خالق نیز دوسرے شعراء کو
بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

▲ حنیف نجمی، ہمیر پور (یو۔پی)

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لبیل آرٹ
پریس شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر
دفتر "سہیل" ریلور سائیڈ روڈ گیا
سے شائع کیا۔

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

کرشن موہن
دہلی

ابھی اور

ابھی تک میری ندرت آشنا نظمیں، جداگانہ روش غزلیں
نہیں پہنچی ہیں اہلِ ذوق تک اے دل
ابھی ناپید ہے ترسیل کی منزل
ابھی ابلاغ کی تشکیک ہے، اربابِ حل و عقد کی تحسین سے محروم ہوں
درپیش ہے مشکل
کہ فرصت ہی نہیں، اس ضمن میں، کچھ کر نہیں سکتا
اسی باعث ابھی میں اور جینا چاہتا ہوں، ابھی میں مر نہیں سکتا

نظمیں

حامدی کاشمیری

روانگی

بیڈ کے تکئے پر سر رکھے
تم رہ رہ کر وارڈ کی کھڑکی کو تکتے تھے
چہرے پہ سکوں
آنکھوں میں نورِ ماہ کی راحت
تم ہم کو، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو، سچ مچ
چھوڑ کے جانے پر آمادہ تھے
کیا موت اتنی اچھی ہوتی ہے!

نورِ ماہ کا رتھ
کھڑکی کے پاس رکا
میرے اندر کہرام بپا تھا
تم خاموش تھے، ہونٹوں پہ نمودِ صبح صادق تھی
پل بھر میں رتھ لوٹ گیا
پل بھر میں میری دنیا ویران ہوئی تھی!

صابر آروی

پٹنہ -

جو جام ہمیں روز ازل اس سے ملا ہے
اس جام میں کیوں تلخیٔ دوراں کا مزا ہے

دھڑکا ہے اگر دل تو یہ احساس ہوا ہے
پھر درد زمانہ نے ہمیں یاد کیا ہے

رخسار پہ کج خلقی و بے راہ روی کے
حضرت نے عبث غازۂ اخلاص ملا ہے

دنیا ہی سلامت ہے نہ اب دین سلامت
یوں آج ہر اک شخص گرفتار بلا ہے

اے نازِ تغافل، ترے انداز کے صدقے
پوچھا ہے کہ کیا جرم محبت کی سزا ہے

خوشبو تری سانسوں کی بسی ہے مرے دل میں
یہ زخم محبت تری یادوں سے ہرا ہے

رکھ دو کسی دوکان پہ سرمایۂ جاں کو
بازار میں اس کا بھی خریدار کھڑا ہے

"تفریق خیالات" نہیں "امن" میں مانع
دشمن بھی گلے دوست کے مانند ملا ہے

وہ ناز سے انداز سے یوں دیکھ رہے ہیں
سمجھو تو تغافل ہے نہ سمجھو تو ادا ہے

کیوں سر سے کفن باندھ کے میدان عمل میں
صابر نکل آئے ہیں، یہی ان کی خطا ہے

داماں نہیں رہا، کہ گریباں نہیں رہا
سب کچھ رہا پہ حلقۂ یاراں نہیں رہا

میرے چراغ دل سے جلے سیکڑوں چراغ
یہ روشنی بجھی تو چراغاں نہیں رہا

اے ذوق بندگی، تری توقیر بڑھ گئی
کب سامنے نگاہ کے یزداں نہیں رہا

خوش ذوقیٔ نگاہ کا احسان مانئے
کہئے نہ یہ کہ آپ پہ احسان نہیں رہا

بڑھتا گیا مرض، ترے بیمار شوق کا
کیوں تیرے پاس درد کا درماں نہیں رہا

اب کیا ملے گا تم کو پسِ گمرہی کارواں
دشتِ جنوں میں کوئی حدی خواں نہیں رہا

قصۂ غم والم کا سناتے رہے مدام
بس داستان رہ گئی، عنواں نہیں رہا

اب دو دلوں کے بیچ میں دیوار آ گئی
احباب میں خلوص فراواں نہیں رہا

جب اعتبار اٹھ گیا قول و قرار کا
صابر یقین وعدۂ جاناں نہیں رہا

ملک زادہ جاوید

- نوئیڈا -

ہر نفس پر بوجھ ہے اک کام کا
وقت ملتا ہی نہیں آرام کا

جب دنوں سے بڑھ گئیں پرچھائیاں
ڈھل گیا سورج کسی کے نام کا

ریڈیو کے پاس چل کر بیٹھ جائیں
نشر منظر ہو گا قتل عام کا

ہو گیا اس شہر سے رخصت کوئی
اب یہ موسم ہے مرے کس کام کا

بجھ گئے جلتے ہوئے کتنے دیئے
بک رہا ہے پوسٹر صدام کا

کتنی میٹھی گفتگو جاوید کی
پیڑ ہے گویا اس کے گاؤں میں آم کا

[illegible]

[illegible]

غزلیں

صابر رومانی

۔گوپال گنج۔

ن کو تلاش امن کی تھی آخر کہاں گئے
یموں کے شہر سے وہ مہاجر کہاں گئے
نزل قریب آنے کو ہے بے قرار جب
شوار راستوں کے مسافر کہاں گئے
مال کس نے کر دیئے خوابوں کے کشت زار
سر سبز وادیوں کے مناظر کہاں گئے
آزاد پھر رہے ہیں سبھی مجرمانِ وقت
انصاف دینے والے دفاتر کہاں گئے
تکیہ تھا جن کا ورثہ، اجداد پر مدام
اللہ وہ بے چارے مجاور کہاں گئے
ہے وقت امتحاں تو مسلماں گئے کدھر
جو لوگ ہم کو کہتے تھے کافر کہاں گئے
ان کے بھی جل رہے ہیں مکاں میرے گھر کے بعد
صابر وہ شر پسند عناصر کہاں گئے

شارق عدیل

۔علی گڑھ۔

چاٹتی ہے روح کو فکر مندیاں اس مرتبہ
کوششیں ہو جائیں گی اپنی رائیگاں اس مرتبہ
رنگ محلوں کی چمک بینائیوں کو ڈس گئی
دل میں گھر کرنے لگیں تاریکیاں اس مرتبہ
پڑھنے والے مجھ کو سائنس کے حوالے سے پڑھیں
لکھ دی لوحِ ہوا پر داستاں اس مرتبہ
بستیوں کو بھوگنا ہوگا سرابوں کا عذاب
ہے سروں پر ریت کا اک سائباں اس مرتبہ
یاد ہے اپنے سفر کا مجھ کو آغاز و مآل
کس نے چھینا مجھ سے میرا درمیاں اس مرتبہ
آگہی کی منزلوں تک غالباً میں آگیا
گفتگو کرنے لگیں خاموشیاں اس مرتبہ

ابراہیم اشک

۔پونہ۔

شیشے حساب مانگتے ہیں
پتھر سے جواب مانگتے ہیں
آنکھوں سے شراب مانگتے ہیں
پھر دل پہ عذاب مانگتے ہیں
ہم تشنہ لبوں کا ہے یہ عالم
صحرا میں سراب مانگتے ہیں
لمحے کا حساب جوڑنا ہے
صدیوں سے حساب مانگتے ہیں
نظروں میں اگر بسا کے ان کو
ہم نیند سے خواب مانگتے ہیں

اوم کرشن راحت

— ہریانہ —

نہ لے سکیں گی یہ خوش فہمیاں خوشی کی جگہ
نشانِ جمع لگاتے رہو نفی کی جگہ
ہم اپنا درد کہیں بانٹنے نہیں جاتے
ہم اپنے درد کو رکھتے ہیں درد ہی کی جگہ
مسرتوں سے کہو اور گھر تلاش کریں
ہمارے دل میں تو ہے ہی نہیں خوشی کی جگہ
حساب کیجئے تو گنجائشیں نکلتی ہیں
ہر ایک جمع میں موجود ہے نفی کی جگہ
ہزار بار ادھر سے اُدھر گیا ہوں میں
ہے میکدے کے برابر ہی بندگی کی جگہ
اسی بھرم میں کئی بار آئینہ دیکھا
ہو میرے ہونٹوں پہ شاید کہیں ہنسی کی جگہ
بہم دوستاں ہوتے ہوئے بھی اے راحت
ہمیں تو سونی سی لگتی ہے دوستی کی جگہ

رئیس الدین رئیس

— علی گڑھ —

عارض، آنکھیں، ابرو، زلفیں، کب لکھنا
ہم سے آیا رنگین غزلیں کب لکھنا
گہری نیند میں سونے کا کرتب لکھنا
سمجھ سکو تو دنیا کا مطلب لکھنا
ایک اک سانس کی قیمت دینا پڑتی ہے
خون پسینہ کر کے دن کو شب لکھنا
جب عنوان مرے قصے کا لکھنا ہو
ہلکی آہٹ اور دھندلی چھب لکھنا
جس میں کیف خواب بھی ہو اور نیند بھی ہو
ایسی میرے نام رئیس اِک شب لکھنا

غزلیں

مسلک

قسط ۱۲

مشرف عالم ذوقی

ترجمہ:- تبسم فاطمہ

۹۰-۸۶ء دہلی

★ یہ کہانی تو کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اگر اتفاق سے اس دن اس نے وہ منظر نہ دیکھ لیا ہوتا۔۔۔۔ نہ دیکھ لیا ہوتا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی ہوتی۔

جی راشی کے لئے رپورٹ تیار کرنے نکلی تھی وہ۔۔۔

تیز دھوپ چاروں طرف پھیلی تھی۔ بدن جل رہا تھا۔ وہ بھی پسینہ میں نہائی ہوئی تھی۔

اچانک ٹھہر گئی۔ وہاں دور تک منتریوں کے سفید کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس کی نظر ایک طرف چلی گئی۔ کئی آدمیوں سے گھرا ہوا تھا ایک شخص، کھادی کے کپڑے پہنے اپنی چمچماتی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر وہ شخص گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

اسے ٹکٹکی سی دیکھتی رہ گئی ـــ

یہ شخص۔۔۔۔

اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔۔۔۔

پھر یہ سب کیا تھا۔۔۔۔

یہ آدمی کون تھا۔۔۔؟

ایک شخص نے پوچھنے پر بتایا ـــ منتری ہیں ـــ

جاگیر صاحب، ابھی ابھی راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے ہیں۔

"منتری راجیہ سبھا کے"

اندر ہلچل سی مچ گئی ـــ لگا، اس کی ساحت ادھوری ہے۔ امتحان کا وقت تو اب آیا ہے۔

جاگیر صاحب۔۔۔ ایک زہریلی ہنسی اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

بائی اماں کے آگے بیس بیس کے لوگوں کے بنڈل کو پھینکتا ہوا جاگیر ـــ گوہر جاؤ، یہ تیرے افروز کی نتھ اترائی کی قیمت ہے۔۔۔۔

ٹوٹی کواڑ اور دہشت زدہ سی اماں کے آگے جلتی مشعل لئے کھڑا جاگیر ا۔۔۔۔۔

دھند میں ڈوبی ساری تصویریں یکایک اس کے

جی کا رتھ ہوگیا ۔ جو پورے ملک میں فساد کے سہارا معصوم
انسانوں کی فصل کو روندتا ہوا تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا ۔
خاص بات صرف اس قدر تھی کہ اس آندھی میں گونڈہ
ضلع کا ایک شخص بھی کام آگیا ۔
یہ آدمی شعیب کے روم پارٹنر ونئے کا بڑا بھائی تھا ۔

ایک انجان سا نظر آنے والا شہر ـــ چپے چپے پر جیسے
یادیں بکھری پڑی تھیں ۔ لیکن انجو ان یادوں کو کھرچنے میں مشغول
تھی ۔ ایسے کہ یہ شہر پہچانا ہی نہیں جا سکے ۔
لیکن زخم کہاں چھپتے ہیں ـــ
وہ جس کام کے لئے نکلی تھی، اس کام میں تو بار بار زخم
کے رسنے کا ڈر تھا ۔ پورا شہر ہی اچانک اسے ڈسنے پر اتر آیا تھا ۔
کل اور آج میں کتنا فرق تھا ۔
وہ پھر انہی وادیوں میں تھی، جہاں سے مجرے کی آواز
گونجا کرتی تھی ۔ اجمیری بائی کا کوٹھا، دلشاد جان، نسیم بانو،
مہر بائی، قمرو، رخسانہ ـــ اور بھی کتنی ہی طوائفیں ـــ
' نکو ـــ نا بابا، نا ۔۔۔۔ ' رخسانہ تو صاف ہی مکر
گئی ۔

اجمیری بائی نے ٹھنڈی سانس بھری ـــ جو اس جہنم
سے نکل گیا وہ بھلا ۔ تم گوہر جان کی امانت ہو ـــ جاگیرا
سے دشمنی کیوں مول لے رہی ہو ۔ جو کر رہی ہو وہی ٹھیک ہے ۔
دلشاد جان ناگواری سے بولی ـــ جاگیرا نے تو جو
بھی کمایا، موے نے دنگوں میں کمایا ـــ بے رحم ـــ لاج بھی
نہیں آئی کم بخت کو ـــ بھڑوے کا بچہ، سالا آج نیتا بنتا ہے ۔
ساری کمائی تو لوٹ لی تھی ۔ بس لوٹ لی ـــ '
انجو دھیرے سے بولی ۔" بس یہی تو چاہتی ہوں میں ۔
اس کاغذ پر اپنے دستخط کر دو ۔"

" نا بابا، نا "
دلشاد جان پیچھے ہٹ گئیں ۔ جیسے ڈھیر سارے بچھو
کو دیکھ لیا ہو ۔
" آپ لوگ تو گواہ ہیں ۔ جب رانی منڈی اور پاس
کے علاقہ میں فساد چھڑا تھا، تو لچوں لفنگوں کے ساتھ یہی
جاگیرا تھا جو گوہر بائی کے مکان میں بھی آگ لگانے آیا تھا ۔
اجمیری بائی نے غصے سے انجو کو دیکھا ۔ افروز جان ۔
ہمارے پیشہ کو تو بخش دو ـــ تم نہیں جانتی جاگیرا کی طاقت ۔
آپ چپ رہیں تو یہ طاقت بڑھتی چلی جائے گی ۔
ہماری سننے کا بھی کون ۔ اتنا بڑا شہر ہے ۔ دوسروں
کے پاس کیوں نہیں جاتی تم ؟
دوسرے کے پاس بھی جاؤں گی ـــ لیکن یہ بات صرف
رانی منڈی کے لوگ ہی جانتے ہیں کہ جاگیرا کی اصلیت کیا ہے ۔
" وہ اب نیتا بن گیا ہے ۔ ہم مجبور ہیں ۔ مہر بائی ہوائی
چپّل پیر میں ڈالتے ہوئے بولی ۔" میں تو چلی ۔۔۔۔ ان کے چکر
میں کون پڑے ۔
اجمیری بائی نے کہا ۔" ہم تو پہلے ہی لٹے لٹائے ہیں
افروز جان ـــ پیشے سے بھی جاتے رہے تو سڑکوں پر بھیک
مانگنے کی نوبت آجائے گی ۔"
یہ جگہ تمہارے لائق نہیں رہی افروز جان ۔"
دلشاد جان کا لہجہ کچھ کمزور پڑ گیا ۔" تم جا سکتی ہو ۔"
وہ کوٹھے سے نیچے اتر آئی ـــ
نیواڑی، ادھر ادھر گھومتے بھڑوے، کوٹھے کے نیچے
بیٹھے فقیر، جیسے سب اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے ۔
اس کے قدم بوجھل تھے ۔
یا شاید وہ سچ مچ ہار گئی تھی ۔
ایک گھنٹہ

دو گھر —

تین ....پانچ.... سات —

پھر اس نے کتنے ہی دروازے کھٹکھٹائے — کتنے ہی لوگوں سے ملی — لوگ اس کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ جاگیرا کیسے بنا، اس مقام تک کیسے پہنچا، یہ کہانی سب کو معلوم تھی۔ مگر اتنے بڑے شہر میں کوئی اس کے خلاف اٹھنے کو تیار نہیں تھا —

یہ گھر اس کی آخری امید کا مرکز تھی — وہ تھکی ہاری مایوسی سے اتری تھی — کہ اچانک بیس بائیس سال کی ایک لڑکی دوڑی دوڑی اس کے پاس آکر ٹھہر گئی۔

سُنیئے !

وہ ہانپ رہی تھی —

انجو نے ٹھٹھک کر دیکھا — وہ میلی ساری میں تھی مگر اس کے باوجود چہرے مہرے سے طوائف نہیں لگ رہی تھی۔

میرے پاس وقت کم ہے۔ اس وقت میں دلشاد بائی کے یہاں تھی۔ آپ کی باتیں سُنیں۔ جاگیرا مجھے یوپی کے گاؤں سے بھگا کر لایا تھا — مجھ سے شادی کا ناٹک کھیلا اور یہاں کوٹھے پر ڈال گیا۔

اس نے بلاؤز میں ہاتھ ڈالا اور ایک میلی سی تصویر نکالی — یہ رکھ لیجئے — لائیے میں دستخط کر دیتی ہوں۔

وہ کافی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

انجو نے کاغذ آگے کیا۔ لڑکی نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیا۔

اچھا میں چلتی ہوں۔

سنو — تم کبھی کسی مصیبت میں پڑ گئی تو —؟

وہ ٹھٹھکی — انجو نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ڈورے تیرتے ہوئے پائے۔

"اب اس سے زیادہ اور مصیبت کیا ہو سکتی ہے"

پھر اس کے بعد وہ ٹھہری نہیں — بھاگتی ہوئی چلی گئی — لیکن کیا صرف ایک دستخط کافی تھا۔ اس نے اس دھندلی میلی تصویر کو غور سے دیکھا۔ جاگیرا اس عورت کے ساتھ اگنی کے پھیرے لے رہا تھا۔

[signature]

برائے کرم اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں۔ مخطوطہ ہمیشہ ہمیشہ لکھیں۔ "سہیل" ہم سب کا رسالہ ہے اسے پیش نظر رکھیں۔

ورنیندر پٹواری

ہم دونوں!

★ کیا ہوا؟ ڈر گئے؟

● ہاں۔ بادل گرجتے ہیں۔ بجلیاں کڑکتی ہیں تو — ڈر لگتا ہے —!

● مجھے بھی مگر!

● مگر کیا —؟

● بجلیاں کڑکتی ہیں تو اچھا بھی لگتا ہے۔

● کیا — کیا کہا — پھر سے کہو؟ —؟

● ہاں۔ اچھا لگتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہی۔ مگر اچھا لگتا ہے۔

● کیسے آدمی ہو تم — ایسا کیوں ہے؟

● بجلیوں کی چمک سے چاروں طرف پھیلا ڈراؤنا اندھیرا سٹ جاتا ہے۔

● ہاں — وہ تو ہے — مگر کیا فائدہ — تم ہنس رہے ہو —؟

● اور نہیں تو کیا —

● کیوں۔؟

● کم از کم یہ تو دیکھ پاتے ہیں کہ کون ہنس رہا ہے اور کون رو رہا ہے۔

● ہاں۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم کبھی کبھار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ پاتے ہیں۔

● ہے نا عجب ورنہ ہم دونوں اس تاریکی کا حصّہ بن گئے ہیں — ہے نا؟

● ہاں — لیکن روشنی کی کرن دیکھ کر اندھیروں کی گہرائی زیادہ ڈراؤنی لگ رہی ہے۔ تمہیں ایسا نہیں لگ رہا ہے —؟

● وہ تو ہے — ارے تم جوان ہو — میں سمجھ رہا تھا کہ تم بوڑھے ہو —

● تمہاری طرح —؟ نہیں نہیں — میں جوان ہوں! نوجوان!!

● اچھا نوجوان یہ بتا دو کہ اگر تمہیں ان تاریکیوں سے ڈر لگتا ہے تو اس بیابان میں کیا کرنے آئے ہو۔؟ — بتا بھی دو —!

● ارے بابا — کوئی مجبوری ہوگی تب آیا ہوں۔ کیا معلوم تھا برسات ہوگی اور بارش رکنے کا نام نہیں لے گی۔

تم یہاں کیسے آئے ہو بابا ؟
- لکڑیاں کاٹنے آتا ہوں۔ شام کو لوٹ کر جاتا ہوں۔ کیا معلوم تھا گاؤں جانے کا راستہ کٹ جائے گا۔
- گویا تم بھی پھنس گئے ہو۔ میں کسی کی تلاش میں آیا تھا اور لگتا ہے کوئی میری تلاش کر رہا ہوگا۔
- تمہارے ماں باپ تا ـــ ؟
ہاں بابا ـــ میں نے کہا تھا مرغابیاں مار کر گھر لوٹ آؤں گا۔
- اچھا اچھا ـ اسی لئے تمہاری چادر کے نیچے بندوق ہے ـــ ہے نا ؟
- ہاں ! ہاں ہاں !!
- میں حیران تھا کہ ـــ ؟ ـ ؟
- ہاں ـــ ورنہ بندوق کیوں ساتھ لے آتا بھلا ؟
- نوجوان ـــ تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا ہے ـ
- نہیں ـ جو پیدا ہوتا ہے وہ مر جاتا ہے۔ پھر ڈر کیسا ـ ایسا میرے آقا کہتے ہیں۔ آپ کا خیال غریف میں ؟
- آقا ـــ ؟
- ہاں ـ جن کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ آقا ہی کہلائے گا نا ـــ !
- اس کم سنی میں غلام بن گئے ـــ ؟
- ہاں ـ پھر ؟
- اپنے انجام سے ڈر نہیں لگتا ـــ ؟
- انجام سے ؟ کیوں ؟ یہ کیوں پوچھ رہے ہو ـ ؟
- آج کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آندھی ہے ـــ طوفان ہے ـــ یا پھر ـــ !
- بابا ـــ تمہارے پاس کلہاڑی ہونی چاہئے ـــ پھر یہ بندوق کیوں ؟

- جنگل میں وحشی درندے بھی آتے جاتے ہیں نا اسی لئے ـــ جھانک کر کیا دیکھ رہے ہو نوجوان ـــ ؟
- کچھ نہیں ـــ یوں لگا جیسے کوئی آ رہا ہے۔ تمہیں ایسا نہیں لگ رہا ہے ـــ ؟
- ہوا کا شور ہے ـ کھڑکی بند کر دو ـــ اندھیرے میں جھانک کر دیکھو گے تو اندھیرا ہی نظر آئے گا نوجوان! اندھیرے میں واپسی کا راستہ بھی نظر نہیں آتا ـــ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ؟
- وہ تو ہے ـ لیکن بابا کیا کیا جائے۔ لگتا ہے اس جگہ کو سیلاب کے پانی نے گھیر لیا ہے ـ ڈوب جانے کا خدشہ ہے ـــ
- ایسا تو ہونا ہی تھا ـــ لو چھت سے بھی پانی ٹپکنے لگا ہے ـ
- اب کیا کریں گے بابا ـــ ؟
- صبح کا انتظار ـــ ! ـــ صرف انتظار !!
- ہاں ـــ انتظار کرنا ہوگا ـ ٹھیک ہے انتظار کریں گے ـ
- بابا سو گئے کیا ـــ ؟
- نہیں نیند نہیں آتی ہے ـ ! تم سو جاؤ ـ
- میں سونا نہیں چاہتا ہوں ـ آؤ باتیں کریں ـ
- نوجوان تمہارا نام کیا ہے ؟
- کرشن ـــ کرشن کمار ـ بابا تمہارا نام کیا ہے ؟
- میں کریم ـــ کریم خان ـــ
- چلو یہ بھی اچھا ہے ـــ ورنہ شاید ـــ
- کیا مطلب ـــ ؟
- کچھ نہیں ـــ کچھ نہیں ـــ
- [illegible]

ہو گیا ــــ ؟

• بابا تم سے کیا چھپاؤں ـــ میں یہاں کسی کی تلاش میں آیا ہوں۔

• کس کی تلاش ہے ۔؟

• بابا ہمارا ایک آدمی ہے ۔ وہ اس جنگل میں چھپ کر بیٹھا ہے

• دوست ہے یا دشمن ـــ ؟

• واہ ۔ کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہو بابا ـــ دوست کو بندوق لے کر تلاش کرتا ہے کوئی ـــ وہ دشمن ہے ـــ دشمن ـــ لیکن تم پریشان کیوں ہو رہے ہو۔؟

ـ اے کیا ہو ؟ ـــ ؟

• نہیں نہیں ـ ایسی کوئی بات نہیں ۔

• بابا ـ سچ سچ بتا دو ـــ کیا تم واقعی لکڑہارے ہو ـــ ؟

• ارے نہیں ـــ میں بھی تمہاری طرح اپنے دشمن کی تلاش میں نکلا ہوں ـ مجھے اس کو پکڑنا ہے ـ زندہ یا مردہ ـــ

• گویا ہم دونوں کی منزلیں الگ الگ ہیں مگر راستہ ایک ہی ہے ۔

• ہاں ـ مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے ۔

• بابا ـ یہ کیا تمہاری ٹانگ سے خون بہہ رہا ہے ۔

• ہاں نوجوان ـــ انسان کا جسم کٹ جائے گا تو خون ہی نکلے گا ۔

• مگر بابا یہ زخم لگا کیسے ـــ ؟

• کل شہر میں فسادات ہوئے تھے نا ـ بس اسی

• عجیب اتفاق ہے بابا ـ میں بھی زخمی ہو گیا ہوں ۔ یہ دیکھو میرے ماتھے پر گھاؤ ـ ہاں ـــ کپڑے سے چھپا لیا تھا ـ تم اپنے جیسے لگتے ہو ـــ بالکل میرے باپ کی طرح ـــ تمہیں اپنا زخم دکھانا اچھا لگ رہا ہے ۔ نہ جانے کیوں ۔ شاید اس لئے کہ بہت درد ہو رہا ہے ۔

• وہ اس لئے کہ میرا بھی ایک بیٹا ہے ۔ تمہاری طرح نوجوان ۔

• لو میں زخم کو باندھ لوں گا ۔ ورنہ خون بہتا رہے گا اور تم ـــ

• خدا تمہیں سلامت رکھے میرے بچے ۔ لیکن خون بہت بہہ چکا ہے

• بابا ـ کچھ نہیں ہوگا ۔ میں ہوں نا ـ تمہاری دیکھ بھال کروں گا ۔

• اور اگر میں مر گیا تو ـــ ؟

• بابا ـ کریم بابا میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا ۔

• کرشن ـــ سنو ـــ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم یہاں سے نکل نہیں پائیں گے ۔ ہاں پانی کم ہوا تو تم تیر کے اس جگہ سے نکل سکتے ہو ۔ میں نہیں ۔ سوچا تھا اپنا کام پورا کر کے مر جاؤں تو بیوی بچوں کے لئے کچھ چھوڑ جاؤں گا ـــ مگر لگتا ہے ـــ اب میرے بیٹے کو میرا ادھورا کام کرنا ہوگا ۔ ورنہ بھوکا مر جائے گا بے چارہ ۔

• ایسی باتیں نہیں کرتے ہیں کریم بابا ـــ مجھے کا بتا دو ـ بارش ختم جائے گی تو میں پہلے تمہارا کام کروں گا پھر اپنا کام کروں گا ـــ

• " کر سکو گے نوجوان ـــ ؟

تمام کر دوں گا۔
• کرشن۔ سچ سچ بتا دو۔ تم کیا کام کرتے ہو؟
• جان کی قیمت لے کر جان لیتا ہوں۔
• گویا قتل کرتے ہو۔؟ قتلِ عام۔!
• ہونہہ —— جنگ میں دشمن کو مار ڈالنا قتل نہیں ہوتا —— بلکہ جیت کی طرف بڑھتا ہوا ایک اور قدم ہوتا ہے۔ صرف اتنا بتا دو کہ تم کس کا کام تمام کیوں کرنا چاہتے ہو —— ؟ —— ؟
• وہ شخص میرے ان داتا کا دشمن ہے۔ وہ زندہ رہا تو میرے مالک کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ وہ شخص جوان ہے۔ جوشیلا ہے اور اس کا نام انور ہے۔ تم چونک کیوں پڑے۔ ؟
• انور کیا تمہارا بھی دشمن ہے۔ کریم بابا؟
• نہیں —— میں اس کو جانتا نہیں —— پہچانتا بھی نہیں۔ بس اتنی اطلاع ملی ہے کہ وہ یہیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے۔ سمجھ کو حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔
• انجانے میں کسی معصوم کو قتل کر دیا تو —— ؟
• تو کیا —— ایک اور —— شاید کئی اور قتل کرنے ہوں گے —— کیا کریں نوجوان۔ ایسا تو ہوتا ہی رہے گا —— ہم لوگ اسی رفاداری، اور جانبازی کی تنخواہ لیتے ہیں —— یہ کیا؟ نوجوان ہوش میں آؤ! یہ بندوق کیوں نکال رہے ہو۔ ؟
• کریم خان —— تو تم میری جان لینے آئے ہو۔؟
• یہ کیا احمق پن ہے۔ میں انور کی جان لینے آیا ہوں۔ تمہاری نہیں کرشن!
• میں انور ہوں۔ کرشن نہیں۔ مجھے شک تو تھا لیکن تمہارا یہ چہرہ دھوکہ دے گیا۔ چہرہ معصوم ہے اور دل کالا ہے تمہارا۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔
• انور گولی چلاؤ —— اچھا ہے میں اس عذاب سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں خود دوسرے کو دھوکہ دے دے کر اپنے آپ کو دھوکہ دیتا رہا ہوں۔ مندر اور مسجد کے دھوکہ میں پھنس کر یوں محسوس کر رہا ہوں کہ میں ایک دلدل میں پھنسا جا رہا ہوں —— گولی چلا دو —— گولی چلا دو۔ تم گولی کیوں نہیں چلاتے —— ؟
• تمہارے ہاتھ میں بھی بندوق ہے۔ تم گولی کیوں نہیں چلاتے۔
• مجھے تمہاری جوانی پر ترس آرہا ہے انور۔!
• اور مجھے تمہارے بڑھاپے پر ترس آرہا ہے! حالانکہ اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے ——!!
• ہاں۔ ہاں —— میں کریم خان نہیں ہوں —— رام پرشاد ہوں۔
• رام پرشاد! جھوٹ تم بھی بولتے رہے —— اور میں بھی جھوٹ بولتا رہا۔
• ہاں —— لیکن اب سچائی سامنے ہے۔ گولی چلاؤ۔
• رام پرشاد میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا ہوں۔
• میں بھی تمہاری جان لینا نہیں چاہتا ہوں اور اگر میں یہ چاہتا تو تمہیں کمرے میں داخل ہوتے ہی گولی مار دیتا۔ تم انور ہوتے تب بھی اور کرشن ہوتے تب بھی۔
• تم کیا سمجھتے ہو مجھے تمہاری باتوں پر یقین آرہا تھا۔ نہیں —— ہرگز نہیں۔ لیکن تمہارا جسم بخار سے جھلس رہا تھا اور تمہارے ماتھے کو چھو کر میں گولی کیسے چلا سکتا! مگر اب ——! —— نہیں نہیں۔ مجھے بھی حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ ورنہ سزا مل جائے گی۔ مارا جاؤں گا۔ باتوں کے زہر سے یا پھر بارود کے دھماکے سے۔

● پھر دیکھ کیا رہے ہو ۔۔؟ ۔ گولی چلاؤ ۔ رک
یوں گئے ۔۔؟

● تم کیا دیکھ رہے ہو ۔۔؟ تمہاری انگلی بھی بندوق
کے گھوڑے پر ہے ۔؟

● جانے کیوں گولی چلانے کو جی نہیں چاہتا ہے ۔
۔ انور تب تم گولی چلادو ۔۔

● یہ کیا بندوق میری کنپٹی پر رکھ بھی دی اور اب
ہٹا کر پھینک دی ۔ کیوں ۔۔؟

● اس لئے کہ تم نے اپنی بندوق پھینک دی ۔۔
ارے یہ کیا تمہارے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں ۔
کیا ہوا بابا تم کانپ کیوں رہے ہو ۔

● میں بابا نہیں ۔ کریم خان یا بابر خان بھی نہیں ۔
رام پرشاد ہوں ۔

● چھوڑو یہ بیکار کی باتیں ۔ میرے لئے تم بابا ہو ۔
لو یہ چادر اوڑھ لو ۔

● ارے ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ تمہیں بھی تو سردی لگ جائیگی ۔

● ہاں ۔ وہ تو ہے ۔ میرے جسم میں بھی کپکپی سی ہونے
لگی ہے ۔

● لگتا ہے دونوں کا ایک جیسا حال ہے ۔ یہ کیا
کر رہے ہو انور ؟

● بابا حل تلاش کر رہا ہوں ۔ سوچ رہا ہوں چادر
کے دو ٹکڑے کر لوں ۔ آدھی تم لو ۔ آدھی میں لیتا ہوں ۔
یہی ایک راستہ ہے ۔ ورنہ مر جائیں گے ۔ ہم دونوں ۔

● نہیں یہ بٹوارہ ہے ۔

● چلو بٹوارہ سہی ۔۔ بچ تو جائیں گے نا ۔

● ایسا مت کہو ۔ یہ ایک اور بٹوارہ ہوگا ۔ ملک
کا بٹوارہ ۔ زمین کا بٹوارہ ۔۔ ہوا اور پانی کا بٹوارہ ۔
زندگی کا بٹوارہ ۔ مجھے یہ منظور نہیں ہے ۔

● پھر کیا کریں ۔ تم ہی بتادو ۔ ؟

● جیسے ہم دونوں بارش سے بھیگ گئے ہیں ۔ ویسے
ہی ہم دونوں اگر ایک ہی چادر اوڑھ لیں تو ۔

● کیا خوب کہی ۔۔ یہی میں بھی کہنا چاہتا تھا ۔

● پھر آؤ ۔ ایک ہی چادر اوڑھ کر سحر کا انتظار کریں ۔

● ہاں ۔ بہت اچھا لگ رہا ہے ۔ ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں اپنے باپ کی چھاتی سے لپٹ گیا ہوں ۔ جانے
کیوں رونے کو جی چاہتا ہے ۔

● مت رو میرے بچے ۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں
عرفان میری گود میں بیٹھا ہے ۔

● بابا ہم ایک دوسرے کی جان کے پیچھے کیوں پڑ گئے
تھے ۔۔؟

● اپنے خود غرض اور مطلب پرست آقاؤں کی جان
بچانے کی خاطر !

● ایسا کیوں ہو رہا ہے بابا ۔ ؟

● ہو نہیں رہا ہے میرے بچے ۔ سب کچھ کروایا
جاتا ہے ۔

● لیکن اب ایسا نہیں ہوگا ۔ اب ایسا نہیں ہوگا ۔
بابا بارش کو تھم جانے دو ۔ بادلوں کو چھٹ جانے دو ۔۔
سحر کی پہلی کرنیں جب ان تاریکیوں کو دبوچ لیں گی
تب ہم دونوں واپسی کا راستہ تلاش کریں گے ۔
نہیں ایک نئے راستے کی تلاش کریں گے ۔ اور
ایک منتشر ہجوم کو کارواں کی شکل دے کر اپنی منزل کی
تلاش کریں گے ۔!

● ہم دونوں نا ؟ ۔۔!

● ہاں ۔ ہاں ۔۔ ہم دونوں ۔ !!

[illegible]

نئے کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

نام کتاب :- خودرو (شعری مجموعہ)
مصنف :- سید بشارت علی
ضخامت :- ۱۹۲ قیمت :- ۸۰ روپے
ناشر :- مکتبہ شعر و حکمت ۲/۶۵۹-۳-۶، سائبان
کپاڈیہ لین، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴

" خودرو " سید بشارت علی کا شعری مجموعہ جو آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی اعانت سے کمپیوٹر پر چھپا ہے۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور کتاب کی معنویت کو ابھارتا ہوا ہے۔ کئی رنگوں کے امتزاج نے اس کی دیدہ زیبی اور معنویت میں اضافہ کیا ہے

سرزمین دکن کے " شعر و ادب " کی دنیا میں بشارت علی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ شعبہ انگریزی کے باصلاحیت اور ممتاز لکچرر ہیں۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ بہار کے کلیم الدین احمد کی طرح زبان اردو پر بھی ان کی مکمل دسترس ہے جس کا اندازہ ان کی تحریروں اور شعری مجموعے کو پڑھ کر ہوتا ہے۔

سید بشارت علی نظموں کے شاعر ہیں۔ غزلیں کم کہتے ہیں مگر خوب کہتے ہیں۔ نظموں میں آزاد و معرا نظموں کی طرف ان کا فطری رجحان زیادہ ہے۔ پابند نظمیں بھی کہتے ہیں جو تمام تر صنفی اور صوری خوبیوں سے ملبوس ہوتی ہیں "خودرو" میں ان کے انتخاب کا ایک بڑا حصہ آزاد نظموں پر مشتمل ہے چند پابند اور سہ مصرعی نظمیں بھی ہیں۔ غزلوں کا حصہ تشنہ ہے۔ شاید یہ ان کی کسی منصوبہ بند اسکیم یا وقت کے تقاضے کا سبب ہو۔ ان کے نظموں کی زبان عام فہم اور مروجہ ہے۔ انہوں نے بھاری بھرکم اور دبیز و ثقیل الفاظ کے استعمال سے حتی الامکان پرہیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقفی اور مرصع الفاظ سے دامن بچاتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی نظموں میں سلاست، روانی، موسیقیت اور غنائیت ہے جو ہر قاری کو اپنی طرف کھینچ کر مطالعہ کے لئے مجبور کرتی ہے۔ نظموں کا آخری بند ماحصل ہوتا ہے۔ ہر نظم اپنے آپ میں مربوط اور مکمل ہے۔

سید بشارت علی کا اسلوب خود کلامی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے آپ سے بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کا مخاطب ان کے علاوہ بھی کوئی ہوتا ہے تو بھی ان کی آواز تیز نہیں ہوتی۔ لہجہ مدھم اور آواز نرم ہے۔ ان کی نظمیں طویل ہو یا مختصر ان میں ایک چنگاری سی محسوس ہوتی ہے۔ مگر جذبات کی راکھ میں دبی دبی سی۔ وصل و فاصلہ اتصال اور انفصال سے ان کی شاعری وجود میں آتی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ نظموں میں جدید اسلوب اختیار کیا ہے
ان کی سوچ بھی نئی حیثیت سے مملو ہے۔ ان کی نظمیں خواہ
جس عنوان کی ہوں ان میں حقیقت بیانی اور یاسیت
کا پہلو نمایاں ہے۔ یاسیت کی جلوہ گری اور جلوہ نمائی
غزلوں میں اچھی لگتی ہے اور پابند نظموں میں بھی مگر نثری
اور آزاد نظموں میں مجھے یہ اچھی نہیں لگتی۔ اس کے علاوہ ان
کی نظموں میں قصہ عدم وجود، فلسفہ حیات و ممات، ہندو
عقائد کے مطابق دوبارہ جنم لینے کی بات اور ذکر قیامت
موجود ہے۔ ان نظموں میں ایک معمولی عورت، رخت
سفر باندھو، جشن چراغاں، اعادہ، تم کو نج کے، صرف گریہ،
اب روبرو ہو، تمہاری قربت، یہ مکاں، میں بھی خالق ہوں
تیرے بدن کے سمندر، دوبارہ جنم قابل قدر مطالعہ ہیں۔
مثال کے لئے چند بند مختلف نظموں سے پیش کر رہا ہوں۔

- مسافر ہم
ہماری منزلیں معدوم
اٹھو رخت سفر باندھو (رخت سفر)

- اک ذرا کمتر سہی
میں بھی خالق ہوں
مجھے تو مستند کر (میں بھی خالق ہوں)

- یہاں یہ نسلوں کا سلسلہ اک فریب سا ہے
ہمارے اجداد
ہمارے جسموں میں خود کو دہراتے آرہے ہیں (اعادہ)

- میں اگر ہوں بھی
تو شاید نقطۂ معدوم ہوں
اور نہیں تو
ان کو ہٹا کے آخر
جو بچے
میں کس قدر ہوں؟ ...... (میں کس قدر ہوں)

جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے۔ اس مجموعے
میں غزلوں کی تعداد کم ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری
کی پہچان غزلوں ہی کے حوالے سے ممکن ہے۔ جو کلاسیکی تہذیب
نئی حیثیت اور الفاظ کی تازہ کار تراشیدگی سے عبارت
ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پڑھنے والے کو بہت آہستگی
سے اپنی گرفت میں لیتی ہیں اور آہستہ آہستہ گرویدہ بنا
لیتی ہیں۔ ان میں حقیقت بیانی، فلسفہ و فکر، فلسفۂ حیات و
ممات، غم دوراں غم جاناں وغیرہ سب کچھ ہیں۔ ان کے علاوہ
ساری فنی معنوی اور صوری خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ
ہیں۔ موسیقیت کی زیریں لہریں ان میں پوری طرح موجزن ہیں۔
ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

ندی کھا جا کے سمندر کی تہہ میں جذب ہوا
مٹا جو میں تو نئے روپ میں ابھر آیا
سفید پوشوں کا احسان مجھ پہ کیا کم ہے
بگاڑ میری طبیعت کا کچھ نکھر آیا
زرا سا چھیڑ کے تو خود ہی آزما لے مجھے
نہ سوچ شعلہ نہاں اس شرار میں کیا ہے
کہیں سے شعلہ ہی لا کر اتار دو دل میں
مری رگوں میں اندھیرا سما گیا ہے بہت
مرے وجود کو میری صدا سے پہچانو
تو قبل اس کے کہ چپ ہو میری زباں سُن لو

مجموعی طور پر ان کی شاعری اردو زبان و ادب میں ایک گراں
قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یقیناً ہر سال شائع ہونے
والے بے شمار شعری مجموعوں کی بھیڑ میں "خود رو" اپنی صوری
اور معنوی، باطنی اور ظاہری خوبیوں سے آراستہ ایک مجموعہ ہے۔

● سید ابوالفیض سید آبادی

نام کتاب لبِ فرات (شعری مجموعہ)
شاعر :۔ فاخر جلال پوری
ناشر :۔ انجمن نئی آواز جلال پور، فیض آباد
ہدیہ :۔ پانچ روپیہ

"لبِ فرات" فاخر جلالپوری کا نتیجۂ فکر ہے. جیسا کے نام سے ہی ظاہر ہے یہ اہل بیت اطہار کے حضور میں بطور عقیدت نذر کئے گئے کلمات کا مجموعہ ہے جسے شاعر نے "عرض ہے کہ..... عنوان سے قلم بند بھی کیا ہے۔ اس مختصر مگر کامیاب و کارآمد مجموعے میں مجموعی طور پر ۲۲ نظمیں سلام اور مراثی ہیں. کتاب کے شروع میں اقبال کا یہ شعر جہاں اہلبیت سے شاعر کی والہانہ عقیدت و وابستگی کو ظاہر کرتا ہے وہیں اپنی حقیقت بیانی میں ایک عظیم تاریخی داستان بھی چھپائے ہوئے ہے.

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیل

اس کے بعد "اے خدا" کے عنوان سے حمد ہے بعدہٗ یاد "شہ لولاک" کے عنوان کے تحت نعت اور "علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ" کے عنوان سے منقبت و نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ "باب علم والتقا" اور "اے کاش" دعائیہ نظم ہے جو اپنے آپ میں مربوط و منظم ہے۔ ان میں عاجزی و انکساری، سلاست، روانی تاثر سب کچھ ہے۔

اس مجموعے میں شامل نظمیں "حسنیت" "ولادت حضرت عباسؓ" "نذر حسینؓ" "سر بکف اللہ اکبر سر بکف" "اصول حق" "جبیں اللہ کے آگے جھکی ہے" اور سلام بحضور امام حسینؓ" نہ صرف یہ کہ صوتی اعتبار سے اچھی ہیں بلکہ بہ لحاظ سے قابل قدر اور باوزن ہیں۔

فاخر کی زبان صاف شستہ اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں بھی بلا کا جادوئی اثر رکھتے ہیں۔ ان کے سیدھے کلام میں جو وزن، زور اور جادو ہے وہ ان کی فنی پختگی اور مہارت کا ثبوت دیتی ہے اور بلاشبہ وہ مقام پر اپنے قدما مرثیہ نگاروں سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ وہ بات کہتے، اسے دل کی گہرائی تک اتارتے، اسے منواتے اور فضا سازی کے گُر سے پوری طرح واقف معلوم ہوتے ہیں. تمام نظمیں مرصع، مسجع و مقفیٰ ہیں۔ ان میں پابند نظموں کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

اس کتاب کے متفرق اشعار اور بند ملاحظہ ہوں۔

دوات کو زمیں تل جائے تو ہو سکتا نہیں
اے علی مرتضےٰ تیری عبادت کا صلہ

تری زمانے کو اک بار پھر ضرورت ہے
حمیدیت کا ہے دنیا میں پھر چلن عباس

یہی کہ خون شہیدان کربلا سے ہم
کریں گے قسمت فردا کے واقعات رقم

حسینیت اہنسا، امن، قومی یکجہتی بھی ہے
مریض عہد حاضر کی حسینیت دوا بھی ہے
حسینیت رگ باطل کے حق میں اک نشتر ہے
حسینیت صدائے نعرۂ اللہ اکبر بھی ہے
حسینیت خواب سطوت کسریٰ و قیصر بھی ہے
حسینیت مزاجِ فقر سلمانؓ و ابوذرؓ سے ہے

پرچم حق بلند کرنے کو
ٹکڑے بدر و حنین پیدا کر

اے مرے دوست اپنی نسلوں میں
پہلے عزمِ حسین پیدا کر

اسلام کے فروغ و اشاعت کی بات تھی
یعنی وہ ایک معرکہ بدر و حنین کا
اب تک مگر جہاں میں بنامِ اصولِ حق
کوئی جواب ہو نہیں پایا حسین کا

طباعت عمدہ ہے، کاغذ بھی اچھا ہے۔ قیمت کے لحاظ سے
اس گرانی کے دور میں اس گرانی کے دور میں اس کی کوئی
قیمت ہی نہیں ہے۔ اسے مفت کہا جائے تو زیادہ بہتر
ہوگا۔ مواد کے لحاظ سے بڑی قیمتی کتاب ہے ہر اردو داں
بالخصوص اہل بیعت سے عقیدت رکھنے والوں کو اس
کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ اتنی کم قیمت پر اس قیمتی مجموعہ
آج کل شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

● سید ابوالفیض سیدابادی گیا

نام کتاب :۔ آوازِ جرس (شعری مجموعہ، ہندی)
شاعر :۔ منصور اعجاز جوش
قیمت :۔ تیس روپے
ناشر :۔ ارنیسٹو پرکاشن۔ ونی۔ ایوت محل

چھوٹی سی مختصر کتاب — عام پاکٹ سائز
(جیبی) سے کچھ بڑی۔ مختصر آزاد نظموں کا مجموعہ — جاذب
نظر سرورق۔ بیک کور پر ایک جدید شاعر کی وضیح رائے
اور شاعری کی تصویر — کل ستاون صفحات پر بکھری
ستاون نظمیں — لیکن اُردو میں نہیں — اردو
[illegible]

اجمال میں ممکن ہے کوئی قابل توجہ بات نہ ہو — میں
نے بھی ایک دوست کے پاس یہ کویتا سنگرہ دیکھا تو
سوائے ٹائیٹل (آرٹسٹ بلی کھیرے) — بے حد بامعنی
سہ رنگا ٹائیٹل — کوئی اور بات متوجہ نہ کر سکی۔ لیکن
انہیں دوست (ظفر اللہ خاں نیازی۔ کس دل سے
انہیں مرحوم لکھوں — ۲۰ جولائی ۹۳ء کو وہ اللہ
کو پیارے ہو چکے) کے اصرار پر ساتھ لایا۔ پڑھا۔
ٹھیر ٹھیر کر پڑھا اور کوئی تین گھنٹہ میں پورا مجموعہ پڑھ
چکا —

میں شاعری کی کتاب کو اتنے کم وقت میں پڑھنے
کا قائل نہیں ہوں۔ اتنے وقت میں ورق گردانی تو ہو
سکتی ہے لیکن مشمولات کو صفحۂ دل پر اتارنے کی کوشش
لا حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اعجاز کی کویتاؤں میں زیریں
لہریں UNDER CURRENT نہایت توانا اور زور آور
ہے۔ شاعر کی سوچ اور محسوسات کی سطحیں کتنی اور کیسی
ہیں۔ نظمیں بنیادی طور پر ایک دھاگے میں پروئی اگرچہ
محسوس ہوتی ہیں لیکن اندازِ اظہار کی نیرنگیاں ہر نظم کو
منفرد بناتی ہیں۔ یہ نہیں کہ شاعر کے پاس موضوعات کی کمی
ہے، اور کچھ نظمیں کہہ لینے کے بعد اس نے انہیں خیالات کو
دوہرایا ہے — لیکن ان نظموں میں Common thread
مشترک قدر کی تلاش بھی بے سود نہیں ٹھہرتی، یہ مشترک
قدر، یہ تمام نظموں پر حاوی ایک موضوع بجائے خود
اتنا متنوع، ہم جہت اور ہمہ گیر ہے کہ ازل سے مختلف
پیرائیوں اور نثر و شعر کے مختلف سانچوں میں ڈھل کر پیش
کئے جانے کے بعد بھی وہ موجود ہے۔ نئے دور کے نئے قالب
میں ڈھل کر — اپنے ہزاروں روپ اور بے شمار شکلوں
کے ساتھ زیادہ توانا، بے حد طاقت ور، اٹل اور

ہیئت ناک محسوس ہوتا ہے۔

یہ موضوع ہے ناہمواری، عدم مساوات، ظلم اور حالات کا جبر مسلسل اور اس کے انیک روپ ہیں۔ کبھی مہاجنی اور ساہوکاروں کا نظام، تو کبھی زمینداروں اور جاگیرداروں کا نظام، کہیں ذات پات اور اعلیٰ ذات و کم ذات کی عدم مساوات، تو کبھی طبقۂ واریت کی جنگ۔ کبھی رنگ و نسل کی بنا پر خونی فسادات تو کہیں مذہب و علاقہ پرستی کے جنون میں طویل جنگوں کا سلسلہ — پرانی اور نئی ان کشمکشوں جنگوں اور فسادات کے لئے وجہ اور اسباب وہی ہیں صرف دور کے بدلنے کے ساتھ ان کے نام بدلتے ہیں۔ ہم عصر دنیا میں مساوات کے نام پر سماجی نابرابری، اور سیکولرزم کے نام پر برپا کئے ہوئے خونیں فسادات اور ظلم و بربریت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ امن و جمہوریت کے نام پر مساوی اور اول درجے کے شہری، حقوق کی دستوری ضمانت دیئے جانے کے نام پر ہر طرح کی ناانصافی، عدم مساوات کو اور آئینی قدروں کی کھلے عام ناقدری و پامالی کے مظاہر عام ہیں۔ اب جو ان کھوکھلی قدروں کے نظام اور اس نظام کے جبر سے متاثر ہو کر اظہار کی صورتیں سامنے آئیں گی تو ان کی زبان، لفظیات، ہیئت اور لہجے مختلف ہوں گے لیکن عصری حسیت کا احساس بہر صورت مشترک و مشابہ ہوگا۔ اعجاز کی ستاون نظموں کے موضوعات اگر ستاون ہیں تو ان کے اظہار کی جہتیں اور سمتیں بھی [illegible] ہیں — لیکن ان سب میں [illegible] منصور اعجاز کہیں مایوس، دل برداشتہ، پست ہمت [illegible] فرد کی حیثیت [illegible] نظر آتے ہیں۔ ہم عصر دنیا [illegible] گیر سطح پر [illegible] حالات پر وہ ماتم و بین کرتے نظر نہیں آتے۔ بلکہ اس قرینے میں اس نظام کے کھوکھلے پن، رشتوں کی ناقدری، علمی

انسانی قدروں کی پامالی۔ اور اخلاقی و تہذیبی نظام کی دیواروں میں رخنے پڑتے دیکھ کر وہ چیخ کر، پکار کر آواز دے کر اپنے ہم وطنوں کو اور انسانوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

رُکو:

رُکو نہیں تو اب اس کے آگے
نہ ظلم ہوگا نہ تم رہو گے۔

اعجاز کی نظموں میں ان کا بیانیہ، ان کا تخاطب اور ان کی گفتگو — ان کی بلند آہنگ سوچ ہے۔

منصور اعجاز جوش — آواز جرس کے وسیلے سے کچھ بتاتے اور سمجھاتے ہیں۔ انہیں کسی طور ناصح مشفق نہ کہیں، قائد و رہبر کے القاب سے نہ پکاریں۔ اس لئے کہ اعجاز کو ان ناموں اور القاب سے پکارے جانے کا شوق اور چسکا نہیں۔ جستجو ہے تو صرف اس بات کی کہ غافل اور نیند کے ماتوں۔ کم حوصلہ اور مایوس اہل وطن کو ان کی آواز نیند سے جگا دے۔ بیدار کر دے۔ ان کے دلوں کے تاریک نہاں خانوں میں آس اور امید کی کرنیں جگہ پالیں۔ وہ خود کو حوصلہ دے لیں۔ یہی کم حوصلہ اور کمزور بھی سمجھ کر ایک، نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو کل ان کا ہوگا۔

آواز جرس کی نظمیں ہم تو اپنے دکھوں، اپنے دور اپنے دور کی ناانصافیوں، کھوکھلے نظام کے جبر اور انسانی قدروں کی زوال آمادگی، سماجی ڈھانچے کے ٹوٹنے بکھرنے کا منظر دکھاتی ہیں، بشرطیکہ ان نظموں کے توسط سے ہم منصور اعجاز کے تجربوں اور احساسات میں شریک ہو جائیں [illegible] نظموں کی زبان اور ان کا رسم الخط ترسیل و ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتیں۔ یہ سچ ہے کہ دیوناگری [illegible]

رتی الخطا کے واسطے سے یہ نظمیں ایک بڑے حلقے میں متعارف ہوں گی یہ تو اچھی بات ہے۔ یوں بھی اپنی نظموں کے مخاطب قاری کسی مخصوص طبقے یا حلقے کے ہوں، یا انہیں تک محدود رہ جائیں یہ اعجاز کا منشا ہرگز نہیں، لیکن عملی طور پر اردو والوں کا ایک بڑا حلقہ اس کے مطالعہ سے محروم رہے گا۔ اور جوش شاید یہ کبھی نہیں چاہیں گے، اس لئے ان کے نظموں کی تخلیق کے وقت یہی بڑا لیکن محروم طبقہ خصوصی طور پر ان کے پیش نظر رہا ہوگا۔ ان کو ان نظموں کو اردو جاننے والوں کے حلقے میں متعارف و مقبول بنانے کے لئے سعی کرنی ہوگی۔

اب کون، اور کس دل سے انہیں مشورہ دے یا تجویز رکھے کہ وہ اس کتاب کو اردو میں چھاپیں۔ ظاہر ہے [illegible] دوں نے اس سمت میں سعی و اقدام کیا کبھی ہوگا۔ جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا رہا کہ انتخاب کچھ اور سخت ہوتا اور ترتیب کچھ اور ہوتی۔ کچھ نظمیں شامل نہ کی جاتیں تو مناسب ہوتا۔ اعجاز کو جن لوگوں نے سنا ہے وہ گواہ ہیں کہ ابھی اعجاز کے پاس کئی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ اردو کا مجموعہ ترتیب دیتے وقت وہ ان نظموں کو ضرور شامل کریں۔

آوازِ جرس کی چند بے حد مختصر لیکن خوبصورت نظمیں ہیں۔ کربلا، بھارت، رشتہ، انسانیت، جیالی، اور مرد وغیرہ۔

کچھ نظموں کے عنوانات قائم کرنے میں شاید اعجاز نے عجلت سے کام لیا ہے۔ اس لئے کہ ایسے کچھ عنوانات نظموں کی فضا قائم رکھنے اور بھرپور تاثر پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔ تاہم ایسی کئی نظمیں ہیں جو آپ کے ذہن کی گونج بن کر رہیں گی۔

کیا ہوا تمہیں، ؟ کب تک آخر؟ دکھاوا، یاد ہے۔ سوگند اور ماں جیسی نظمیں صرف سوالیے ہی نہیں بلیغ اشارے ہیں۔ اعجاز کی نظم سچائی، ہم کو فوری طور پر متوجہ کرتی ہے۔ اس لئے کہ شاعر کی شخصیت، سوچ اور جذبوں تجربوں کو سمجھنے میں یہ کسوٹی کا کام کرتی ہے۔

من حیث المجموعہ ——— آوازِ جرس، قابل مطالعہ مجموعہ ہے۔ اسے تیس روپے میں راشد سلو ڈلیو الیوت محل کے پتے سے حاصل کر کے پڑھنے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ اور ادب دوستوں کو بلا تردد مشورہ دیا جاسکتا ہے

● فیض الرحمٰن شاہ، الیوت محل، جلو نگر بہار

★ نیا سال مبارک ہو —

سہیل کے شمارہ ۹ اور ۱۰ تقریباً ساتھ ساتھ ہی ملے۔ شمارے ۹ میں حقانی القاسمی کی اس تاکید کے باوجود کہ " ان کے ہاں الفاظ کا ناجائز استعمال بہت ملتا ہے اور تحریر میں بے ربطگی بھی بہت جھلکتی ہے " مجھے ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون " اردو ہندی اور امرت رائے " بہت پسند آیا۔ اگر میرا حافظہ دھوکا نہیں دے رہا ہے تو مجھے یاد آتا ہے کہ حقانی صاحب نے کئی بار پہلے بھی ڈاکٹر رستوگی کی تحریروں پر اعتراض کئے ہیں۔ انھیں کی علامہ اقبال پر کسی تحریر کے متعلق یہ پوچھنے پر کہ اقبال کی شاعری میں عظمت کے کیا عناصر ہیں میں بھی حقانی صاحب کے غیض و غضب کا نشانہ بن چکا ہوں۔ مگر موصوف میری رہنمائی نہیں کر سکے — اب اگر میں یہ پوچھ بیٹھوں کہ الفاظ کا ناجائز استعمال کیا ہوتا ہے یا تحریر میں بے ربطگی کی کیا علامتیں ہیں تو ایک بار پھر حقانی القاسمی صاحب شاید میری رہنمائی نہ کر سکیں گے۔ علی گڑھ کی اردو دانی پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ فراق گورکھپوری وہاں کسی مشاعرے میں کلام سنانے کے لئے ننگے سر مائک کے سامنے آ گئے اور اپنے مخصوص انداز میں ابھی انہوں نے ایک ہی مصرع پڑھا تھا کہ سامعین کے درمیان سے نعرہ اٹھا " ٹوپی پہنو، ٹوپی پہنو " جب فراق صاحب کو دو تین بار وہی مصرع دہرانے کے بعد بھی نعرہ سنائی دیا تو بڑی سنجیدگی سے بولے کہ یہ علی گڑھ والوں کی اردو کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے بھائی ٹوپی نہیں بلکہ جوتی پہنی جاتی ہے۔ ٹوپی تو اوڑھی جاتی ہے۔ حقانی القاسمی ریسرچ سکالر ہیں اور ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ہر بات کو کسی طرح کے اعتراضات کی زد میں نہ آنے دیں حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کی تحریروں کو بے عیب قرار دیں۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر رستوگی نے یہ سولہ آنہ سچ لکھا ہے کہ انگریزوں پر لسانی تقسیم کو ہوا دینے کا الزام بالکل غلط ہے اور انہوں نے رسم الخطوں کے مابین چھڑی ہوئی رسہ کشی سے صرف سیاسی فائدہ اٹھایا۔ یعنی رسم الخطوں کے مابین رسہ کشی کے لئے بھی انگریز ذمہ دار نہیں ہیں لیکن اہل اردو شاید

P. & T. Gy-12/94 R. N. I. Regd. No. 3520/73

The SOHAIL Monthly River Side Road, Gaya—823001

rs of Publication Phone : 21573

پہلے بچے کا
حق
تین سال تک
مکمل پیار
مالا ڈی اپنائیں
माला-डी
Mala·D
CONTRACEPTIVE PILLS
ع حمل گولیاں
روپے فی پیکٹ
صرف
ایک گولی
روزانہ